DUE DATE

Acc. No. ___________

nary Books **25 Paise** per day. Text Book
Over Night Book **Re. 1/-** per day.

منظور شدہ محکمہ تعلیمات پنجاب بموجب سرکلر نمبر ایس - ۱۰ (بی سی - ڈی) لائبریرین - ۶ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹ عیسوی
منظور شدہ محکمہ تعلیمات بلوچستان بموجب سرکلر نمبر سی - ۶۳۲۱/A / ای - ای اینڈ ایس - ایس مورخہ ۱۰ فروری ۱۹ عیسوی

ٹیلیفون نمبر
۴۶۱۹۹

ماہنامہ

رجسٹرڈ ایل نمبر
۶۹۳۵

تحریر

ایڈیٹر

زاہدہ صدیقی

جلد ۷	اکتوبر - نومبر	شمارہ ۱۰، ۱۱

موجودہ شمارہ : ۲۵ روپے

مقام اشاعت
چوک اردو بازار ــــــ لاہور

ماہنامہ "تحریریں" لاہور

ترتیب

عکسِ شخص

مطالعۂ فکر وفن

خیالات

عبدالعزیز خالد نمبر

بنام خالد

مکتوبات

عبدالعزیز خالد نمبر

تبصرے

تقریبات

عکسِ نظم و نثر

عکسِ تحریر

خیالات

زاہدہ صدیقی

پہلی تحریر

عبدالعزیز خالد نمبر کی پہلی جلد کے اداریے میں ہم نے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ ہم تمام مضامین نظم و نثر ایک جلد میں نہیں سمیٹ سکے مگر ہم اس بات کا واضح اعلان نہیں کر سکے تھے کہ جو مضامین اس جلد میں شامل نہیں کئے جا سکے انہیں کب اور کس صورت میں پیش کیا جا سکے گا جس کا سبب وہ تمام مشکلات تھیں جو ایک خالص ادبی پرچے کا مقدر ہیں ——— جس قدر مواد ہمارے پاس محفوظ تھا وہ ایک جامع جلد کے لئے کافی تھا۔ ہمیں اس بات کا قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ دوسری جلد کی اشاعت کا مرحلہ آنے تک اس قدر مزید مواد دستیاب ہو جائے گا کہ ہمیں ایک بار پھر تنگیٔ داماں کا احساس ہو گا اور اسے ایک جلد میں پیش نہ کیا جا سکے گا ——— سو، موصولہ مضامینِ نظم و نثر اور خیالات و تاثرات مزید جلدوں میں پھیل گئے ہیں اور یوں عبدالعزیز خالد نمبر مجموعی طور پر تین جلدوں پر محیط ہے جس کی دوسری کڑی زیرِ نظر شمارہ ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے شاعروں اور نقادوں کی تخلیقات بھی شامل ہیں اور پہلی جلد کے بارے میں برِصغیر کے اہم لکھنے والوں کی آرا بھی شامل ہیں۔ ہم نے کسی خاص اندازِ نظر سے عبدالعزیز خالد کی شخصیت اور شاعری کو پیش کرنے کی ارادی کوشش نہیں کی بلکہ لکھنے والوں نے زیرِ نظر شخصیت کی ذات اور شاعری کو جیسا پایا، ہم نے ان کی تحریروں کو ویسے ہی پیش کر دیا۔ چنانچہ نظموں میں بھی اور مضامین میں بھی جہاں تحسین کا پہلو ملے گا وہاں بعض مقامات پر تیز لہجے میں سخت تنقیدی لہجہ بھی ملے گا۔ گذشتہ شمارے میں کہیں کہیں مقصد اور مفہوم کو متاثر کئے بغیر بعض جگہ اختصار بھی کیا گیا تھا مگر اس جلد میں کہیں بھی نہ تو اختصار کیا گیا ہے اور نہ ہی ذرہ برابر ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے کسی بھی مضمون کو اس کے تیز لہجے کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا بلکہ بعض نقادوں کو جنہیں دعویٰ تھا کہ وہ نہ صرف عبدالعزیز خالد کے فن کی خامیاں نمایاں کر سکتے ہیں بلکہ فنی اور لسانی غلطیوں کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں، خاص طور سے لکھنے کے لئے کہا گیا۔ تاکہ کوئی پہلو چاہے وہ کتنا ہی کمزور ہو، احاطۂ تحریر میں آنے سے رہ نہ جائے مگر ہماری یاد دہانی کے باوجود ہمیں ان کی طرف سے مضامین موصول نہیں ہوئے۔

پہلی جلد میں جیسا کہ ہم نے واضح اعتراف بھی کیا تھا بعض مضامین میں قدرے اختصار لیا گیا تھا مگر ان کی اصل روح متاثر نہیں ہوئی تھی۔ دو ایک مضامین میں چند سطریں چھپنے سے رہ گئی تھیں۔ بعض مضامین کسی خاص تقریب میں پڑھے جانے کے بعد شامل اشاعت کئے گئے تھے۔ ایسی صورت میں اس خاص نشست یا مقامِ اجلاس کے نام کو حذف کر دیا گیا تھا کہ شائع شدہ مضمون میں اس کی ضرورت یا اہمیت نہیں رہتی۔ بعض اوقات پڑھے جانے والے مضامین میں حاضرین کو مخاطب کیا جاتا ہے مگر اسی مضمون کو شائع کرتے ہوئے تخاطب کے جملے حذف کرنے پڑتے ہیں کہ یہ مضمون سامعین کو سنانے کی بجائے اب قارئین کو پڑھانا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بعض غلط فہمیوں نے جنم لیا اور بعض لکھنے والوں نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔ محترمہ جمیلہ ہاشمی کے مضمون کی بھی چند سطور رہ گئی تھیں۔ ہم اُن کے تمام تر ردِ عمل اور الزامات کے جواب میں ان کا مضمون دوبارہ شائع کر رہے ہیں

اس شمارے میں نظموں کے علاوہ شخصی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں اور اکثر لکھنے والے پاک و ہند کے اہم اور پرانے مصنفین ہیں۔ تاہم چند ایک تحریریں نئے لکھنے والوں کی بھی ہیں۔

ہماری خواہش تھی کہ انتخابِ کلام خالد بھی پیش کرتے اور ایک دقیق انتخاب کرانے کے بعد اسے کتابت بھی کرایا جا چکا تھا مگر افسوس ہے کہ ہم اس قابل نہیں ہو سکے کہ یہ اہم اور ناگزیر انتخاب جس کے بغیر ہم اس نمبر میں ایک خلا محسوس کرتے ہیں شائع کر سکتے۔ تاہم چند نظمیں اور چند غزلیں شامل کر دی گئی ہیں اور چند تخلیقات "عکسِ تحریر" کے تحت عبدالعزیز خالد کے اپنے خط میں دی جا رہی ہیں۔ یہ حصہ انتخاب کی جگہ تو نہ لے سکے گا مگر کسی حد تک اس کی تلافی کر سکے گا اور پڑھنے والوں کو خالد کے افکار کے علاوہ خالد کی تحریر کے عکس سے بھی روشناس کرا سکے گا۔

طور پر زبانی یا تحریری طور پر کیا۔ یہ برجستہ آراء اپنی اہمیت کے علاوہ دلچسپی کا پہلو بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کے ساتھ خصوصی تقریبات قریب قریب ہر شہر میں متعدد بار منعقد ہو چکی ہیں۔ ہم نے ان میں صرف چند ایک کی روداد شائع کی ہے اور یہ صرف ان تقریبات میں سے چند ہیں جو گزشتہ چار سال کے اندر منعقد ہوئیں۔

اس شمارے میں بھی "خیالات" کے تحت پاک و ہند کے اہم لکھنے والوں کے عبدالعزیز خالد کے فن کے بارے میں تاثرات شامل کئے گئے ہیں۔

ہم نے حتی الوسع اس شمارے کو اپنی حیثیت میں ایک جامع نمبر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ اس کے پڑھنے والے ہی کر سکیں گے جن کی بے لاگ آراء کے ہم منتظر رہیں گے۔

خطوط کا مطالعہ کسی شخصیت کو سمجھنے میں کس قدر معاونت کرتا ہے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ شخصیت کی پرتیں ان خطوط سے بھی کھلتی ہیں جو کسی شخصیت کی طرف سے لکھے جاتے ہیں اور ان سے بھی جو اس شخصیت کے نام لکھے جاتے ہیں۔ ہمیں وہ خطوط دستیاب نہیں ہو سکے جو عبدالعزیز خالد نے دوسرے لوگوں کو لکھے مگر دوسرے لوگوں کی طرف سے آنے والے خطوط شائع کئے جا رہے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

عبدالعزیز خالد

ہلّلویاہ

ہے بے نیازِ علائق وہ ذاتِ بے ہمتا
صفات و ذات میں یکسر منزّہ و یکتا
تمام حمد و ستائش اسی کو ہے زیبا
وہ جس نے کُن سے کیا کائنات کو پیدا
وہ جس نے دے کے مذاقِ تجسّسِ اشیا
کفِ غبار کو سونپی خلافتِ دنیا
بدیعِ ارض و سما لا الٰہ الاّ اللہ

اسی کے فیض سے فرشِ زمیں ہے خُلد آسا
فضائے گلشنِ ایجاد ہے نشاط افزا
اسی کا نام ہے وردِ زبانِ موجِ ہوا
اسی کا تذکرہ کرتے ہیں اہلِ نُطق و نوا
شہیدِ ذوقِ ترنّم، طیورِ نغمہ سرا
ہمیشہ پڑھتے ہیں سُبحانَ رَبیَّ الاَعلیٰ
اسی کا حق ہے ثنا لا الٰہ الاّ اللہ

ہر ایک ذرۂ صحرا، ہر ایک برگِ چمن
ادا شناسِ رسالت کو ہے صحیفۂ فن
بہارِ باغِ عدن ہو کہ دارِ رنج و محن
اسی کے ذکر سے آباد ہیں دیار و دمن
ضیائے شمس و قمر ہو کہ دیدۂ روشن
اسی کا نور ہے خود آشکار و جلوہ فگن
فروغِ صبح و مسا لا الٰہ الّا اللہ

خرامِ کبکِ دری، زمزمہ عنادل کا
سرودِ ابرِ بہاری، سکوت ساحل کا
فسانہ زلفِ دوتا کا، فسونِ شمائل کا
صبا کی نرم روی، اضطراب بسمل کا
نمود تاروں کی، نظّارہ ماہِ کامل کا
یہ اہتمام مداراتِ دیدہ و دل کا
ہے شانِ پاکِ خدا لا الٰہ الّا اللہ

عجب مقام ہے یہ کارخانۂ قدرت
طلسمِ حیرت و افسونِ وحدت و کثرت
بنا کے محرمِ اسرارِ حرمت و حلّت
دیا ہے اذنِ تمتّع بشر کو بے منّت
وہ خوش نصیب میسّر ہو جس کو یہ نعمت
مدام کیوں نہ رہے سرخوشِ مئے طاعت
کہ ہے یہ عینِ وفا لا الٰہ الّا اللہ

ماذ ماذ

وہ قریشی جو بنی سعد کے خیموں میں پلا
سلسلہ جس سے زمانے میں سیادت کا چلا
مجھ سے الکن کو کہاں اس کے بیاں کا یارا
والدِ امِ حبیبہ سے سنو اس کی ثنا
اس رحیم و مترحم سے پڑا سابقہ جب
قالَ : ما اَخلفكَ اَو عَمّكَ اَو رمَلكَ!
اِدھر اعشیٰ سے سخنور کا دیکھو انجام
حرمتِ خمر کے باعث جو مسلماں نہ ہوا
کوہِ فاراں سے ہوا مہرِ ابد تابِ طلوع
اب کہاں مطلعِ انوار سعیر و سینا
کم ہے وحشی سے سعادت میں اویس قرنی
روئے انور کے نظارے سے جو محروم رہے
رات دن میری زباں محوِ مناجات رہے
کچھ نہیں دل میں مرے اسکی محبت کے سوا
میں کروں اس کی غلامی بہ رضا و رغبت
وہ کہ ہے باعثِ منشا و معاد و مبدا
کہیں جس کو شہِ کونین و رسولِ ثقلین
ماذ و مزمل و عقیب ہے جو طاب طاہا

شدتِ جُوع سے جو پیٹ پہ پتھر باندھے
جس کے در سے کوئی سائل نہ تہی دست گیا

شاق جس پہ کہ گذرتی ہے ہماری تکلیف
فَهُوَ يُفْطِرُ يَوْمًا وَيَصُومُ يَوْمًا

سینہ معمور ہے اسرارِ خداوندی سے
لیلۃ البدر کے مہتاب سے روشن چہرہ

علم کا ہے وہ مدینہ ہے اگرچہ اُمّی
لوحِ محفوظ میں مسطور ہے جو اس نے پڑھا

رحمت و مرحمت و توبہ و تسکیں کا نبی
حسنِ اخلاق کی تکمیل ہے مقصد جس کا

جس کی خوشنودیٔ خاطر کے لئے پردہ کریں
ابنِ مکتوم سے میمونہ و امِ سلمہ

سنگریزے بھی کفِ دست پہ تسبیح کریں
پتے پیڑوں کے دمِ دید پڑھیں: صَلِّ علیٰ

سر جھکاتا ہے فلک بہرِ قدم بوس وہاں
نظر آتے ہیں جہاں اس کے نقوشِ کفِ پا

ہم کہیں گنبدِ خضرا کو مقامِ محمود
ہے یہ اک قطعۂ زمیں عرشِ بریں کا ٹکڑا

فِي السَّمَاءِ لَأَمِينٌ وَأَمِينٌ فِي الْأَرْضِ
فرق جو بندہ و مولا کے ہے رتبے میں بجا

اس کو کہتا ہے خدا: "آست"[*] حبیب الرحمٰن
مرا محرم، مرا محبوب، مرا رہنما

صاحبِ جود و نعم، فضل و کرم، لوح و قلم
کون ہے اس کے سوا مونسِ وحشت میرا!

---

[*] عبرانی (توریت): آنتَ، تو : تو خدا کا دوست ہے۔

خطایا

غریب و دردمند و سوختہ جاں یا رسول اللہ
میں مداح ہوں ترا ادنیٰ ثنا خواں یا رسول اللہ

سخن میرا معنون با ہمہ ایں سست عہدی
بنام شاہد نازک خیالاں یا رسول اللہ

گرہ کھولی زباں کی رفتہ رفتہ طبع موزوں نے
تھا لکنت کا سبب حرفِ پریشاں یا رسول اللہ

گزاری ہے شبستانِ ہوس میں زندگی میں نے
پشیماں ہوں پشیماں ہوں پشیماں یا رسول اللہ

تن آساں، ناتواں، آلودہ داماں بے سروساماں
میں کس منہ سے کہوں خود کو مسلماں یا رسول اللہ

فسوں آمیز باتوں سے خمار آلود نظروں سے
دلِ سادہ کو بہکاتے ہیں خوباں یا رسول اللہ

رہے نامحرم و ناآشنا با وصفِ یکجائی
دماغِ نکتہ سنج و قلبِ ناداں یا رسول اللہ

نکالا تو نے میری جان کو پاتال کی تہ سے
ہے نسلاً بعد نسلٍ تیرا احساں یا رسول اللہ

جو مجھ کو زندگی ہے تاب یابندگی جس سے
ترا ہر لفظ ہے تقدیر یزداں یارسول اللہ

ہو میرا شعر مصداق نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي
رہے یہ شمع تجھ کر بھی فروزاں یارسول اللہ

ہو تیرے ماسوا کس سے توقع دستگیری کی
ہے مرد افگن سے سر توڑ بحراں یارسول اللہ

محبت حسن سے کرتا ہوں آزادی پہ مرتا ہوں
تپش دل کی ہے رزق چشم حیراں یارسول اللہ

ہوں تیرا بندہ تیرا بردہ بیٹ تیری باری کا
بیاں کی منزلیں کر مجھ پہ آساں یارسول اللہ

پراگندہ دلیات اس کو جو اشتباہات بچا لے
عطا کر دل کو اطمینان ایماں یارسول اللہ

تری رحمت کے دروازے کھلے ہیں ہر کہ و مہ پر
ہے تو واحد انیس مستمنداں یارسول اللہ

وَاَنْتَ الْكَاظِمُ لِلْغَيْظِ وَالْعَافِيْ عَنِ النَّاسِ
ہے انسانوں میں تو ہی کامل انساں یارسول اللہ

تو خورشید سحر زنذیر کامل ہر ادا تیری
نگاریں مشک آگیں عنبر افشاں یارسول اللہ

صراط مستقیم و مجسم تادیب ہے لقب تیرا
ہے تجھ پر ختم ہر انعام و برہاں یارسول اللہ

ہے تیری خاک در کحل جواہر سے کہیں بڑھ کر
ترے دریوزہ گر ہیں میر و سلطاں یارسول اللہ

تری حلقہ بگوشی نازش اکلیل و افسر ہے
محبت ہے تری معراج انساں یارسول اللہ

ترے طاعت گزاروں کو خدا محبوب رکھتا ہے
لطیفہ ہائے پنہانی کے قرباں یا رسول اللہ

نظر بیمار کی جیسے پڑے تیمار داروں پر
بہت تکلیف میں ہے نوعِ انساں یا رسول اللہ

رعایا سے کہے راعی: فَلَا کَیۡلَ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ
بھڑک اٹھا چراغِ زیرِ داماں یا رسول اللہ

عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں کون دنیا میں
ترے دیوانے پکڑیں کس کا داماں یا رسول اللہ

سفینہ ہے رواں ایسا مگر اَیَّانَ مُرۡسٰهَا
کہیں پیدا نہیں منزل کا عنواں یا رسول اللہ

کفِ سیلاب ہے تیرہ شبی ہے نیشِ افعی ہے
زمیں دشمن، عدو گردونِ گرداں یا رسول اللہ

کہاں تابِ نفس ٹھہرے مقابل برق و باراں کے
بلائے بے اماں ہے موجِ طوفاں یا رسول اللہ

بھرے گا زخمِ لذت کب تری درماندہ امت کا
ڈھلے گی کب سحر میں شامِ حرماں یا رسول اللہ

ہوا ہے ہر طرف سے تنگ اس پر عرصۂ ہستی
سیہ بختی نے پکڑا ہے گریباں یا رسول اللہ

نہ دعویٰ بے گناہی کا، نہ شکوہ کم نگاہی کا
ہے عینِ شرمساری چشمِ گریاں یا رسول اللہ

کرم نے تیرے بخشا حوصلہ عرضِ تمنا کا!
وگرنہ میں کہاں کا ہوں سخنداں یا رسول اللہ

کہاں بوصیری و حسان بن ثابت کہاں خالد
نگلسے بر منِ ننگِ نیاگاں یا رسول اللہ

۴۴۴

فارقلیط

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے
میں سانسوں کا مہماں تُو موجِ ہوا ہے
زباں اپنی کھولے نہ کلک کیسے
بیاں تیرے حُسنِ گلُو سوز کا ہے
شہنشاہِ لولاک و مولائے سِدرہ
تُو میرے تخیّل سے بھی ماورا ہے
تیری ذات فخرِ بنی نوعِ انساں
تو صلِّ علیٰ، خیرِ خلقِ خُدا ہے
سُنی اُمِّ معبد سے تعریف تیری
بہت تجھ سے ملنے کو جی چاہتا ہے
دمِ گفتگو مُنہ سے کرنوں کی بارش
دَہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے
جو بنتِ مُعَوِّذ سے پوچھا تو بولیں
سمجھ لو کہ مشرق سے دن چڑھ رہا ہے
وَسیمٌ قسیمٌ بِہٖ نیستہ دعجٌ
اسے دیکھنا انشراح و شفا ہے

ترا چہرہ، مصحف کا زرکار ورقہ
تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے
ہے چشمِ سیہ رُوکشِ نجمِ ثاقب
رُخِ دلربا صبح کا کوکبہ ہے
کنارِ شفق میں لڑی موتیوں کی
گُلِ نو دمیدہ لبوں پر فدا ہے
ہے یہ سلکِ الماس و سمطِ لآلی
نہیں تیرے دانتوں کی موجِ ضیا ہے
بوئے مشکِ اذفر بسی ہے بدن میں
ترا پیرہن قطعہ گلزار کا ہے
شہابی بدن زیبِ تن سرخ جوڑا
کنول آبِ شفاف پر تیرتا ہے
تراشیدہ بُت کی طرح، رشکِ مینا
درخشندہ گردن ہے یا آئینہ ہے
زہے اعتدالِ بیاض و ملاحت!
تجھے دلبری کا خزینہ ملا ہے
چلے تُو تو خوشبو چلے آگے آگے
بدستِ صبا مجمرِ غالیہ ہے
کھڑے ہیں سرِ راہ خوبانِ عالم
تری خاکِ پا ہے کہ مُشکِ ختا ہے؟
چمکتی ہے بجلی سی ابرِ سیہ میں
ترا چہرہ زلفوں میں لو دے رہا ہے
کَرِیمُ السَّجِیّہ، جَمِیلُ الطَّوِیّہ
تُو خَیرُ البَرِیّہ، شہِ انبیا ہے۔

ہے گنجینۂ علمِ لدُنی کا سینہ
بہ پُشت، نقشِ نبوّت کھُدا ہے
طَلِیقُ اللّسَانِ، فَصِیحُ البیان
سُخن سنج حیرت سے مُنہ تک رہا ہے
فصوصُ الحِکم تیری پُرمغز باتیں
نہاں ان میں رمزِ دوام و بقا ہے
نہ یہ قولِ شاعر نہ یہ قولِ کاہن
یہ میزان و معیارِ حُسن و بہا ہے
دلآرام و رنگیں، گُل افشاں و شیریں
کلامِ گہربار بے ساختہ ہے
وہی تو کہے جو خدا مُنہ میں ڈالے
ترا نطق رُوحِ روانِ خدا ہے
مزامیرِ داؤد کا سحر ٹوٹا
تری گفتگو خوشبوئے ریختہ ہے
خطیبِ الکن و دم بخود تیرے آگے
طلایہ ترا قُسّ بن ساعدہ ہے
ادیب آکے طرزِ بیاں تجھ سے سیکھیں
تو شہرِ سُخن، شہریارِ نوا ہے
ہے روئے مُدوّر منیر و مُنوّر
نجومِ درخشاں میں کس کی ضیا ہے
یہی ہے چراغِ شبِ تار و تیرہ
نہ جانے پتنگوں سے کس نے کہا ہے
یہی سروِ آزاد و ابریقِ فضّہ
تری ہر ادا دلکش و دلربا ہے

طلوعِ سحر کی طرح تیرا رُو یا
تو بدرُ الدُّجےٰ ہے تو شمس الضُّحےٰ ہے
نہ وسواسِ خنّاس و خوابِ پریشاں
جو حق الیقیں ہے وہی دیکھتا ہے
سیہ تاب زلفیں، لٹیں گھنگھریالی
شکن بر شکن ہے گرہ در گرہ ہے
یہ تخیلِ متیں ہے کہ موئے مُعقّد
کہ مرغولہ ریشمِ تافتہ ہے؟
خماریں، سیہ، سرگیں، چشمِ رعنا
طبیعت مچلتی ہے، دل جھومتا ہے
لپکتا ہے مژگاں سے خطِ شعاعی
نگاہوں میں خورشید کا شعشعہ ہے
ان آنکھوں سے شرمندہ جزعِ یمانی
کوئی کُنہ ان کی کہاں پا سکا ہے؟
ستاروں سی روشن، سمندر سی گہری
یہاں سانس غوّاص کا پھولتا ہے
سپیدی ہے چہرے کی مائل بہ سُرخی
بدن لعل و مرمر میں گویا ڈھلا ہے
رُقیقہ نے چاہا تھا یہ نُور لے لے
قُتَیلہ کا دل بھی قتیلِ خطا ہے
قیامت ہے قامت کا شاداب مصرع
چنبیلی کے بُوٹے پہ لالہ کِھلا ہے
پکارا تجھے فاطمہ بنتِ مُرّ نے
کتاب اُس نے دیکھی ہے وہ کاہنہ ہے

نظمیں

احسان دانش

عبدالعزیز خالد

نازشِ شعر و ادب ہے، عظمتِ پنجاب ہے
اس کی ہستی سر بسر مہر و وفا کا باب ہے

اس کی پیشانی سے اس کے دل کے جلوے آشکار
اس کے الفاظ و معانی ہیں بہار اندر بہار

صاحبِ فکر و قلم بھی، صاحبِ اخلاق بھی
زندگی میں سوز بھی، ادراک میں اعماق بھی

ہے بلند اس کا تخیل اور جواں اس کا قلم
ہر زمینِ شعر میں دیکھا رواں اس کا قلم

صرفِ گردشِ اس کے ابلاغِ جنوں کا جام ہے
ہے یہ خوشِ کردار، اس کی رُوح میں اسلام ہے

اپنے کارِ منصبی میں کامگار و کامیاب
شاعری ہے اس کی صنعت، اس کا سرمایہ کتاب

ایک اعلیٰ منصرم ہے ایک دانا آدمی
مدتوں میں یہ زمیں دیتی ہے ایسا آدمی

نعیم صدیقیؒ

ایک تاثر

شبِ تاریک میں دیکھو کوئی مہ رو نکلا
سیل سا ایک شعاعوں کا بہ ہر سو نکلا
لبِ لرزاں سے ترے، تم کی جگہ تُو نکلا
غصہ کیا خوب رہا، قرب کا پہلو نکلا
تیرے اشعار کئی بار پرکھ کر دیکھے
کوئی گوہر، کوئی شبنم، کوئی آنسو نکلا
جلوۂ فن کی یہ کثرت کہ ہیں ستر پردے
جب بھی سرکا کوئی پردہ تو وہاں تُو نکلا
ایک ہی باغ میں تو سرو ہے شمشاد ہوں میں
کی جو کاوش تو یہی فرقِ من و تو نکلا
مل گیا تیرے چمن زارِ تخیل کا سُراغ
نالہ بھی دل سے ترے صورتِ خوشبو نکلا
سات رنگوں کی دھنک ہے تری سلکِ الفاظ
معنیٰ ایسا کہ کسی دام سے آہو نکلا
دفترِ شعر سبھی صفحہ بہ صفحہ دیکھا
سارا صورت کدہ شاعرِ خوش رُو نکلا

پھر سحر سیرِ چمن مثلِ صبا اس کا چلن
شام کو سروِ خراماں وہ لبِ جُو نکلا
کی نظر جب بھی تو پیاسوں نے بھرے پیمانے
ایک خُمِ خانہ بزیرِ خمِ ابرو نکلا
وہ نہ تھی تیرگیٔ بخت! غلط ہم سمجھے
غور کرنے پہ وہ پھیلا ترا گیسو نکلا!
رابطے روحوں کے جُڑ جاتے ہیں، دل ملتے ہیں
ترا جادو تو نئی شان کا جادو نکلا
ہجر کی رات گلستاں میں تڑپ کر کاٹی
ساتھ دینے کو فقط اِک گلِ شبّو نکلا
ہم تری بزم سے اس شان سے اٹھے شب کو
جیسے پتھرائی ہوئی آنکھ سے آنسو نکلا
بے سکوں عالمِ معنیٰ میں تجھے دیکھا ہے
سارا سرمایہ ترا ذوقِ تگاپو نکلا!
شہر آشوب جو نوکِ قلم سے نکلے
خانۂ محتسبِ شہر سے دارو نکلا
شعرِ کج مج مرے سُن کر، مری تحسین کیے
ساری محفل میں بس ایک خالدِ خوش خُو نکلا

حفیظ تائب

عبدالعزیز خالد

وُہ فکر و فن کا تشخص، وہ اعتبارِ قلم
وقارِ بتکدۂ شعر، آبروئے حرم

وُہ ندرتوں کا پیامی، وہ جدّتوں کا سفیر
وُہ زندگی کا تبسم، وہ آگہی کا بھرم

اُفق سے تا بہ اُفق اُس کے تجربوں کی دھنک
کراں سے تا بہ کراں پھیلتی بہارِ شمیم

علوم کی نئی دُنیاؤں کا کولمبس وُہ
ستارہ بوس ہے اُس کی تلاش کا پرچم

وُہ ہے نواگرِ فطرت کی منفرد آواز
وُہ ہے شہنشہِ عالم کا شاعرِ اعظم

نہیں تعلّی بے جا اگر وہ کہتا ہے
"بگردنِ شعرائے زماں نہم پایم"

مَیں اُس کو غوثِ سخن مانتا ہوں اے تائب
رہے گا اُس کے ادب کے لئے مرا سر خم

کردگارِ نغمہ

اے کردگارِ نغمہ اے خالقِ معانی
قدرت ہے تیری شاہد لفظوں کی لن ترانی
شعروں میں نغمگی ہے بندش میں پختگی ہے
مضمون کا [illegible] مانی کا نقشِ ثانی
رنگیں بیان تیرا قوسِ قزح کا مطلع
سادہ زبان تیری گنجینۂ معانی
اوروں میں وہ کہاں ہے جو تجھ میں پا رہا ہوں
نغماتِ سرمدی میں اک کیفِ غیر فانی

عبدالعزیز خالد

عطار کی دوکاں تو شبلی کا ہم زباں تو
رازی کا رازداں تو رومی کا ترجماں تو
منصور کا بیاں تو سرمد کا نوحہ خواں تو
اک خندۂ مشیت اک اشکِ خوں چکاں تو
حیرت کا آئینہ ہے نیرنگِ فکر تیرا
گلبانگ ہے حرم میں ناقوس میں فغاں تو

تو فلسفی عجم کا تو منطقی عرب کا
اقبال کا نشاں تو کعبہ کا پاسباں تو
عبدالعزیز خالد

میں کیا لکھوں کہ کیا ہے حافظ کا میکدہ ہے
اخلاق کا معلم سعدی کا مدرسہ ہے
اسباب اور علل کا تو رمز آشنا ہے
اقلیم فکر و فن کا بے تاج بادشاہ ہے
دیکھو تو رند مشرب پرکھو تو پارسا ہے
غالب کا ہے مقلد جامی کا ہم نوا ہے
اب اور کیا لکھوں میں کیا اور رہ گیا ہے
تو عاشق پیمبر مداح مصطفےٰ ہے
تو شاعر خدا ہے
عبدالعزیز خالد

ہے خوشگوار موسم مہکی ہوئی فضائیں
مستانہ ہر روش پہ چلنے لگیں ہوائیں
آ ہم بھی ساتھ تیرے اک شام تو منائیں
ارباب فکر و فن کی اک انجمن سجائیں
شعر و ادب کے ساغر مل کر پئیں پلائیں
کچھ آپ سے سنیں ہم کچھ آپ کو سنائیں
کچھ یادگار لمحے ایسے بھی چھوڑ جائیں
سانسوں کا کیا بھروسہ پھر آئیں یا نہ آئیں
عبدالعزیز خالد

عظیم قریشی

عبدالعزیز خالدؔ

فکر و نغمہ میں بسا ہوا !

پیکر

خالدؔ !!

عشقِ احمد میں گھلا ہوا !

دلبر

خالدؔ !!

نقشِ فردا میں رچا ہوا !

محور

خالدؔ !!

رشید انور

شعروادب دا اک متوالا

حرفاں ، اکھراں، شعراں دے کئی دیپ جگائی جاندا اے
شعرادب دا اک متوالا راس رچائی جاندا اے

فکراں ، سوچاں، فلسفیاں دے موتی ڈھال دا رہندا اے
علم وادب دا بھربھر دارُو جام اُچھال دا رہندا اے
سُکھ سجناں دی جھولی پاکے درد سنبھال دا رہندا اے

سازاں اندر سوز نوں بھر کے گیت سنائی جاندا اے

ہیرے، موتی، لعل تے گوہر چن چن ونڈی جاندا اے
تاریخاں دے پائے ہوئے گُھلے گنڈھی جاندا اے
کم ظرفاں دے منہ نہیں لگدا ہر دم چھنڈی جاندا اے

مہر و وفا اخلاص دے سوہنے نقش بنائی جاندا اے

فن دے شہر دا چھیل چھبیلا بانکا گبھرو لگدا اے
فن دی شہزادی دے دل نوں سچ سبھا پیا ٹھگدا اے
من دی جوت جگاؤندا اے پرچھاویں سارے جگدا اے

حافظ ، غالب تے اقبال دی ریت نبھائی جاندا اے

شاہواں ورگے ٹھرنیں پر درویشاں ورگی فطرت اے
لاالہ دا دوے آوازہ دین دے نال محبت اے
عزم یقین عمل دا راہی فن دی کردا خدمت اے

عشق وفا دی منزل ول تے قدم ودھائی جاندا اے
حرفاں اکھراں شعراں دے کئی دیپ جگائی جاندا اے

قمر صدیقی

عبدالعزیز خالدؔ

اے قلم کار!
تجھے کونسی شے پیش کروں ؟
کون سا لفظ ہے جو میں تری فرہنگ کو دوں؟
کونسا ساز ہے جو میں ترے آہنگ کو دوں؟
نظم کہہ کر جو کروں پیش تو حیرانی ہو
اور غزل کہنے کی کوشش میں پشیمانی ہو
تُو کہ مینارِ سخن ہے تجھے درکار نہیں
لفظ — یا نظم و غزل
تو سخن کا وہ محل
جس کی تعمیر میں خود تیرا لہو شامل ہے
عشق ہے اُس سے تجھے حسن میں جو کامل ہے
تُو نے جو لفظ لکھا ہے اسے بینائی دی
تو نے جو شعر کہا ہے اسے گہرائی دی
پیش کرنے کو مرے پاس نہیں ہے کچھ بھی
تیری عظمت میں نہیں کوئی کلام

اے قلم کار!
تجھے میری عقیدت کا، محبت کا سلام
تیری تصویر میں کب رنگ میں بھر سکتا تھا
بس محبّت ہی تجھے پیش میں کر سکتا تھا

اے قلم کار!
بہت خوش ہوں، تری محفل میں
میں تہی دست نہیں آیا ہوں
چومنے کو تری تخلیقِ حسیں
تھرتھراتے ہوئے لب لایا ہوں

اے قلم کار!
تجھے میری محبت کا، عقیدت کا سلام

حفیظ صدیقی

اس کے نام ـــــ ایک نظم

پکاسو کی طرح
رنگوں پہ قدرت ہو
تو میں رنگوں کی صورت میں
تمہیں وہ خواب دکھلاؤں
جو تم کو اک نظر تک کر مری آنکھوں نے دیکھے ہیں

جو خالد کی طـــرح
لفظوں پہ قـــادر ہوں
تو میں لفظوں کے جامے میں
وہ سارے خواب دکھلاؤں
جو تم کو دیکھ کر میـــری سکوں نا آشنا آنکھوں نے دیکھے ہیں

ارسطو کی طرح
باتوں میں جادو ہو

تو باتوں کے ذریعے سے
مناظر اپنے ان خوابوں کے دکھلاؤں
جو تم سے مل کے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
جو مدت سے سکوں ناآشنا ہیں
اور محبت کرنے والوں کو ترستی ہیں

مرے یہ خواب ایسے ہیں
کہ ان کی اک جھلک بھی تم کو دکھلاؤں
تو تم جانو
کہ میں وہ شخص ہوں
جس سے زیادہ چاہنے والا نہ آئے گا۔
کہ تم وہ شخص ہو
جس سے زیادہ کوئی صدیوں تک کبھی چاہا نہ جائیگا

مگر میرا یہ عالم ہے
پکاسو کی طرح رنگوں پہ قادر ہوں
نہ غالب کی طرح لفظوں پہ قدرت ہے
نہ باتوں میں ارسطو کا سا جادو ہے

مرے خوابوں کی کیا تعبیر ہوگی
کہہ نہیں سکتا
مگر میں اپنی باقی عمر کے سب خواب
انہی خوابوں کے پس منظر میں دیکھوں گا

اکبر کاظمی

وہ بہت کم ہیں جنہیں وقت نے بخشا اعزاز

حدِ تخئیل پہ لہراتے ہیں دلکش سائے
تیرا ادراک جو پرواز کو پَر تولتا ہے
بہرِ تخلیق اُفق تا بہ اُفق فن تیرا
رُوحِ احساس میں تمثیل کا رَس گھولتا ہے

رُوئے قرطاس پہ جب رقص کرے تیرا قلم
حرف تا حرف حکایات کے دفتر کھولے
قریہ جاں میں کرن تا بہ کرن تیرا شعور
طشتِ اظہار پہ اخلاص کے گوہر تولے

رنگ دیتی ہوئی اظہار کی قندیلوں میں
تیرا وجدان ستاروں کی طرح بولتا ہے
دیکھنے میں تو زباں تیری ہے لکنت کا شکار
تو مگر کتنی زبانوں کی گرہ کھولتا ہے

تو جو نکلا ہے لئے فکر و خیالات کے رنگ
بادِ صرصر کے مقابل رہیں سرشار یونہی !
عربی ، فارسی ، عبرانی و ہندی ، اردو
رقص دکھلائیں سرِ حلقۂ افکار یونہی

تیرا قد اپنا ہے انداز بھی سب اپنے ہیں
اس کی تابندہ شہادت ہیں تری تحریریں
تیرے افکار اچھوتے ترے تیور تیکھے
تیرے انداز پہ مائل ہیں تری تقدیریں

تو جو خوش کار و خوش اظہار ہے خوش بخت بھی ہے
زندگی ہی میں ترے فن نے اشاعت پائی،
عہدِ حاضر میں کئی ایسے بھی ہیں جنھوں نے!
خونِ دل فن کو دیا پھر بھی نہ عزت پائی!

وہ بہت کم ہیں جنہیں وقت نے بخشا اعزاز
وہ بہت کم ہیں کہ ناشر جنہیں پہچانتے ہیں
ورنہ اس ملک کے حالات ہیں سب پر واضح
اہلِ فن اہلِ نظر خاک یہاں چھانتے ہیں

ناصر زیدی

عبدالعزیز خالد کی نذر

شاعرِ باکمال ہے خالد
آدمی بے مثال ہے خالد
ہے سخن گوئی کا بھرم اس سے
دہر میں لازوال ہے خالد

فروغ احمد

عبدالعزیز خالد کی "حدیثِ خواب" پڑھ کر

میں خالد کی حدیثِ خواب پڑھ کر
نہ جانے کیوں تڑپ جاتا ہوں اکثر

نظر میں ہے جمالِ ماہ و اختر
مگر دل میں خیالِ حُسنِ دلبر

مجھے پنجاب میں یاد آ رہا ہے
وہی بنگال کا پُرکیف منظر

اُمیدِ وصلِ جاناں رہ گئی ہے
اور اس سے دردِ ہجراں ہے فزوں تر

کمالِ بے نیازی جس کا شیوہ!
فروغ زار مرتا ہے اُسی پر

وزیری پانی پتی

عبدالعزیز خالد

شاہراہوں کی کوئی کمی تو نہ تھی
جن پہ بے خوف صدیوں سے چلتے رہے
ان گنت راہرو، راہبر، راہ زن
مضمحل سُست بے جان خوابیدہ سے
اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے
وصل کی حد میں تھے اور مہجور تھے
پاس ہو کر بھی سب دور ہی دور تھے

شاہراہوں سے کچھ دور اک کوہ پر
ایک مزدور بیدار تیشہ بکف
شدتِ جہد میں اپنے چاروں طرف
ایک نورِ مشقت کا ہالہ لئے
شام سے صبح تک صبح سے شام تک
زندگی کے مرقعے تراشا کیا !!
زندگی اک نئی راہ اپنے لئے
وقت کے جنگلوں میں بناتی گئی

غلام حمید رموزؔ

پرواز عقاب

چہ پرواز است "پرواز عقابے" — کہ ہر جنبش نوید انقلابے
بنظرش در نیاید ماہتابے — بگردد ہم سفر با آفتابے
و بودش در نسازد با کنامے — ورائے حلقۂ گردوں مقامے
دہد "اقوام مغرب" را پیامے — کہ جمہور است تیغ بے نیامے
ولیکن "انتخابش" ہم عجیب است — عجیب است و نجیب است و غریب است
بآں قومے کہ از خون جگر ہا — خراشد سنگہا پاشد شرر ہا
ز اشک خویش رویاند شجر ہا — مگر محروم از برگ و ثمر ہا
بر آرد از تگِ دریا گہر ہا — کشیدہ رنجہا اندر سفر ہا
سلیم از قلبہا پاک از نظر ہا — و دیدہ شامہا شبہا سحر ہا

ولے زیں محنت اورا حاصلے نیست
کہ اندر سینہ اش گویائے نیست

تحسین فراقی

زلِ بے نام کا مسافر

وہ اک مسافر
جو ہفت خوانِ حیات کے سخت مرحلوں کو
بہ فیضِ افراطِ آگہی پار کر رہا ہے
جو فکرِ صالح پہ کب سے اصرار کر رہا ہے

وہ اک صدف ہے
جو خام سے فکر کو ذکر میں سمو کر
نئے نئے، حکمتوں کے گوہر اگل رہا ہے
جو عصرِ حاضر کے فکر و فن سے ملا کے کاندھا
بڑے تدبر، بڑے تیقن سے چل رہا ہے
رواقِ دانشوری سے جو
صفِ شکستہ اداس نسلوں کو درسِ امید دے رہا ہے
جدید انساں کو حسن کا تناتٌ کے حوالے سے اذنِ تقلید دے رہا ہے
دکھی دلوں کو، لٹے ہوئے قافلوں کو

مژدۂ عید دے رہا ہے

ابھی تو وہ آگہی کا مہر روشن
کتابِ نورِ سحر کی وسعت کو جزوِ تمہید دے رہا ہے
وہ جس کے فن میں
جلیل و جبّار قدسیوں کے مہیب شہ بازوؤں کی جنبش
وہ جس کے فن میں
غزالِ صحرا کی ساعدِ سیم سا کی لرزش

وہ جس کے شبنم فشاں قلم میں
کنواریوں کے حسین کومل سے نرم ہونٹوں کی تازگی بھی
وہ جس کے ہاں تندیٔ تفکر کی شعلگی بھی !
وہ جس کے صحنِ چمن میں رقصاں
حیات افروز زندگی بھی ،
وہ جس کی کلکِ سخن میں
اک اُمّیٔ عرب سے وابستہ
بے نہایت سُپردگی بھی
وہ جس کے جوشِ رجز کی لَے پر
ہزار ہا سر بکف مجاہد
عدو کے حق میں مثالِ ہرکارۂ اجل ہیں
وہ جس کی نَے پر
ہزار ہا گندمیوں کے جھرمٹ نرت کے عالم میں وقفِ سرمستیٔ ازل ہیں !
وہ جس کے ابرِ گہر چکاں کی سخاوتوں سے
ادب کی نوخیز سیپیوں کے کشکول بھر رہے ہیں
عصائے فکر و عمل سے جس کے، بڑے بڑے گہرے پانیوں کے چہرے اتر رہے ہیں

وہ جس کو خاکِ وطن کا ہر ذرہ سرمہ سا ہے
وہ جس کے ہاتھوں میں دامنِ شاہِ دوسرا ہے
وہ جس کی زنبیلِ فکر و فرہنگ میں ہر اک موسمی ثمر ہے
وہ جس کو نئے فکر محتسب ہے، وہ جس کو نئے حاکموں کا ڈر ہے
وہ جس کے پیشِ نظر ہمیشہ سے ایک نا مختتم سفر ہے
سفر کہ جس کی جہات کی کوئی حد نہیں ہے

وہ اک نوا گر جنابِ عبدالعزیز خالدؔ
کہ پر صدا تش سکوتِ کہسار ہا بنالد

غلام حیدر مرزا

حسان العصر جناب خالد کی خدمت میں

عجب ہیں کیفیت افزائے عشق تحریریں
حدیثِ شوق کی یا فکر و فن کی تفسیریں

ادب کو قید میں رکھا تھا جن ادیبوں نے
انہی کے ہاتھوں یہ کھولی گئی ہیں زنجیریں

جہانِ رنگ میں جیسے ہے علت و معلول
جہانِ صوت بھی رکھتا ہے خاص تعبیریں

عطا کیا ہے جو خالد نے حرف و صوت کو رنگ
جہانِ شعر و ادب کی بنا ہیں تقدیریں

جو قوم فہم اساسِ ادب سے عاری ہو!
اسے بچا نہیں سکتیں بلیغ تقریریں

فدائے شوق سے خالد نے توڑ ڈالا جمود!
کہ جس کو توڑ نہ سکتی تھیں لاکھ شمشیریں

ٹھہر ٹھہر کے پڑھیں گر کلامِ خالد کو،
تو پیدا ہوتی ہیں دل میں عجیب تاثیریں!

زبانِ شعر میں تاریخ، فلسفہ، اخلاق
اسی سے ہوتی ہیں حیدر حرم کی تعمیریں!

جاوید امتیازی

ربِّ سخن

چلا جا رہا ہے
سخن کی کٹھن وادیوں میں
اکیلا ، اکیلا
نہ ہمراز کوئی ، نہ دمساز کوئی
مسافت میں وہ ایک تنہا مسافر
خراماں خراماں
رواں ہے ، دواں ہے
رہِ فن میں وہ اجنبی بھی نہیں ہے
وہ مانوس ہے یوں کہ
ملکِ سخن اس کے زیرِ نگیں ہے
وہ شہرِ ہنر ہے

(وہ دانش کا پیغامبر ہے)
ہے منزل کہاں اسکی کس کو خبر ہے
لگن گم شدہ عظمتوں کی
اُسے رکھتے بیتاب و مضطر
کسی کو بھی یاں
ہمتِ ہمسر کابی نہیں ہے
(وہ یکتائے دوراں ہے یکتا رہے گا)
تب و تابِ فن،
سوز و وجدان کا،
الہام کا رازداں!
دانش آموز و شاعر، حکیم و مفکر
پتہ تھا کسے آخر آخر
یہ تنہا مسافر
ادب کا مجدد بنے گا
مگر آج ہم دیکھتے ہیں
وہ تنہا مسافر
خالدِ فن ہے
ربِّ سخن ہے۔

زاہدہ صدیقی

بدالعزیز خالد کے لئے ایک نظم

اے میرے معجز بیان شاعر!
تو فکر اور فن کی جس بلندی پہ جلوہ فرما ہے
اس کی نسبت سے لکھنا چاہوں
تو لفظ ایسے کہاں سے لاؤں
جو اس بلندی کو بھی سمیٹیں
اور اس کے پہلو بہ پہلو
میری عقیدتوں کو بھی لفظ و معنی کا روپ بخشیں

اے میرے معجز بیان شاعر!
تو فکر و فن کا کھلا سمندر ہے
جس میں اقبال کے تصوّر کی لہر بھی ہے
تو میر و سودا کی نکتہ سنجی کی موج بھی ہے
اسی میں حافظ کا اور سعدی کا فلسفہ ٹھاٹھیں مارتا ہے،
تو رومی کے اور بلال کے سچے جذبے کا مدّ و جزر بھی ہے

اے میرے معجز بیان شاعر!
بلاشبہ تو عظیم شاعر ہے
اس سے انکار کی کسے تاب ہو سکے گی
مگر مرے واسطے کٹھن مرحلہ یہی ہے
کہ فیصلہ ہو
کہ شاعری میں عظیم ہے تو
یا شخصیت میں عظیم تر ہے
کہ دونوں ہی پہلوؤں سے تیرا مقام اونچے پہاڑ سے بھی بلند ہے

اے میرے معجز بیان شاعر!
مجھے یہ کہنے میں باک ہرگز نہیں ہے کوئی
کہ اس زمانے کی تیرگی میں تو روشنی کا پیامبر ہے
جو تیری عظمت کے معترف ہی نہیں ہیں
وہ لوگ بے بصر ہیں

عکسِ شخص

ابن انشاء

ذکر عبدالعزیز خالد کا

ہم ذکر اپنے دوست عبدالعزیز خالد کا کر رہے ہیں جن کا نام اور کلام نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر مشہور ہے بلکہ "صرف اسی خطے میں نہیں ہمارے ملک میں بھی ان کا کلام سمجھنے اور اسکی قدر کرنے والے پائے جاتے ہیں - ایک ریسرچ سکالر جنھوں نے گرو گرنتھ صاحب کے عربی اور فارسی الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے، آجکل اردو کے ان الفاظ کی فہرست بندی کر رہے ہیں جو خالد صاحب کے کلام میں ملتے ہیں - ان الفاظ کی تعداد خاصی ہے کسی کا قول ہے بلکہ شاید ہمارا ہی ہے کہ عالمِ عرب میں دو ہستیاں ایسی گذری ہیں جو اردو پر جان چھڑکتی ہیں - ایک سید عزام بے (مرحوم) اور دوسرے عبدالعزیز خالد - ایک زمانے میں ان کا کلام جامعہ ازہر کے نصاب میں شامل کرنے کی تجویز بھی ہوئی تھی - لیکن پھر عربوں نے کہا کہ اس میں کہیں کہیں اردو بھی آگئی ہے جس کے لئے ڈکشنری دیکھنی پڑتی ہے" بلکہ بعض نظموں میں تو پورے پورے مصرعے اردو کے ہیں - نتیجہ یہ ہوا کہ بات رہ گئی -

ان کے مداحوں میں تین طرح کے لوگ ہیں - ایک وہ جو انھیں شاعرِ اعظم کہتے ہیں مثلاً مولانا اسد القادری - دوسرے وہ جو انھیں فقط شاعر کہتے ہیں، جیسے ہم - تیسرے وہ جو محض اعظم گنتے ہیں، ان کو شاعر نہیں مانتے - ان کی تحریریں بھی اس نمبر میں جلوہ گر ہیں - ایک چوتھا طبقہ بھی ہے جو اپنی زبان سے کہتے ہیں ہم نے خالد کو پڑھا ہی نہیں - ان میں ہمارے مشہور افسانہ نگار انور ہیں اور مخدومنا مولانا رازق الخیری - مولانا نے زیادہ تر خالد کی انسانی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے اور آخر میں نہایت فیاضی اور سیرچشمی سے فرمایا ہے کہ اگر جنت الفردوس میں دو محل ہوئے - ایک موتیوں اور جواہرات کا دوسرا چاندی کا تو میں ہیرے جواہرات والا محل بخوشی خالد صاحب کو دے دوں گا - خود چاندی کے محل پر اکتفا کروں گا - ہم ان کے ایثار کے قائل تو ہوئے لیکن اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ ہمیں وہ بالکل ہی بھول گئے حالانکہ ہم ان کے پڑوسی ہیں اور روز کے ملنے والے بھی، اتنا ضرور ہے کہ آسان زبان میں لکھتے ہیں - اگر وہ خالد صاحب کے اعمال سے خوش ہیں تو استدعا ہے کہ ایک موقع ہمیں بھی وہ اپنے اعمال ٹھیک کرنے کا دیں - ہم بھی چھپنے خالد صاحب کی طرح دوڑ لگا کر اپنی صحت کو ترقی دینے کا وعدہ بھی کرتے ہیں - اگر مولانا کا دل نہیں پسیجتا تو ہم خالد صاحب سے کہیں گے کہ ایک آدھ موتی اپنے محل میں سے توڑ کر ہماری طرف پھینک دیں، کسی کو پتہ بھی نہیں چلے

گا - ہمارے دلدّر دور ہو جائیں گے"۔
خالدصاحب ہمارے ہمعصر ہیں - ہم بھی شاعر وہ بھی شاعر - فرق چھوٹے اور بڑے کا ہے آڑے اور کھڑے کا نہیں اصولاً
تو ہمیں اس بات کا دکھ ہونا چاہیئے کہ ان کے نام کا نمبر نکلا جب کہ ہم پر ایک سطر بھی نہیں لکھی گئی لیکن ہم خوش ہیں
اور دلی خوش ہیں کہ خیر ہماری نہ سہی ہمارے اس یارِ عزیز اور گرامی کی قدر تو لوگوں نے پہچانی اور ان کے جیتے جی بلکہ عالمِ جوانی میں
پہچانی - ورنہ اب تک تو ایسا ہوتا آیا ہے کہ ادھر شاعرِ ملت کی میت لحد میں اتاری گئی اور لوگوں نے مٹی دینی شروع کی ادھر ہرکارہ
گھر سے پتہ پوچھتا پوچھتا قبرستان پہنچا کہ "ابھی مت دفن کیجیے اس رجسٹری پر ان کا انگوٹھا لگوانا ہے" "کیوں بھائی کس بات کی
رجسٹری ہے"؟ "جی یہ سرکاری پروانہ ہے - بڑے غور و فکر کے بعد ان کے کیس کا فیصلہ ہو گیا ہے اور ان کے لئے تاحیات پنشن منظور
ہو گئی ہے - مبارک باد عرض کرتا ہوں انعام کا متمنی ہوں"۔
خالدصاحب بہت پیارے آدمی ہیں کوئی برا بھی کہے تو ہنستے جاتے ہیں - انکی اس خصوصیت نے ہماری عادت بگاڑ دی
ہے - دل سے ہم ان کی شاعری کی خوبیوں کے معترف ہیں - کئی بار کھلے دل سے اس کا اعتراف بھی کر چکے ہیں کیونکہ یہ ہمارے اب
تک ایک نئی چیز ہے - لیکن انکی مشکل پسندی کے حوالے سے انکی ٹانگ ضرور کھینچتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ تم خود کیوں نہیں
علم حاصل کرتے تاکہ میرے کلام کو پوری طرح سمجھ سکو ہم کہتے ہیں

کم مایہ ہیں سوداگر، اس دیس میں ارزاں ہو

اگر مولانا مودودی نے آپ کی شاعری سمجھ بھی لی تو کیا حاصل - ہم نے تو صرف فارسی پڑھی ہے - عربی میں بھی شُدبُد رکھتے ہیں -
آج کل نظامِ تعلیم میں تو ان زبانوں کا چلن اتنا بھی نہیں - آج کا کالج کا طالب علم تو رفتہ گیا اور بوڑھا بھی نہیں جانتا - غالب
آخر راہِ راست پر آ گئے تھے نا - آپ بھی آ جائیے" اپنی آنے والی نسلوں پر" لوگوں سے ان کی زبان میں گفتگو کیا کرتے ہیں - یہ
کیا بات ہوئی کہ آپ آپ کر کے مر گئے سرہانے دھرا رہا پانی -
اگر گفتہ را گویم رواست (منقول از خالد نمبر) خالد صاحب پنجابی کے اہلِ زبان ہیں تو یہ دعویٰ ہم بھی کر سکتے ہیں - وہ
اردو میں لکھتے ہیں ہم بھی اردو میں بند نہیں - انگریزی میں ہم ان کی طرح شاعری کرنے پر تو قادر نہیں لیکن چھوٹی موٹی عرضیاں
لکھ سکتے ہیں - فارسی کی حد تک تو ہم ان کے ساتھ چلے لیکن جب وہ سیدھے سیدھے عربی پر آئے تو ہمارا حوصلہ پست ہونا شروع
ہوا - آخر ان کی کتابوں کے بھاری پتھروں کو چوم کر رکھنا شروع کر دیا - ہمارے ہاں عربی کی تحریر کا ایسا احترام ہے کہ خواہ
عربی زبان میں لوٹا بیسٹ کا اشتہار ہی کیوں نہ ہو اسے اٹھا کر کنوئیں میں ڈال دیتے ہیں تاکہ پامال نہ ہو اور ہم گنہگار نہ ٹھہریں -
اگر خالد صاحب نے اپنی کتابوں میں جابجا اردو کے مصرعے نہ لکھے ہوتے تو ہم بھی ان کی کتابوں سے احترام کا یہی سلوک
کر چکے ہوتے - اور ان کی کتابوں کے حجم اور تعداد کو پیش نظر رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ کئی کنوئیں پاٹ چکے ہوتے -
علم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے - حد سے زیادہ تو اچھی چیز بھی نقصان دیتی ہے فارسی عربی بھی سہی - اس کے

بعد خالد صاحب ہندی پر آ گئے ۔ یہاں بھی ہم ان کے ساتھ چلے لیکن سنسکرت ! یہاں ہم بول گئے پھر تو ان کے کلام میں سندھی ۔ عبرانی ۔ سریانی ۔ یونانی ۔ فرانسیسی ۔ جرمنی ۔ جاپانی ۔ سوامی نیوزی لینڈ کے قدیم قبائل اور گرین لینڈ کے اسکیموؤں کی زبانوں کے الفاظ بھی ٹھاٹھیں مارنے لگے ۔ اب اول سے آخر تک ان کا کلام سمجھنا کسی ایک قومیت کے آدمی کے بس کی بات نہیں ۔ ہاں خالد صاحب خود اپنا لکھا ہوا تمام سمجھ لیتے ہوں تو اور بات ہے ۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر ۔ ہمارے ہم عصروں اور ہم عمروں میں اس نکتے کو اگر کوئی سمجھا تو یہ حنیت سے نکالا ہوا انسان سمجھا ۔ ہمارے ہاں شاعری جگالی بن گئی تھی ۔ موضوعات کی جگالی ۔ لفظیات کی جگالی تجربہ دو اہمال ۔ خالد نیا آہنگ اور نئی تراشیں خراشیں لیکر آیا ۔ لوگوں کی تنقید سے بے پروا اپنی لائبریری میں بند ہو کر لکھتا رہا اور لکھتا چلا گیا ۔ اس محنت اور دلسوزی نے دفتہ رفتہ قدرشناسوں کا ایک حلقہ پیدا کر دیا ایسا کہ مقبولِ عام رنگ میں لکھنے والوں کو اس پر رشک آتا ہے مشاعرے اور اسٹیج اچھے اچھوں کو گھیر کر روشِ عام پر لے آتے ہیں خالد نے یہ روگ ہی نہیں پالا ۔ فقط کتابوں کو اپنا منیر اور وزیر، مونس اور غمخوار رکھا ہے ۔ سارا وقت لائبریری کی خلوت اور کتابوں کی حضوری میں صرف کرنا پسند کرتے ہیں ۔ یہ سب سچ ہے لیکن میرے بھائی ذرا باندھ کے ۔ ذرا آساں کر یہاں پہ رہتے ہیں اور بھی جنہیں حسن سے بھی لگاؤ ہے جنہیں زندگی بھی عزیز ہے ۔

عبدالعزیز خالد

نگاہیں

رات کی سینکڑوں نگاہیں ہیں
دن کی ہے ایک ہی، مگر پھر بھی
قرص خور کے غروب ہونے پر
آسماں گیر تیرگی کی ردا
سارے عالم کو ڈھانپ لیتی ہے

ذہن کی سینکڑوں نگاہیں ہیں
دل کی ہے ایک ہی مگر پھر بھی
شعلۂ آرزو کے بجھنے پر
زندگی کا سبوچۂ نازک !
اک چھناکے سے ٹوٹ جاتا ہے!

انتظار حسین

عبدالعزیز خالد

عبدالعزیز خالد نے بہت لکھا مگر اس سے زیادہ یاروں نے ان پر لکھا۔ ان پر تنقید کا اتنا سرمایہ ہو چکا ہے کہ اب غالب اور اقبال کا تنقیدی سرمایہ ہی اس کا مقابلہ کرے تو کرے۔ اس زمانے میں وہ کون ہے جس نے کسی نہ کسی وقت اس شاعر کے بارے میں قلم نہیں اٹھایا۔ ہم آخر کب تک بچے رہتے۔ کسی نہ کسی روز تو ہماری بھی اس شاعر سے مڈھ بھیڑ ہونی ہی تھی۔ سو کل ہماری ان سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ ہم نے پوچھا کہ آپ کی زبان و بیان، ہماری کیا مجال کہ اس پر حاکمہ کریں مگر ؎

از کجا می آید ایں آوازِ دوست۔

آپ نے اپنی جو الگ زبان بنائی ہے یہ کب کیسے اور کہاں سے، اس کا کچھ اتا پتہ تو دیجیے۔ کہنے لگے کہ میں تو شروع ہی سے اس زبان میں اظہار کر رہا ہوں۔ جب میں میٹرک میں تھا تو میں نے ایک نظم یوسف ظفر صاحب کو ان کے رسالے میں چھپنے کے لئے بھیجی انہوں نے یہ لکھ کر اسے واپس کر دیا کہ مولانا کبھی آپ اردو میں کچھ لکھیں تو ہمارے لئے بھیجیں"۔ یہ تو میٹرک کی بات تھی۔ عبدالعزیز خالد بتاتے ہیں کہ وہ جب پانچویں کلاس میں پڑھتے تھے تو اسی زمانہ میں سبعۂ معلقہ پڑھ لی تھی۔ لیجئے معاملہ صاف ہو گیا۔

ہم نے پوچھا کہ "خالد صاحب آپ نے بچپن میں پتنگ ونگ بھی اڑائی ہے یا سبعۂ معلقہ ہی پڑھتے رہے"۔ بولے کہ "نہ پتنگ اڑائی، نہ گلی ڈنڈا کھیلا نہ کوئی اور کھیل۔ سائیکل چلانے کی کوشش کی تھی وہ بھی نہیں چلا سکا بس کتابیں پڑھتا تھا گلستان، بوستاں، سکندر نامہ یہ سب پانچویں چھٹی کے زمانے میں پڑھ ڈالا"۔ لیجئے دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا جس نے پنگھوڑے میں سبعۂ معلقہ پڑھ لی ہو اس کے بڑے ہونے پر آپ کیا توقع رکھ سکتے تھے مگر خالد صاحب نے اپنے زبان و بیان کی توضیح بہت معقول کی، کہتے ہیں کہ "یہ زبان میرے لئے اپنی جڑوں تک پہنچنے کی ایک کوشش ہے۔ ان لفظوں کی مدد سے میں تہہ میں جا کر ماضی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں"۔

یار لوگ سمجھتے ہیں کہ خالد صاحب اس طور اردو کو عربی بنا دینا چاہتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ "میں اردو ہی کو اپنی زبان جانتا ہوں

جب یہ تحریک ہوئی تھی کہ عربی کو پاکستان کی قومی زبان بنا دیا جائے تو میں شدت سے اس کا مخالف تھا۔ ہماری زبان اردو ہے"۔

عبدالعزیز خالد کی اردو میں صرف عربی اور فارسی ہی کا طوطی نہیں بولتا بلکہ مختلف قدیم زبانوں مثلاً عبرانی کا بھی عمل دخل نظر آتا ہے۔ مگر خالد صاحب نے کیسے غضب کی بات کہی کہ "محمود غزنوی ہندوستان میں آیا کتنی لوٹ مار کر کے یہاں سے لے گیا کہ غزنی کو متمول بنائے، یہی انگریزوں نے کیا لوٹ مار کر کے لے جاتے تھے اور اپنے وطن کو نہال کرتے تھے۔ میں دوسری مالدار زبانوں سے لوٹ مار کر کے لاتا ہوں اور اردو کو متمول بناتا ہوں"۔ عبدالعزیز خالد کی اردو عبدالعزیز خالد کی فتوحات کا پتہ دیتی ہے کتنی قدیم زبانوں پر انہوں نے ہلہ بولا، لوٹ مار کر کے واپس لوٹے اور اردو کو نہال کیا۔ عبدالعزیز خالد کہتے ہیں کہ "ہمارے ذہنوں کے دریچے بند ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ دریچے کھلیں اور سب طرف سے ہوائیں آئیں"۔ کم از کم عبدالعزیز خالد کی شاعری میں سب دریچے کھلے ہوتے ہیں۔ دور دور سے ہوائیں آتی ہیں۔ عبرانی سے یونانی سے لاطینی سے۔

میں نے پوچھا کہ "خالد صاحب اب آپ کی کوئی نئی کتاب آنے والی ہے"۔ سادگی سے بولے کہ "اس مہینے میں دو تین کتابیں آجائیں گی۔ دو تین کتابیں زیر تیاری ہیں"۔ میں نے حیرت سے کہا کہ "یکمشت" بولے کہ "ہاں یکمشت" ویسے اس پر تعجب ہونا تو نہیں چاہیئے۔ عبدالعزیز خالد کوتاہ قلم شاعروں میں نہیں ہیں۔ ان کا معاملہ سدا سے یہ چلا آتا ہے کہ ع

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کا پھر انبار

مضامینِ نو کا انبار لگاتے لگاتے شعروں کے انتیس مجموعے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اور کئی کئی مجموعے اکٹھے شائع ہوتے ہیں۔ اس زمانے کا کون سا شاعر ہے جو اس معاملہ میں ان کے مقابلے میں ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن اتنا کچھ کہہ ڈالنے کے باوجود خالد صاحب بہت منکسر المزاج ہیں۔ کہتے ہیں کہ "میں نے تو ابھی کچھ نہیں کہا ابھی تو صرف تمہید باندھی ہے۔ خدا کہنے کی توفیق دے گا تو کہوں گا"۔

عبدالعزیز خالد کا کمال یہ ہے کہ یہ سارا کام انہوں نے افسری کے باوصف کیا ہے۔ انکم ٹیکس کے محکمہ میں تھے۔ آج کل کپڑے لتے کی کارپوریشن میں چلے گئے ہیں جسے گارمنٹس کا شعبہ کہا جاتا ہے۔ مگر اپنی ملازمت کو محض اور صرف وسیلۂ معاش سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ "حاصلِ عمر شاعری کو جانتا ہوں باقی پوری زندگی میرے لئے خام مواد کی حیثیت رکھتی ہے"۔

عبدالعزیز خالد بتاتے ہیں کہ "میں رات کو فرش پر سوتا ہوں"۔ میں نے پوچھا "وہ کیوں" بولے "میں باہر سے دنیادار ہوں اور اندر سے راہب ہوں"۔

ارشاد احمد حقانی

عبدالعزیز خالد

علم و فن کے کسی بھی شعبے سے غیر معمولی تخصص یا انتہائی انہماک رکھنے والی اکثر و بیشتر شخصیات کی زندگیاں بالعموم توازن، ہمہ جہتی ہوشمندی اور بیدار مغزی کی خصوصیات سے عاری ہوتی ہیں۔ لاتعداد فنکاروں، سائنسدانوں، فلسفیوں اور ماہرین ریاضی کی ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے مذکورہ بیان کی صداقت واضح ہوتی ہے۔ اس پہلو سے شعراء کی حالت بالعموم سب سے بڑھ کر دگرگوں ہوتی ہے اور لوگ ان سے عام زندگی میں زیادہ سلیقہ مندی، نظم و ضبط، ذاتی صفائی ستھرائی، ترتیب کار، اوقات کی پابندی اور عملی سوجھ بوجھ کی بہت کم توقع کرتے ہیں۔ شاعر حضرات الاماشاء اللہ لاابالی پن، بے ہنگم عادات، پریشان خیالی اور غیر منظم آداب و اطوار کی منہ بولتی تصویر ہوتے ہیں۔ مولانا گرامی جیسے بزرگ اور عبقری شاعر کے بارے میں علامہ اقبال کا یہ فقرہ مشہور ہے کہ گرامی شعر میں تلمیذ الرحمٰن ہے، باقی تمام معاملات میں عبد حذیب۔ خود علامہ مرحوم اپنی تمام تر عظمت اور اپنے پیغام اور کلام کی رفعت کے باوجود اپنی ذاتی زندگی میں ایک عام سہولت پسند، غیر منظم عادات کے مالک انسان تھے۔ سلیقہ مندی اور اہتمام ان کے کردار کی مضبوط صفات نہیں تھیں۔ اس کی ایک وجہ ان کا علمی اور شاعرانہ انہماک بھی تھا جس نے زندگی کے دوسرے بہت سے معاملات و وظائف سے انہیں بے نیاز، بے پرواہ اور مستغنی کر دیا تھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک تو ایک عبقری (GENIUS) کی یہ لازمی صفت ہے کہ اپنے مخصوص میدان کے علاوہ باقی دائروں میں وہ عام سطح سے بھی نیچے ہو۔

جناب عبدالعزیز خالد مسلمہ طور پر ایک عبقری، ایک نابغۂ روزگار شخصیت اور ایک بے مثل شاعر ہیں۔ شعر ان کا میدان بلکہ ان کی زندگی ہے۔ اور اس میدان میں وہ اب تک اتنا متنوع کام کر چکے ہیں کہ بعض پہلوؤں سے ان کا کوئی ثانی موجود نہیں۔ نعت، منظوم ڈرامے، حکمت و دانائی، قومی شاعری اور فلسفہ و حکمت ایسے دوائر ہیں جن میں وہ منفرد مرتبہ و مقام کے حامل ہیں۔ پھر ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی جولانیاں بہت سوں کے لئے باعث رشک بلکہ باعث حیرت ہیں۔ اب تک ان کی دو درجن کے قریب کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ مزید دو تین کتب تصنیف و تدوین کے مختلف مراحل میں ہیں۔ یہ سارا کام انہوں نے سرکاری ملازمت کی کڑی ذمہ داریوں کے درمیان اور ان کے باوصف کیا ہے۔ میں نے بہت سے

لوگوں کو خالد صاحب سے یہ سوال کرتے سنا ہے کہ آپ اس قدر کام کب اور کس طرح کرتے ہیں بلکہ ان کے بعض بد فطرت حاسدین کے لئے ان کی سرکاری اہلیت اور منصبی کارکردگی پر حملہ کرنے کے لئے یہ امر واقعہ ایک دلیل کا کام دیتا ہے کہ جو شخص اس تیز رفتاری سے علم و ادب کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہے وہ لازماً اپنے فرائض منصبی سے غفلت کا مرتکب ہوتا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس الزام میں کوئی صداقت نہیں ہے اور ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے ان کی کارکردگی ہمیشہ تسلی بخش اور مثالی رہی ہے اس لئے مذکورہ الزام ان کے اعلیٰ افسران کو کبھی قائل نہیں کر سکا۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ خالد اپنے فن میں انہماک کے ایسے مقام پر فائز ہے کہ بہت کم لوگوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہے۔ چنانچہ ممتاز ادیب اور شاعر جناب احمد ندیم قاسمی نے خالد کی جس خصوصیت پر بطور خاص رشک کا اظہار کیا ہے وہ ان کا یہی غیر معمولی علمی و شعری انہماک ہے۔

عام حالات میں اپنے فکر و فن سے خالد کے اس غیر معمولی شغف بلکہ عشق کا ایک نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان کی زندگی توازن سے محروم ہو جاتی اور زندگی کے دوسرے معاملات کے بارے میں ان کی کارکردگی کا معیار گر جاتا۔ لیکن نہ صرف ایسا ہرگز نہیں ہوا بلکہ ان کی زندگی میں ایسا غیر معمولی انضباط، ایسا سلیقہ، ایسی نفاست اور ایسی تنظیم اور ترتیب پائی جاتی ہے کہ بہت کم لوگوں کی زندگی میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ خالد انتہائی صاف ستھرے آدمی ہیں۔ ذاتی صفائی (PERSONAL HYGIENE) میں بہت کم لوگ ان کے ہم پایہ ہوں گے۔ باقاعدہ سیر، ورزش اور گرما و سرما میں روزانہ غسل تو ان کے عمر بھر کے معمولات میں ہی۔ صاف ستھرا لباس، انتہائی صاف جوتے، اپنے ذوق کے مطابق آراستہ بال۔ خالد کی شخصیت کے ایسے بنیادی عناصر ہیں جن میں کبھی خامی یا جھول نظر نہیں آتا۔ خالد صاحب کا کمرہ کتابوں اور رسالوں سے بھرا رہتا ہے اور اس میں گنجائش سے زیادہ کتب و رسائل موجود ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ ایک کتاب یا ایک رسالہ بے ہنگم اور غیر منظم طریقے سے پڑا ہوا نظر آجائے۔ خالد فرش پر تکیوں کے سہارے بیٹھ کر لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ ان کے قریب ہی ایک میز پر ان کے کاغذات، مسودات، نیم مکمل مسودات، لکھنے کا سامان موجود رہتا ہے۔ لیکن ہر چیز اس قدر سلیقے، نفاست اور قرینے سے رکھی ہوتی ہے کہ ناواقف آدمی یہ سمجھے کہ اس میز کو صرف سجا کر نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہ استعمال کرنے کے لئے نہیں ہے۔ حالانکہ دفتر کے بعد کا سارا وقت خالد کا اسی کمرہ میں گزرتا ہے۔ اور اکثر اوقات نصف شب تک وہ مطالعہ اور لکھائی پڑھائی میں مصروف رہتے ہیں لیکن کیا مجال کہ ان کے کمرے کی ترتیب و تنظیم یا ان کے میز کے سامان میں کوئی بدنظمی پیدا ہو سکے۔ ہر ہفتہ درجنوں رسائل ان کے پاس آتے ہیں وہ سب کو حسب ضرورت دیکھتے ہیں۔ لیکن ہر رسالہ کو فارغ کرنے کے بعد اس خوبصورتی سے ٹھکانے لگاتے ہیں کہ کمرہ پر کسی بدنظمی کا سایہ بھی نہیں پڑتا۔ ابھی دو ہفتے قبل خالد صاحب ایک بزرگ علمی و طبی شخصیت سے گفتگو کر رہے تھے۔ اس نے یہی سوال کیا کہ خالد صاحب آپ پڑھنے اور لکھنے کے لئے وقت کس طرح نکالتے ہیں۔ جب انہیں بتایا گیا کہ خالد صاحب کا سونے اور مطالعہ کرنے کا ایک ہی کمرہ ہے تو جھٹ انہوں نے کہا پھر تو آپ کے چاروں طرف کتابوں کے انبار اور رسالوں کے ڈھیر لگے رہتے ہوں گے۔ خالد صاحب تو خاموش رہے میں بھی پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کہا "حکیم صاحب، خالد صاحب کے کمرہ میں انبار یا ڈھیر قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ ہر چیز اپنی جگہ پر قرینہ اور نفاست کے ساتھ رکھی ہوتی ہے اور ایسا صاف ستھرا کمرہ آپ کو بہت کم دیکھنے میں آئے گا۔" میرا یہ جواب ان بزرگ کے لئے خاصا باعث حیرانی

[illegible] بات یا قابلِ فہم تھی کہ جس کمرہ میں ایک شخص سوتا بھی ہے رات گئے تک پڑھتا لکھتا بھی ہے۔ اس میں [illegible] نفاست باقی رہ سکتے ہیں لیکن یہ خالد کے مزاج کے توازن اور انضباط کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ خالد صاحب [illegible] ۱۹۶۶ ایک فوکس ویگن کار ہے۔ جسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتے ہیں۔ آپ اس کار کو دیکھیں تو اندازہ نہیں کر [illegible] آپ کو کبھی گرد و غبار نظر نہیں آئے گا۔ اس کے اندر کبھی ایک تنکا بھی گرا ہوا نہیں ملے گا۔ ایسا [illegible] سے ملازم دستیاب ہیں یا سارا دن کار کی حفاظت ہوتی رہتی ہے۔ اس کی صفائی اور ستھرائی خالد کے اپنے مزاج کی مرہونِ منت ہے۔ وہ گرد، غلاظت اور گندگی کسی شکل میں اور کسی درجے میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

خالد صاحب اس وقت جس سرکاری مکان میں رہائش پذیر ہیں۔ گزشتہ تین چار سال میں انہوں نے اس کا حلیہ ہی بدل ڈالا ہے۔ ظاہر ہے تبادلہ کی صورت میں کسی بھی وقت انہیں یہ مکان چھوڑنا پڑ سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کی آرائش میں گہری ذاتی دلچسپی لی ہے۔ آرائش سے میری مراد اسے قیمتی سامان سے مزین کرنا نہیں بلکہ اس کے اندر گلاب، موتیا، چنبیلی کے لاتعداد پودے لگوائے ہیں۔ روشیں ٹھیک کرائی ہیں۔ بڑے سلیقے سے کیاریاں بنائی ہیں۔ گھاس کی کٹائی کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ انہوں نے اس میں پھول دار درخت بھی لگوائے ہیں حالانکہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ان کے ثمر آور ہونے سے پہلے خالد صاحب اس مکان کو خالی کر چکے ہوں گے۔ سبزہ اور پھولوں کی سجاوٹ کے لحاظ سے اس مکان کی حالت اس قدر بہتر ہو چکی ہے کہ تین چار سال پہلے کے مقابلے میں یہ ایک انتہائی دلفریب اور پرفضا مقام بن چکا ہے۔

خالد صاحب کی پابندیٔ اوقات بھی مثالی ہے۔ اپنی پچیس سالہ ملازمت میں وہ ہمیشہ دفتر میں سب سے پہلے آنے والے افسر رہے ہیں اور مقررہ وقت سے پہلے اٹھ کر نہیں جاتے۔ کسی بھی نوعیت کی (APPOINTMENT) ہو، خالد صاحب پابندیٔ وقت کے ساتھ مقررہ مقام پر پہنچ جائیں گے۔ خواہ دوسرے لوگ کس قدر بھی دیر سے آئیں۔ یہ سب باتیں مزاج کے انضباط اور تنظیم کا پتہ دیتی ہیں۔ اور فی الحقیقت ان سے شخصیت کے داخلی حسن کا اظہار ہوتا ہے۔ خالد صاحب کو صفائی اور نظم و ضبط سے جس قدر محبت ہے۔ میرے نزدیک یہ ان کے من کی صفائی اور ان کے فکر کی پختگی اور وضاحت کا ایک اظہار ہے۔ جو شخص الجھے ہوئے خیالات، طرح طرح کے (COMPLEXES) کا شکار ہو۔ جسے نفسِ مطمئنہ کی دولت میسر نہ ہو۔ جو زندگی کا ایک واضح نصب العین اور تصور نہ رکھتا ہو، جو اس حیاتِ مستعار میں بہت کچھ کرنا نہ چاہتا ہو۔ اس کے معمولات و عادات میں ایسا توازن، ایسا حسن، ایسی نفاست اور ایسی ترتیب نہیں ہو سکتی۔

یوں تو خالد کی پوری زندگی ہمیشہ سے نظم و ضبط، اپنے فن اور شخصیت کے احتساب سے عبارت رہی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کے بارے میں حضور نے کہا ہے کہ وہ شخص ہلاک ہوا جس کا آج کل سے بہتر نہ ہوا۔ وہ اپنی شخصیت، مزاج اور نفس کی تہذیب کے ایک مسلسل عمل سے ہمیشہ گزرتے رہتے ہیں اور ان کا قلبی و روحانی، فکری و فنی علمی ارتقاء ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ جس کا اظہار ان کی ذاتی زندگی اور ان کی فنی تخلیقات میں مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس عمل کے دوران بھی بعض مراحل ایسے آتے ہیں۔ جب ان کی دور بینی کا عمل تیز تر ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے افکار و خیالات پر گہری تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ اور اپنے رویوں کی تشکیل نو تیزی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ ان دنوں وہ ایک ایسے ہی انتہائی تیز رفتار عمل سے دوچار ہیں۔ گزشتہ تین چار

سال کے دوران وہ ایک ایسے عہدے پر فائز رہے جس میں فرائض اور منصبی ذمہ داریوں کا بوجھ غیر معمولی تھا اور ایک اوسط درجے
کے فنکار اور ادیب و شاعر کے لئے کوئی تخلیقی کام کرنا ممکن نہ تھا لیکن اس عرصہ میں بھی نہ صرف ان کا فنی انہماک پوری طرح برقرار
رہا اور انہوں نے اپنی ایک درجن کے قریب کتابوں پر نظرِ ثانی کی بلکہ ان کی دو تین بلند پایہ نئی کتابیں بھی سامنے آئیں۔ لیکن چند
ہفتے قبل انہیں ایک ایسی ذمہ داری سونپی گئی جس میں دفتری کام کا بوجھ نسبتاً کم ہے۔ خالد نے سرکاری کام کا بوجھ ہلکا ہوتے
ہی اپنے فکر و فن پر نئے سرے سے زیادہ گہری، زیادہ ناقدانہ نظر ڈالنی شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ان دنوں وہ احتسابِ ذات، تطہیرِ
نفس اور تنقیح و تعمیرِ افکار کے ایک گہرے عمل سے گزر رہے ہیں۔ وہ نئے سرے سے اپنی روحانی کیفیات و قلبی واردات کا
کا جائزہ لے رہے ہیں، وہ استغناء، تعلق باللہ، توکل کی خصوصیات کو اپنے قلب و ذہن میں راسخ اور پختہ تر کرنے اور اپنی
روحانی خامیوں کا عمیق تجزیہ اور علاج کرنے میں مصروف ہیں۔ گویا وہ ذہنی و روحانی ریاضت کے ایک نئے عمل سے گزر رہے
ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے پیغام، اپنے فکر و فلسفہ، اپنے فنی اہداف اور اپنے مقاصد علمی و ادبی پر گہری تنقیدی نظر ڈال
کر فکری ارتقاء کی نئی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ مثلاً ان دنوں خالد، اپنے افکار کو ایک باقاعدہ واضح اور مربوط نظام کی شکل
دینے کی جاں گسل جدوجہد میں مصروف ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں نعت، فلسفہ و حکمت، زندگی کی بنیادی حقیقتوں اور
اوصاف پر بہت کچھ کہا ہے۔

ان کے ہاں انسان اور کردار کا ایک اعلیٰ تصور ملتا ہے۔ انہوں نے عالمگیر سچائیوں اور اخلاقِ عالیہ کی
تعلیم دی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی پستی اور بے عملی پر آنسو بہائے ہیں، انہوں نے معاشرہ کے عوارض پر تنقید کے نشتر چلائے ہیں۔
انہوں نے ملتِ اسلامیہ کو حرکت و عمل کا پیغام دیا ہے۔ یہ سب کچھ ان کے کلام میں موجود ہے۔ ان کی فنی بوقلمونی کے باوجود ان کا
عکس ایک مصلح، ایک پیامبر، ایک ناصح، ایک فلسفی کا ہے۔ جو اسلام کی عظیم روایات کا وارث اور ان کا مبلغ اور علمبردار ہے لیکن
ان دنوں وہ خود احتسابی کے ایک نئے عمل سے گزر رہے ہیں وہ اپنے تمام افکار و نظریات کا ناقدانہ تجزیہ کر رہے ہیں۔ وہ اپنے
الذہ و پیشتر مسلّمات کا نئے سرے سے جائزہ لے رہے ہیں۔ اور ایک ایسے نظامِ افکار (SYSTEM OF THOUGHT)
کی صورت گری میں مصروف ہیں۔ جو ان کے پیغام اور کلام کا محور بن جائے اور جو انسان کے فکری ارتقاء کی موجودہ منزل میں
ایک قابلِ قدر اور بے مثال اضافہ کا باعث بن سکے۔ خالد اسلام کی ازلی اور ابدی صداقت کا قائل ہے۔ اس کی فکری کائنات کی بنیاد
یہی قرآن اور سیرتِ رسول ہے۔ لیکن وہ دورِ حاضر کے حوالے سے اسلام کے پیغام کو ایک نئے انداز، ایک نئے اسلوب، ایک نئے
آہنگ سے پیش کرنے کے امکانات اور مشکلات پر گہرے غور و فکر میں مشغول ہے۔ انہی دنوں وہ اس سوال سے بھی دوچار
ہے کہ اس کے خطاب کا رُخ کیا ہو۔ اس کی براہِ راست مخاطب صرف ملتِ اسلامیہ ہو یا پوری انسانی برادری، نیز چونکہ وہ نظری و
زبانی تلقین کا قائل نہیں بلکہ عملی زندگی کو بدلتے اور ایک انقلاب سے ہمکنار ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ بقول اقبال اس کے اندر
حاضر و موجود سے ہمہ جہتی اور شدید بیزاری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کے سامنے ایک اور اہم سوال بھی حل طلب ہے۔
اور وہ یہ ہے کہ وہ جس فلسفہ، نظامِ افکار اور پیغام کو پیش کرے۔ اس کے نافذ ہونے اور عملی زندگی پر اثر انداز ہونے کی کیا شکل
ہو۔ چند روز کے غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ شاعر اور فلسفی کا کام قوتِ نافذہ کی تلاش اور اس کی فراہمی شرط لازم کی

حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لئے ان اس پہلو سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہ جو فلسفہ پیش کرنے جا رہا اس کے عملی تنفیذ کے امکانات بھی فراہم ہونے چاہئیں۔

مفکر کا کام پیغام پیش کر دینا ہے۔ وہ عملی زندگی پر کب، کس طرح اور کس جہت سے اثر انداز ہوگا، یہ فلسفی اور مصلح کا درد سر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا کام بیج ڈال دینا ہے، اس کے برگ و بار لانے کا اہتمام کرنا، اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ سوچ کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد خالد کا ذہن واضح اور یکسو ہو گیا ہے یا ہو رہا ہے۔ اور اس کی پوری ذہنی توانائیاں اب اس بات پر صرف ہو رہی ہیں کہ وہ اپنے افکار و نظریات، کو ایک نیا رخ نیا اسلوب، ایک نیا انداز اور نیا آہنگ دے۔ وہ اپنی فکری کائنات کا حدود اربعہ نئے سرے سے متعین کرنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ اور اپنے آپ کو ایک انقلابی مفکر کے روپ میں پیش کرنے کی ذہنی تیاری کر رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ معاصر انسانی فکر کے ارتقاء میں کوئی قابل قدر اضافہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ سعادت کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں میں سے کسی کسی کے حصہ میں آتی ہے۔ خالد اس سعادت سے بہرہ ور ہوتا ہے یا نہیں، اس کا حال تو اس عالم الغیب کو معلوم ہے۔ لیکن خالد ان دنوں اپنے آپ کو سنجیدگی سے اس عظیم منصب کے لئے تیار کرنے کی کوشش بہر حال کر رہا ہے۔ اس کے لئے جہاں ایک طرف وہ علمی و فکری ارتقاء کے لئے نئے افقوں کی تلاش میں ہے وہاں دوسری طرف وہ تطہیر نفس اور تزکیہ قلب کی ایک نئی جدوجہد میں مصروف ہے۔ وہ اپنے دل و دماغ کو انسانی علائق بشری کمزوریوں اور مادی کششوں سے آزاد اور بالاتر کرنے کی شعوری جدوجہد میں مصروف ہے۔ وہ رات دن تبتّل اور حنیفیت کی خصوصیت کو پختہ تر کرنے کی فکر میں ہے تاکہ اس کے افکار پر کسی قسم کے تعصب یا خوف اور لالچ کا سایہ غیر شعوری طور پر بھی نہ پڑے۔

مقتدا ہے انّی وجّہت وجہی للذی فطر السموات والارض کی روحانی کیفیت پیدا کرنے کی عظیم اور مقدس جدوجہد میں مصروف ہے تاکہ اس کے افکار پر کسی دنیوی آلائش کا سایہ بھی نہ پڑے۔ خالد جس قسم کے روحانی و قلبی تطہیر کے عمل سے گزرا ہے۔ فی الحقیقت وہ اس عظیم اصلاحی اور انقلابی کام کے لئے شرط لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر اس کی سوچ کا رخ اور ہدف درست نہیں ہو سکتا اور اس کے لئے فکری گمراہی سے بچنا آسان نہیں رہتا۔ خالد کی موجودہ روحانی و قلبی، فکری و نظری واردات اور سمت سفر سے آگاہی نے میرے اس دیرینہ تاثر اور یقین کو پختہ تر کر دیا ہے کہ وہ فکر و فن کی دنیا میں ایک لازوال مقام حاصل کر کے رہے گا اور کچھ عجب نہیں کہ اس کا شمار انسانیت کے ان عظیم محسنوں میں ہو جو ہر دور میں اپنے فکر و کردار سے اس کی سمت سفر درست کرنے اور زندگی کے صحیح خطوط سے آگاہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اقبال کے کلام اور پیغام کا گہرا اثر (IMPACT) ہم سب محسوس کر رہے ہیں۔ اس نے ہندی مسلمانوں کو بالعموم، ملت اسلامیہ کو بالخصوص بیدار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس کا فلسفہ وسیع تر انسانی اپیل بھی رکھتا ہے۔ اور اسلام کو بنیاد بنا کر اس نے عملی زندگی کی صورت گری کے لئے ایک انقلابی پیغام دیا ہے۔ مبالغہ نہ سمجھا جائے اگر میں کہوں کہ خالد ان دنوں ایسی ذہنی و قلبی و روحانی تیاری کے مراحل سے گزر رہا ہے جو اسے اس مقام سے اپنے انداز میں کام کو آگے بڑھانے کا موقع دے جہاں اقبال نے اس کو چھوڑا ہے نیز وہ اپنے خطاب کا

دائرہ وسیع تر کرکے پوری انسانیت کے لئے ایک مفکر اور مبلغ کا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ کام معمولی انسانوں کے کرنے کا نہیں اور خالد کے اندر مجھے وہ صفات بدرجۂ اتم نظر آتی ہیں جو اس قسم کے عظیم کام کے لئے ضروری ہیں۔ اس کی ذاتی زندگی کی ترتیب و تنظیم، ضبط نفس اور باقاعدگی، نفاست اور پاکیزگی و صفائی سے محبت دراصل اس کی شخصیت کے داخلی حسن اور اس کے افکار کی رفعت و عظمت کی ایک جھلک ہے۔ عظیم مقاصد کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے خود اپنی ذاتی زندگی اور اپنی کائنات کی ترتیب و تہذیب انتہائی بلند معیار پر کریں۔ خالد کی زندگی کے تمام مظاہر یہ امید دلاتے ہیں کہ وہ ان عظیم انسانوں کی صف میں شامل ہوگا۔ جو فکر انسانی کے ارتقاء پر صالح اور انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ جو اس دنیا کو حسین تر اور خوش تر بنانے میں ایک کردار ادا کرتے ہیں۔ اور اس طرح ان کا شمار انسانیت کے محسنوں اور خادموں کی صف میں ہوتا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

میری آنکھوں نے بالیقیں دیکھا
مگر آنکھوں کا بھی بھروسہ کیا!
میں تمہارے لئے ترستا ہوں
آبِ شیریں کو جس طرح پیاسا
علم کی قدر ہے نہ عالم کی
چپ ہے دل سا خطیبِ شعلہ نوا
ملے آزادیٔ خیال و بیاں
یعنی حق اختلافِ رائے کا
دل حریمِ فجور و تقویٰ ہے
دل کے اوصاف فہم و شکر و ذکا
ہوں نہ زوروں سے پیار کے سودے
پیار بازار میں نہیں بکتا
تخمِ امید مزرعِ دل میں
کبھی نشو و نما نہیں پاتا
کوئی صورت نہیں وقوع پذیر
کوئی نقشہ نظر نہیں آتا
سرو قد، دل فریب، جاذبِ زیب
بند کوزوں میں حسن کا دریا

پی سبو سے شرابِ ریحانی
اس لبِ آتشیں کا بوسہ لیا
جھٹپٹے میں رخِ نگار کو دیکھ
آگ یزداں کے حکم سے گویا
اسے چوما کتاب کی مانند
پیار میں احترام شامل تھا
رفتہ رفتہ ہی اے دلِ بیتاب
غمِ دیرینہ برطرف ہوگا
غم وہ قہوہ ہے جس کے پینے سے
کیفیت ہر شراب کی پیدا
ذہن محدود، تنگ لیکن تیز
مال و منصب حسب نسب تیرا
ڈر مسلمان کی فراست سے
إِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللّٰهِ!
کامل العقل صاحب الرائے
طالب وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ
مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ!
پردۂ نور ہے حجابِ خدا

حفیظ صدیقی

عبدالعزیز خالد کی شخصیت

اگر میں کہوں کہ میں عبدالعزیز خالد کو صدیوں سے جانتا ہوں تو یہ سراسر مبالغہ ہوگا لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں عبدالعزیز خالد کو اس طرح جانتا ہوں جیسے صدیوں اس کا قریبی مطالعہ و مشاہدہ کیا ہو تو اس میں قطعاً مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ میں نے ان سے ملاقات سے قبل کے عرصے میں ان کی تخلیقات کا مسلسل مطالعہ کرکے اور ملاقات کے بعد مسلسل گھنٹوں ان کے ساتھ گزار کر اس حد تک انہیں سمجھ لیا ہے کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں ان کی شخصیت کی قریب قریب سبھی سطحوں سے آشنا ہو چکا ہوں اس لئے کہ میں نے محبت اور عقیدت کے سچے جذبے کے ساتھ انکی شخصیت کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کے معمولات کے علاوہ ان کے افکار و خیالات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

جب تک ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی میں نے ان کی شعری نگارشات کا مسلسل مطالعہ کیا تھا کہ قریب قریب ہر پرچے میں انکی نظمیں، غزلیں، رباعیات، تمثیلات وغیرہ شائع ہوتی رہتی تھیں اور وقفوں کے ساتھ ان کے مجموعے بھی آتے رہتے تھے چنانچہ میں نے عبدالعزیز خالد کی شعری تخلیقات کے مطالعے سے ان کی شخصیت کا ایک ایسا خوشنما ہیولا سا تعمیر کر لیا تھا کہ مدت سے ان سے ملاقات کے لئے بے چین تھا اور جب بھی انکی کوئی تخلیق نظر سے گزرتی تھی میری اس بے چینی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ یوں ذہنی طور پر میں کئی برس سے ان کے قریب تھا مگر میرے اور ان کے درمیان جو ایک پردہ سا حائل تھا اس کے سرکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی کہ خالد کراچی میں رہائش پذیر تھے اور میرے سلسلہ ہائے روز و شب اس انداز کے تھے کہ کراچی کا سفر اختیار کرنا اور وہاں کچھ دیر قیام پذیر ہونا میرے بس کی بات ہی نہیں تھی۔

میں کلام خالد پڑھتا، جہاں کہیں انکا مطالب تک پہنچنے کے لئے کبھی محض سوچ اور کبھی سوچ اور لغت دونوں کا سہارا لیتا اور جب مطالب کی تہہ تک پہنچ جاتا تو ایک خاص نوع کا سرور محسوس کرتا جو میری اس پرانی بے چینی میں اضافہ کر دیتا۔ یوں بہت عرصہ میں اپنی شدید خواہش کے باوجود عبدالعزیز خالد سے ملاقات نہ کر سکا، جبکہ دوسری طرف تو عالم ایسا ہونا ممکن ہی نہیں کہ انہیں بھی علم ہو کہ کوئی شخص ان سے بہت دور بیٹھا عقیدت و احترام اور محبت کے اس گہرے جذبے کے ساتھ ان کے قرب کا متمنی ہے۔ گویا یہ تعلق جہاں غائبانہ تھا وہاں سراسر یک طرفہ بھی تھا تا آنکہ چند سال قبل میں نے انہیں کراچی کے پتے پر ایک خط لکھا جس کا جواب مجھے اپنی توقع سے بھی جلد تر موصول ہوا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ

جیسے میرا یہ تعلق ہزار ایک طرفہ سہی غالباً سو فیصد یک طرفہ بھی نہیں ہے۔ کم از کم میری تحریریں وہ میرے جذبات و احساسات کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر چکے تھے، چاہے یہ احساس کا بہت معمولی جزو ہی کیوں نہ ہو۔ پھر ایک خط میں، جسے اس کے انداز کے لحاظ سے محبت نامہ بھی کہہ سکتا ہوں میرے لئے ایک خوشخبری بھی تھی کہ انہوں نے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور بڑی خوشخبری تو اس اطلاع میں مضمر تھی کہ اب وہ لاہور ہی میں تبدیل ہو کر آ رہے تھے اور ملاقات کے لئے لاہور ہی کا پتہ دیا گیا تھا۔

ایک سہانی صبح میں نے ان سے ملاقات کا ارادہ کیا اور دل میں ایک انجانی خوشی کا خزانہ سمیٹے ہوئے مگر بوجھل قدموں کے ساتھ ان کے دفتر جا پہنچا۔ قدموں کے بوجھل ہونے کا سبب بہت سے گزشتہ تجربات تھے مگر ان میں سے زیادہ اہم اور تلخ تر تجربہ وہ تھا جب میں ایک ایسے بزرگ سے ملاقات کے لئے سیالکوٹ سے خاص طور سے سفر طے کر کے آیا تھا جن کی علمی و ادبی شخصیت کا میں معترف تھا اور ان کا حد درجہ احترام کرتا تھا۔ میں ان کا بے غرض عقیدت مند بھی تھا کہ میرے پیش نظر ان کی بے شمار تحریریں تھیں جن میں ادبی مسائل ہی زیر بحث لائے جاتے تھے اور مشرقی آداب و اخلاق کی تبلیغ بھی ہوتی تھی۔ میرے ساتھ ان کے ایک اور ارادت مند پروفیسر صاحب بھی تھے۔ ہم کوئی نو بجے ان کے دفتر پہنچے۔ چٹ اندر بھجوائی تو ایک ہی جملہ (اسی چٹ پر) لکھا ہوا موصول ہوا "بارہ بجے سے پہلے ملاقات ممکن نہیں" یہ سات الفاظ آج بھی میرے دل پر نقش ہیں۔ یہ سات الفاظ جن کے رقم کرنے کے لئے خدا جانے انہوں نے اپنی مصروفیات سے کیسے وقت نکالا، پڑھتے ہی ان کی شخصیت کا جو بت میں نے بنا رکھا تھا وہ دھڑام سے زمین پر آ رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ تب سے آج تک کئی برس گزر چکے ہیں، اس شہر کے اندر رہتے ہوئے بھی ان سے ملاقات کی ہلکی سی خواہش بھی آج تک میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں تو اسی وقت طے کر چکا تھا کہ "آپ کے لئے تو بارہ بجے سے پہلے ملاقات کے لئے وقت نہیں ہے (ویسے بارہ بجے کے بعد بھی ملاقات یقینی نہیں تھی، ہاں ممکن تھی) مگر میرے لئے تو شاید عمر بھر آپ سے ملاقات کے بارے میں سوچنا بھی ممکن نہ ہو اور میں شاید کبھی آپ کی شخصیت کا وہ بت تعمیر نہ کر سکوں جو آپ نے ایک ہی آن میں از خود ریزہ ریزہ کر دیا ہے"۔

کئی سال بعد یہ حادثہ مجھے اس وقت یاد آیا جب میں نے خالد صاحب کو چٹ بھجوائی مگر دوسرے ہی لمحے چپڑاسی نے آ کر بتایا کہ "صاحب بلا رہے ہیں"۔ میں اندر داخل ہوا تو میرے سامنے ایک نہایت ہی پیاری سی شکل و صورت کے ساتھ بڑی باوقار اور پرکشش شخصیت کا ایک شخص تھا جس کی دلکش مسکراہٹ اور والہانہ استقبال نے ایک سیکنڈ میں وہ پردہ درمیان سے سرکا دیا جو کئی سالوں سے حائل تھا، اور پھر چند ہی سیکنڈ میں میں نے ان کے ہاں ایک ایسی اپنائیت محسوس کر لی جس سے میں یہ شبہ کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھ رہا تھا کہ میری عقیدت بے بنیاد نہیں تھی اور میرا احترام اور خلوص کا تعلق سراسر یک طرفہ نہیں تھا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ بعض اوقات درمیان کے کتنے ہی سالوں کا فاصلہ چند ہی ساعتوں میں ختم ہو جاتا ہے اور مجھے یوں لگا جیسے میں انہیں پہلی بار نہیں ملا بلکہ اس سے پہلے بھی مسلسل ملتا رہا ہوں اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کرتا رہا ہوں۔ اس ایک ہی ملاقات میں میں نے ان سے اس قدر حاصل کیا کہ اگر جانتا کہ ایک صاحب دل کی صحبت کا حاصل کیا ہوتا ہے تو شاید میں اتنے برس تک یوں ان کے انتظار میں نہ رہتا۔ بے شمار موضوع زیر بحث آئے علم، ادب، سیاست، اخلاقیات اور جانے کس کس موضوع پہ باتیں ہوئیں جن میں ان کے اندازِ بیان کی دلپذیری کا یہ عالم تھا کہ

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

چنانچہ دورانِ گفتگو میری حیثیت بڑی حد تک ایک سامع کی رہی اور بسا اوقات ایک ایسے طالب علم کی جسے سچ مچ طلبِ علم ہو۔ ان سے گفتگو کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اتنا کچھ لکھ چکنے کے باوجود ان کے پاس مواد کی کبھی کمی نہیں ہو سکتی کہ اُن کا مطالعہ غیر محدود اور مشاہدہ زندگی بے کراں ہے۔ اس ملاقات نے مجھے ان کے بہت زیادہ قریب کر دیا اور تب تو یہ حالت ہو گئی کہ ان سے ملے بغیر کچھ دن گذر جانے کے بعد وہ کیفیت جسے میں بے چینی کہا کرتا تھا تڑپ کی صورت اختیار کر جاتی اور پھر اُن کے ساتھ میرے تعلق میں کمی نہ آئی۔ میں ان سے بے شمار دفعہ ملا ہوں اور بہت قریب سے ان کا مشاہدہ و مطالعہ کیا ہے۔

جب وہ لاہور آئے تو اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس کی حیثیت سے آئے۔ یہیں انہوں نے کنٹرولر اسٹیٹ ڈیوٹی کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ یہیں انہوں نے لاہور زون کے کمشنر انکم ٹیکس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اسی لاہور میں انہوں نے کمشنر انکم ٹیکس (انویسٹی گیشن) کے طور پر بھی کام کیا۔ اور اب اسی شہر لاہور میں وہ فنانس ڈائریکٹر پاکستان گارمنٹس کارپوریشن کی حیثیت میں متعین ہیں۔ ان کی شخصیت کا ایک وصف ایسا ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور وہ وصف ہے کہ کسی بھی عہدے کو اپنے لئے بہت بڑے فخر کا باعث نہ سمجھنا بلکہ کسی بھی عہدے اور کرسی سے بے نیاز ہو کر کام اور کام سے غرض رکھنا اور ہر حیثیت میں اپنے ملنے والوں اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ انسانی حیثیت میں مساوی سطح پر ملنا اور پھر اس کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کرنا۔ اس دور میں یہ وصف بڑا نایاب ہے۔ بڑے بڑے بے تکلف دوست اور قریب ترین لوگ عہدوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اپنے روابط میں ترمیم کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنے کبر و نخوت میں بتدریج اضافے کرتے چلے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ انہیں اپنا قد بڑھتا اور دوسروں کا گھٹتا دکھائی دینے لگتا ہے جس کی حقیقت تو سراب سے زیادہ نہیں ہوتی مگر وہ سراب کی طرح اسے حقیقت ہی سمجھتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ وہ ریٹائر ہو کر اصل سطح پر نہیں آ جاتے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب وہ خود کو آسمان سے زمین پر گرتا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں کیونکہ جن لوگوں کے ساتھ انہوں نے خالصتاً افسرانہ طرزِ عمل روا رکھا ہوتا ہے افسری کا تاج اُتر جانے کے بعد وہ لوگ انہیں سلام تک کے لائق نہیں سمجھتے کیونکہ انہوں نے جتنے بھی سلام کرائے تھے وہ ان کی افسری کو تھے۔ ان کی شخصیت کو نہیں تھے۔

اس کے برعکس خالد ایسی طبیعت کے لوگ ریٹائر ہو کر بھی ویسی ہی عزت کراتے ہیں جیسی افسری کے دوران کیونکہ ان کے دوسروں کے ساتھ روابط میں افسری کو دخل نہیں ہوتا اور ان کے طرزِ عمل پر افسری کا ملمع نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس جس دفتر سے تبدیل ہو کر گئے بھی وہاں کے عملے نے ہمیشہ انہیں یاد کیا ہے جس کی انتہا یہ ہے کہ ان کے اس دفتر میں قیام کے دوران ان کے جو بے تکلف دوست ان کے پاس آتے رہے اس دفتر میں موجود لوگ اب بھی ان کی اسی طرح عزت کرتے ہیں جس طرح خالد کے زمانے میں کرتے تھے اور ضرور پوچھیں گے کہ ——— "خالد صاحب کیسے ہیں؟"
اور خواہش کریں گے کہ ان کا سلام ان تک پہنچایا جائے۔

آج کے دور میں کہ مطالعہ برائے نام رہ گیا ہے جو شخص دو درجن کتابیں پڑھ لیتا ہے بزعمِ خویش عالم بن جاتا ہے۔

اور اپنی ذات کے گرد ایک مصنوعی خول چڑھا لیتا ہے کہ دیکھنے والا اس کا رعب اور دبدبہ محسوس کرے (نہ کہ احترام اور محبت) وہ ہنسنے اور مسکرانے میں بھی تحمل سے [illegible] لگتا ہے کہ یوں اس کی ذات پر سے رعب دار شخصیت کا ملمع اتر جانے کا ڈر ہوتا ہے مگر وہ لوگ کیا جانیں کہ ایک مرعوب [illegible] اور ایک پیار کرنے والے شخص میں کیا فرق ہوتا ہے اور دبدبہ کے تحت ملنے والے اور عقیدت و احترام کے جذبہ سے مجبور ہو کر ملاقات کرنے والے میں کیا تفاوت ہوتا ہے۔ اس قماش کے لوگ گن گن کر الفاظ بولنے کی عادت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کھل کر بات کرنے سے ان کے مطالعہ اور عمل مشاہدہ کا پول کھل جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ خالد کے ہاں یہ بات نہیں ہے (کہ انہیں ایسی صورت حال میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی نہیں) وہ بولتے ہیں اور خوب دل کھول کر بولتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو ان کی باتوں سے جہاں سامع علم اور عمل زندگی کی بیشمار باتیں سیکھتا ہے وہاں ان کا خزانۂ علم اس قدر غیر محدود ہے کہ انہیں بند [illegible] کر رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور ان کے علم میں روز بروز اضافہ ہوتا ہے مگر ان کے اطوار بلکہ کسی لکھے [illegible] شائبے سے بھی کوئی ایسا لفظ تک نہ نکلے گا جو یہ ظاہر کرے کہ انہیں اپنے علم پر ناز تو کیا، اس کا احساس تک بھی ہے — اور فی الحقیقت اسی انکساری نے انہیں ایک ایسے عہد میں اس قدر قد آور عالم بنا دیا ہے جس میں اچھے انسانوں کا سخت ترین قحط ہے۔ وہ بولتے [illegible] گلوں کی خوشبو کا گہرا احساس ہوتا ہے کہ دورانِ گفتگو ان کے باوقار اور پرکشش چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ بھی ہوتی ہے [illegible] دلفریبی اور اپنائیت کی کیفیت کو احاطۂ الفاظ میں لانا ممکن نہیں۔

خالد بہت صاف دل انسان ہیں۔ بات کرتے ہیں اور کھل کر کرتے ہیں۔ وہ لگی لپٹی رکھنے کے بھی ہرگز قائل نہیں —— مگر یہ بھی قطعاً ناممکن ہے کہ انہوں نے خلافِ طبع بات کے جواب میں بھی جو الفاظ کہے ہوں درشت ہوں اور وہ کسی بھی اعتبار سے تلخ اور ان کی پرکشش شخصیت سے متصادم ہوں۔ وہ مخاطب کی کسی بات کو پسند کریں گے تو بھی کھل کر اس کا اعتراف کریں گے اور ضروری ہوا تو اسے سراہیں گے بھی اور اگر ناپسند کریں گے تو بھی ہاں میں ہاں نہیں ملائیں گے۔ فوراً اپنا نقطۂ نظر بتائیں گے، سمجھائیں گے، دلیل دیں گے، مثالیں دیں گے —— مگر —— اپنا نقطۂ نظر پھر بھی مسلط کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اگر آپ باتوں میں انہیں اپنا ہم خیال بنالیں تو بھی وہ خوش، اور وہ آپ کو اپنا ہم خیال بنالیں تو بھی وہ اتنے ہی خوش ہوں اور دونوں ہی صورتوں کو کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیں گے۔ نہ پہلی صورت میں کوئی کمتری کا احساس اور نہ دوسری صورت میں کوئی برتری کا احساس ان کے ہاں جنم لے گا کہ وہ ان باتوں سے بہت بلند ہیں —— حالانکہ —— وہ ایسے دور میں جی رہے ہیں جب ہمارے گرد و پیش کا ماحول یہ ہے کہ بڑا شخص کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ وہ سچ بات پر بھی کسی ایسے شخص کا ہم خیال نہیں بن سکتا جو کسی بھی دنیاوی میدان میں اس سے پیچھے ہو اور اگر وہ شخص افسر بھی ہے تو دل سے دوسرے کی بات کا قائل ہو جانے کے بعد بھی مخاطب کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کرے گا کہ اس کی نگاہ میں یہ کسرِ شان ہے مگر خالد کے ہاں یہ صورت نہیں ہے ان کے نزدیک شان ہی یہ ہے کہ حق حق ہے چاہے اس کا بیان کرنے والا یا اس پر کاربند رہ کر چلنے والا شخص کوئی بھی ہو وہ ہر اچھی بات کو سراہیں گے، چاہے کہنے والے شخص کا دنیاوی مرتبہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اور ہر بری بات کو ناپسند کریں گے چاہے اس کا کہنے والا یا اس پر کاربند رہ کر چلنے والا شخص دنیاوی مرتبے کے لحاظ سے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔

اور یہ انکی عظمت کا صرف ایک پہلو ہے۔ آپ کو خالد کے چہرے پر مخصوص قسم کی دلفریب مسکراہٹ ہمیشہ نظر آئے گی۔ ان کی باتوں میں یوں بھی گلوں کی خوشبو ہوتی ہے لیکن اس پر اس مسکراہٹ سے تو ان میں اور بھی شہد گھل جاتا ہے جس کی حلاوت کو احاطہ تحریر میں لانا ممکن ہی نہیں۔ تاہم مزے کے معاملے میں اس قدر سخی ہونے کے باوجود آپ انہیں کھل کر قہقہے لگاتے ہوئے نہیں دیکھیں گے، وہ کھوکھلے قہقہے جو کھاتے پیتے لوگوں کے ایوانوں میں گونجتے ہیں انہیں سخت ناپسند ہیں کہ یہ کھوکھلے قہقہے دراصل کھوکھلی شخصیتوں کے اشتہار ہوتے ہیں اور متعلقہ لوگوں کے زندگی کے بارے میں غیر سنجیدہ طرز فکر کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

ان کی باتیں اتنی پیاری اور امید افزا ہوتی ہیں کہ سننے والے دل کا میل اتر جاتا ہے اور طبیعت ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔ میں خود جب بھی زیادہ پریشان ہوتا ہوں تو اپنی ساری مصروفیات بیت تلم منسوخ کر کے ان کے پاس جا بیٹھتا ہوں۔ پھر جب کھل کر باتیں ہوتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے طبیعت بشاش ہو گئی ہے۔ دل پر سے ایک بوجھ اتر گیا ہے۔ ان کے ساتھ محو گفتگو ہوتے ہوئے سب سے بڑا تحفظ (جو اس عہد میں نایاب ہے) یہ ہوتا ہے کہ ان سے کی ہوئی بات یوں ہے جیسے کہیں دفن کر دی گئی ہو اور ان کا مشورہ ہمیشہ خلوص پر مبنی ہوتا ہے جو ان کے وسیع مطالعہ اور غیر محدود مشاہدہ کی بنیاد پر صائب بھی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی بات کو اپنی ذات تک محدود رکھنے پر قادر ہیں اور صحیح مشورہ دینے کے معاملے میں سخی ہیں۔ ویسے ان کا عقیدہ ہے کہ مشورہ اس وقت دیا جائے جب ضروری ہو اور اسے دیا جائے جو اس کا طالب بھی ہو ورنہ مشورہ بے کار ثابت ہوتا ہے۔ وہ تب تک آپ کی بات کسی دوسرے شخص تک نہیں پہنچائیں گے جب تک ایسا کرنا اشد ضروری نہ ہو اور وہ آپ سے اس کی اجازت نہ لے چکے ہوں اور یہ بات بہت بڑی ہے۔

مشورے کے سلسلے میں ایک بڑی بات اہم ہے کہ ان کا مشورہ نہایت نیک نیتی پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی بصیرت کا بھرپور عکاس ہوتا ہے۔ اس یا اگر ان کے مشورہ کو فوری طور پر قبول کر لیا جاتے تو بعد میں احساس ہوگا کہ وہ مشورہ کس قدر صحیح اور قابل عمل تھا جب کہ اسے قبول نہ کر کے اتنی بڑی غلطی کی ہے جس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ میں نے اپنے کسی ذاتی مسئلے میں ان سے چند نشستوں میں تفصیل سے گفتگو کی اور ان کی رہنمائی طلب کی۔ انہوں نے کچھ دنوں بعد از خود مجھے یاد دلایا اور ایسا مشورہ دیا جو بظاہر بڑا ہی دو ٹوک اور کڑوا کسیلا تھا۔ میں اس کڑوے کسیلے مشورے کو نگل نہ سکا اور دو ٹوک فیصلے کے لئے جس ہمت اور استقامت کی ضرورت تھی ان کا مظاہرہ نہ کر سکا اور عملاً اس مشورے کو نظر انداز کر کے خاصا اذیت ناک سفر طے کر کے ایسا فیصلہ قبول کیا جو ان کے مشورے کے بالکل برعکس تھا انہوں نے اس پر کسی ناگوار ردعمل کا اظہار بالکل نہیں کیا بلکہ کہا کہ "خدا کرے یہ فیصلہ راس آ جائے" مگر چند ثانیوں بعد سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ـــ "مگر یوں لگتا ہے جیسے جو مشورہ میں نے دیا تھا اصل حل وہی تھا ـــــ بہرحال ـــ اب جو ہوا سو ہوا ـــ"

ان کی وسیع القلبی نے مجھے بیحد متاثر کیا اور جب تھوڑے ہی عرصے کے بعد نہایت پریشانی کے عالم میں میں نے ان سے کہا کہ "آپ ہی کا مشورہ صحیح تھا، میں نے سخت غلطی کی ہے اور اسکی سزا بھگت رہا ہوں" تو انہوں نے بجائے اس بات کو نظر انداز کر کے کہ ان کے صحیح مشورے کو میں نے نظر انداز کیا تھا، ایسے منطقیانہ انداز میں مثالیں دیکر اور وضاحتیں کر کے میری ہمت بندھائی کہ میں اپنے آپ میں نئی محرومی

صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پوری توانائی محسوس کرنے لگا۔ دوسروں کی ہمت بندھانا، اندھیرے میں روشنی کی کرن دکھانا اور گرتے ہوتے حوصلوں کو بلند کرنے کی سعی کوشش کرنا انکی زندگی کے مقاصد میں سے ایک واضح مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول کیلئے وہ قابلِ رشک استقامت کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں۔

خالد ایک حساس اور دردِ دل رکھنے والے انسان ہیں اور ان پیغمبر صفت لوگوں میں سے ہیں جو دنیا کی ہر نعمت حاصل ہو چکنے کے باوجود اپنے آپ کو اس لئے دکھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ آسائشیں تمام لوگوں کو کیوں میسر نہیں ہیں۔ وہ دکھ کی بات سن کر خود بھی اتنے ہی دکھی ہوتے ہیں جتنا کہ وہ شخص جو دراصل اس دکھ میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ اس کے دکھ کو اپنا ذاتی دکھ سمجھ کر اس کے لئے امکانی حد تک جو کچھ ممکن ہو کر گذرتے ہیں اور جہاں ایسا کرنا ممکن نہ ہو وہاں اپنی تمام تر ہمدردی اور محبت کے باوجود کوئی ایسی امید نہیں دلائیں گے جس سے کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، وہ خود حساس اور صاف دل ہیں اور حساس اور صاف دل انسانوں کو پسند کرتے ہیں اور انکی سچا طور پر قدر بھی کرتے ہیں۔

خالد بہت مردم شناس آدمی ہیں اور بخوبی سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی انہیں کیا سمجھتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کوئی ان کا کس قدر احترام کرتا ہے اور ان سے کس حد تک عقیدت اور محبت رکھتا ہے اور وہ اسکی قدر بھی کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کن لوگوں کا تعلق منافقت کا ہے اور محبت اور ... کا نہیں ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ ان لوگوں سے بھی برا سلوک نہیں کرتے وہ نہ صرف ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کریں گے بلکہ ان پر کبھی یہ ظاہر نہیں کریں گے کہ وہ اس منافقت کو جانتے ہیں جو ان کے ساتھ روا رکھی جا رہی ہے یہ بھی انکی عظمت ہی کی ایک دلیل ہے۔

خالد کے ہاں ایک مخصوص رکھ رکھاؤ کی خوشگوار کیفیت ہے جو ان کی طبیعت کا جزو بن چکی ہے۔ یہ رکھ رکھاؤ حد درجہ بے تکلفی کے باوجود قائم رہتا ہے اور ان کی شخصیت میں مزید دلکشی پیدا کرتا ہے۔ یہ رکھ رکھاؤ جو مشرقی آداب کا لازمہ ہوتا تھا مگر اب قریب قریب ناپید ہے۔ انکی گفتگو میں، ان کے اطوار میں، ان کی تمام حرکات و سکنات میں غرضیکہ زندگی کے ہر مرحلے پر ان کا ساتھ دیتا ہے۔ اس مخصوص رکھ رکھاؤ کا سبب انکی طبعی احتیاط پسندی ہے یا یہ ان کے رکھ رکھاؤ کی عادت کا نتیجہ ہے اس کا سراغ لگانا تو خاصا مشکل ہے تاہم حقیقت یہی ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں بہت محتاط ہیں اور یہ احتیاط پسندی زندگی کی خاردار راہوں پر سے گذرنے والوں بالخصوص ان لوگوں کے لئے جن کا کوئی بلند آدرش بھی ہو اور جن کے پیشِ نظر زندگی کے واضح مقاصد ہوں اور ان کے حصول کی لگن ہو، ضروری بھی ہے۔

ایک اور خاص بات جو آپ کو خالد کے ہاں نظر آئے گی وہ شاید آج کی مجالس میں شاذ و نادر ہی کہیں نظر آئے ——— ان کے ساتھ گفتگو کے دوران علم، ادب، مذہب، فلسفہ سیاست، آدابِ زندگی سے متعلق بے شمار موضوعات کے علاوہ بھی جانے کتنے موضوع زیرِ بحث آسکتے ہیں اور ان پر صحت مند تنقید اور عالمانہ بحث ہو سکتی ہے ——— مگر گھنٹوں مسلسل باتیں کرنے کے باوجود بعض موضوع براہ راست یا بالواسطہ کبھی زیرِ بحث نہیں آئیں گے۔

مثلاً وہ کبھی ذاتی ترقیوں کے موضوع پر لب کشا کبھی نہیں ہوں گے۔ وہ ذاتی ترقی کے بارے میں کبھی فکر مند نہیں ہوں گے (گو قدرت نے اس بے نیاز طبیعت کے شخص پر بے نیازی کے ساتھ ترقی کے دروازے از خود وا کر رکھے ہیں) ——— دورانِ گفتگو آپ کو مناقشوں، باہمی رنجشوں اور چھوٹی چھوٹی حاسدانہ باتوں کا وجود نظر نہیں آئے گا ——— یہ باتیں ان کے موضوعات سے خارج ہیں ——— ان کے ساتھ ہزار کھل کر باتیں کیجئے، کبھی ان کی زبان سے کسی کی خوشامد

کا ایک لفظ یا کسی کے خلاف ایک کلمہ نہیں سُن پائیں گے ۔ وہ ان باتوں سے بہت بلند ہیں ۔ ان کے ذہن میں ایسا خیال اور زبان پر ایسا لفظ آنا ممکن ہی نہیں ۔ اس عہد میں یہ بات خاص طور سے غنیمت ہے کہ آج تو روابط کی بنیاد ہی اکثر و بیشتر خوشامد اور چغلی پر ہے اور ہمارے بیشتر ثقہ لوگوں کی مجالس میں بھی یہ موضوعات سننے میں آ ہی جاتے ہیں۔

دوران گفتگو آپ ایک اور بات بھی محسوس کریں گے ـــــ وہ اپنی تمام تر زباندانی (میرا یہ قیاس غالباً غلط نہیں ہے کہ وہ اپنے ہر معصر سے زیادہ زبانوں پر قادر ہیں) کے باوجود سیدھی سادی مادری یا قومی زبان میں بات کریں گے ۔ حالانکہ آج تو چھوٹے چھوٹے افسر کی بھی پہچان عموماً یہ ہو گئی ہے کہ وہ بلاوجہ، بے ضرورت اور بے موقعہ انگریزی کا سہارا ضرور لے گا ۔ میں بیشمار ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ان کے مقابلہ میں کئی درجہ چھوٹے عہدے پر فائز ہیں مگر مصنوعی اور بے ڈھنگے پن سے انگریزی بول بول کر انہوں نے اپنے چہروں کی قدرتی ساخت ہی خراب کر لی ہے۔ وہ ایسے مصنوعی انداز میں جبڑوں کو اکڑا اکر بات کریں گے کہ آپ کراہت محسوس کریں گے ـــــ مگر کیا کیا جائے کہ لوگ اسی کو تو افسری کی نشانی سمجھتے ہیں ـــــ پھر زیادہ مضحکہ خیز صورت وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں یہ لوگ اردو، پنجابی، انگریزی وغیرہ کا ملغوبہ بنا کر بولتے ہیں جس میں آدھا یا آدھے سے زیادہ جملہ انگریزی کا ہوتا ہے جو بسا اوقات غلط اور مصنوعی لہجے میں بولا جاتا ہے ۔

خالد کے ساتھ ملاقات کے دوران بڑی دلچسپ صورت حال اس وقت پیدا ہو جاتی ہے، جب ان کا کوئی مخاطب ٹھیٹھ سے انگریزی بولتا ہے مگر آپ کمال تحمل سے ہر بات اپنی زبان میں کہتے ہیں، اور انگریزی کا ایک لفظ تک اس کے جواب میں نہیں کہتے (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ انگریزی اپنے اس مخاطب سے زیادہ اور دیگر زبانیں اپنے بیشمار ہمعصروں سے زیادہ جانتے ہیں) ایسی کئی صورتوں میں ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ وہی شخص بالآخر ان کے ساتھ گفتگو میں انگریزی سے اجتناب کرنے لگتا ہے اور ان کے ٹوکنے کے بغیر اپنی غلطی کا احساس کر لیتا ہے ۔

اس مادی دور میں کہ لوگ عہدوں اور حیثیتوں کے سوا کسی بات سے متاثر نہیں ہوتے اور مجھے ذاتی طور پر زندگی کے اس پہلو کے بیشمار تلخ تجربات بھی ہیں جن میں ایک ایسا تجربہ بھی شامل ہے جس میں میرے مخاطب نے میرے اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے (اگر اس میں بھی طنز کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اخلاق نام کی کوئی چیز ان لوگوں کی طبقاتی لغات میں موجود نہیں) بات یہاں ختم کی تھی کہ اخلاق اچھی چیز ہے مگر محض اخلاق سے کام نہیں چلتا۔ آپ کسی صاحب حیثیت آدمی کو جسے میں بھی جانتا ہوں (اگر یا صاحب حیثیت ہونے کا فیصلہ بھی وہ خود کریں گے) ساتھ لائیں تو بات ہو سکتی ہے ۔ بہرحال مجھے خالد کی (کہ وہ خود بہت بڑے افسر بھی ہیں اور انکی معاشرتی حیثیت بھی ماشاءاللہ بہت بلند ہے) یہ ادا بہت ہی دل پسند ہے کہ کوئی چاہے کتنی ہی بڑی معاشرتی حیثیت کا مالک ہو اور چاہے کتنا ہی بڑا افسر ہو، وہ اس سے ہرگز متاثر نہیں ہوں گے تاوقتیکہ ان کے اندر کوئی حقیقی وصف موجود نہ ہو۔ انکی نگاہ میں بڑائی کا معیار عہدہ یا حیثیت نہیں بلکہ انسان کا اخلاق و مرتبہ ہے اور مرتبے کے اسی معیار کے مطابق وہ کسی انسان کو بڑا یا چھوٹا سمجھتے ہیں چنانچہ عین ممکن ہے کہ ایک بڑے عہدے یا بڑی معاشرتی حیثیت کا شخص (جو بزعم خویش بہت بڑا آدمی ہو) ان کی نگاہ میں بہت چھوٹا آدمی ہو اور ایک معمولی عہدے اور معمولی معاشرتی حیثیت کا شخص ان کی نگاہ میں بہت بڑا آدمی ہو ۔

صفائی پسندی انکی طبیعت کا ایک اور خاصہ ہے جس کی جھلک انکی ذات اور لباس کے علاوہ ان کے کمرۂ مطالعہ سے لے کر ان کے دفتر تک ہر کہیں نظر آتی ہے ـــــ کہیں کوئی داغ یا دھبہ نظر نہیں آئے گا ۔ لباس کوئی بھی پہنیں اس میں سادگی کے ساتھ کمال درجے کی نفاست نظر آئیگی ۔ غالباً ان کی صفائی پسند طبیعت ہی نے انہیں سگریٹ نوشی اور پان کی عادت میں مبتلا نہیں ہونے دیا ۔ میں نے دوران

ملاقات کئی بار محسوس کیا کہ وہ سگریٹ سے کلی اجتناب کرنیوالے شخص ہیں اور میں کہ چند منٹ بھی سگریٹ کے بغیر نہیں گزار سکتا — یہ کیا عجیب تضاد ہے — ایک موقع پر مجھے شدت سے اس امر کا احساس ہوا تو میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ سگریٹ کا دھواں انکی طبیعت پر بار تو نہیں گزرتا — جس کے جواب میں انہوں نے مخصوص رکھ رکھاؤ مگر خوشگوار بے تکلفی کے ساتھ فرمایا کہ دھواں تو نہیں — البتہ کمرے میں سگریٹ کی راکھ کا وجود انہیں اچھا نہیں لگتا —— اور تب میں نے محسوس کیا کہ ان کے کمرے میں سوائے میرے سگریٹ کی راکھ کے کوئی اور داغ یا دھبہ نہیں تھا — اور نہ — پھر سے میں قدرے محتاط ہو گیا اور انکی موجودگی میں میرے سگریٹ پینے کی رفتار وہ نہ رہی جو اس ملاقات سے پہلے تھی — صفائی سے غفلت ہمارے بیشتر پڑھے لکھے اور علم دوست احباب کی کمزوری ہے مگر خالد سے مل کر احساس ہوتا ہے کہ انسان علم دوست بھی ہو اور ساتھ ہی صفائی پسند بھی تو زندگی میں کس قدر حسن پیدا ہو جاتا ہے ۔

کتابیں خالد کی کمزوری ہیں — کوئی بھی کتاب چاہے وہ چند ہی روز قبل شائع ہوئی ہو، ان کے ہاں مل جائیگی اور نئے سے نئے رسائل ان کے پاس ضرور موجود ہوں گے — اور — یہی سبب ہے کہ ان کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں بے شمار کتابیں اور لاتعداد رسائل ہیں — کتابیں آپ کو ان کے ہر کمرے سے ملیں گی، مطالعہ کے کمرے کے علاوہ بھی گھر کے کمروں میں کتابیں ملیں گی ۔ دفتر میں بھی آپ کو کتابیں ملیں گی اور بسا اوقات ان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے احساس ہوگا کہ کار میں بھی ان کے پاس کوئی نہ کوئی کتاب یا رسائل موجود ہیں —— کتابیں سبھی بھلا آپ کو کئی اور بھی ملنے والوں کے ہاں نظر آسکتی ہیں مگر جہاں خالد کے ہاں کتابوں کی کثرت حیران کن ہے وہاں یہ امر خصوصاً قابل ذکر ہے کہ یہ ساری کتابیں اور رسالے انہوں نے پڑھے بھی ہیں ۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور بسا اوقات تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ کلاسیکی مطالعہ اور زبانوں کے وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ تازہ ترین ادب کا مطالعہ بھی کس طرح کر لیتے ہیں مگر اس کا جواب اس سبب سے زیادہ مشکل نہیں کہ ان کا واحد مشغلہ کتابیں پڑھنا ہی ہے ۔ مطالعہ انکی واحد اور اہم ترین دلچسپی ہے جس کے لئے وہ زندگی کی ہر دلچسپی قربان کر سکتے ہیں — ان کے ساتھ گفتگو کے دوران پتہ چلتا ہے کہ وہ نئے سے نئے رسائل اور نئی سے نئی کتب کا کس حد تک مطالعہ کر چکے ہیں وہ دورانِ مطالعہ پسند آنیوالی تخلیقات کا ذکر بھی کریں گے اور مصنف کی تعریف بھی کریں گے ۔ حالانکہ ہمارے ہاں ادب میں بھی ایک بورژوا ذہنیت کارفرما ہے ۔ آپ بہت کم کسی بڑے شاعر یا ادیب کو کسی لکھنے والے کی اچھی تحریر کی کھل کر تعریف کرتے ہوئے پائیں گے ۔

خالد کو آپ نئے سے نئے لکھنے والے کی اچھی تحریر کی بھی اتنی ہی فراخدلی سے تعریف کرتے ہوئے پائیں گے جتنی صاف دلی سے آپ انہیں بڑے سے بڑے لکھنے والے کی کمزور تحریر کے بارے میں بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے پائیں گے — دورانِ گفتگو وہ ہر اچھی تحریر کا حوالہ دے سکتے ہیں مگر ذکر نہیں آئے گا تو خود ان کی اپنی تحریروں کا —— وہ کبھی اپنی تحریروں کے بارے میں آپ کو رطب اللسان نظر نہیں آئیں گے حالانکہ بیشتر لکھنے والوں کا محبوب ترین ذکر خود ان کی اپنی نئی تحریریں ہوتا ہے جن کا ذکر کرنے سے مقصود مخاطب سے تعریف کرانا بھی ہوتا ہے ۔

خالد عملی زندگی میں نہایت ذمہ دار انسان بھی ہے —— اوقاتِ کار کے دوران وہ ضرور دفتر میں ہوں گے ۔ دیر سے آنے یا جلد واپس چلے جانے کا تصور ان کے ہاں موجود ہی نہیں ہے — کام، اپنے وقت کے ساتھ ساتھ نبٹانا ان کی عادت ہے — یہی سبب ہے کہ انکی میز پر فائلوں کے ڈھیر آپ کو نظر نہیں آسکتے ۔ دوران گفتگو آنے والی فائلوں کو بھی وہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے اطمینان کے ساتھ نپٹا لیں گے — اور — فراغت پانے کے بعد ہی بات آگے بڑھے گی — اور جب فارغ ہوں گے تو علم ہوگا کہ کیا بات ہو رہی تھی اور کہاں تک پہنچی تھی — ان کی ان عادات کا نتیجہ

یہ ہے کہ وہ جس دفتر میں بھی رہے ہیں، وہاں دیر سے آنے یا جلد چلے جانے کا رجحان ماتحت عملے میں بھی نہیں رہا کہ وقت کی پابندی بھی ایک متعدی امر ہے جس کا منبع کسی محکمے کا افسر خود ہوتا ہے۔

خالد کی ایک اور خوبی جس نے مجھے متاثر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی شخص کی یکطرفہ بات سُن کر محض اسی کی بنیاد پر کوئی سخت رائے قائم نہیں کر لیتے اور نہ ہی کسی کی اچھی یا بری رائے کو سُن کر اسکی روشنی میں کسی فرد کو دیکھتے ہیں۔ خود میری موجودگی میں بعض لوگوں نے مختلف مواقع پر ان کے بعض ماتحتوں کے بارے میں بقول ان لوگوں کے بڑے بڑے انکشافات کئے اور اپنے زعم میں اس قدر قائل کر لیا کہ اب اس ماتحت کی شامت آئی کہ آئی مگر جب وہ سب کچھ سُن کر کہتے کہ آپ نے جو بتانا تھا بتا دیا اب میں خود بھی معلوم کروں گا کہ اصل حقیقت حال کیا ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ جو کچھ معلومات آپ نے فراہم کی ہیں وہ درست ہی ہوں، وہ غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ ان کا قطعاً غیر جذباتی رویہ بہت سے جذباتی شکایتیوں کو برا بھی لگتا مگر وہ کسی بھی طرح کسی شکایتی کے جذباتی رویے سے متاثر نہ ہوتے۔ سو عین ممکن ہے چند ایسے لوگ انہیں پسند نہ بھی کرتے ہوں مثلاً ایک صاحب بڑے بھرے ہوئے آئے اور کسی ماتحت افسر کے خلاف تقریر جھاڑ کر کر اسے بے ایمان اور نااہل قرار دیتے ہوئے توقع کرنے لگے کہ اس کے خلاف کارروائی ہونی چاہیئے۔ آپ نے ان کی تقریر سُن لینے کے بعد کہا کہ آپ نے افسر متعلقہ کے خلاف جو کچھ کہا ہے اسے لکھ کر دے دیجئے اور اسکی بے ایمانی اور نااہلی کو ثابت کرنے کے لئے ذاتی تجربے کی بنیاد پر عملی مثالیں بھی لکھیئے تاکہ پوری طرح جانچ پڑتال کے بعد اگر واقعی قصور نکلے تو اس کے مطابق کارروائی عمل میں آئے ——

یہ سُن کر وہ صاحب ناراض ہو گئے اور لکھ کر دینے یا واضح مثالیں دینے سے انکار کر کے چلے گئے۔ انہیں اصرار تھا کہ جب وہ کسی کو بے ایمان کہتے ہیں تو اسے بے ایمان سمجھ لیا جائے۔ وہ بہت مایوس ہو کر گئے اور شاید وہ انہیں پسند نہ کرتے ہوں

اسی طرح بعض ایسے لوگ بھی انہیں ناپسند کرتے ہوں گے جو ان سے ناجائز توقعات وابستہ کر لیں مگر وہ ان توقعات کو پورا نہ کر سکیں بلکہ یقینی بات یہ ہے کہ وہ ناجائز توقعات کو پورا کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اپنے دائرۂ اختیار سے بڑھ کر کبھی کوئی کام کرنے کی ہامی بھرتے ہی نہیں اور جو نہیں کر سکتے، صاف الفاظ سے معذرت کر دیتے ہیں جس سے بعض لوگ برا بھی مان جاتے ہیں مگر خالد صاف گوئی سے کسی کو ناراض کرنے کا خطرہ تو مول لے سکتے ہیں مگر کسی کو غلط امید نہیں دلا سکتے

ایسے ہی بعض ناراض لوگوں نے کچھ عرصہ قبل ان کے خلاف باقاعدہ طور پر نہایت منظم مہم چلائی اور ان کے خلاف پراپیگنڈے کا طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ اس پراپیگنڈہ کے دوران ان پر کیچڑ اچھالنے کی پوری کوشش کی گئی مگر وہ اس ساری مہم کے دوران کبھی پریشان نہ ہوئے بلکہ حد تو یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ مہم چلانے والے کون ہیں ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانا تو درکنار، ان کے خلاف کوئی بات تک نہیں کرتے تھے۔ ان کی استقامت اور بے نیازی ہی کا نتیجہ تھا کہ یہ مہم اپنی موت آپ مر گئی۔

اس تھوڑی اقلیت کو چھوڑ کر جو چھوٹی چھوٹی ذاتی خواہشات ان کے ذریعہ پورا نہ کر سکنے کے باعث ناخوش ہو، ان سے ملنے والوں کی اکثریت ان کی دل سے عزت ہی نہیں کرتی بلکہ ان سے محبت بھی کرتی ہے۔

میں باوقار، پرکشش، سنجیدہ اور متوازن طبیعت کے عبدالعزیز خالد کو جو بے اصولی اور قول و فعل کے تضادات

کے اس مادی دور میں اپنی متعین کردہ الگ تھلگ راہ پہ گامزن ہے، اس عہد کا ایک عظیم انسان سمجھتا ہوں اور میری اس سمجھ کے پس پردہ کوئی جذباتیت نہیں ہے بلکہ اس کی تمام تر بنیاد ان ٹھوس حقائق پر ہے جو انہیں عام انسانوں سے ممیز کرتے ہیں اور جن کا میں براہ راست مشاہدہ کر چکا ہوں۔

وہ امید اور روشنی کا ایسا مینار ہیں جس کے سائے میں دلوں کی سیاہی ڈھلتی ہے اور جہاں مایوسی سے پیدا ہونے والا اضمحلال امید کی توانائی میں تبدیل ہوتا ہے ـــ

میں جب بھی کسی ایسی کیفیت میں مبتلا ہوا ہوں، سید صاحب کے ہاں پہنچا ہوں اور ـــ بھرپور توانائی کا خزانہ سمیٹ کر لوٹا ہوں ـــ

میر نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

عبدالعزیز خالد

پیام

عارضی موت ہے احباب کی مہجوری بھی
محو ہو جاتے ہیں یادوں سے خط و خال نقوش
اور اس بیخودی سے ان کے پیام شیریں
کر کے بیدار دلاتے ہیں پھر احساس حیات!
کیا اسی طرح کوئی سلسلہ لاسلکی
واسطہ کوئی، کوئی رابطہ حرف و کلام
اپنے اور عالم ارواح کے مابین نہیں
دل کے کنجوں میں اچانک جو خیال اٹھتے ہیں
جن میں الہام کی سی برق وشی ہوتی ہے
کیا وہ ہوتے نہیں پیاروں کے پر اسرار پیام

سلطانہ مہر

عبدالعزیز خالد

۱۹۴۲ء/ ۱۹۴۳ء میں لاہور سے شائع ہونے والا رسالہ ہمایوں اپنے شباب پر تھا۔ یوسف ظفر ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے میں ہر لکھنے والے کی فرمائش ہوتی تھی کہ وہ ہمایوں میں شائع ہو۔ اس لئے اس کے مدیر یوسف ظفر کا کام بھی دوسرے ایڈیٹروں کے مقابلے میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ ایک دن انہیں ایک لفافہ موصول ہوا جس پر جالندھر کی مہر تھی۔ تحریر اجنبی تھی کھول کر دیکھا تو اندر ایک غزل تھی۔ یہ غزل اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دی گئی کہ ہمارا رسالہ اردو میں شائع ہوتا ہے۔

یہ لطیف طنز اس لئے کیا گیا تھا کہ غزل پچاس فیصد عربی چالیس فیصد فارسی اور صرف دس فیصد اردو میں تھی —— یہ شاعر تھے عبدالعزیز خالد —— انہیں ہمارے نظام تعلیم سے بڑی شکایت ہے۔

عبدالعزیز خالد کو اپنی قوم سے ایک اور شکایت بھی ہے اور وہ یہ کہ ذوق کے معاملے میں ہم قدامت پسند ہیں ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے شاعری میں جو نئی تشبیہات استعمال ہو رہی ہیں —— انہیں ہمارے ذوق کا حصہ بننے میں ابھی وقت لگے گا۔

تنقیدی نشستوں کی افادیت کا انہیں احساس ہے کیونکہ اس طرح آدمی اپنی چیز کو دوسرے کی نگاہ سے دیکھ پاتا ہے۔

عبدالعزیز خالد غزل کے مقابلے میں نظم کے قائل ہیں کیونکہ بقول ان کے زندگی کی پہنائی اسی میں سما سکتی ہے۔ ایک زمانے میں انگریزی شاعری کا بھی شوق رہا اور کالج میگزین میں کچھ کلام شائع بھی ہوا۔ مگر پھر سوچا کہ پرائی زبان میں تخلیق کا حق پوری طرح ادا نہیں ہو سکتا اس لئے یہ خیال چھوڑ دیا۔

عبدالعزیز خالد ایک قابل رشک لائبریری کے مالک ہیں۔ ساری زندگی کتابیں خریدنے اور جمع کرنے کے سوا دوسرا شوق نہیں رہا۔ ان کے مطالعے کا شوق چند گنے چنے موضوعات تک محدود نہیں ہر موضوع پر کتابیں پڑھتے ہیں۔ احباب اور ملاقاتیوں کی تعداد محدود ہے۔

ایک خاص بات یہ کہ مشاعرے کے ہنگاموں سے گھبراتے ہیں۔ چنانچہ سوائے چند مخصوص نشستوں یا ایک دو گنے چنے مشاعروں کے علاوہ کبھی شرکت نہیں کی۔

شناور و دیگر

عبدالعزیز خالد

حقیر۔ نقیر، تاجدارِ معنی و الفاظ،   عبدالعزیز خالد

مندرجہ بالا ان کے خودساختہ خطابات ہیں جن پر اعتراض کی تو ہم جرأت نہیں کرتے، البتہ ان کی توجیہہ و وضاحت کی جسارت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ہمارے خیال میں حقیر یہ نہیں کہ اس لفظ کا حقارت سے کوئی برادرانہ تعلق ہے اور خالد صاحب اپنے ذوقِ لطیف کے خلاف چیزوں اور لوگوں کو کمال حقارت سے کرنے میں ماہر فقیہ ہیں یہ اپنی فرش نشینی کے حوالے سے، وہ فرش جس پہ ساڑھے تین انچ موٹا قالین بچھا رہتا ہے۔ فقیری کے ساتھ تکیہ نشینی کا اضافہ ہم کئے دیتے ہیں کہ ہم نے انہیں ان کے گھر پہ جب کبھی دیکھا دس بارہ فوم کے تکیوں میں گھرا پایا، اور تاجدارِ معانی و الفاظ تو انہیں ہم آپ سب مانتے ہیں —— لیکن ہماری جرأتِ بلکہ جرأتِ رندانہ کی داد دیجئے کہ ادھر یہ لفظ و معنی کے بادشاہ ادھر ہم۔ سے تہی دست کہ دو چار زبانوں کے پیوند سے بمشکل تمام جملہ بنا پاتے ہیں، پھر بھی اپنا مدعا سمجھا پائیں تو شکر واجب سمجھتے ہیں اس قادرِ مطلق کا کہ جسے Class Differance کی نیرنگی ہر میدان میں مرغوب ہے۔

یوں بھی آٹھ دس سیر کے دو چار خاص نمبر نکلنے کے بعد کونسا لفظ اُردو ڈکشنری میں بچا ہوگا جو ہم ان کے بارے میں لکھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے باوجود صاحب یہ ہمارے قلمِ نوآموز کی زد سے بچ کر نکل نہ پائیں گے۔

عبدالعزیز خالد پوتڑوں کے شاعر ہیں بلکہ عالم اور لکھاری بھی —— بلکہ یوں کہئے کہ کالی، نیلی، سیاہی وال کلکانی مُنہ میں لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ آنکھ کھولی تو بقول ان کے اپنے آزاد کے قصص ہند چٹ۔ حاتم طائی، گل بکاؤلی کی حکائیتیں، امیر حمزہ اور الف لیلہ کی داستانیں ہضم —— اور پھر کیا تھا، عرفانِ ذات، کی پہلی منزل کی جو کھنٹ پہ مشرق و مغرب کے ادب آ آ کے حاضری دینے لگے اور انتہا یہ ہوئی کہ ان سب زبانوں پہ بھی حاوی ہو گئے جن کے آج نام بھی ساتویں صدی کے کھنڈروں سے کھود کے لانے

پڑیں۔ ویسے ٹیکسلا وکیلا یہ جانتے رہتے ہیں، شاید اسی نسبت سے جلتے ہوں۔

شاعر یہ جوڑدار بھی ہیں اور پھلدار بھی . . . . شاعر اور پیغمبر کا کام ایک ہی ہے۔ پیغمبر جو پیغام مستقبل کے حوالے سے دیتا ہے شاعر اس صداقت کو ماضی کے رشتوں سے باندھ باندھ کے لاتا ہے۔ یوں حق کے نکتے پہ آکے ازل اور ابد منطبق ہو جاتے ہیں اور شاعر اور پیغمبر ایک ——— اور پھر اسی قدر کے واسطے سے ایک اچھا شاعر مستقبل پہ بھی حاوی ہو جاتا ہے اور یہ کہتا ہے؎

ہم ذریعہ نہیں ہیں مقصد ہیں
ہم نہیں دولت و حکومت کے
آلۂ کار، ہم سخن ور ہیں!
تاجدارِ معانی و الفاظ
ترجمانِ خدائے اکبر ہیں

خالد صاحب خصوصاً تو اپنا ناطہ عربی روایات سے جوڑتے ہیں لیکن گوہر یہ ہر زبان، ہر قوم، ہر خطہ سے چن لائے ہیں اور ان کی اس دولتِ بے بہا سے کدر رکھنے والے لوگ ترجمہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں لیکن شیکسپیئر نے کتنی چیزیں Original دیکھیں؟ ان کی "سرو درفتہ" آپ نے پڑھی؟ . . . . یونانی زبان ہم جانتے نہیں۔ انگریزی تنقید میں "سیفو" کے حوالے دیکھے ہیں

——— کیا یہ جان ہے ان میں؟

اس خوش نصیب کو میں سمجھتی ہوں دیوتا

اس نظم کا تیسرا شعر ؎

لہجے کی مُرکیوں میں گھُلاوٹ وُہ شہد کی
آنکھوں میں ناچتی ہے ہنسی جو دبی دبی
اس نامراد دل میں لگاتی ہے آگ سی
پل بھر جو تیرے روئے نگاریں کو دیکھ لُوں
سینے میں ولولے بھڑک اُٹھتے ہیں گو نگوں
آواز گھٹ سی جاتی ہے محرابِ نطق میں

اسی نظم کے چند آخری اشعار ہیں ؎

پژمردہ ہے مزاج طبیعت کلی کلی
دل میں بھی ہے اشک و رقابت کی کھلبلی
تپتا ہے جسم شعلۂ جوالہ کی طرح
بڑھتی ہے اور حبس و حرارت سے بے کلی
لے نو بہارِ ناز، رہے تو سدا سہاگ!
اس مست کو تو لغزشِ مستانہ لے چلی!

صاحب پر شاعری نہیں مسیحائی ہے اور وہ کبھی بارہ سو سال کے گڑے مردے میں روح پھونکنا . . . .

ویسے ان کی شاعری نجیکے ساتھ عجب رقت ہے ـــــ یا تو وہ میرے جیسوں کے اوپر سے گذر جاتی ہے یا اگر سنجیدگی سے جانچنے بیٹھو تو سچی کھری رائے کو خوشامد کا روپ دے دیتی ہے۔ اپنے پہلے جھٹکے سے ہم خود چونک گئے۔ پھر خود کو تسلی دی کہ خوشامد ہمارے خمیر میں نہیں اور خالی پھونک کو اپنے ذاتی Ethical Code میں سب سے بڑا گناہ سمجھتے ہیں ـــــ لیکن لوگ ان کی خوشامد بہت کرتے ہیں۔ جانے کیوں؟ کچھ دن پیچھے خواتین کے ایک کالج میں ان کے ساتھ کوئی دوپہر یا شام منانے کے لئے انہیں بلایا گیا۔ مقالہ نویسوں نے زمین آسمان کے قلابے ملانے کے ساتھ ساتھ ان کے ہکلانے کے واسطے سے انہیں موسیٰ تک کہہ ڈالا جبکہ ہمیں ان کا ہکلانا یونہی فراڈ لگتا ہے۔ بائرن کی نقل مارتے ہیں۔ کبھی ان سے بحث کر کے دیکھئے۔ حاضرات سے لے کر ستاروں کے علم تک کوئی موضوع دنیا کا چھیڑ دیجئے پھر دیکھئے ان کی زبان اور خیال کی روانی۔ چند لمحوں میں گفتگو monologue کا روپ دھار لے گی اور ہکلاہٹ ایک دو ابتدائی لفظوں میں ہو تو ہو اس کے بعد تو آپ روک کے دیکھ لیجئے۔ ہم جیسے کہ اپنی آواز کی بلندی کے زعم اور طبیعت کی گستاخی کے سبب کسی کی گفتگو تین منٹ تک بغیر دخل در معقولات سُن نہیں سکتے ان کے سامنے بیٹھ کر لگاتار اس لمحہ کی تاک میں رہتے ہیں کہ جب کہیں خیال یا لفظوں میں کوئی کامہ، فل سٹاپ آئے اور ہم بھی اپنے جبڑے کو لقوہ ہونے سے بچالیں۔

اکثر دیکھا ہے کہ کسی کے ہاتھ میں خوش قسمتی یا بدقسمتی سے قلم آجائے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ باقی ساری دنیا جاہل، نابینا اور مفلوج ہو جائے کہ پڑھے، نہ دیکھے، نہ لکھے لیکن خالد صاحب کا مزاج سب فنکاروں سے انوکھا ہے۔ ان کا بس چلے تو سب کے ہاتھ میں قلم تھما دیں۔ ہمیں بار بار کچھ لکھنے کو کہتے رہے اور جب قائل ہو گئے کہ یہ مٹی سیم زدہ ہے تو ہماری بیٹی کو ہر شکانا شروع کر دیا۔ خیر وہ بھی ہمارے بس کی بات ہے۔ اور اب ہمارے میاں پہ بھی آنکھ رکھتے ہیں۔ شاید اسی لئے ان جیسے بے پیر انسان نے ہم انہیں اپنا مرشد مان لیا ہے۔

ویسے آدمی بڑی کئی اور ڈھب سے بھی عجب ہیں۔ گڑ کھاتے ہیں گلگلوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ گاجر کے حلوے کی پلیٹیں سب چاٹ جاتے ہیں اور چائے کے کپ میں شکر چمچہ نہیں ملانے دیتے۔ عورت سے عشق کرتے ہیں اور اس کے عورت پن کو [illegible] بتاتے ہیں . . . . ان کی شاعری کا سب سے جاندار حصہ وہی اشعار ہیں جو انہوں نے حسن کی تعریف

ہیں کہے ۔۔

محراب عمود برج قوسین
سجدار سڈول گول کومل
مٹی سے نہیں خمیر جیسے

دنبالہ دار قدرتی کاجل بھرا ہوا
غش سوئی سوئی آنکھ پہ چشم غزال ہے
سر پہ دوشالہ قرمزی، بر میں لباسِ سُرخ
وارفتگی کا رنگ ہے بدمست چال ہے

حُسن کے وُہ وُہ نقشے کھینچے ہیں کہ ان کے محبوب اگر ہمارے سامنے سے گزر جائیں تو اپنی جنس سے ایک قدرتی تقابل و رقابت تک کو بھُول کے والہانہ ان کے پیچھے ہو لیں۔
لیکن ایک طرف تو احترامِ حُسنِ خوباں کا دعویٰ، دُوسری طرف حُسن کی سیرت ؎

شید و تلوین و لاغ و لابہ دروغ
ہے شعار اہلِ حُسن و دولت کا

وُہ عورت کے حُسن کے مصوّر ہی نہیں بلکہ اس کے دل میں اُتر جاتے ہیں ——— اور اس کے دل کی آواز بن جاتے ہیں۔
حکایتِ نے کے یہ اشعار ؎

کہاں چلے گئے میرے رنگیلے من موہن ؟
مرے علاوہ کسی دُوسری سے ہے وعدہ
سکھی! پیا کو منا! کیوں وُہ رُوٹھ گئے ؟
کیا جو غیر نے اغوا، تو ہے قصور مرا ؟
زباں سے گر نہیں آنکھوں سے گفتگو کرتے
ترس نہ درد رسیدہ پہ کچھ انہیں آیا ؟

چھڑا کے ہاتھ چلے دل سے جاؤ تو جانوں
تو مجھ سے بھاگ کر آخر کہاں پہ لے گا!
تو میرے دل میں تو رہنا ہے خط کسے لکھوں
میرے سکوت سے نا حق تو خشمناک ہوا
تو میرا مان ہے منک ہے میرا عالیجاہ
تو کائنات ہے میری تو عرش و فرش بھرا
پکارتی ہیں تجھے دھڑکنیں میرے دل کی

اور یوں اُن کا رشتہ ہندی شاعری کی روائت سے بھی جا ملتا ہے۔ اور ان کی جڑیں مزید پھیلنے لگتی ہیں۔ اُن کی شاعری کے پودے کا تن اور تنومند اور گھنیرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

آپ عاشق ہیں بوالہوس نہیں۔ مومن ہیں زندگی میں بھی اور شاعری میں بھی۔ ان کی شاعری اور فن کی تعریف اور تنقید کا گراں بہا سرمایہ ہو سکتی ہے۔ فن کی تعریف جو دیتے ہیں اس پہ خود بھی پورا اُترتے ہیں۔ ان کے ایسے ناقدانہ خیالات کے موتی "لحن صریر" میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔

خالد صاحب کے ساتھ ایک بدقسمتی یہ ہے کہ ان کی دوستی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ "دوستی" کا لفظ ہمارا ہے کیونکہ خالد صاحب کی دوستی کی تعریف بہت عجیب و غریب ہے۔ ہم تو کسی سے ملتے ہیں، ایک آدھ دفعہ اس کے ہاں گئے، دو چار مرتبہ اسے بلایا، دوستی ہو گئی۔ یہ لوگوں سے بڑے تپاک سے ملیں گے، بڑی خوشدلی سے مسکرا مسکرا کے، مکرر فرمائش سے انہیں اپنے ہاں بلائیں گے اور اگر کوئی ان کے پاس پہنچ گیا تو دو چار گھنٹے سے پہلے اسے اُٹھنے کی اجازت نہیں دیں گے ــــ ایسے میں میرے جیسے کسی سیدھے سادے کے منہ سے اگر نکل جائے کہ آپ کے وہ دوست، تو چونک کے اُچھل پڑیں گے۔ "دوست؟ دوست ... میرے دوست۔ نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔" بات کرنے والا بیچارا پریشان ہو جاتا ہے کہ کہیں میں نے اچھے شعر کہنے والے کا نام تو نہیں لے دیا۔ ذرا سنبھلنے کے بعد احساس ہو جاتا ہے کہ گھپلا ان کی دوست کی تعریف کے ساتھ ہے۔

اُن سے دوستی کے لئے شرطِ اول تو Intellectual Companion ہے اور شرط نمبر ۲، ۳ اور ۴ بھی کچھ ایسی ہی گہری گہری اور ثقیل باتیں ہیں جو میرے آپ کے قطعی کام کی نہیں۔

خیر تو ہم ان کی مصاحبت کے وسیع حلقے کی بات کر رہے تھے۔ دراصل ان کی شاعری کے اکثر نقاد اسی حلقے سے ہیں اور جب ان پہ قلم اٹھاتے ہیں تو اُن کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ چلو یار۔ چار لفظ لکھ ہی ڈالو۔ دوست آدمی ہے۔ نہ لکھا تو کیا سوچے گا۔" چنانچہ ایک کتاب پڑھی یا صرف دیکھی اور جھٹ ساری شاعری پہ رائے دے ڈالی ــــ بلکہ بعض مضامین تو یوں لگتا ہے کہ کسی کتاب کا صرف ٹائیٹل ہی دیکھ کے لکھ دیئے گئے اور یوں خالد صاحب تمام Reading Public سے متعارف ہونے کی بجائے ان کے لئے ایک ہوا بنتے چلے جا رہے ہیں ــ یا پھر دیس دیس کی گوپیوں کا گردھر، جس کی اس قوم یا آئندہ نسل کو کوئی ضرورت نہیں۔ ناقدین کو یہ بھی اعتراض ہے کہ ان کے ہاں اقبال کی طرح قوم کا احساس اور کوئی پیغام نہیں ملتا۔ ــ

بے برگ و بے ثمر شجر موم کی طرح
دیکھی نہ جائے قوم کی یہ حالتِ تباہ

ایسے اشعار کو آپ کیا کہئے گا ؟

اصل میں فنکار کا قد اس کے زمانے اور اس کی ضرورتوں کے حوالے اور پھر اس کی شاعری کے عمومی اور آفاقی پہلوؤں سے بنایا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال کے زمانے میں یہ قوم سوئی ہوئی تھی۔ اسے جھنجھوڑنے کی ضرورت تھی، شانوں سے پکڑ کر ہلانے کی، بلند آواز سے چونکانے کی لیکن خالد کی قوم بیمار ہے۔ ناسوروں سے بھری ہوئی۔ اسے تیز نشتروں کی ضرورت ہے اور وہ بھی سنبھل سنبھل کے لگائے جائیں اور ایسے نشتر "لحن صریر" اور باقی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

یہ الگ بحث کہ ان کی تیزی کی حد کیا ہے اور کیا ہونی چاہئے یا ان کا Antiseptic effect کیا ہے ؟

پھر اس بیماری کے عالم میں صحت کا Internal "منحنا" اور "فارقلیط" کی صورت میں دے دیا ہے۔

شروع شروع میں ان کی شاعری سے ہم بہت بدکے۔ پڑھنے بیٹھتے تو اکثر لفظ زبان کی نوک پہ آکے ہی اٹک جاتے۔ ذہن میں اترنا بہت دور کی بات ہے۔ چنانچہ ہم نے فوراً ان کی شاعری کو رد کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ اس عربی دانی سے کون سا پٹرول سستا ہو جائے گا، یا صراطِ مستقیم کے طول و عرض میں کوئی فرق پڑے گا یا جنت کے دروازے ہم پہ وا ہو جائیں گے۔ بے فائدہ مغز کھپی کا کیا فائدہ — لیکن پڑھا — پھر پڑھا اور پڑھا تو چٹخارہ لگ گیا۔

درحقیقت اچھی شاعری زبان اور زندگی کو نئے معنی دیتی ہے اور علم و احساس کو نئی جہت۔ خالد صاحب کی شاعری نے اُردو زبان کو تقویت بخشی ہے۔ زندگی کو صحت کا پیغام دیا ہے۔ ان کی شاعری میں علم کی انتہا ہے اور احساس کی بے پناہ وسعت اور گہرائی بھی۔ یہ ششش جہات ہیرا نا قدر شناس کو ملے تو کانچ کا ٹکڑا اور جوہری کے ہاتھ لگے تو دولت۔

عبدالعزیز خالد

تگ و دو میں کمی نہ کر لیکن
جو میسر ہے اس پہ شاکر رہ
مل ہر اک سے بخندہ پیشانی
راز دل کا کسی کسی سے کہہ
تن پہ پشمینہ ہو کہ اطلس ہو
خود پہ قابو رکھ؛ اپنے آپ میں رہ
علم ہے ماحصل و حاصل کیا
مرد بن، سختیٔ زمانہ سہ

اے مقامر سنبھل کے چل چالیں
بری ہوتی ہے دیکھ دل کی شہ
عین حکمت ہے عاقبت بینی!
سیلِ جذبات میں نہ ہرگز بہ
ملے آ ذوقہ تو اُبھر جائیں
مردمانِ کمینہ و بے سنہ!

لطیف کاشمیری

علم وفراست کا سنگم

عبدالعزیز خالد سے مل کر طبیعت کو وہی طمانیت اور سکون میسر آتا ہے جو ریگستان کی جلتی دوپہر میں کسی گھنے پیڑ کے سائے میں پہنچ کر ـــــ اس کی خنک مزاجی اور عجز بھری دھیمی گفتگو، معاشرہ کے شاکی انسانوں کے زخموں پر جیسے مرہم سا رکھتی چلی جاتی ہے۔ اس کی پوری زندگی پر اسی دھیمے پن کی گہری چھاپ ہے۔

وہ اپنے عالمانہ استدلال اور عاجزانہ طرزِ تخاطب سے آپ کے فکر کے ہر اُلجھاؤ اور تذبذب کی کیفیت کو یقین سے منوّر کر دے گا۔ اور آپ مسائلِ حیات کو آئینہ صفت دیکھ کر خود اعتمادی سے مالا مال ہو جائیں گے۔

خالد کی شخصیت کے یوں تو ہزارہا پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو اپنے اندر ایک جداگانہ رنگ و رُوپ کا حامل ہے لیکن درویشانہ اندازِ زیست سے اس کی سوچوں کی پختگی اور فکری عظمت کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ فنی ریاضت کو حاصلِ زیست سمجھنے والا وہ ایک ایسا فنکار ہے جو برسوں کے عابدانہ انہماک سے چمنستانِ شعر میں علم وعرفان کے پھول کھلاتا اور نغاثت بھرے نرم و نازک گیت الاپتا رہا ہے۔ اُس نے کسبِ کمال کی مسلسل جد وجہد اور برسوں کی ریاضت کے نتیجے میں یہ مقام پایا ہے کہ اب شعر خود بخود ایک الہامی کیفیت کے ساتھ اُس پر وارد ہونے لگتے ہیں۔ وہ زندگی کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل اور سائنسی حقیقتوں کو شعر کے قالب میں سمونے پر قادر بھی ہے۔ اور اُن کے اظہار میں بھی اُسے کوئی باک نہیں۔ اس کے جذبوں میں ایک ہمہ گیر صداقت اور ایک کائناتی حسن ہے۔ ان جذبوں کی شدت عموماً اس کے کلام اور گفتگو سے نمایاں نہیں ہوتی مگر اس کے فن میں جو ایک رجائی عنصر اور انسانی فکر کی جو رفعت ہے، وہ اس کے قول وعمل میں جابجا بکھری ملتی ہے۔ اور اس میں ایک ارفع قسم کی باطنی طہارت کا سراغ بھی ملتا ہے۔

خالد کے فن میں حسن وخیر کا جو رچاؤ ہے، اس کا عکس اس کی عملی زندگی میں بھی نمایاں طور پر جھلکتا ہے اور حقیقت میں عمل کا روپ دھار کر ہی کوئی فن زندگی کی حرارت سے ہمکنار ہوتا ہے اور اسی سے کسی فنکار کی عظمتوں کا تعین ہوتا ہے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح عبدالعزیز خالد بھی اپنے عہد کی روش سے شاکی اور غیر مطمئن ہے۔ اس کی طبیعت بیشتر جب

خوب تر کی جستجو میں رہتی ہے۔ شاید اس لئے اس میں قرار نہیں۔ اُس پر ایک طرح موہوم سی بے کلی اور اضطراری کیفیت چھائی ملتی ہے۔ کبھی بعض اوقات ایک معین راستے، ایک سمت کو چھوڑ کر از خود دوسری جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔

وہ اپنی قوم کے ساتھ دوسری پس ماندہ اقوام خصوصاً مسلم قوم کی زبوں حالی اور فکری انجماد پر ہمیشہ متاسف رہا ہے۔ اور اس پر اس کا دل [illegible] آنسو رویا ہے۔

ایک بار دوستوں کی محفل میں کسی واقفِ حال نے یوگنڈا کے صدر کی سیاسی قلابازیاں اور غیر افریقی باشندوں کو دیس نکالا دینے کے اقدام کی تفصیلات بتائیں تو خالد بہت ہی آزردہ لہجے میں کہنے لگا۔

"آج کا مسلمان دنیا کے جس خطے میں ہے، نہ جانے کیوں زیادہ تر ذلت و رسوائی کے کام ہی سرانجام دیتا ہے۔"

اپنے معاشرہ سے عدم اطمینان کا یہ عمل اُسے انفعالیت نہیں بخشتا اور نہ ہی قنوطیت کے ریگزاروں کی سمت لے جاتا ہے بلکہ اسے مستقبل کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندانہ اور سائنسی زاویہ فکر اپنانے کی ترغیب دیتا ہے اور یوں وہ فرسودہ رسوم و قیود کے زنداں کی زنگ خوردہ سلاخیں توڑ کر باہر نکلنے کا حوصلہ عام کرنے لگتا ہے۔ منفی سوچوں اور شر سے اُسکی بیزاری، مردم بیزاری نہیں بنتی بلکہ خیر سے محبت کا ایک اٹوٹ پیمان بن جاتی ہے۔ اور اصول پرستی کی ایک زندہ علامت بھی، یعنی وہ ایک ایسا روایت شکن مردِ قلندر ہے۔ جو فکرِ انسانی کو جمود اور تعطل سے ہمکنار کرنے والی قوتوں کی تکذیب کرتا ہے اور بت شکنی کی روایت (چاہے وہ کسی شکل میں بھی ہو) کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ یہ بت چاہے حرص و آواز کے بت ہوں، چاہے افسرانہ پندار اور کروفر کے بت، چاہے جاہ و منصب اور زر و سیم کی پرستش کے۔ ان بتوں کی شکست و ریخت اُسے ایک روحانی تسکین سے ہمکنار کرتی ہے۔

ایک روز اُس کا ایک نیازمند (جو میری ہی طرح اس کے فن اور شخصیت کا شیدائی ہے) خالد کے ساتھ شام منانے کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ شیدائی نے اپنی نیازمندی اور عقیدت کے اظہار کے لیے تجویز پیش کی کہ پروگرام کے اختتام پر فنکار کو خراجِ تحسین کے طور پر اس کا ایک بُت پیش کیا جائے۔ اس نے یہ تجویز انتہائے عقیدت میں پیش کی تھی اور میں کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ خالد نے بڑے ملائم انداز میں اپنے نیازمند پر چوٹ کی۔ شاید اُسے اس اقدام سے باز رکھنے کے لئے۔ اور کچھ اس سلیقے سے کہ اس سے موصوف کی دل شکنی بھی نہیں ہوئی

"تو گویا آپ بت شکنی کی بجائے بُت پرستی کو فروغ دینا چاہتے ہیں؟"

میں نے دیکھا خالد کے چہرے پر ایک ایسا سکون مترشح تھا جو سمندر کی سطح پر اس وقت بھی موجود ہوتا ہے۔ جب لہریں اس میں مد و جزر پیدا کرنے کی سعیٔ لاحاصل کر رہی ہوتی ہیں۔

خالد کی متین اور پرسکون شخصیت ایک ایسے سمندر کی طرح ہے جس کی سطح خاموش ہو مگر جس کی پہنائیوں میں لعل و گوہر کے دفینے موجود ہوں۔ عمیق مشاہدے اور وسیع مطالعے نے اس کی ذات میں رچ بس کر اس میں سمندر ایسی ایک گہرائی پیدا کی ہے۔ اور اسے کشادہ خاطری اور وسیع النظری سے ہمکنار کیا ہے۔

اُس نے زندگی کو نہ تو ایک رندِ خانہ خراب کی آنکھ سے دیکھا ہے اور نہ ایک زاہدِ خشک کی نظر سے بلکہ زندگی اپنی اصلی

ہیئت اور حقیقی خدو خال کے ساتھ اس کے سامنے اُجاگر ہوئی ہے۔ اُس نے زندگی کو ایک متوازن اور مفکرانہ ذہن کی ٹھنڈک کے ساتھ پرکھا اور برتا ہے۔ یوں کہیے کہ وہ ایک نارمل جینئیس ہے۔ جس کی زندگی میں ابنارمل فنکاروں ایسی بے قاعدگی یا لااُبالی پن نام کو بھی نہیں ملتا۔ وہ لاابالی فنکاروں کو جام و مینا کی نذر ہوتا دیکھ کر بڑا کُڑھتا ہے اور اکثر سوچتا ہے کہ زندگی کتنی قیمتی اور اہم شئے ہے۔ اُسے شراب وشاہد کی نذر کر دینا کس قدر حماقت ہے۔ اُس کی نظر میں زندگی حقیقتاً وہی ہے۔ جو کسی اعلیٰ مقصد یا بلند نصب العین کی خاطر گذاری جائے۔ اس کی رائے میں یہ بلند نصب العین عقائد کی باہمی آویزشوں یا مذاہب کے تنگ دلانہ نظریات اور کٹرپن سے حاصل ہونا محال ہے۔ اس لیۓ وسیع النظری کے ساتھ ساتھ جدید نظریات سے ہم آہنگ ترقی پسندانہ تصور کو اپنانا ہوگا۔ جس میں مذاہب کے جذباتی خلوص کے ساتھ ساتھ عقلی بنیاد بھی موجود ہے۔

خالدؔ مذہبی و سیاسی تعصبات سے بالاتر ہو کر ہر مدرسۂ فکر سے اکتسابِ نُور کرتا ہے۔ افکار و نظریات کی یہ رنگا رنگی اُسے گلشن کے مختلف النوع پھولوں کی طرح بھاتی ہے۔ اور وہ ہر پھول کو سونگھ کر روحانی کیف اور سُرور حاصل کرتا ہے۔ اس سے جہاں اس سے وسعتِ نظر اور بیکرانیٔ قلب میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی نیک دلی اور رواداری کے ساتھ ساتھ اُس کا اپنی ذات پر غیر متزلزل اعتقاد بھی دوچند ہو جاتا ہے۔ وہ قرۃ العین طاہرہ کی نظموں کو بھی اُسی ذوق و شوق سے پڑھتا ہے۔ جس جذبے اور عقیدت سے ہوتیؔ مہرؔ کی انقلابی نظموں کا ترجمہ کرتا ہے۔ وہ اپنے ادبی ذوق اور احساسِ جمال کی تسکین کے لیۓ دنیا کی مختلف زبانوں میں بکھرا ہوا لٹریچر کھنگال ڈالتا ہے اور اُسے جہاں کہیں سے علم و دانش کے نادر نگینے ملتے ہیں اور جہاں سے بھی مومنانہ فراست کے گم شدہ خزینے اور ایمان کی روشنی میسّر آتی ہے، اسے اپنے وجودِ معنوی میں سمو لیتا ہے۔

خالدؔ کی چال ڈھال، گفتگو اور پہناوے تک میں ایک مردِ درویش کی جو سادگی اور فروتنی ملتی ہے، وہ زندگی کے بارے میں اس کے نکتۂ نظر کی بڑی حد تک ترجمان بھی ہے۔ اس کے فکری استغراق اور طبیعت کے فقیرانہ استغناء اور دولتِ ایمان کے باوصف، اقبال کے اس مردِ قلندر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جو اپنے اندر قدرت و عمل کے لامحدود امکان رکھتا ہے۔ اور جو آفاق میں گُم ہونے کی بجائے، آفاق کی وسعتیں اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ اس مقام و مرتبے تک پہنچنے کے لیۓ اسے شبانہ روز کی ریاضت کے علاوہ دُہری جنگ بھی لڑنا پڑی ہے۔ ایک اپنے حرص زدہ معاشرے کے قدم بقدم ترغیب دینے والے ماحول سے اور دوسری اپنی ذات سے کہ بقول پال سارتر ــــــــــــ

"جب تک انسان اپنے نفس پر قدرت نہیں پاتا اور اپنی ذات کو تابع فرمان نہیں کر لیتا، وہ حقیقی آزادی کھو کر مختلف اشیاء اور احتیاجات کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔"

یعنی اس نفسی غلامی سے نجات پا کر ہی کوئی اہل فکر صحیح معنوں میں انسانیت کا حلقہ بگوش بن سکتا ہے اور اسی فتح ذات سے اس سچی روحانیت کے سوتے پھوٹتے ہیں جو فنکار کو حرص و آز کے سیلاب میں ایک چٹان کی طرح سراپا استقلال کی صورت بخش سکتے ہیں۔

عبدالعزیز خالدؔ بھی استقلال کی ایک چٹان ہے۔ شرافت و نجابت کا ایک قدیم مشرقی معیار، قانون دوستی اور اصول پرستی کی ایک خوبصورت مثال ــــــــــــ یہ اصول پرستی بسا اوقات اس کے لیۓ نہ صرف دردِ سر بن جاتی ہے بلکہ

شناسا اور جان پہچان والوں کے لئے وجہ شکایت بھی ۔

ایک بار ایک شاعر جو مالی مشکلات سے مجبور ہو کر ریلوے اسٹیشن پر قُلی کا کام کرتے تھے ۔ ناقدریٔ زمانہ کا کرب لئے اور اپنے شہر نا پرسُاں کا گلہ کرتے کرتے عبدالعزیز خالد کے دفتر پہنچ گئے ۔ احباب نے اُن کے کلام کی بے پناہ تعریف کے ساتھ سفارش کی کہ شاعر کو ملازمت دے دی جائے کہ پھر اُسے گردشِ حالات کی شکایت نہ رہے لیکن خالد نے ان زوردار سفارش کے جواب میں ایک ہی بات کہی جو اُس کے نزدیک اصولی تھی کہ شاعرِ ممدوح کے مقام و مرتبہ کا اُسے بڑا لحاظ ہے ۔ مگر اس ملازمت کے لئے جو قانونی ضابطہ اور طریق کار ہے ، اسے پورا کئے بغیر وہ ان کی کوئی مدد کرنے سے قاصر ہے ۔ یعنی شاعر اگر محکمانہ تحریری امتحان اور انٹرویو میں کامیاب ہو گیا تو وہ اس آسامی کا مستحق ہو گا بصورتِ دیگر نہیں ۔

بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود وہ قانون کی بالادستی کو نظر انداز نہیں کرتا اور خود کو اس کا پابند ہی نہیں بلکہ اس کے سامنے جواب دہ بھی ہے ۔ وہ عہدہ و منصب کو اپنے یا دوسرے کے لئے کبھی وجہِ افتخار نہیں گردانتا ۔ اس کے نزدیک انسانی بڑائی کسی فرد کے کردار اور عمل سے عبارت ہے ۔ اسی لئے اس کے ہاں نہ تو پرانے حاکموں کی بے بنیاد کرّوفر ملتی ہے اور نہ ہی وہ افسرانہ پندار جو ان کا رشتہ زمینی مخلوق سے منقطع کر کے انہیں نارمل انسانوں کے زُمرے ہی سے خارج کر دیتا ہے ۔ خالد نے نہ صرف ان افسروں کی خُو بُو نہیں اپنائی بلکہ بڑی دیانت اور فخر کے ساتھ اپنے آپ کو حکام کی بجائے فنکاروں کے طبقے سے منسلک کیا ہے کہ فن اس کا اوڑھنا بچھونا ہے ۔ اس کی روح کی غذا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مادیت کے مقابلے میں اس کی فطرت میں روحانیت کا رچاؤ نمایاں طور پر اُبھرا ہے ۔

اپنے اعزاز میں شہر بہ شہر منعقد ہونے والی شاموں کے دوران جب وہ سامعین کے درمیان متانت اور سنجیدگی میں گھرا ، دولھا بنا بیٹھا ہوتا ہے اور مقالہ نگار کے کسی تنقیدی چبھتے ہوئے جملے کو سنتا ہے تو اس کی فراخ پیشانی پر کسی شکن کی لہر نمودار نہیں ہوتی البتہ پڑھنے والے کے تعریفی جملے سنتے ہوئے اس کے گالوں پر کسی ناکتخدا کی طرح حیا کی سرخی ضرور دوڑ جاتی ہے ۔ اور جب کلام سنانے کی باری آتی ہے ۔ تو اس کے چہرے پر حیا آلود سُرخی کی جگہ جلال و جمال کی ایک ایسی ملی جُلی کیفیت نمایاں ملتی ہے جو شاعر کے جذبۂ خلوص کے باوصف اس کے کلام کی تاثیر میں دوچند اضافہ کر دیتی ہے اور اس کی آواز میں رچے بسے اعتماد اور گمبھیرتا کو اُبھار کر فن کے روایتی سہمے جذبوں اور ہکلاتے احساسات کو ایک آفاقی آہنگ اور انقلابی گھن گرج میں تبدیل کر دیتی ہے ۔ کشادہ پیشانی ، سوچوں میں ڈوبی ہوئی سی آنکھوں اور خوبصورت دل والے اس فنکار کو دوستوں کی محفل میں دیکھیں تو اپنی شیریں گفتاری اور شگفتہ مزاجی سے محفل پر حاوی ملے گا ، اور تخلیے یا تخلیق کے لمحوں میں گمبھیرتا اور متانت و فراست کا ایک دیوتا ۔ ایک جہانِ استغراق ۔ جس میں ڈوب کر جب وہ اُبھرتا ہے تو علم و عرفاں کے ایسے ایسے جواہر ریزے ساتھ لاتا ہے ، جن کی آب و تاب برسوں تک ماند نہیں پڑا کرتی اور جو بجائے خود فنکار کی شہرتِ عام اور بقائے دوام کا موجب بنا کرتے ہیں ۔

خالد سے میری ملاقات گذشتہ برس ہی ہوئی تھی ۔ اس سے مل کر مجھے قطعی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے میں برسوں سے اُسے جانتا ہوں ۔ اس کے دل کی دردبھری دھڑکنوں سے میرا دل ہم آہنگ رہا ہو ۔ جیسے اس کے

ذہن اور میرے ذہن نے ایک ساتھ انسانیت کے تابناک مستقبل کے سندر سپنے دیکھے ہوں۔

"مری لٹریری سرکل" اس ذہنی و روحانی قرب کو عملی صورت دینے کے لیے اس کے ساتھ ایک خصوصی تقریب منعقد کرنے کا خواہاں تھا۔ کچھ عرصہ تک یہ پروگرام ملتوی ہوتا رہا اور آخر اس فرض نما قرض کو چکا کر میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ مری کی ایک بزرگ ادبی شخصیت حافظ عبدالرشید کو اس تقریب میں شرکت کی جب دعوت دی گئی تو ان کی آنکھوں میں مچلتی عقیدت ان کی زبان پر لہرا اٹھی۔

"میں اس محفل میں سر کے بل آؤں۔ کیا بتاؤں، دل میں عبدالعزیز خالد کو دیکھنے کی کتنی حسرت ہے۔"

اس تقریب میں کلام شاعر بزبان شاعر سن کر ان صاحب کی کیفیتِ دل جو ہوئی سو ہوئی۔ لیکن تقریب کے اختتام پر ہجومِ شوق میں بے اختیار شاعر سے لپٹ گئے۔ وفورِ جذبات میں ان کا گلا رُندھ گیا اور سسک سسک کر رونے لگے اور اسی جذبہ و شوق کے عالم میں بمشکل بتا سکے کہ خالد کو دیکھنے کی آرزو ایک مدت سے تھی جو اب پوری ہوئی ہے۔

اسی شام میں رات گئے گھر پہنچا تو کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں دروازے پر دستک ہوئی۔ بیوی نے سوچا کہ میاں کے وہی لاابالی دوست ہوں گے۔ جو رات کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ بے وقت اس کے گھر یلو قسم کے شوہر کو اڑا لے جاتے ہیں۔ (ان دوستوں میں ایک تو اپنی بلانوشی کی وجہ سے گھر میں اور باہر خاصے بدنام تھے۔) چنانچہ اس نیک بخت نے اپنی چھٹی حس کو کام میں لاتے ہوئے میری موجودگی کے بارے میں بتائے بغیر کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔

صبح شیدائی لائبریری آیا تو کہنے لگا۔ "یار آپ کمال آدمی ہیں۔ رات میں اور خالد صاحب آپ کے گھر آئے تھے۔ شکریہ ادا کرنے ــــ لیکن ہمیں دیکھ کر جس انداز سے دروازہ بند کر لیا گیا، اس سے ہماری سخت توہین ہوئی ہے۔ اور خالد صاحب کی نظروں میں تو آپ کی شخصیت کا سارا تاثر زائل ہو کر رہ گیا ہے۔"

پھر وہ قدرے توقف کے بعد مصالحانہ انداز میں بولا۔ "پھر بھی غمزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں، وہ ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں ہی بیٹھے ہیں، چلو چل کر ان سے رات کے واقعہ کے لیے معذرت کر لو۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

میں یہ بات سن کر اپنی جگہ پر سخت نادم تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس زیادتی کے لیے (جو محض غلط فہمی کی بنا پر سرزد ہوئی) کس انداز میں معذرت کی جائے۔ لائبریری کے دالان میں کھڑا میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خالد خود مسکراتا ہوا وہاں آ گیا۔ اور مجھ سے گذشتہ تقریب اور مضامین کے بارے میں کھلے دل سے باتیں کرنے لگا۔

جاتے ہوئے اس نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور تقریب کے انعقاد کے لیے "سرکل" کے اراکین کا کچھ اس محبت بھرے جذبے سے شکریہ ادا کیا کہ اس کے چہرے پر مجھے گذشتہ رات کی بدمزگی کا نقش یا اس کا کوئی شائبہ تک نظر نہ آیا۔ میرے گھر کے کواڑ بند ہونے پر بھی اس کے دل کے پٹ کھلے تھے۔

اور اس کا دل تشکر و امتنان کا ایک بے پایاں سمندر لگتا تھا ــــ ــــ عظیم، خاموش اور پُرسکون سمندر!!

طاہر شادانی

عبدالعزیز خالد

عبدالعزیز خالد ہمارے روشن ضمیر اسلاف کے علمی تبحر اور علمی تجسس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ خالد نے زوالِ علم و عرفان کے اس دَورِ زبوں کار میں انہماکِ مطالعہ اور علمی تفحص کا وہ بلند اور پاکیزہ معیار پیش کیا ہے جو ہمارے قدیم مشاہیر علماء اور اکابر فلسفہ کے لئے طرۂ امتیاز اور تمغۂ افتخار رہا ہے۔ خالد کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے اس سوزِ دماغ کو سوزِ جگر کا مقام عطا کیا ہے۔ اس دَورِ کم سواد میں خالد بلاشبہ ان اعاظم رجال کی ایک زندہ یادگار ہے جو علم و حکمت کے بطلِ جلیل اور " الحکمۃ ضالۃ المومن" کا صحیح مصداق تھے۔ مولانا حالی نے اشعارِ ذیل میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی ملفوظات کی ترجمانی کی ہے۔ دیکھئے ان اشعار کا خوبصورت جامہ خالد کے قامتِ زیبا پر کتنا بھلا لگتا ہے :-

ہر اک میکدے سے بھرا جاکے ساغر
ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہوکر
گئے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر
گرہ میں لیا باندھ قولِ پیمبرؐ
کہ حکمت کو اک گمشدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

یہ بجا کہ جوہرِ قابل خدا کی دین ہے لیکن ہر جوہرِ قابل کو اجاگر کرنے اور نکھارنے کے لئے بے پناہ ریاضت اور مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے اور خالد نے اپنے خداداد شعری جوہر کی تربیت کے لئے مختلف علوم کی پہنائیوں اور گہرائیوں کے خونِ گرم کو اس انداز سے جزوِ بدن بنایا ہے کہ اب وہ "کتاب خواں" کی منزل سے گذر کر "صاحبِ کتاب" کے مقامِ بلند پر فائز نظر آتا ہے۔ گویا اس کی شخصیت علمی و فنی تجربات کی کٹھالی میں سے گزر کر کندن بن چکی ہے اور پھر یہ بھی ایک بامقصد اور عظیم مطالعے کا فیضان ہے کہ زندگی

کی وہ اعلیٰ و ارفع روحانی اور اخلاقی قدریں جن سے ایک مردِ مومن کے ہمہ پہلو کردار کی تشکیل ہوتی ہے ان کی تابانیاں ہمیں بڑی حد تک خالد کی محبوب شخصیت میں ملتی ہیں۔ علامہ اقبال کا ارشاد ہے :۔

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

اگر خالد کی شخصیت کو محولہ بالا صفات کا پیکرِ جمیل کہا جائے تو اس حسین پیکر کے باطنی خد و خال کا بھرپور عکس ہمیں اس کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا خالد ایک وسیع المطالعہ شاعر ہے۔ اسی بنا پر اس کا فکر و فن بھی لامحدود وسعتوں پر محیط ہے۔ جوں جوں اُس کے دریائے معانی کا پاٹ پھیلتا جاتا ہے توں توں اس کے ساحلِ بیان کی آغوش بھی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ خالد نے ظرفِ تنگنائے شعر کو اس قدر کشادہ اور وسیع الفضا بنا دیا ہے کہ عام شاعروں کی طرح اُس کے اسلوبِ بیان کو تنگ دامانی کا کوئی گلہ نہیں۔ اُس نے مختلف عالمی زبانوں کے استعارات و تلمیحات کنایات و تشبیہات، نیز قرآنی آیات اور احادیث و اقوال کو بڑی فنکارانہ مہارت اور حاکمانہ قدرت کے ساتھ اپنے اشعار میں جذب کیا ہے۔ مزید براں اس کا ایک بہت بڑا کمال یہ ہے کہ اُس نے برِّصغیر پاکستان کی علاقائی زبانوں کی تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کو بھی اپنے اشعار میں جگہ دی ہے اور یوں اردو کے شعری پیکر کو ہلکا سا مقامی رنگ دے کر اُس کے آب و رنگ میں ایک نئی جاذبیت اور دل پذیری کی ایک نئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اسی فنی عمل سے اردو اور علاقائی زبانوں میں یگانگت اور بھائی چارے کا احساس پیدا ہوا ہے اور زبان کی سطح پر یگانگت کا یہ احساس پاکستان میں لسانی اور صوبائی عصبیت کو کم کرنے اور اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے ایک ارفع اور وقیع مقام بخشنے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

بعض نقاد خالد پر مشکل گوئی کا الزام دھرتے ہیں اور یہ الزام ایک حد تک ہے بھی صحیح، مگر با ایں ہمہ بعض فطری وجوہ کی بنا پر یہ مشکل گوئی خالد کے لئے ایک ناگزیر مجبوری کا حکم رکھتی ہے۔ بھلا ایک ایسا فنکار جس نے مختلف عالمی زبانوں کے ادبی جواہر پاروں کو حرزِ جاں بنا کر ان کے فکری اور فنی محاسن کو روح کی گہرائیوں میں اتار لیا ہو اس کا فکر سطحی اور اس کا لہجہ عوامی کیونکر ہو سکتا ہے اور پھر حقیقت بھی اپنی جگہ پر بڑی اہم ہے کہ پُرشکوہ، عظیم اور عمیق افکار کے اظہار و ابلاغ کے لئے پیرایۂ بیان بھی تو بلند آہنگ اور مہتم بالشان ہی ہونا چاہیئے۔ یہ بجا کہ خالد کے لہجے کا اشکال ایک عام قاری کے ذوق پر گراں گزرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے چمنستانِ شعر سے گلچینیٔ جمال کے لئے مختلف زبانوں کے علمی و ادبی سرمائے پر گہری نظر ہونی چاہیئے۔ ہمارا وہ قاری جو خالد کی مشکل گوئی کا شکوہ سنج ہے، اگر اپنی علمی سطح کو بلند کر کے تھوڑے سے علمی پس منظر کے ساتھ اس کی شاعری کا مطالعہ کرے تو اسے اُس کے دقیق اور پیچیدہ اشعار کی تہوں میں مضامین و معانی کے ایسے ایسے لآلیٔ آبدار ملیں گے جن کی آب و تاب سے علمی و ادبی اور روحانی اہتزاز نصیب ہو گا۔ یہ مسلّم کہ خالد کے بحرِ خیالات کا پانی بڑا گہرا ہے لیکن یقین مانیئے کہ اس کے مختلف اللون افکار میں ہر سطح کے قاری کے لئے تسکینِ ذوق کا سامان موجود ہے۔ اس اعتبار سے خالد ایک جامع حیثیات شاعر ہے اور اس کی منفرد جامعیت کا یہ پہلو دورِ جدید

کے کسی دوسرے شاعر میں تلاش کرنا بے سُود ہے۔ یہ حقیقت بہرحال تسلیم کرنا ہوگی کہ خالد کے اشہبِ قلم نے تقریباً ہر شعری موضوع پر جولانیاں دکھائی ہیں وہ بلاشبہ عرصۂ شعر کا یکہ تاز اور اقلیمِ سخن کا فرمانروا ہے اور اُس نے کلاسیکی شعری روایت کو ایک پرشکوہ آہنگ اور ایک منفرد اور جدید لہجہ عطا کرکے ایک نئی اٹھان بخشی ہے۔

موضوعات کی رنگارنگی اور بوقلمونی کے اعتبار سے خالد کی شاعری ایک ایسا خوانِ نعمت ہے جس سے ہر صاحبِ ذوق بقدرِ ظرف اور بقدرِ لب و دنداں لذت یاب ہوتا ہے۔ اس کی شاعری میں محبت کی سرخوشی بھی ہے اور دردِ مہجوری کی تڑپ بھی، عشق کا گداز بھی ہے اور جذبات کا تلذذ بھی، مظاہرِ فطرت کی عکاسی اور حسن کی مرقع نگاری کے ساتھ ساتھ زندگی کے رومانی پہلوؤں کی نیرنگیاں بھی دامنِ دل کھینچتی ہیں۔ عرفانِ جمال بھی ہے اور علمی بصیرت اور حکمت و ادراک کی کرشمہ کاریاں بھی، اسی پر بس نہیں، خالد کا قلم انسانی وحدت اور احترامِ انسانیت کی آفاقی قدروں کا نقیب بھی ہے اور ملی احساسات اور اسلام کی تہذیبی روایت کا مصور بھی۔ اُس کے ہاں اہلِ فکر و نظر کے لئے عرفِ مشاہدات کی جلوہ سامانیاں بھی ہیں اور عجمی تخیلات کی تابانیاں بھی اور سب سے بڑھ کر خدائے اکبر کے کیفِ الوہیت میں ڈوبے ہوئے نغمے بھی ہیں اور عالمِ انسانیت کے محسنِ اعظم سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زندۂ جاوید تقدس اور مکارمِ اخلاق کے قصیدے بھی، جو شاعر نے عام نعت گو شاعروں کی روش سے ہٹ کر، محبت کی ایک مخصوص سرمدی لے اور عشق کی ایک والہانہ الہامی کیفیت میں ڈوب کر گائے ہیں۔

یہ ہے خالد کی شاعری کا ایک سرسری، مختصر اور محدود سا جائزہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ خالد کی شاعری ایک بحرِ ذخار ہے۔ اس بحر کی غواصی کے لئے ایک ایسے ہنرمند غواص کی ضرورت ہے جو سمندر کی گہرائیوں میں ڈبکی لگا کر موتی نکالنے کا فن جانتا ہو، ادھر اپنا علمی حدود اربعہ ابھی تک اُس طفلِ ناداں سے زیادہ نہیں جو سمندر کی بے کراں وسعتوں اور اس کے خزینوں سے بے خبر ساحلِ سمندر پر بیٹھا سیپیوں سے کھیل رہا ہو۔

عبدالعزیز خالد

○

بہارِ آزینا! ترے فیض نے
کہ ہے گلشن آرائے کون و مکاں
عطا کرکے معمورۂ آرزو
دلِ مختصر کو کیا بیکراں!

○

مرے اس سبوئے سفالینہ کو
تہی کرکے بھرتا ہے تو بار بار[1]
نئی زندگی کی مئے سُرخ سے
ہے پت جھڑ کے پردے میں گویا بہار

---

[1] پیمانہ چو شُد سے دگر پُر گردد

عمر خیام

ڈاکٹر نکہت فاطمہ

عبدالعزیز خالدؔ

میں نے اپنی دوست زاہدہ صدیقی کی زبانی کئی مرتبہ عبدالعزیز خالد صاحب کی شخصیت اور فن کے بارے میں سُنا تھا اور گاہے بگاہے مختلف روزناموں اور ادبی پرچوں میں انکی شخصیت اور فن کے بارے میں مضامین پڑھنے کا موقع ملا۔ اس سے میرے دل میں انکی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ میں نے انکی ۲۲ کتابوں میں سے صرف دو کتابیں " فارقلیط " اور " اقبال اور عطیہ " زاہدہ صدیقی سے لیکر پڑھیں میں نے ان کا بھرپور مطالعہ کیا اور بیحد متاثر ہوئی۔ تب میرے اشتیاق نے میرے جی میں خالد صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کی اشتہا پیدا کر دی کہ ۲۲ کتابوں والا شاعر بحیثیت انسان کے عام زندگی میں کیسا ہوگا۔ ایک تو ۲۲ کتابوں کا مصنف، دوسرے ایک بہت بڑا افسر، گویا سونے پر سہاگہ ـــ ایک روز میں زاہدہ صدیقی کے ہمراہ خالد صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے چلی گئی۔ میں یوں بھی کچھ زیادہ ہی کم گو ہوں مگر ان سے ملاقات کے دوران تو عام طور پر کوئی بات نہ کر پائی جسکی وجہ شاید یہ ہو کہ میں لاشعوری طور پر ان کی باتیں سُننا اور ان سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتی تھی جس میں میں کامیاب رہی۔

ان کی باتیں اتنی بامقصد مگر دلچسپ تھیں کہ سنتے ہوئے ایک خاص لطف محسوس ہوا۔ تین چار گھنٹے کی طویل نشست میں ہماری حیثیت صرف سامع کی تھی بولتے صرف وہی رہے مگر ان کا کوئی لفظ نہ تو بے مقصد تھا اور نہ ہی دوسرے فریق کی دلچسپی کے پہلو کو خارج کئے ہوئے تھا چنانچہ کسی قسم کی بوریت کا احساس نہ ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ انکی زبان میں معمولی سی لکنت سی ہے مگر طبیعت سے کہ یہ لکنت کسی عارضہ کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے اندر علمیت کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ اظہار کے وقت زبان ساتھ نہیں دیتی۔ ان سے ملاقات کرکے اندازہ ہوا کہ وہ انتہائی ملنسار اور خوش مزاج طبیعت کے مالک ہیں کوئی بھی شخص انکی صحبت میں بوریت کے احساس کا شکار نہیں ہو سکتا بلکہ وہاں

تو اسے وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔ معاشرتی مسائل سے انہیں گہری دلچسپی ہے۔ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے امین اور انہیں عام دیکھنے کے تمنائی ہیں انسانی ہمدردی انکی رگ رگ میں رچی بسی ہوئی ہے اور وہ معاشرے میں موجود ناہمواریوں اور الجھنوں سے دکھی محسوس ہوتے ہیں۔ معاشرے میں عام بے چینی اور امیروں کی غریبوں پہ اجارہ داری پہ وہ بہت کڑھتے ہیں اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کے اندر انسانی ہمدردی کا ایک سمندر موجزن ہے اور وہ اس جذبے کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ خالد ایک عالی ظرف اور ہمہ گیر شخصیت ہیں انہوں نے ہر ملنے والے شخص کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اسکی صلاحیتوں کو بیدار کر کے اسے تحریک بخشی ہے اگرچہ وہ خود کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں مگر کسی بھی زبان میں پیوند کاری کے سخت خلاف ہیں۔ مشکل الفاظ جو ان کی عام تحریروں میں ملتے ہیں بولنے میں ان کا شائبہ تک بھی نہیں ہوتا۔ ان کے پاس علم اور فن کا اتھاہ سمندر ہے مگر ان کا انداز گفتگو ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا کسی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتا وہ بھی کسی پر چھانے اور اپنی علمیت کے تلے اسے دبانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں سے کام لیکر آگے بڑھنے کی تحریک بخشتے ہیں۔ وہ گفتگو کے دوران ہر شخص کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اپنی ذات کے بارے میں گفتگو سے زیادہ دوسروں کے بارے میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں جس کی وجہ سے سامع احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی بجائے اپنی صلاحیتوں کا سراغ لگانے اور ان سے کام لینے کی طرف مائل ہوتا ہے چہ جائیکہ وہ ان کی علمیت کے دبدبے سے مرعوب ہو۔ وہ دوسروں کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں اور انہیں اپنے مخصوص میدان میں مزید کام کرنے اور نام پیدا کرنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ خالد صاحب علم کے جویا ہیں شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جو انہوں نے نہ پڑھی ہو بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور نہ کیا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بیک وقت کئی زبانوں کی لغت بھی ہیں۔ ان کے کلام میں اگر عربی، عبرانی یا کوئی دوسری زبان کا استعمال آتا ہے تو یہ دانستہ نہیں بلکہ ان زبانوں پر عبور ہی اس قدر ہے کہ ان کے الفاظ خود بخود ان کے کلام میں آجاتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد ایک ذمہ دار، بااصول اور نہایت ہی فرض شناس انسان ہیں۔ اگر دورانِ گفتگو بھی کوئی سرکاری کام آجائے تو پہلے اسے نپٹائیں گے اور اس پر نہایت اطمینان اور پوری توجہ سے غور کریں گے۔ حیرت آتی ہے کہ اتنے مصروف اور اعلیٰ افسر ہوتے ہوئے وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اور زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب پتہ چلتا ہے کہ اتنا بڑا افسر اور اس سے بہت ہی بڑا شاعر، عالم، زباندان اور فلسفی ہوتے ہوئے ان کے اندر تکبر کا شائبہ تک نہیں بلکہ ایک باوقار عجز و انکسار جھلکتا ہے جو صرف سچے اور بڑے عالم اور سچے اور عظیم انسان کی شان ہونی چاہیے۔

عبدالعزیز خالد

○

یہ دنیا نمود کی ہے یہاں
خلوص و وفا کا نام کہاں
جو صاحبِ قراں ہو فتح کرے
طلسمِ خیال سود و زیاں
اسے تو عذابِ جاں نہ سمجھ
ملے طالعوں سے سوزِ نہاں
غمِ دل کو بے نقاب نہ کر
نہیں دردمند اہلِ جہاں
بدلتے ہیں رنگ روز نئے
تلوّن ہے خوئے گلبدناں
صداقت کو لاغ و لابہ سے کد
نفاق و دروغ رطب لساں
اکیلی وکیلی سیر کرے
عروسِ بدی جوانِ جہاں
ہوس کے فریب بوقلموں
برنگِ فسونِ لالہ رخاں
دلیلوں سے اضطراب بڑھا
یقیں ہے تمام وہم و گماں
جسے دیکھیے اسیرِ خودی
زباں پہ مذمتِ دگراں

ملا دائمی شباب اسے
خوشا حسنِ عالمِ گزراں
نہ پیک و پیام سے ہو سکوں
کرے دل مسلسل آہ و فغاں

وہی ہے مجھے بہشت بریں
کرے تو خرامِ نازِ جہاں
جو نالہ کریں تو لوگ کہیں
کہ مرغِ سحر ہے زمزمہ خواں
یہ خلخال دے رہا ہے صدا
ہے پا در رکاب حسنِ بتاں
یہ سب کارخانہ غیب کا ہے
وگرنہ سرود نئے میں کہاں؟
ہمہ خستگی، گدا خستگی
شہیدانِ حسن شعر و بیاں
چلے گرد باد، ریت اڑے
لگے آگ تو اٹھے گا دھواں
نہیں بے سبب یہ سوز و تپش
یہ ہے رازِ آفرینشِ جاں
نظام، انتشار میں سے اٹھے
ہیولوں سے ابھرے تازہ جہاں

مطالعۂ فکر و فن

ڈاکٹر وزیر آغا

دھوپ چھاؤں کا شاعر

کچھ عرصہ ہوا میراجی کے بارے میں لکھتے ہوئے میں نے بعض ایسے شعراء کا ذکر کیا تھا جو ریلوے ٹرمینس کی طرح ہوتے ہیں یعنی جہاں سے آگے کوئی لائن نہیں جاتی۔ ساتھ ہی میں نے بعض ایسے شعراءؑ کا ذکر کیا تھا جو ریلوے جنکشن کی طرح ہوتے ہیں اور جہاں گاڑیاں آتی ہیں اور رخصت ہوتی رہتی ہیں۔ ریلوے ٹرمینس شہرت کے شاعروں سے میں مرعوب تو ہوتا ہوں لیکن متاثر نہیں ہوتا البتہ ریلوے جنکشن ایسے شعراء کے ہاں مجھے امکانات کا ایک جہان ہوتا رہا نظر آتا ہے جو میرے سفر کو ختم ہی نہیں ہونے دیتا۔ عبدالعزیز خالد مجھے اسی وضع کے شاعر دکھائی دیتے ہیں

اگو یار لوگوں نے انھیں ریلوے ٹرمینس بنا دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ بیتے جی ان پر دو ضخیم نمبر شائع کیے۔ پہلے نمبر نے گویا اس بات کا اعلان کیا کہ عبدالعزیز خالد کی شاعری اب آخری سٹیشن پر پہنچ گئی ہے اور تھکے ہارے مسافروں سے التماس کی کہ وہ خالد صاحب کی معیت میں کیے گئے سفر کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کریں تاکہ آنے والی نسلیں ان سے استفادہ کر سکیں دوسرے نمبر نے پہلے نمبر کی توثیق کی اور تاثرات کے علاوہ مسافروں کے منظوم جذبات بھی سمیٹ لیے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ شاعر کو اب قومی تحویل میں لے لیا گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اب اگر کوئی تیسرا خالد نمبر افقِ لاہور پر نمودار ہوا تو وہ قومی تحویل میں لیے اس شاعر پر "ممنوعہ علاقہ" کی تختی آویزاں کر دے گا اور پھر خالد

صاحب تاریخ کا ایک ورق بن کر رہ جائیں گے۔

> کسی بھی تخلیق کار کے لیے یہ کوئی اچھی صورتِ حال نہیں بلکہ ایک اعتبار سے یہ نقصان دہ بھی ہے۔ وہ یوں کہ تخلیق کار خلقِ خدا کی تعریف و توصیف کے بوجھ تلے اس قدر دب جاتا ہے کہ پھر کھلی فضا میں آ ہی نہیں سکتا۔ نہ صرف مواد بلکہ اسلوب کے اعتبار سے بھی وہ منجمد ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ اپنے اس رنگ سے انحراف کرے جس کی پسندیدگی کی سند اسے قارئینِ کرام سے مل چکی ہے۔ مگر فن بالخصوص شاعری تو بہتے پانی کی طرح ہے جب تک شاعر نئے سے نئے مواد کو خلق نہ کرے اور اسے اپنے اسلوب کی تازہ کاری سے ایک لطیف پیکر نہ عطا کرتا رہے اس کی وہ حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی جو ایک زندہ تخلیق کار کے لیے ضروری ہے۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ خالد صاحب دو ضخیم نمبروں کے باوجود اپنی انفرادیت سے دست کش نہیں ہوئے اور ان کے ہاں فن کا ارتقا جاری ہے اور ان کا اسلوب نئے سے نئے پیکروں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جب کوئی شاعر نرگسیت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور روز و شب اپنے ہی نام کی تسبیح کرنے لگتا ہے تو اس بات کو طے سمجھیے کہ اس کا تخلیقی سفر ختم ہو چکا اور اس کے ساتھ ہی اس کے قارئین بھی آ کر رک گئے مگر خالد صاحب کے ہاں منزل کی لگن اور سفر کا شوق اتنا زیادہ ہے اور ان کے ہاں تخلیقی اسٹیم کی اتنی فراوانی ہے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ ان بریکوں سے رک نہیں سکیں گے جو مولانا نعیم صدیقی اور ان کے بعد پروفیسر حفیظ صدیقی صاحب نے خالد نمبروں کی صورت میں ان پر آزمائی ہیں۔

خالد صاحب کی شاعری کا سرسری سا مطالعہ کرنے سے بھی یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ وہ ایک رُکے شاعر نہیں نیز یہ کہ ان کی

شاعری میں امکانات کا دامن بہت وسیع ہے اگرچہ ان کے ہاں ابھی اختصار کا دامن وسیع نہیں ہو سکا جو بڑے شاعر کے لیے ضروری ہے۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

اس شعر سے اگر لفظ "کائنات" حذف کر دیا جائے اور اسکی جگہ "کلامِ خالد" کے الفاظ رکھ دیے جائیں تو ہر چند اس عمل سے اقبال کا یہ خوبصورت شعر شاعری کی سطح سے "نثری شاعری" کی سطح پر اتر آئے گا۔ تاہم خالد کی شاعری کے عام مزاج کو ضرور اجاگر کر دے گا کیونکہ خالد کے ہاں ہر دم، ہر لحہ، معانی کی سرحدوں کو توڑنے اور شاعری کے افق کو پھیلانے کا عمل جاری ہے۔ گویا ان کی شاعری دیواروں کے اندر مقید ہونے کے باوجود دیواروں کو توڑنے کا منظر بھی دکھاتی ہے۔ یہ صورت حال کچھ اس وضع کی ہے کہ شاعر کے مقام کے بارے میں کوئی حتمی بات کہہ دینا قبل از وقت ہوگا۔ اسی لیے میں نے ابھی تک خالد صاحب کی شاعری کے بارے میں کوئی اٹل رائے قائم نہیں بلکہ اس دھوپ چھاؤں کے عمل سے محظوظ ہو رہا ہوں جو ان کی شاعری میں پوری توانائی کے ساتھ جاری ہے۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ خالد کی شاعری تو کسی ایسی ہستی کی طرح ہے جس نے بھاری منقش لباس زیب تن کر رکھا ہو۔ مگر جس کا بدن گاہے گاہے اس لباس کے کسی نہ کسی چاک میں سے لَو دے اٹھے اور کوئی نازک ہاتھ غیر شعوری طور پر اسے دوبارہ بھاری منقش لبادے سے ڈھانپ دے۔ خالد کے ہاں یہ منقش لباس عربی فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ تراکیب، تلمیحات اور حوالوں سے بُنا گیا ہے اور اسے دیکھ کر قاری نہ صرف مرعوب ہوتا ہے بلکہ کئی بار تو زمین بوس بھی ہو جاتا ہے۔ یہ شعری جاہ و حشمت شاعر کو کہیں برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے اور خالد صاحب نے اسے حاصل کرنے میں خون پسینہ ایک کیا ہے مگر دلچسپ

بات یہ ہے کہ خالد نے اس بھاری لباس سے زیادہ تر خود کو چھپانے کا کام لیا ہے عریاں کرنے کا نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالد نے خود کو چھپانے کی اتنی بڑی کوشش کیوں کی؟ شخصیت کے وہ کون سے خفیہ تہہ خانے ہیں جنھیں وہ زمانے کی نظروں سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں؟ مگر یہ کام تو ڈاکٹر اجمل ایسا ماہر نفسیات ہی کر سکتا ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ چھپانے کی اس کوشش کے باوجود خالد صاحب کی شاعری کے اصل چہرے نے متعدد موقعوں پر اپنی جھلک دکھائی ہے اور اس جھلک نے ان کی شاعری کو معانی کی عام سطح سے اوپر اٹھایا ہے۔

عبدالعزیز خالد ان شعراء میں سے نہیں ہیں جو شاعری کو زندگی کے کسی حادثے سے پیدا ہونے والے جذباتی تشنج کو رفع کرنے کا ذریعہ تصور کرتے ہیں اور جب ان کا مزاج اعتدال پر آ جاتا ہے تو شاعری کو نذرِ نسیاں کر کے زندگی کی دوسری نسبتاً زیادہ دلچسپ باتوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ خالد کی شاعری کسی خاص واقعہ کا ردِ عمل نظر نہیں آتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شاعری تو روح کی ازلی و ابدی پیاس کو سیراب کرنے کی ایک کوشش اور کائنات کے رازہائے سربستہ کو ٹٹولنے کا ایک زاویہ ہے۔ چنانچہ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نہ تو تعریف و توصیف سے لبریز تبصرات کا راستہ روک سکتے ہیں اور نہ ناقدانِ کرام کی بہیمانہ سرگرمی ہی انھیں دل برداشتہ کر سکتی ہے۔

شاعری عبدالعزیز خالد کے لیے ایک حیاتیاتی ضرورت ہے۔ بعینہٖ جیسے غذا جسم کے لیے ایک ضرورت ہے اور جس طرح غذا کے بغیر انسانی جسم زندہ نہیں رہ سکتا بالکل اسی طرح تخلیقی طور پر فعال ہوئے بغیر ایک سچا شاعر تادیر سانس نہیں لے سکتا اور میں عبدالعزیز خالد کو ایک سچا شاعر سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

خالد کی ایک جھلک

ایک دفعہ کا ذکر ہے، تماشائیوں کے ایک بہت بڑے مجمعے میں ایک شعبدہ باز اپنے فن کے جوہر دکھا رہا تھا۔ اچانک اس نے پکار کر کہا "کسی کے پاس ایک سیب ہے؟" تماشائیوں میں سے ایک شخص اٹھا اور اسکی خدمت میں ایک سیب پیش کر دیا۔ شعبدہ باز نے سیب کو بڑے بانکپن سے ہاتھ میں اچھالتے ہوئے کہا "کوئی ہے جو سیب کو مٹھی میں دبا کر رس نچوڑ دے؟" مجمع خاموش رہا کیونکہ سیب اتنا سخت تھا کہ اسے مٹھی میں دبا کر رس نکالنا ممکن نہیں تھا۔ اس پر شعبدہ باز نے میز پر ایک پیالی رکھی، سیب کو مٹھی میں لیا اپنی آہنی گرفت تیز کی اور تماشائی کیا دیکھتے ہیں کہ سیب سے رس نکلنے لگا۔ تاآنکہ آخری قطرہ تک نکل گیا۔ سارا مجمع تالیاں بجانے لگا کہ ایک تماشائی نے اٹھ کر کہا "باقی کا رس بھی نکالو"۔ شعبدہ باز بولا، "عجیب بولتی ہو، رس تو سارا نکل گیا باقی کہاں سے نکالوں"۔ اس پر وہی تماشائی بڑے طمطراق سے آگے بڑھا، سیب کا بظاہر خشک گودا اپنی مٹھی میں لیا۔ اللہ کا نام لیکر اسے دبایا اور سارا مجمع یہ دیکھ کر دم بخود ہو کر رہ گیا کہ رس اتنا نکلا، اتنا نکلا کہ پیالی بھر گئی۔ اس پر سناٹا ٹوٹا اور تماشائیوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ جب ذرا خاموشی ہوئی تو شکست خوردہ شعبدہ باز نے اس تماشائی سے پوچھا "میاں! کیا کام کرتے ہو؟" بولا "میں انکم ٹیکس افسر ہوں"۔

جب میں عبدالعزیز خالد کی حسین و جمیل کتابوں کے اوراق الٹتا ہوں تو میرے ذہن کے پردوں پر ایک ایسی انوکھی البیلی دنیا کی تصویر کھنچ جاتی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی تخلیقات میں ایک ایسا رس گھلا ہوا ہے جسکی لذت پکار پکار کر کہتی ہے کہ میری کشید کا سزاوار صرف اور صرف خالد ہے۔ وہ ایک شاعر ہے لیکن ایک مختلف قسم کا شاعر جس نے بے پناہ ریاض کیا ہے۔ تحقیق کے سمندر میں غواصی کی ہے۔ فارسی، عربی، یونانی اور لاطینی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ عربی شاعری، یونانی اور مختلف زبانوں کی قدیم داستانوں سے روشنی حاصل کی ہے۔ ان کے رومانی کرداروں کے حسین اور بدنما پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ پرانی تہذیبوں کے خدوخال سے آگہی میں بڑی محنت سے کام لیا ہے اور جو کچھ حاصل کیا ہے، اسے اپنے طبع زاد تخیل میں سمو کر ایک ایسی نئی شاعری کو جنم دیا ہے جو شاعری بھی ہے اور فلسفہ بھی۔ اس میں وہ تمام رنگینیاں قطار اندر قطار موجود ہیں جن سے شاعری کی دنیا آباد ہے اور ان کے پہلو بہ پہلو وہ تمام فلسفیانہ تصورات بھی موجود ہیں جو فکرِ انسانی کا

موضوع بنے ہیں۔

خالد نے کچھ ادبی شہپاروں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ترجمے کا فن بہت ریاض چاہتا ہے کیونکہ مختلف زبانوں میں اندازِ بیان روایات اور تشبیہات واستعارات مختلف ہوتے ہیں۔ ایک زبان کے کسی ادب پارے کے تمام عناصر کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام بے حد کٹھن ہوتا ہے اور جب نظم کا ترجمہ نظم میں کرنا ہو تو مترجم مشکلات کے ایک بے پناہ ہجوم میں گھر جاتا ہے کیونکہ نظم کی روایات میں یہ فرق بہت واضح ہوتا ہے۔ اچھے ترجمے کی پہچان یہ ہے کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہو اور خالد کے تراجم کو پڑھ کر بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ اس کا اپنا طبع زاد کلام ہے۔ ملاحظہ فرمایئے: عشقِ زندہ اور شعلۂ تابندہ سیفو کا ایک ادب پارہ:

چاند کا زرد مرمریں چہرہ
قلزمِ نیلگوں میں ڈوب گیا
شعلۂ پروین کا بجھ کے راکھ ہوا
رات بھیگی، گریز پا لمحے
منزلِ نور کو روانہ ہوئے
سیج سونی ہے خوابگہ تنہا
اے شبِ تار اے دلِ رسوا

اور ٹیگور کی کتاب "گیتان جلی" سے ایک گیت کا ٹکڑا سنیے گا:

بارہا میں نے سوچا مگر
دل ہے بودا نہ اسکو ہوا حوصلہ
تیری گردن میں جو پھول مالا ہے وہ مانگ لوں
گم اسی دھیان میں
میں رہی صبح کی منتظر
جب تو ہوگا وداع
چند مسلی ہوئی پتیاں تیرے بستر سے مل جائیں گی
اک بھکارن کی مانند کی میں نے وقتِ سحر جستجو
برگِ آوارہ اک دو ملے

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

خالد کی ایک جھلک

ایک دفعہ کا ذکر ہے، تماشائیوں کے ایک بہت بڑے مجمع میں ایک شعبدہ باز اپنے فن کے جوہر دکھا رہا تھا۔ اچانک اس نے پکار کر کہا "کسی کے پاس ایک سیب ہے؟" تماشائیوں میں سے ایک شخص اٹھا اور اس کی خدمت میں ایک سیب پیش کر دیا۔ شعبدہ باز نے سیب کو بڑے بانکپن سے ہاتھ میں اچھالتے ہوئے کہا "کوئی ہے جو سیب کو مٹھی میں دبا کر رس نچوڑ دے؟" مجمع خاموش رہا کیونکہ سیب اتنا سخت تھا کہ اسے مٹھی میں دبا کر رس نکالنا ممکن نہیں تھا۔ اس پر شعبدہ باز نے میز پر ایک پیالی رکھی، سیب کو مٹھی میں لیا اپنی آہنی گرفت تیز کی اور تماشائی کیا دیکھتے ہیں کہ سیب سے رس نکلنے لگا۔ تاآنکہ آخری قطرہ تک نکل گیا۔ سارا مجمع تالیاں بجانے لگا کہ ایک تماشائی نے اٹھ کر کہا "باقی کا رس بھی نکالو"۔ شعبدہ باز بولا، "عجیب احمق ہو، رس تو سارا نکل گیا باقی کہاں سے نکالوں"۔ اس پر وہی تماشائی بڑے طمطراق سے آگے بڑھا۔ سیب کا نچڑا خشک گودا اپنی مٹھی میں لیا۔ اللہ کا نام لیکر اسے دبایا اور سارا مجمع یہ دیکھ کر دم بخود ہو کر رہ گیا کہ رس اتنا نکلا، اتنا نکلا کہ پیالی بھر گئی۔ اس پر سناٹا ٹوٹا اور تماشائیوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ جب ذرا خاموشی ہوئی تو شکست خوردہ شعبدہ باز نے اس تماشائی سے پوچھا "میاں! کیا کام کرتے ہو؟" بولا "میں انکم ٹیکس افسر ہوں"۔

جب میں عبدالعزیز خالد کی حسین و جمیل کتابوں کے اوراق الٹتا ہوں تو میرے ذہن کے پردوں پر ایک ایسی انوکھی البیلی دنیا کی تصویر کھنچ جاتی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی تخلیقات میں ایک ایسا رس گھلا ہوا ہے جس کی لذت پکار پکار کر کہتی ہے کہ میری کشید کا سزاوار صرف اور صرف خالد ہے۔ وہ ایک شاعر ہے لیکن ایک مختلف قسم کا شاعر جس نے بے پناہ ریاض کیا ہے۔ تحقیق کے سمندر میں غواصی کی ہے۔ فارسی، عربی، یونانی اور لاطینی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ عربی شاعری، یونانی اور مختلف زبانوں کی قدیم داستانوں سے روشنی حاصل کی ہے۔ ان کے رومانی کرداروں کے حسین اور بدنما پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ پرانی تہذیبوں کے خدوخال سے آگہی میں بڑی محنت سے کام لیا ہے اور جو کچھ حاصل کیا ہے، اسے اپنے طبع زاد تخیل میں سمو کر ایک ایسی نئی شاعری کو جنم دیا ہے جو شاعری بھی ہے اور فلسفہ بھی۔ اس میں وہ تمام رنگینیاں قطار اندر قطار موجود ہیں جن سے شاعری کی دنیا آباد ہے اور ان کے پہلو بہ پہلو وہ تمام فلسفیانہ تصورات بھی موجود ہیں جو فکرِ انسانی کا

موضوع بنے ہیں۔

خالد نے کچھ ادبی شہپاروں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ترجمے کا فن بہت ریاض چاہتا ہے کیونکہ مختلف زبانوں میں اندازِ بیان، روایات اور تشبیہات و استعارات مختلف ہوتے ہیں۔ ایک زبان کے کسی ادب پارے کے تمام عناصر کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام بے حد کٹھن ہوتا ہے اور جب نظم کا ترجمہ نظم میں کرنا ہو تو مترجم مشکلات کے ایک بے پناہ ہجوم میں گھر جاتا ہے کیونکہ نظم کی روایات میں یہ فرق بہت واضح ہوتا ہے۔ اچھے ترجمے کی پہچان یہ ہے کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہو اور خالد کے تراجم کو پڑھ کر بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ اس کا اپنا طبع زاد کلام ہے۔ ملاحظہ فرمایئے: عشقِ زندہ اور شعلۂ تابندہ سیفو کا ایک ادب پارہ:

چاند کا زرد مرمریں چہرہ
قلزمِ نیلگوں میں ڈوب گیا
شعلۂ پرویں کا بجھ کے راکھ ہوا
رات بھیگی، گریز پا لمحے
منزلِ نور کو روانہ ہوئے
سیج سُونی ہے خوابگہ تنہا
اے شبِ تار، اے دلِ رسوا

اور ٹیگور کی کتاب "گیتان جلی" سے ایک گیت کا ٹکڑا سنئے گا:

بارہا میں نے سوچا مگر
دل ہے بودا نہ اسکو ہوا حوصلہ
تیری گردن میں جو پھول مالا ہے "وہ مانگ لوں"
گم اسی دھیان میں
میں رہی صبح کی منتظر
جب تو ہوگا وداع
چند مسلی ہوئی پتیاں تیرے بستر سے مل جائیں گی
اک بھکارن کی مانند کی میں نے وقتِ سحر جستجو
برگِ آوارہ اک دو ملے

دل کا غنچہ کھلے، کس طرح چاکِ دامن سلے
کیا یہی ہے نشاں تیرے چت جا ؤ سکا
جو ملا ہے مجھے دل رُبا

خالد کی شاعری میں بے پناہ روانی موجود ہے۔ یہ روانی اس وقت خاص طور پر کام آتی ہے جب وہ نظم کی روایتی ہیئت سے کنارہ کش ہو کر نثری اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں "زنجیرِ رمِ آہو" میں "راہ و رسمِ منزل ہا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو:۔

مرے سامنے رہگذر اپنے دامن میں جلوے سمیٹے
جنونِ تماشا کو آمادۂ امتحاں کر رہی ہے
خیابان و صحرا کے گہواروں، فطرت کی بے قید پہنائیوں میں
یہ محسوس ہوتا ہے گویا حصارِ ہوس سے نکل کر
میں محبوب کی گرم و آسودہ آغوش میں آگیا ہوں
جہاں مجھ کو آفاتِ دنیائے دوں سے اماں مل گئی ہے
جہاں ذہنِ فکرِ پریشاں سے، دل اضطرابِ خفی سے
نظر کلفتِ چشمِ حیراں سے، سر بارِ آشفتگی سے
سبکدست ہو کر تر و تازہ و نوجواں ہو گئے ہیں
مرے سامنے رہگذر اپنے دامن میں جلوے سمیٹے
مرے ذوقِ صحرا نوردی کو جنبش پہ اکسا رہی ہے
اُمنگیں شرائین میں گردشِ خوں کو تیز تر کر رہی ہیں
پس و پیشِ گلکاریٔ رنگ و لو دیکھتا سینۂ رہگذر پر
ہوس سے منزہ خراماں چلا جا رہا ہوں
میسّر ہے مجھ کو تموّل، فراغِ نظر کا نشیب جگر ہے
نشیبِ زمیں کے سفالیں نظاروں کی رعنائیوں میں
سپہرِ زبرجد کے اجرامِ نوریں کی حسرت نہیں ہے
وہ اپنی جگہ ہی بھلے ہیں میں اس بات کو جانتا ہوں
مجھے اپنے فردوس میں لی بناتِ فلک کے بسانے کی حاجت نہیں ہے

۵۱/۲/۱ ہ

اور یہ سلسلہ کئی صفحات تک اسی تسلسل اور روانی کے ساتھ چلا جاتا ہے جو اس بات کا شاہد ہے کہ خالد کو زبان اور فنِ شعر پر غیر محدود عبور حاصل ہے۔

"ورقِ ناخواندہ"، "دکانِ شیشہ گر" اور "برگِ خزاں" میں منظوم تمثیلیں پیش کی گئی ہیں۔ اکثر میں یونانی ضمیات اور کلاسیکی ادب کے شہپاروں کو ڈرامائی روپ میں ڈھالا ہے۔ ان میں بھی روانی اور دلچسپی اور تخیل کے عناصر موجود ہیں۔ لیکن بسا اوقات ہمیں خالد پر بہت مشکل پسند کا دھوکہ ہوتا ہے کیونکہ بعض تلمیحات سے ہم جیسے نیم خواندہ لوگ ناآشنا ہیں لیکن اس میں خالد کا کوئی قصور نہیں۔ قصور ہمارا ہے جو مطالعہ کی اس منزل پر نہیں پہنچے جسے خالد نے مسلسل ریاض سے حاصل کر لیا ہے۔

"سلکِ موج" غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اس میں تو بہ نو رنگ قاری کا دامن تھام لیتے ہیں۔ کہیں اندازِ بیان خالص کلاسیکی ہے کہیں بالکل جدید اسلوب میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ کہیں ریختی کی جھلک نظر آتی ہے کہیں فاتش اسلوب بیان عربی کے مشہور شعراء کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ عورت اسے بے حد محبوب ہے اور کسے محبوب نہیں۔ اس لئے وہ جب عورت کا ذکر کرتا ہے تو اس کا سب کچھ بیان کر دیتا ہے مگر رکھ رکھاؤ اور حیا کے ساتھ۔ اس میں وہ عیب نہیں جو ہم نے اپنی شاعری میں ورثے کے طور پر پائے ہیں۔ میں اس کے کلام کے ایسے نمونے پیش کر دیتا لیکن متامل ہوں کہ یہ چیزیں محفلوں میں پڑھنے کی نہیں گوشۂ تنہائی میں مطالعہ کرنے کی ہیں۔ بہر حال "سلکِ موج" میں سے ایک ہلکی پھلکی چیز کے چند شعر سنا دیتا ہوں:

اے حسینو، گلعذارو، مہوشو
ہم دعاگو ہیں تمہارے خوش رہو
عیش پرور ہوں بہاریں عمر کی
نور پھیلاؤ بڑھو پھولو پھلو
مشک نافہ بن کے مہکو دہر میں
خرم و خنداں تر و تازہ رہو
سیج پھولوں کی بدن کی راز دار
بوستاں ہو بوستاں بانی کرو
طرۂ لعف ہائے کاستہ آراستہ
جامۂ چسپیدہ خوش پیوست ہو
پھڑ پھڑانے دو لباسِ پرنیاں
مل مل کے ملکاؤں کے تمکیں سے چلو
شاعرانِ سوختہ دل سے مگر

دل کا غنچہ کھلے، کس طرح چاکِ دامن سِلے
کیا یہی ہے نشاں تیرے جیت جا سکا
جو ملا ہے مجھے دل رُبا

خالد کی شاعری میں بے پناہ روانی موجود ہے۔ یہ روانی اس وقت خاص طور پر کام آتی ہے جب وہ نظم کی روایتی ہیئت سے کنارہ کش ہو کر بیتی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں "زنجیرِ رمِ آہو" میں "راہ و رسمِ منزل ہا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو:۔

مرے سامنے رہگذر اپنے دامن میں جلوے سمیٹے
جنونِ تماشا کو آمادۂ امتحاں کر رہی ہے
خیابان و صحرا کے گہواروں، فطرت کی بے قید پہنائیوں میں
یہ محسوس ہوتا ہے گویا حصارِ ہوس سے نکل کر
میں محبوب کی گرم و آسودہ آغوش میں آگیا ہوں
جہاں مجھ کو آفاتِ دنیائے دوں سے اماں مل گئی ہے
جہاں ذہنِ فکرِ پریشاں سے، دل اضطرابِ خفی سے
نظر کلفتِ چشمِ حیراں سے، سر بارِ آشفتگی سے
سبکدست ہو کر تر و تازہ و نوجواں ہو گئے ہیں
مرے سامنے رہگذر اپنے دامن میں جلوے سمیٹے
مرے ذوقِ صحرا نوردی کو جنبش پہ اکسا رہی ہے
اُمنگیں شرائین میں گردشِ خون کو تیز تر کر رہی ہیں
پس و پیشِ گلکاریِ رنگ دلجو دیکھتا سینۂ رہگذر پہ
ہوس سے منزہ خراماں خراماں چلا جا رہا ہوں
میسّر ہے مجھ کو تموّل، فراغِ نظر کا شکیبِ جگر کا
نشیبِ زمیں کے سفالیں نظاروں کی رعنائیوں میں
سپہرِ زبرجد کے اجرامِ نوریں کی حسرت نہیں ہے
وہ اپنی جگہ ہی بھلے ہیں میں اس بات کو جانتا ہوں
مجھے اپنے فردوس میں ان بناتِ فلک کے بسانے کی حاجت نہیں ہے

۹۱/۲/۱/ م

اور یہ سلسلہ کئی صفحات تک اسی تسلسل اور روانی کے ساتھ چلا جاتا ہے جو اس بات کا شاہد ہے کہ خالد کو زبان اور فنِ شعر پر غیر محدود عبور حاصل ہے۔

"ورقِ ناخواندہ"، "دکانِ شیشہ گر" اور "برگِ خزاں" میں منظوم تمثیلیں پیش کی گئی ہیں۔ اکثر میں یونانی ضمیات اور کلاسیکی ادب کے تبہاروں کو ڈرامائی روپ میں ڈھالا ہے۔ ان میں بھی روانی اور دلچسپی اور تخیل کے عناصر موجود ہیں۔ لیکن بسا اوقات ہمیں خالد پر دبت مشکل پسند کا دھوکہ ہوتا ہے کیونکہ بعض تلمیحات سے ہم جیسے نیم خواندہ لوگ نا آشنا ہیں لیکن اس میں خالد کا کوئی قصور نہیں۔ قصور ہمارا ہے جو مطالعہ کی اس منزل پر نہیں پہنچے جسے خالد نے مسلسل ریاض سے حاصل کر لیا ہے۔

"کلکِ موج" غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اس میں تو بہ نو رنگ قاری کا دامن تھام لیتے ہیں۔ کہیں اندازِ بیان خالص کلاسیکی ہے کہیں بالکل جدید اسلوب میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ کہیں ریختی کی جھلک نظر آتی ہے کہیں فاحش اسلوب بیان عربی کے مشہور شعراء کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ عورت اسے بے حد محبوب ہے اور کسے محبوب نہیں۔ اس لئے وہ جب عورت کا ذکر کرتا ہے تو اس کا سب کچھ بیان کر دیتا ہے مگر رکھ رکھاؤ اور حیا کے ساتھ۔ اس میں وہ عیب نہیں جو ہم نے اپنی شاعری میں ورثے کے طور پر پائے ہیں۔ میں اس کے کلام کے ایسے نمونے پیش کر دیتا لیکن متامل ہوں کہ یہ چیزیں محفلوں میں پڑھنے کی نہیں گوشۂ تنہائی میں مطالعہ کرنے کی ہیں۔ بہرحال "کلکِ موج" میں سے ایک ہلکی پھلکی چیز کے چند شعر سنا دیتا ہوں :-

اے حسینو گل عذارو ، مہوشو
ہم دعاگو ہیں تمہارے خوش رہو
عیش پرور ہوں بہاریں عمر کی
نور پھیلاؤ بڑھو پھولو پھلو
مشکِ نافہ ہن کے مہکو دہر میں
خرّم و خنداں تر و تازہ رہو
سیج پھولوں کی بدن کی راز دار
بوستاں ہو بوستاں بانی کرو
زلف ہائے کاستہ آراستہ
جامۂ چسپیدہ خوش پیوست ہو
پھڑ پھڑانے دو لباسِ پرنیاں
محل ملاؤں کے تکیں سے چلو
شاعرانِ سوختہ دل سے گھر

جب ملو تم خود سپردانہ ملو

خالدؔ کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی کے کئی الفاظ اُردو زبان میں داخل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس نے نئی نویلی اور اچھوتی ترکیبوں کا ایک انبار لگا دیا ہے جسے دیکھ کر کچھ لوگ بدکتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب ترکیبیں یا لفظ چالو ہو جائیں گے، یہ ممکن ہی نہیں لیکن ان میں سے کچھ ضرور اُردو ادب میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیں گے۔ رہا ان کا اجنبی پن تو نئی ترکیب اور نیا لفظ ہمیشہ پہلے پہل اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس کے نئے پن کو بھول جاتے ہیں۔ "دلچسپ" اور "گراوٹ" اور اس قسم کے دوسرے لفظ نصف صدی پہلے موجود نہیں تھے، آج یہ ہماری زبان کا جزو ہیں۔

عبدالعزیز خالدؔ کو اسلامیات کا جذبہ بھی وافر ملا ہے۔ وہ جب حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں کچھ لکھتا ہے تو عقیدت کے ایسے پھول پیش کرتا ہے جن کی مثال ماضی کی شاعری میں نہیں ملتی۔ "فارقلیط" میں اس نے جو کچھ لکھا، اس کی دوہری اہمیت ہے۔ اوّل:- رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے بعض پہلو گہری تحقیق کے بعد دریافت کئے۔ دوم:- انہیں اپنے مخصوص اسلوبِ بیان کے سانچے میں بے مثال خوبصورتی سے ڈھالا۔

تری وسیع و عریض آسماں کے سائے تلے
بہار بندِ طلسمِ سکوت و تنہائی
دھڑکتے دل سے ترے روبرو کھڑا ہوں گا
تری اس آگ بھری پُر بہار دنیا میں
ازل سے جس میں ہے آشوبِ آزمائش کا
جہاں کھوٹے سے کھرا گنج و کو میں ملتا ہے
ہزار کشمکشِ دار و گیر ہو لیکن
میں عاجزانہ ترے روبرو کھڑا ہوں گا

اے ناداں! خود اپنے پر سواری کے جتن کرنا
اسے بھکو[1]! صدا دینے کو اپنے ہی دوار آنا
یہ بار اس کے حوالے کر جسے تابِ تحمّل ہے
پلٹ کر پھر کبھی پیچھے نہ دیکھ افسوس و حسرت سے
کہ رم کرتی ہے تمکین انفعال و پند و عبرت سے
تری خواہش بجھا دیتی ہے فوراً شمعِ مومی کو
پیامِ مرگ ہے موجِ نفس اس کی تجلّی کو
یہ ہے ناپاک اپنے تحفے اس کے ہاتھ مت لے
مقدس عشق کا تحفہ ہی بس لینے کے قابل ہے

---

[1] آئے میرے سجنا پھر گئے انگنا
میں ابھاگن رہی سوئے رہی — میرا بائی

کبیر انور جعفری

عبدالعزیز خالد کا ایک شعر

بدن سے روح نکلتی ہے اس طرح جیسے
پرندہ شاخِ شجر سے اچانک اڑ جائے

ہم

یہ شعر صرف پڑھنے پڑھانے سے تعلق نہیں رکھتا زندگی اور موت کے جو ہر بھی اسمیں مضمر ہیں یہ بھی ایک قسم کی زندگی ہے، زندگی کی نقیض ہے موت اور موت زندگی کی۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوجے کی ضد ہیں، اور دونوں چیزیں یعنی موت اور زندگی پر بحث کی جاتے تو دفتر کی ضرورت ہے۔ میں یہاں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زندگی کا معیار اور ہے، موت کا معیار اور۔

پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہئیے کہ زندگی کس چیز کا نام ہے جس وقت یہ سمجھ لیں گے تو پھر معنی پر نظر پڑے گی جب اس بات کو بھی طے کر لیں گے تو پھر ضرورت محسوس ہوگی کہ انسان کی زندگی کیا ہے۔

یہاں دو پہلو نکلتے ہیں ایک غم کا اور دوسرا خوشی کا، غم کو بھی زندگی کہا جاسکتا ہے اور خوشی کو بھی بقول خود ؎

ذرا پاس چھوڑ دے نغمۂ عیش بھی سنا
وہ بھی کوئی ہے زندگی جس میں کبھی خوشی نہیں
غم سے نہ ہو فسردہ دل پھر بھی بہار آئے گی
جو خزاں سے بچ سکے ایسی کوئی کلی نہیں

جب ملو تم خود سپردانہ ملو

خالد کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی کے کئی الفاظ اُردو زبان میں داخل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس نے نئی نویلی اور اچھوتی ترکیبوں کا ایک انبار لگا دیا ہے جسے دیکھ کر کچھ لوگ بدکتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب ترکیبیں یا لفظ چالو ہو جائیں گے، یہ ممکن ہی نہیں لیکن ان میں سے کچھ ضرور اُردو ادب میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیں گے۔ رہا ان کا اجنبی پن تو نئی ترکیب اور نیا لفظ ہمیشہ پہلے پہل اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس کے نئے پن کو بھول جاتے ہیں۔ "دلچسپ" اور "گراوٹ" اور اس قسم کے دوسرے لفظ نصف صدی پہلے موجود نہیں تھے، آج یہ ہماری زبان کا جزو ہیں۔

عبدالعزیز خالد کو اسلامیات کا جذبہ بھی وافر ملا ہے۔ وہ جب حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں کچھ لکھتا ہے تو عقیدت کے ایسے پھول پیش کرتا ہے جن کی مثال ماضی کی شاعری میں نہیں ملتی۔ "فارقلیط" میں اس نے جو کچھ لکھا، اس کی دوہری اہمیت ہے۔ اوّل:۔ رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے بعض پہلو گہری تحقیق کے بعد دریافت کئے۔ دوم:۔ انہیں اپنے مخصوص اسلوبِ بیان کے سانچے میں بے مثال خوبصورتی سے ڈھالا۔

ترے وسیع و عریض آسماں کے سائے تلے
بہار بندِ طلسمِ سکوت و تنہائی
دھڑکتے دل سے ترے روبرو کھڑا ہوں گا
تری اس آگ بھری پُر بہار دنیا میں
ازل سے جس میں ہے آشوب آزمائش کا
جہاں کھوے سے کھوا گنج و کُو میں چلتا ہے
ہزار کشمکشِ دار و گیر ہو لیکن
میں عاجزانہ ترے روبرو کھڑا ہوں گا

اے ناداں! خود اپنے پر سواری کے جتن کرنا
اے بھکو[1]! صدا دینے کو اپنے ہی دوار آنا
یہ بار اس کے حوالے کر جسے تابِ تحمل ہے
پلٹ کر پھر کبھی پیچھے نہ دیکھ افسوس حسرت سے
کہ رم کرتی ہے تمکیں انفعال و بندِ عبرت سے
تری خواہش بجھا دیتی ہے فوراً شمع موسیٰ کو
پیامِ مرگ ہے موجِ نفس اس کی تجلی کو
یہ ہے ناپاک اپنے تحفے اس کے ہاتھ میں تھما لے
مقدس عشق کا تحفہ ہی بس لینے کے قابل ہے

---

[1] آئے میرے جھنا، پھر گئے انگنا
میں ابھاگن دی سوئے دی — میراں بائی

کبیر انور جعفری

عبدالعزیز خالد کا ایک شعر

بدن سے روح نکلتی ہے اس طرح جیسے
پرندہ شاخِ شجر سے اچانک اڑ جائے

یہ شعر صرف پڑھنے پڑھانے سے تعلق نہیں رکھتا زندگی اور موت کے جوہر بھی اسمیں مضمر ہیں یہ بھی ایک قسم کی زندگی ہے، زندگی کی نقیض ہے موت اور موت زندگی کی۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوجے کی ضد ہیں، اور دونوں چیزیں یعنی موت اور زندگی پر بحث کی جائے تو دفتر کی ضرورت ہے۔ میں یہاں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زندگی کا معیار اور ہے، موت کا معیار اور۔ پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہئیے کہ زندگی کس چیز کا نام ہے جس وقت یہ سمجھ لیں گے تو پھر معنی پر نظر پڑے گی جب اس بات کو بھی طے کر لیں گے تو پھر ضرورت محسوس ہوگی کہ انسان کی زندگی کیا ہے۔

یہاں دو پہلو نکلتے ہیں ایک غم کا اور دوسرا خوشی کا، غم کو بھی زندگی کہا جاسکتا ہے اور خوشی کو بھی بقول خود ؎

زخمِ یاس چھوڑ دے نغمۂ عیش بھی سنا
وہ بھی کوئی ہے زندگی جس میں کبھی خوشی نہیں
غم سے نہ ہو فسردہ دل پھر بھی بہار آئے گی
جورِ خزاں سے جو بچے ایسی کوئی کلی نہیں

اسلام نے جو زندگی کا نظام پیش کیا ہے وہ صحیح اور درست ہے یعنی مرجاؤ، مرنے سے پہلے اگر زندگی حاصل کرنا ہے تو وہ بھی راہِ حق پر، یعنی باطل کے آگے مت جھکو۔

اگر تاریخ کربلا کے اوراق اُلٹ کر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ ضد کے مقابل میں جب تک ضد نہ آئے مقصدِ زندگی حاصل نہیں ہوتا گویا یہ بھی ایک زندگی ہے موت نہیں ورنہ وہی ہوگا جیسے ؎

تنہا پیشِ قاضی روی راضی آئی

زندگی کا مفہوم آسان بھی ہے اور مشکل بھی

ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ہم زندہ ہیں جاندار ہیں۔ یہ بات حیوان میں بھی پائی جاتی ہے۔ جس کا معیار یہ ہے کہ جب تک روح نے جسم کو نہیں چھوڑا زندگی ہے اور جب روح سوئے آسماں پرواز کرگئی تو موت۔ یعنی روح کا تعلق ہے جسم سے اور جسم کا روح سے، جب تک روح قائم ہے زندگی ہے اور جب روح نکل گئی تو مردہ۔ روح جب جدا ہوتی ہے تو نظر نہیں آتی اور جدا ہو جاتی ہے۔ جیسے پرندہ شاخِ شجر سے اُڑ جائے اور پھر نظر نہیں آتی۔

سورج طلوع ہوتا ہے، یہ کیا ہے، زندگی ہے مگر تفریح کُن ہے اور جب دوپہر ہوتی ہے گرمی زوروں پر ہو جاتی ہے تو یہ بھی زندگی ہے مگر کیسی؟ دل ہلا دینے والی، جس سے ہر کسی کا دماغ کھول اٹھتا ہے۔ یہ کیا ہے، زندگی کا ایک رخ ہے پھر دوپہر ہوئی سورج نے ڈھلنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ڈوب جاتا ہے اور دنیا دیکھ رہی ہوتی ہے کہ سورج سیاہ لباس پہن رہا ہے شام بھی چھا رہی ہے بس بالکل غائب۔ یہ کیا ہے، موت ہے، کس کی موت، سورج کی

یہ ہیں منزلِ زندگی کے سحر و شام

پرندہ جس وقت شاخِ شجر سے اچانک اڑ جاتا ہے اس وقت کیا ہوتا ہے۔ فضا میں ہلچل سی مچ جاتی ہے گویا ہر شے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور ذرہ ذرہ پریشان ہو جاتا ہے گویا یہ موت ہے اور جب تک نہیں اُڑتا تو عناصر قائم رہتے ہیں — یہ ہے زندگی ؎

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترکیب
موت کیا ہے، انہی اجزا کا پریشاں ہونا

بدن سے جب روح نکلتی ہے تو رگ رگ نس نس انگ انگ ٹوٹتا ہے سر سے پاؤں تک اک اندھیرا مچ جاتا ہے

آنکھیں پھٹ جاتی ہیں۔ فرشتہ اجل لقمۂ تر بنانے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ بدن کے پھڑکنے پھڑکنے سے کھڑک اٹھتی ہے یہ بار جس کے سر پہ ہوتا ہے نا موت کا۔ اُسے ہی پتہ ہوتا ہے، دیکھنے والا کیا جانے۔ یہی حال ہوتا ہے اس ہری شاخ کا جس پر پنچھی بیٹھا ہوا ہو اور وہ یکدم پھڑک کر اُڑ جائے پھر بعد میں پریشان کر جاتے اسی منظر کو تو مبکے عزیز خالد صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا ہے کہ ؎

بدن سے روح نکلتی ہے اس طرح جیسے
پرندہ شاخِ شجر سے اچانک اُڑ جائے

عبدالعزیز خالد

○

وہی اندازِ جہان گزراں ہے کہ جو تھا
ان نگاہوں سے وہی راز عیاں ہے کہ جو تھا
وہی رندوں کی سیہ نوشیِ دردِ تہِ جام
وہی نظارہ سرِ کوئے مغاں ہے کہ جو تھا
ہائے اس کیفِ نخستیں کی خمار انگیزی
تری آنکھوں میں وہی خواب جواں ہے کہ جو تھا
وہی ترغیبِ تمنا کی بھرنے آرائی
اور پہلو میں وہی قلبِ تپاں ہے کہ جو تھا
لذتِ شوق کا انفاس میں لمس باقی ہے
مرے سینے میں وہی سوزِ نہاں ہے کہ جو تھا
انقلابات ابھی گردشِ ایام میں ہیں
ترے جلووں میں وہی سحر رواں ہے کہ جو تھا
ذوقِ وارفتہ کی اصنام گری مٹ نہ سکی
حائلِ راہ وہی سنگِ گراں ہے کہ جو تھا
وہی آشفتہ نگاہی، وہی صحرا طلبی
وہی اک معرکۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

○

تقاضائے دل و جاں کا کہیں درماں نہیں ملتا
دیارِ درد میں تسکین کا ساماں نہیں ملتا
خرامندہ ہیں میخانے اگرچہ تیری آنکھوں میں
یہاں سے بھی مداوائے غمِ پنہاں نہیں ملتا
تری چشمِ تماشا مست میں غلطاں ہیں افسانے
مگر تمہیدِ الفت کا کوئی عنواں نہیں ملتا
کسی شے کی کمی ہے تیرے جلووں کی نوازش میں
کہ اب وہ والہانہ پن، وہ ذوقِ جاں نہیں ملتا
ترے انداز کی غارت گری بھی کیا قیامت ہے
کہ نقدِ زندگی و گوہرِ ایماں نہیں ملتا
کمالِ عفتِ قلب و نظر مقصود ہے خالد
یہ رتبہ مل تو جاتا ہے مگر آساں نہیں ملتا

اسلام نے جو زندگی کا نظام پیش کیا ہے وہ صحیح اور درست ہے یعنی مرجاؤ، مرنے سے پہلے اگر زندگی حاصل کرنا ہے تو وہ بھی راہِ حق پر، یعنی باطل کے آگے مت جھکو۔

اگر تاریخ کربلا کے اوراق الٹ کر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ ضد کے مقابل میں جب تک ضد نہ آئے مقصدِ زندگی حاصل نہیں ہوتا گویا یہ بھی ایک زندگی ہے موت نہیں ورنہ وہی ہوگا جیسے ؎

"تنہا پیش قاضی روی راضی آئی"

زندگی کا مفہوم آسان بھی ہے اور مشکل بھی

ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ہم زندہ ہیں جاندار ہیں۔ یہ بات حیوان میں بھی پائی جاتی ہے۔ جس کا معیار یہ ہے کہ جب تک روح نے جسم کو نہیں چھوڑا زندگی ہے اور جب روح سوئے آسمان پرواز کر گئی تو موت۔ یعنی روح کا تعلق ہے جسم سے اور جسم کا روح سے، جب تک روح قائم ہے زندگی ہے اور جب روح نکل گئی تو مردہ۔ روح جب جدا ہوتی ہے تو نظر نہیں آتی اور جدا ہو جاتی ہے۔ جیسے پرندہ شاخِ شجر سے اُڑ جائے اور پھر نظر نہیں آتی۔

سورج طلوع ہوتا ہے، یہ کیا ہے، زندگی جیسے مگر تفریح کُن ہے اور جب دوپہر ہوتی ہے گرمی زوروں پر ہو جاتی ہے تو یہ بھی زندگی ہے مگر کیسی دل ہلا دینے والی جس سے ہر کسی کا دماغ کھول اٹھتا ہے۔ یہ کیا ہے، زندگی کا ایک رُخ ہے پھر دوپہر ہوئی سورج نے ڈھلنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ڈوب جاتا ہے اور دنیا دیکھ رہی ہوتی ہے کہ سورج سیاہ لباس پہن رہا ہے شام بھی چھا رہی ہے بس بالکل غائب۔ یہ کیا ہے، موت ہے، کس کی موت، سورج کی

یہ ہیں منزلِ زندگی کے سحر و شام

پرندہ جس وقت شاخِ شجر سے اچانک اڑ جاتا ہے اس وقت کیا ہوتا ہے۔ فضا میں ہلچل سی مچ جاتی ہے گویا ہر شے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور ذرہ ذرہ پریشان ہو جاتا ہے گویا یہ موت ہے اور جب تک نہیں اُڑتا تو عناصر قائم رہتے ہیں — یہ ہے زندگی ؎

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترکیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

بدن سے جب روح نکلتی ہے تو رگ رگ نس نس انگ انگ ٹوٹتا ہے سر سے پاؤں تک اک اندھیرا چھا جاتا ہے

آنکھیں پھٹ جاتی ہیں۔ فرشتہ ماحل لعنت در تر بنانے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ بدن کے پھڑنے پھڑنے سے کڑک اٹھتی ہے یہ بار جس کے سر پہ ہوتا ہے ندامت کا۔ اُسے ہی پتہ ہوتا ہے، دیکھنے والا کیا جانے۔ یہی حال ہوتا ہے اس ہرنی شاخ کا جس پہ پنچھی بیٹھا ہوا ہو اور وہ یکدم پھڑک کر اُڑ جائے پھر بعد میں پریشان کر جاتے اسی منظر کو تو مبصر عزیز خالد صاحب نے مسکراتے ہوتے فرمایا ہے کہ ؎

بدن سے روح نکلتی ہے اس طرح جیسے
پرندہ شاخِ شجر سے اچانک اُڑ جائے

عبدالعزیز خالد

○

وہی اندازِ جہان گزراں ہے کہ جو تھا
ان نگاہوں سے وہی رازِ عیاں ہے کہ جو تھا
وہی رندوں کی سبو نوشی و دردِ تہِ جام
وہی نظارہ سر کوئے مغاں ہے کہ جو تھا
ہائے اس کیف نخستیں کی خمار انگیزی
تری آنکھوں میں وہی خواب جواں ہے کہ جو تھا
وہی ترغیبِ تمنا کی چمن آرائی
اور پہلو میں وہی قلبِ تپاں ہے کہ جو تھا
لذتِ شوق کا انفاس میں کم باقی ہے
مرے سینے میں وہی سوزِ نہاں ہے کہ جو تھا
انقلابات ابھی گردشِ ایام میں ہیں
ترے جلووں میں وہی سحر رواں ہے کہ جو تھا
ذوقِ وارفتہ کی اصنام گری مٹ نہ سکی
حائلِ راہ وہی سنگِ گراں ہے کہ جو تھا
وہی آشفتہ نگاہی، وہی صحرا طلبی
وہی اک معرکۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

○

تقاضائے دل و جاں کا کہیں درماں نہیں ملتا
دیارِ درد میں تسکین کا ساماں نہیں ملتا
خرامندہ ہیں میخانے اگرچہ تیری آنکھوں میں
یہاں سے بھی مداوائے غمِ پنہاں نہیں ملتا
تری چشمِ تماشا مست میں غلطاں ہیں افسانے
مگر تمہیدِ الفت کا کوئی عنواں نہیں ملتا
کسی شے کی کمی ہے تیرے جلووں کی نوازش میں
کہ اب وہ والہانہ پن، وہ ذوقِ جاں نہیں ملتا
ترے انداز کی غارت گری بھی کیا قیامت ہے
کہ نقدِ زندگی و گوہرِ ایماں نہیں ملتا
کمالِ عفتِ قلب و نظر مقصود ہے خالد
یہ رتبہ مل تو جاتا ہے مگر آساں نہیں ملتا

وفا راشدی

خالد کی شاعری میں تلمیحات

علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کی نرمی و ملی نظموں میں تلمیحات، تشبیہات و استعارات کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں لیکن جہاں تک علامہ عبدالعزیز خالد کی شاعری میں تلمیحات کا تعلق ہے بقول ماہر القادری مدیر فاران کراچی

"اس صنف میں وہ تمام اردو شاعری میں منفرد ہیں۔ کیسی حسین تشبیہات اور تلمیحات ہیں جو اردو شاعری کے قالب میں ڈھل کر سحر حلال بن گئی ہیں (دشتِ شام) اس میں کوئی شک نہیں کہ جس خالد نے شعری محاسن کے اس نازک پہلو و حسن کثرت و مہارت کے سانچے میں برتا ہے۔ اس میں ان کا کوئی ہمسر یا ہم پلہ نہیں۔ اس فن پر عبور و ادراک حاصل کرنے کے لئے انہوں نے انتھک مشق اور مسلسل ریاضت سے عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی، سرائیکی، ہندی، سنسکرت جانے کس کس زبان کے ادبیات اور لغات کو کھنگالا ہے۔ پھر باریکیوں، فنی نکات اور شعری رموز کو سمیٹ کر نہاں خانۂ ذہن میں محفوظ رکھا ہے"

ماہر تعلیم، ممتاز عالم و نقاد اور جلیل القدر دانشور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صدر شعبۂ اردو جامعہ سندھ کی بہ گراں قدر رائے سند آخر کا حکم رکھتی ہے۔

"موجودہ دور کے علماء و فضلاء شعراء و ادباء میں علم و فضل کے لحاظ سے بہت کم ایسے ہوں گے جن کو خالد صاحب جیسا تبحر حاصل ہو۔ وہ بکثرت زبانوں اور متعدد علوم میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا کلام عوام کی علمی سطح سے بہت بلند ہے اور یہی انکی امتیازی شان ہے"

خالد کا یہ اقدام بھی مستحسن ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تلمیحات و تشبیہات اور اردو اشعار میں عربی فارسی کے اجنبی و غیر مانوس و غیر مستعمل الفاظ کی تشریح و تفصیل ہر نظم کے حاشیے میں لکھ دی ہے۔ خالد کا یہ شعر خود ان کے اسی طرزِ خاص کی طرف اشارہ کرتا ہے

ہے تجھ کو اگر درکِ رموزِ ادب و فن
رکھ شعر میں تہ داری و تمثیل کے پہلو

(دشتِ شام ص ۱۵)

خالدؔ نے ہمہ موزِ ادب و فن میں جو غیر معمولی درک و ادراک حاصل کیا ہے اور شعر میں تہہ داری و تمثیل نگاری کا پراثر و پرزور پہلو نکالا ہے۔ اس انداز کی علمی روش سے ہمارے شعرا پہلو تہی کرتے آئے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شہود سے مشہود شاعران دشوار گزار اور کٹھن راہوں سے گزرے بغیر نمود و شہرت کے بامِ عروج پہ پہنچ سکتا ہے تو خالدؔ کی طرح بحر علوم کی شناوری اور اسی مقصد میں جنون و دماغ سوزی چہ معنی دارد؟ پھر یہ ہے کہ یہ سعادت ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ ہمارے ہاں ایک ریت یہ بھی ہے کہ جس کام کو کرنے کے ہم اہل نہیں یا جس مقام تک ہماری گزر نہیں وہاں اگر کوئی دوسرا اپنی خداداد ذہانت، ذاتی کوشش و محنت و مشقت سے نظر آ جاتا ہے تو ہم اسے برداشت کب کرتے ہیں؟

خالدؔ کو راقم نے شروع سے دیکھا ہے شروع سے پڑھا ہے۔ خالدؔ کی شاعری کے ابتدائی دور میں جب انکی نظمیں رسائل و جرائد میں چھپنے لگیں تو ان کی شاعری پر مشکل پسندی، اطلاق پسندی، رجعت پسندی، اسلام پسندی جانے کیا کیا الزامات عائد کئے جانے لگے۔ یہ ہماری قوم کی بدنصیبی ہے کہ اس نے کبھی اپنے محسنوں کے احسانات کو آنکھوں سے نہیں لگایا۔ ان کی اچھی باتوں کو دل میں جگہ نہ دی۔ اس پہ ستم یہ کہ ان کے ہر بول کو رد و کد کی تیغ کا نشانہ بنایا گیا۔ طرح طرح کے الزام تراش کر بلا وجہ کی نکتہ چینی ہمارے ہاں کی روایت بن چکی ہے۔ علم و ادب کے معاملے میں ایسی عصبیت و تنگ نظری کیخلاف جہاد ہر ذی علم و ذی عقل فرد کا فرض ہے۔ اگر لگن سچی ہو تو آتشِ نمرود بھی گلزارِ ابراہیم میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ خزاں بہار میں اور تاریکی خالدؔ کے تابع ہو سکتی ہے۔ تاریخ خواہ ادب کی ہو یا قوم کی شاہد ہے کہ سچائی کی راہ پہ چلنے والے نہ صلہ و ستائش کی تمنا رکھتے ہیں نہ کسی مخاصمت کی پرواہ کرتے ہیں۔ انہیں صرف اپنے کام کی دھن ہوتی ہے صرف کام کی۔ افکار و آثار میں کردار و عمل کی سچائی کے بغیر مستقل قدروں کا دعویٰ بیجا و بیہودہ ہے۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔ یہی نظامِ کائنات ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

خالدؔ جانتے ہیں کہ "زندگی برائے زندگی" کا نعرہ بلند کرنا اور بات ہے لیکن اس عظیم مقصد کے لیے اپنی زندگی کے کچھ حصے سے دوسروں کی زندگی کے لئے کچھ دینا، کچھ اور بات ہے۔ چکنی چپڑی باتوں، حسین استعاروں، خوبصورت لفظوں، اشتعال انگیز بیانات، شعلہ انگیز تقریروں سے قوم نہیں بنا کرتی۔ مذاہبِ عالم، اقوامِ دہر کے قدیم و جدید علوم کے وسیع مطالعے، خود اپنی قوم کی تاریخ و سیاسیات سے آگہی اور فکر و فن کو اپنے خونِ جگر کی دیا سے روشن کئے بغیر شعر و ادب کی مضبوط و معتبر عمارت کی تشکیل و تعمیر ہرگز ممکن نہیں اور اقبال کے الفاظ ہیں ؎

خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

اور خالدؔ کی زباں میں ؎

خود کو قربان کرو عظمتِ فن کی خاطر
روشنائی سے ، نہ یا اپنے لہو سے لکھو

(دشتِ شام صہ ۴۲)

خالدؔ کے مخصوص نظریۂ فن و ادب کا تعلق انکی اسلامی تعلیمات اور علوم عربیہ سے شیفتگی سے بہت گہرا ہے جس کی تائید و تصدیق علامہ عبدالعزیز میمن جیسے مستند و ممتاز استادِ عربی کے اس خیال سے بخوبی ہوتی ہے ۔

"میں یہ نہیں کہوں گا کہ عبدالعزیز خالدؔ اس دور کے ممتاز و بے مثال اسلامی شاعر ہیں بلکہ پوری اردو شاعری کی تاریخ میں جمع مجھے کوئی اسلامیات اور عربی کا اتنا ماہر اور باخبر شاعر و ادیب معلوم نہیں "

خالدؔ کا عربی سے بے پناہ شغف اب ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے ۔ انسانی و قومی زندگی میں یہ اعزاز و امتیاز قرآن و حدیث کے استفادہ سے حاصل ہوتا ہے ۔ اس سلسلے میں خالدؔ کا بیان فکر انگیز بھی ہے اور خیال افروز بھی ۔

"میری شاعری پر عربی کا اثر اس وجہ سے ہے کہ قرآن و حدیث ہمارا تہذیبی سرمایہ ہیں ۔ انہیں ہماری زبان میں ضرور شامل ہونا چاہیئے ۔ جب تک یہ نہیں کیا جائیگا ہم خلا کے گرد چکر لگاتے رہیں گے اور مستقبل کی تعمیر نہ کر سکیں گے ۔ مذہب کو صرف عبادت تک محدود کر دیا ہے اور اسے خشک موضوع سمجھ لیا ہے ۔ مغرب کے مفکروں کے مقولوں کے ہم آئے دن حوالے دیتے ہیں لیکن یہ سب حدیث میں موجود ہیں اور ہم ان سے استفادہ نہیں کرتے ۔ ہمیں قرآنی تعلیمات کو محور بنا کر اس کے گرد زندگی کا تانا بانا بننا چاہیئے ۔ اصل زندگی تو یہی ہے باقی جو ہے وہ محض اس کا عکس ہے "

عبدالعزیز خالدؔ کے طویل و مختصر شعری مجموعے فارقلیط ، منحمنا اور خروش خم کی بعض نظمیں خدائے بزرگ و برتر کی مدح و تحسین و ذکر و فکر سے بھرپور دلکش و دلگداز قصائد اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والہانہ عقیدت و محبت سے مزین روح پرور حیات آفریں نغمات کا بصیرت افروز مرقع ہوتے ہیں ۔

فارقلیط کی تمام تلمیحات کی تشریحات " الواح " کے تحت کتاب کے آخری حصے میں درج ہیں

ترے منتظر تھے یہ دشت و دمن، تو
براہیم بیدار دل کی دُعا ہے
کلیم و حبقوق و یحییٰ کا مژدہ
تو موضوعِ فکرِ سرائیلِ نوا ہے
سلیمان پڑھتا ہے تسبیح تیری
حدیوں نے پوچھا تو نغمہ سرا ہے

فارقلیط صہ ۳۳

(تشریحات علی الترتیب ۸ - ۹ - ۱۰ - ۱۱ صفحات ۲۵۶ تا ۲۵۹)

ترے ہاتھ رنگیں ہیں شوہر کے خوں سے
یقیناً تو کالا تمثم[۳۶] نسوا ہے

فارقلیط صہ ۲۲۱

ڈسے مادہ گرگِ خوں خوار تجھ سے
تو حولو میں ہمشیرہ ہیرا ہے

صہ ۲۲۲

نہ تو ارضِ سردیس کی حسن بانو
نہ وہ ملک سردیس کا بادشاہ ہے

صہ ۲۲۳

لیا تو نے یہ انتقام اس سے کس کا؟
نہ وہ تھا جز یمہ نہ تو ہی زنا ہے

صہ ۲۲۳

(تشریحات ۴۶ تا ۵۰ صفحات ۲۷۵ تا ۲۸۶)

منحمنّا خالدؔ کا نعتیہ قصیدہ ہے ۔ اس میں شاعر کا فن ارتقائی مرحلوں سے گذر کر عروج وکمال کی منزل پر نظر آتا ہے یہ طویل نظم خالدؔ کی شاعری کے مخصوص اسالیب اور خاص طرزِ تخیل کا شاہکار ہے ۔ اظہار بیان کی روانی و بیساختگی اور جذب وکشش نے خالد کو ایک ممتاز و منفرد مقام پر فائز کردیا ہے ۔ اگرچہ منحمنّا پانچ ابواب پر مشتمل ہے لیکن شروع سے آخر تک ایک ہی تسلسل اور ایک ہی تاثر کی حامل ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ تلمیحات کی شان و شوکت نے افادیت میں دو چند اضافہ کردیا ہے ۔ نعتیہ کلام کی یہ خصوصیت —— اردو شاعری میں اس سے پہلے موجود نہیں تھی ۔

احد نے بخشی ہے ما ینطق کی جس کو سند

جو نکتہ سنج ہے رمز آشنائے کیف و کم

وہ خوش بیاں کلمانی ، خطیبِ قرآنی

بہ ہر فضیلت و تکریم ہے مفضّل و مکرم

بساطِ حیرتِ امکاں ہے فرشِ پا انداز

شفق شمائل و گل طلعت و بہار نسیم

ہے وہ اُفق بہ اُفق والسماء والطارق

اسی کے جلوے کی شش حسنِ مُفتنِ عالم

منحمنّا ص ۱۲

(ص ۱۱ کی تلمیحات نیز ۱۲ کی تشریحات اسی صفحے کے حاشیہ میں ملاحظہ ہوں)

آسان اور عام فہم الفاظ کو جدت وندرت کے ساتھ تلمیحات کی صورت میں پیراہنِ شعر میں خوبصورت موتیوں کی طرح آراستہ کرنا بھی خالدؔ کا ایک دلفریب آرٹ ہے ۔ اس طرزِ نو کی مثالیں "خروشِ خم" کے اکثر صفحات پر ملتی ہیں ۔

سقوطِ مشرقی پاکستان صرف پاکستان کا ہی نہیں ، سارے عالمِ اسلام کا سب سے بڑا المیہ ہے ۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے جو سربکف مجاہدین زندانِ ہند میں اسیر ہوئے اور اللہ کے فضل وکرم سے ۱۹۷۴ء میں باعزت و سلامت اپنے وطن واپس آگئے ۔ خالدؔ نے ان مجاہدین اسلام کی یاد میں اُن کے دوران اسیری براں گروہ کے عنوان سے ایک جاں سوز نظم کہی ۔ زبان کی فراوانی ، بیان کی دلکشی اور سیدھے سادے الفاظ میں تلمیحات و استعارات کی فراوانی کے اعتبار سے اس نظم کا جواب نہیں ۔ چند اشعار یہ ہیں ؎

اے ارضِ قادسیہ! لالہ اب بھی کھلتا ہے
تری زمیں سے سراغ آسماں کا ملتا ہے
اے اندلس کی ہواؤ! یہ کونسی رت ہے!
کسی سے پوچھ کے بتلاؤ کیا یہی دن تھے
لگا سفینۂ دل رقت جب آ کے ساحل سے
کنارے پہ جب چلے آ کے بیٹھ گئے؟
وداعِ روز سے ملتے ہیں دونوں وقت گلے
جانے قافلۂ رفتگاں کب آئے گا

(خروشِ خم صہ ۸۲)

کیا ہے ملکِ سلیماں پہ دیو نے قبضہ
نظامِ سقر کے سر بند کا دیتا سا رکے
یزیدیوں کا بھرے پانی ابرِ آزادی
ہے سایۂ چشمِ مسلماں پہ خالِ ہندو کا

(خروشِ خم صہ ۸۷)

خالد کی غزلوں میں بھی ان کا اپنا مخصوص لہجہ اور نیا آہنگ ہے۔ غزل میں محبوبیت و مجاز کا امتزاج اور خدا اور محبوبِ خدا کا رشتہ اور اس رشتہ محبوبیت کا ایک ایسا نازپایا جاتا ہے جو صرف خالد کی نظموں کا حصہ ہے۔ الفاظ کی تراش خراش اور تراکیب و استعارات کی اختراع میں یہ معنوی فکر کے حامل ہیں۔ اردو مصرعوں کے ساتھ عربی مصرعوں بلکہ شعروں کی حسن کاری سے دوشیزۂ غزل کو ایک نیا حسن ایک نیا اندازِ دلبری عطا کر دیا ہے۔ اردو الفاظ کا عربی الفاظ سے اختلاط اس طنطنہ اور اس دم خم سے کرتے ہیں جس کی روح ایک ہی نظم کے دوسرے شعروں میں جلوہ گر ہو تو سے

سرگذشت صاحبِ تخلیق سخن

لَا يَنَامُ قَلْبِيْ وَ عَيْنِيْ تَنَامُ
رات ہے وقتِ نیاز و گفتگو
اُذْكُرُوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ
ہے یہ آوازِ دلِ ہر بوالہوس
رَبِّ اَنْظِرْنِيْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامِ
نہیں حد کوئی ادراک و ہنر کی
وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ

(روشنیِ شام ص ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۷، حواشی ایضاً)

" برگِ خزاں " خالد کی تین ولولہ انگیز و تفکر آمیز منظوم ڈراموں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ منظر کشی، ماحول و کردار کی رنگارنگی، واقعات و حادثات کی تلمیحات شدتِ جذبات اور تفکر و تکلم کی پُر جوش و پُر زور تخلیقات ہیں۔ قرآنی داستانوں کی روشنی میں خالد کا فنِ تمثیل نگاری عروج پر ہے۔

" ورقِ ناخواندہ " میں خالد کی پانچ تمثیلاتِ منظوم شامل ہیں۔ یہ نگارشات خالد کی ہمہ گیر معلومات، مشاہدات اور تخیل و تفکر کی آئینہ دار ہیں۔ ان تمثیلوں میں بھی خالد نے تلمیحات و تشبیہات کو جس صنعت گری سے اُردو اشعار کے دامن میں سمیٹ دیا ہے۔ وہ ان کی انفرادیت ہے۔

خالد کی اس انفرادیت کے بارے میں برصغیر کے مشہور عالم اور دانشور مولانا سعید احمد اکبر آبادی رقمطراز ہیں " خالد کی شاعری کا سارا تار پود دینِ قیم کے اعلیٰ اخلاق اور روحانی اقدار سے تیار ہوا ہے۔ تخیل میں بجائے ژولیدگی اور انتشار کے ایک تسلسل قطعیت اور مقصدیت ہے۔ ابلاغ اس کا نمایاں ترین وصف ہے۔ دہان الہام، اغلاق اور تعمیر اس بلا کا ہوتا ہے کہ سررشتہ مضمون کو پکڑنا آسان نہیں اور یہاں تلمیحات اور تشبیہات کی وہ بھرمار ہے کہ قاری جب تک علامہ نہ ہو پورے کلام کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور اس بناء پر خالد سے لوگوں کو وہی شکایت ہو سکتی ہے جو ایک زمانہ میں غالب سے سخنورانِ کامل کو ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ جس طرح غالب کی شاعری کلنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر " گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل " کا حل پیدا کر لیا تھا: خالد کی شاعری بھی وقت آنے پر ایک ایسا لہجہ اختیار کرے گی جو اسے عوام کے قریب کر دے گی "

(ماہنامہ تحریریں لاہور خالد نمبر ۱۹۷۵ء)

میں نے ۱۹۶۹ء میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ آج خالد کی شاعری پر مشکل پسندی اور عربی الفاظ و تراکیب کے استعمال سے

شعریت کو مجروح کرنے کا الزام لگایا جا رہا ہے لیکن وہ وقت جلد آئے گا جب خالدؔ کے کمالِ فن کا اعتراف کیا جائے گا۔ مقامِ مسرت ہے کہ کل تک جو لوگ عظمتِ خالدؔ کے منکر تھے آج وہ عظمتِ فنِ خالدؔ کے معترف و مداح ہیں۔ عصرِ حاضر کے ایک منفرد اور عظیم المرتبت شاعر کی خدمت میں جس اخلاص مندی اور عقیدت و ارادت سے خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اس کی مثال اس انا پرستی، خود ستائی و خود سری کے زمانے میں بمشکل ملے گی۔ نمونتہً چند سطریں نذرِ قارئین ہیں۔

جوش ملیح آبادی

ان کی ذات میں شاخِ گل کی لچک اور ان کے چہرے پر نجمِ سحر کی دمک پائی جاتی ہے۔

فیض احمد فیض

عبدالعزیز خالدؔ اور ان کا کلام محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کے متعدد ضخیم مجموعے ان کی پختگیٔ فکر اور قدرتِ کلام پر شاہد ہیں۔

شان الحق حقی

ان کا کلام الفاظ کی فراوانی، ترکیبوں کی جدت اور الفاظ کے اچھوتے پن کی بنا پر قابلِ قدر ہے۔ بعض "کنوارے" الفاظ کو انہی نے شعریت سے شرف کیا ہے اور دوسری زبانوں کے [illegible] بھی کتاب کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ وہ اپنے انداز اور اپنے کمال میں ایک ہیں۔

انور سدید

عبدالعزیز خالدؔ کے ہاں شاعری محض فرضِ کفایہ نہیں بلکہ انہوں نے اس کی کلاسیکی روایات کو تازہ رکھنے اور انہیں نیا فکری عروج عطا کرنے کے لئے عمر کا بہترین حصہ قربان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف فن کے نقوشِ جاوداں ہی نہیں ابھارتے بلکہ ماضیٔ پارینہ کی عظمتِ رفتہ کو بھی اجاگر کر ڈالتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ خالدؔ کے عروجِ فن، انسان دوستی، اخلاص و شرافت کا کرشمہ ہے۔ شرافت کے بغیر کمال اور کمال کے بغیر شرافت ایسی ہی ہے جیسے خوشبو کے بغیر پھول، پھول کی رنگ و رعنائی نظروں کو کھینچتی ہے لیکن اس کی خوشبو روح تک اتر جاتی ہے۔ ہر مکتبۂ فکر اور ہر مدرسۂ خیال کے دانشور، فنکار، مصنف، مفکر اور اربابِ علم و کمال علامہ عبدالعزیز خالدؔ کی تخلیقی محفلِ رنگ و بو میں نہایت فراخدلی اور وسیع القلبی سے شریک ہیں۔ نئی اور پرانی نسل کے نمائندوں نے اعترافِ عظمت و کمال کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ سچ ہے خلوص و محنت کی بنیاد پر عظمت کا مینار تعمیر ہوتا ہے، اس کی روشنی دور دور تک آنکھوں کو چکا چوند کیے دیتی ہے۔

علامہ عبدالعزیز خالدؔ کی ہمہ گیر و ہمہ رنگ شاعری کے بارے میں مندرجہ بالا کلمات و ارشادات اس بات کی بھی زندہ اور واضح شہادت ہیں کہ کلامِ خالدؔ کو اب تک اہلِ علم، ادبا اور اہلِ نقد و نظر کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت حاصل ہو چکا ہے، خواص میں کلی طور پر اور عوام میں جزوی طور پر۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اگر خالدؔ کی مشقِ سخن چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ اسی انہماک، تن دہی اور عزم و استقلال سے جاری رہی تو انشاء اللہ مستقبل قریب میں عوام بھی بہت حد تک نگارشاتِ خالدؔ سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

کامل القادری

عبدالعزیز خالد ـــــ باب پنجم کا شاعر

جنسی شاعری سے ہماری مراد کیا ہے!

تعبیروں کے تنوع اور پیرایۂ بیان کی بوقلمونی سے قطع نظر، یہ امر ہے کہ جنس سے مفر نہیں۔ ہماری طبعی زندگی کے لئے ہوا، پانی اور غذا کی طرح جنسی آسودگی کا ساز و سامان بھی ناگزیر ہے۔ ایک صحت مند، متوازن اور بھرپور معاشرے کی من جملہ سرگرمیوں میں جنسی سرگرمی بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ اور اسے سائنسی سطح پر منضبط کرنے کی کوششیں مذہبی، اخلاقی و تہذیبی دائروں میں کی جاتی رہی ہیں۔ جنسی سرگرمی میں نظم و ضبط اور تہذیب و تربیت کے لئے ضابطے بنائے جاتے رہے ہیں تاکہ اس تخلیقی قوت کی غایت حقیقی پوری ہو اور افزائش نسل اور بقائے نوعِ انسانی کا سر و سامان ہوتا رہے۔

آدمی خواب نہیں، خیال نہیں، فکر مجرد نہیں، تحیر مابعد الطبیعات نہیں، جسم و جان رکھتا ہے۔ ایک ٹھوس حقیقت، نامیاتی مظہر، گوشت پوست کا بنا ہوا ہے اور کام، کرودھ، لوبھ، موہ، اہنکار کی خمیر سے اٹھا ہے۔ انسان جبلتوں سے بھرپور ہے، چند کا ہم نے نام رکھ لیا ہے اور بہت سی جبلتوں کا نہ ہمیں احساس ہے اور نہ تمیز۔ معلوم جبلتوں میں جنس (SEX) ایک نہایت سرکش، طاقتور اور پُرلذت جبلت ہے۔ افزائش نسل کے لئے آدمی ازدواجی زندگی اختیار کرتا ہے اور محض بوالہوسی اور لذت اندوزی کے لئے غیر ازدواجی اختلاط کا بھی رسیا نظر آتا ہے۔ شور زمین میں تخم ریزی نہ سائنسی لحاظ سے قرینِ قیاس ہے اور نہ مذہبی و شرعی لحاظ سے درست۔ لہٰذا ازدواجی زندگی میں منسلک ہونے کے اسالیب تو ایک سے زیادہ ہیں۔ لیکن مقصود یہی ہے کہ انسان کی تخلیقی صلاحیت اور جوہر کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھا جائے۔

کوتاہ بین محتسب کی کج روی سے قطع نظر ہماری نظر میں جنسی شاعری نہ "بزبان حرف زدن" ہے اور نہ محض "معاملات" کے خارجی بیان پر مشتمل۔ معاملہ بندی سے آگے کچھ اور بھی ہے ـــــ جمالیاتی تسکین، روحانی آسودگی اور جسمانی بالیدگی۔ یعنی جنسی شاعری سے ایسی شاعری مراد ہے جس میں جنسی ترغیبات پائی جاتی ہوں، ازدواجی افعال و ارتکاب کا پُرلذت بیان ہو۔ جس کے پڑھنے سے جنسی جذبہ و احساس میں تحرک و تموج پیدا ہو، بساط کیف و آسودگی کی وہ کیفیت پیدا ہو جو کورے گھڑے کا پانی پینے کے بعد کسی پیاسے کو نصیب ہوتی ہے۔ جنسی جبلت کے لئے باعث کشش ہو، ملن کی حالت انگیز تصویر ہو یا طوفان فرو ہو جانے کے بعد کا اُڑا اُڑا رنگ، فراقیہ گیت نہ ہو، طرب ہو، نشاط ہو، سرخوشی ہو، سرمستی، بدمستی، سرشاری بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ حزن نہ ہو۔ اضمحلال نہ ہو۔ یہ اوصاف مبتذل نہ ہوں مگر جمالیاتی اقدار کی حامل ہوں گویا ع

سج گرم، جبیں گرم، نگہ گرم، ادا گرم
وہ سر سے ہے تا ناخنِ پا نام خدا گرم

(انشاء)

لے ذرا دیکھ تو اس رشکِ پری کا سینا
میں نے دیکھا نہیں اس سے پری کا سینا

(مصحفی)

ٹک جا لگے سے تاب لبوں لے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

(جرأت)

تجھ ڈر کی سبھی، ادا سبھی، حسن جبیں سبھی
یہ سب سبھی، پر ایک نہیں کی نہیں سبھی

(انشاء)

کیا اُڑ کے رہ گئے جو کہا اُس سے لگ چلوں
بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں بھی

جرأت کی محبوبہ جس شوق کے گرد دائرہ بناتی نظر آرہی ہے، جنسی شاعری اُسی شوق سے عبارت ہے۔ اُردو شاعری میں صنفِ غزل سے قطع نظر واسوخت، عشقیہ مثنویاں، سراپے، قطعات، رباعیات اور نظموں میں بھی عامہ بندی کے خوش نما، بدنما، مہذب و شائستہ، غیر شائستہ و شوقیانہ ہر طرح کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ بعض ایسے شعر بھی ہیں جنہیں سُن کر اخلاق کے رُخ پر پسینہ آجائے ؎

کھلتے جانے پہ ہانپتے جب تا
چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا

(شوقؔ)

اک خلش رہ گئی ہے زیرِ ناف
ران شانے کھلا ہُوا مُو باف

(حامد عزیز مدنی)

گویا جنسی شاعری، جنسی جبلّت کو سہلاتی، گدگداتی اور مشتعل کر کے جنسی تلذّذ پیدا کرتی ہے، اور یُوں عشقیہ شاعری سے حدّت و حرارت میں ممیز ہوتی ہے۔

جمالیاتی، عشقیہ، جنسی جبلّت، کیف و نشاط اور جذبوں میں فرق و تمیز کرنا پُل صراط سے گزرنے کا عمل ہے اور میں سرِ دست ایسی غلطی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں، خصوصاً ایسی صورت میں جب ان کے مابین محض کیفیت و کمیت اور مدارج و منازل کا فرق ہو۔ حسن و جمال —— تحرک و توجہ، تحریص و طمع اور شوقِ وصال کے بیچ بوتا ہے۔ عشق —— اس پودے کو پروان چڑھاتا ہے اور جنسی جذبہ خوشبو سونگھتا اور پھل کھاتا ہے۔ توجہ، عزیمت اور عمل جنسی شاعری کے مدارج ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا بیان جنسی شاعری کی سرحد میں داخل ہے۔ خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ جنسی شاعری "کارِ دگر" کے بیان سے مختص ہے، مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی لحاظ سے خلوت کی حکایاتِ رنگیں کا جلوت میں بیان ناسزا ہی سہی، لیکن عالمی ادب میں یہ ناسزا العروش موجود ہیں۔ "در ایّامِ جوانی چُوں اُفتد" کا ذکر کچھ اردو ہی سے مختص نہیں۔ دُنیا کی ہر زبان میں معتدبہ مقدار میں جنسی شاعری کے نمونے ملتے ہیں اور ہر جگہ توجہ (خیال) عزیمت اور عمل مدارج کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سب کا ذکر جنسی شاعری میں محسوب کیا جاتا ہے۔

عبدالعزیز خالد بڑے پینڈے کا شاعر ہے۔ اُس کے کلام میں انفس و آفاق کے مختلف رُخ کی تصویریں ملتی ہیں اور لکھنوی شعرا کی بیہٹر لوردیاں بھی۔ پھر خالدؔ ڈرپوک نہیں، جرأت مند ہے، وہ ایسا بے باک، نڈر اور پُورا شاعر ہے جو "کارِ دگر" کا بیان کرتے ہوئے ذرا نہیں جھجکتا۔ فکری و نظری لحاظ سے بھی وہ تسخیرِ جنس کا قائل ہے۔ لہٰذا اُس کے یہاں جنس سے گریز کا رجحان نہیں پایا جاتا۔

اُسے نجُوما کتاب کی مانند
پیار میں احترام شامل تھا

یہی احترام، حُسنِ بیان اور شائستگی "جنسی شاعری" کے مانگ کا سیندور ہے اور اُسے ابتذال سے محفوظ رکھتی ہے لیکن یہ احترام ہمیشہ قائم

نہیں رہتا۔ حساسیت لذت کے بیان میں حد سے تجاوز ہو ہی جاتا ہے۔ لغزش خانہ کی صفتیں کہیں کہیں خالد کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن خالد نے لغزش کو تمام کا شاکی ہے، نہ علانیہ گناہ کرتا ہے۔ انسان ابلیس کا بھی حق ہے اور وہ شاید حقوق عباد ادا کرتا ہے۔ مثلاً "مرد و زن عشق" میں عورتوں کے انواع و اصناف صفاتی و ذاتی کے شمار پر جب آتا ہے تو عمر و کلاں گزرتا نظر آتا ہے۔ خوب کھل کھیلتا ہے۔ معانی پہ زبان پا رکی لرد کی ہے لہذا محتسب کی نظر نہ پڑی میں تو تہ ہمہ پیش کرنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتا۔ تاہم قبل اسلام کے عرب شعراء بھی خالد کے ہم استعارہ سے تو مرکزی صنف، بڑے واضح میں اور پھر واضح بات مبتذل نہیں ہوا کرتی۔

خالد نے عرب شعراء کی پیروی میں لعاب دہن کی لذت کا بھی بیان مزے لے لے کے کیا ہے ؎

آب باراں سے کہ مے سے کہ لعاب
منہ میں ٹھنڈک ہے جگر میں شعلے

خالد کے یہاں اعضائے نسوانی کا ذکر بڑے رسیلے انداز اور شہوانی لب و لہجہ کے ساتھ آتا ہے۔ اُس کی نگاہ شاید خدوخال پر سرتاپا پڑتی ہے۔ لب، رخسار، چشم، ابرو، ناک، پیشانی، کان، ٹھوڑی، زلف، گیسو، بال، گردن نشیب ہیں اس کی نظر میں پڑتی۔ وہ ذی نشاط و انبساط میں بھی اترتی چلی جاتی ہے ؎

گورے تلور و عاج و مرمر
ریشم کے لباس میں چھپائے

محراب، عمود، برج، قوسیں
رس میں ڈوبے، نکھرے نکھرے سے

بنڈے کے ساز کے خریدار ہیں ہم
سینے کے تناؤ پہ لٹا دیتے ہیں دھن

لرزش سیماب کون لوٹے عاج
دل میں طوفان ہوس برپا کرے

کنول کی پتیوں سے وہ چھپائے سینے کو
دو دن میں کھل کے کلی پھول بن گئی جیسے!

کلی گلاب کی جیسے تو پھوٹے موجِ رنگ
سنبھلی کھنچی جو کششِ شباب سے چمکے

سورج ہے مثلِ عارضِ گلگوں دمِ غروب
یہ نور ہے چڑھتے جوار میں سیمینہ سینے کا

دو قُبّے نور کے جن پہ ہے مُہرِ عنبری
ہوا میں مُشک کی خوشبو ہے لمسِ ریشم کا

خالد کا ہر عضو اعضائے محبوب کا تشنہ ہے، اور وہ طرح طرح سے اُن کا بیان کرتا ہے، تشبیہ و استعارات کا انبار لگا دیتا ہے، لیکن تسکین نہیں پاتا۔ آسودگی و قرب کے مواقع، خواہ جس قدر بھی میسر ہوں۔ یہ آگ بھڑکتی رہتی ہے، لہٰذا وہ سراپا نگاری میں محو ہو جاتا ہے۔

سراپا نگاری بھی لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کا امتیازی وصف رہا ہے اور شعرائے لکھنؤ نے خارجی حسن و زیبائی۔ لباس، زیور اور خد و خال پہ اپنی نگاہیں مرکوز رکھی ہیں۔ قلبی کیفیت، داخلی محسوسات یا۔ ذہنی عمل کا بیان شاذ ہی شاذ نظر آتا ہے۔ خالد بھی خد و خال کی نظارگی کرتا ہوا اُچٹتی نظر داخلی کیفیات پر بھی ڈال لیتا ہے۔ بہر نوع وہ لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کی پیروی کرتا ہے، چند نمایاں مثالیں ملاحظہ فرمائیے: یہ لکھنویت نہیں تو کیا ہے؟

رگوں سے پھوٹتی ہے، اس بدن کی باس سپاس
مبارک اس کو کہ محرم جو اس بدن کا ہوا

بولی وہ سر خوشی سے نثارِ وصال میں
تو میرا دیوتا ہے، پجارن ہوں میں تری

میں ہوں تیری مجنوں تری اب جو چاہے کر میرے ساتھ
نشاطِ وصل میں کس گل عذار کی ہے پکار؟

آئی ہے تم جانو، راہ کی تھکی ماندی
چہرے کی رنگت اُڑی ہے، سانس چڑھا ہے

چاکِ عمودی سے جھلکے گوشے گریباں
دیدہ و دانستہ بے نقاب کیا ہے

قیمت جو پوچھی بولی کہ بولی لگائیے!
محرم نہ ملیا ایسی جوانی نے ہاں دا

اے کام دیو دیوتا! رک جاؤ رات بھر کو
راہیں منجمل کاری، بوندیں کٹاریاں ہیں
دل میں ہے گدگداہٹ، سینے میں سنسناہٹ
ہونٹوں میں سلسلاہٹ، برما کی ماریاں ہیں
جھنکار سے ہو پیدا، جذبات میں تلاطم
ہے باڑ پر جوانی، عمر بلا سے جاں ہیں

جامہ انارام تو بہار پہ تنگ
شوق کھل کھیلنے پہ آمادہ!

وُہ گج گامنی، چندر بدن، مرگ لوچنی

دبانا مرے ہاتھوں کو دستِ حنائی سے
بدن سوزِ پنہانی سے شاخِ گل تر ہے

مست ہتھنی کی طرح مان بھری
جسم انگارے کی طرح دہکے

انتخاب و التزام کے بغیر یہ اشعار نوکِ خامہ سے ٹپک پڑے۔ مُدعائے سخن یہ ہے کہ جنسی تغزلیات میں سراپا کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ظفّر نے نہایت خوبصورت سراپے پیش کئے ہیں۔ اُس نے چکھی ہے یا نہیں، خلوت کا قصد خدا ہی جانے، لیکن اُس کے بیان میں واقعیت کی ایک محسوس و پُر حرارت لہر صاف غمازی کرتی ہے کہ وُہ معصوم کبھی نہیں کہ محرمِ درونِ خلوت نہ ہو۔ یُوں بھی اُس کی نگاہیں ابتدائے آفرینش سے عہدِ حاضر تک کے عذرا جمالوں کی نظارگی کرتی رہی ہیں، اور جن کا نام بنام وُہ ذکر بھی کرتا ہے۔ اُس کا مشاہدۂ حُسن نہایت متنوع ہے اور اُس نے داخلی و خارجی صفات و کیفیات کو آمیز و آمیخت کر کے ایسے ایسے مرقعے بنائے ہیں کہ شاکر و چغتائی بھی یہ سوچتے رہ جاتے کہ رنگوں کا یہ امتزاج، خطوط کی دلآویزی، بُرشِ قلم کی یہ صفائی کیوں کر عالمِ وجود میں آتی ہے۔ چند تصویریں ملاحظہ ہوں ــ

لب پہ افسوں نظر میں افسانے
دل رُبا جسم سوچ میں ڈوبا!
سانس میں نکہتِ نسیمِ چمن
زلف میں عطرِ عنبرِ سارا
بال کالے، چکور سی آنکھیں
طلعتِ تازہ، لالۂ حمرا
شوخ، چالاک، چست، چلبلی
تیز، طرّار، نوجواں، رعنا

نرم جیسے کہ سیپ کا موتی
سخت جیسے کہ صخرۂ صمّا
سُرخ ڈورے نشے کے آنکھوں میں
پیار کے لمس کا بدن پیاسا

دوسری تصویر ملاحظہ فرمائیے ؎

کالی ساری میں چمک پیڑے کی
جیسے گھنگھور گھٹا میں بجلی
پھر بچھڑتی ہے، شفق پھیلی ہے
تیرے چہرے کی سفیدی، سُرخی
رخصتِ رنگ پہ وداعِ ناموس
نالۂ شوق و حدیثِ مستی
چہرہ غمازیِ دل کرتا ہے
رو سے جو بات بڑھی پھیل گئی

بہکے قدموں سے، دھڑکتے دل سے
وقتِ شب آئے بقصدِ دزدی

ہائے یہ زندگی کتنی عجیب ہے! تیسری تصویر ملاحظہ فرمائیے ؎

صبحِ نوروز، طلعتِ تاباں
شبِ عاشورہ، گیسوئے پیچاں
گرم، لبریز، دودھیا، شیریں
شوخ، جادو نگاہ، سحر بیاں

موتیے کی کلی، گلاب کا پھول
تیرے عارض شقائقِ نعماں
مشرقِ رُخ سے روشنی پھوٹے
لب گلنار، آتشِ خنداں

وصل کی خواہاں عذراؤں کی قسم یہ تصویریں سر چڑھ کر بولتی ہیں۔ جنسی تموّج و تحرّک، ترغیب و انگیخت کی ایسی مثالیں صرف خارجی نقوش و خدوخال کے بیان میں کہاں، اور تجربات کی سچائی اور معاملات کی وقعت خالد کے علاوہ کہاں نظر آتی ہے۔ جدید شعرا میں ن۔م۔ راشد نے جنس کو موضوعِ سخن بنایا ہے، لیکن اُس کے فلسفیانہ انداز نظر میں جنسی تجربے کی سانس اُکھڑی اُکھڑی نظر آتی ہے۔ خالد سی کیفیت نگاری نہیں ہے

حسنِ نایاب و نغمہ کی قیمت
کبھی سونا، کبھی دلِ انساں
اِنَّ کَیْدَ النِّسَاءِ کَیْدٌ عَظِیم
آپ ہوتی ہیں وصل کی خواہاں
جسم عورت کا اُس کا دشمن ہے
جامِ سرجوش کو چھپائے کہاں!

پیار ہے لوک لاج کا تجنا
ریت اُلٹی ہے، اُس کی اُلٹی مت
شرم سے جسم کسمساتا ہے
یہ حیا ہے کہ شوق کی شدت؟
آگ بوسوں میں راگ لفظوں میں،
تجھ میں آئی، کہاں سے یہ حدت؟

سرور رُت میں لیتا ہوں، لب و رخسار کے بوسے
وُہ محوِ خوابِ نوشیں ہے مگر بیدار لگتا ہے

گگن سے چاند اُٹھے دیکھنے کو رات ڈھلے
کدم کے پیڑ تلے بانسری بجائے کون!

ہونٹوں کی سُرخی کس نے اُڑائی؟
آنکھوں کا کاجل کس نے چُرایا؟

گھنیرے کنج دھڑکتے دلوں کے راز نشیں
سکوتِ شب میں ہے آوازِ پا لبِ گویا

سلام کہتی ہیں تجھ کو وُہ وصل کی راتیں
جو کاٹیں ہم نے کھُلے آسمان کے نیچے

اُسے تکتا ہوں چُرا آنکھوں سے
وُہ کن انکھیوں سے دیکھتی ہے مجھے

ہر کنج سے آتی ہیں ترے جسم کی لپٹیں
یادوں کے پری خانے تری سانس سے مہکیں
کیا جنتِ المُوط کا پھر ہوگا نظارہ؟
کیا لَوٹ کے آئیں گی کبھی وصل کی راتیں؟

یہ چند مثالیں بغیر کسی التزام کے پیش کی گئی ہیں۔ یہ بھی جنسی شاعری ہی کی مثالیں ہیں۔ ایک شعر سنئے :

نہ ہم سمجھے، نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے، اپنی جبیں سے

کتنی سادگی سے کیا کچھ نہ کہہ دیا گیا، یہ حسنِ بیان ہے، شاعری ہے، سحر ہے، جادو ہے، اعجاز ہے، قیامت ہے، جو معاملات کے بیان اور عشقیہ شاعری کے مابین حدِ فاصل کھینچتی ہے۔ عشقیہ اور جنسی شاعری میں زاویہ ہی کا فرق ہوتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کے عندیے میں تو غالب کا یہ شعر بھی جنسی ترغیب کا حامل ہے ؎

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

خالد نے "کارِ دگر" کے بیان میں اسی حسن و شائستگی کا مظاہرہ کیا ہے ایک سحرِ بنگالہ کی تصویر دیکھئے ؎

نار پستان و ناردن قامت
سرو قد، ورد خد، شفق چہرہ
سحرِ بنگالہ —— گندمی عارض
مارِ ضحاک —— جعد مشکینہ
آنکھ میں آگ، سانس بے قابو
عنفوانِ شباب کا نقشہ
سہی قامت، گداز، لچکیلی
رنگ جیسے انار کا دانہ

اور یہ محاکاتی انداز ملاحظہ فرمائیے ؎

تمہارے جسم سے بوئے محبت آتی ہے
برہنہ شانوں کو چوموں لرزتے ہونٹوں سے
مری گرفت سے خود کو چھڑا کے کہنے لگی
تمہارے شر سے بچائے خدائے پاک مجھے!

ایک اور نارد کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے جو جنسی جذبات سے بے چین و مضطرب ہو رہی ہے ؎

چھمک سے کوٹھے پہ چڑھتی ہے نارِ البیلی
سجن بدیس ہے کس کے لئے سنگار کرے؟
کنوارے انگ میں بھڑکے پیا ملن کی آس
سُنی ہے سائیکی کیوپڈ کی داستاں جب سے
نگاہِ ناز ملتی ہے رازداں کی طرح
اُٹھاؤ یار سے مِل کے مزے جوانی کے

یہ کلام کیا جنسی ترغیبات کا حامل نہیں، کیا ملن کے رُوپ سروپ کا آئینہ دار نہیں۔ کیا "کارِ دگر" کے گوناگوں تجربات کے بیان پر مشتمل نہیں۔ وہ ہے اور یقیناً ہے، لیکن حسنِ بیان نے ایک پردہ ڈال رکھا ہے۔ یہی پردہ خالد کی ایک نظم سوغات میں اُٹھ جاتا ہے۔ پہلے بند میں خالد نے اپنے محبوب کا سراپا بیان کیا ہے اور دوسرے بند میں "کارِ دگر" کے معاملات گویا سراپا بطور تشبیب آیا ہے اور لفظ تشبیب کے من جملہ معانی میں ایک آگ روشن کرنا بھی ہے۔ آتشِ جنس کو خالد یوں ہوا دیتا ہے ؎

مری غزال، مری زہرہ، میری دُردانہ
بنی بہ جبرِ زمانہ متاعِ بیگانہ

یہ ایک المیہ ہے، جانکاہ حادثہ ہے، غمناک لمحہ ہے، لیکن خالد اس المناکی سے بے نیازانہ و بے پروا آگے بڑھ جاتا ہے۔ یا یہ نہیں ہوگا کہ اس کی یاد سے دل بہلانے لگتا ہے ؎

بجا ہے گر اُسے کہئے حسینۂ عالم
ہے وہ غزالۂ رعنا، فطین و فتانہ
وہ شوخ شاہدِ دل جُو وہ پیکرِ خوش خُو
ہے جس کے چہرے پہ تاب و تبِ صنم خانہ
نثار جس بُتِ مہ رُو کے خالِ ہندو پہ
بُتانِ بربر و سلمیٰ رُخانِ فرغانہ
سیاہ چشم و ستارہ جبیں و فربہ سرین
چراغِ بُت کدہ و ساگینِ میخانہ
قفا و قامت و طلعت کشیب و سرو و قمر

بہارِ شہر و خیاباں، بہشت کاشانہ
دو گوسے عاج نمودار، محکم، استادہ
فروغِ قمقمۂ نور۔ واہ کیا کہنا
ہے رنگ رت بھی سرس راگ بھی کونت رس کا
ہمہ کرشمہ، سراپا فسون و افسانہ
ڈھلا ہے نور کے سانچے میں دل نواز بدن
خجل ہے قد سے صنوبر، لبوں سے شہدانہ
سمندِ رنگ سے جیسے اپنے نشے میں سرشار
بجود فریفتہ و بے نیاز و مستانہ
ہے جس کی یاد انیسِ الجلیسِ تنہائی
ہے جس سے رشکِ چمن حسرتوں کا ویرانہ
وہی ملیحۂ زہرہ نگاہ آہو چشم
بنی بہ جبرِ زمانہ متاعِ بیگانہ
وہ زہرہ مملکتِ حسن و ناز کی ملکہ
وہ زہرہ سلطنتِ دلبری کی شہانہ
نقاب رُخ سے ہٹا کر، لٹوں کو جھٹکا کر
حریمِ وصل میں آئی تھی ماہتابانہ

جاذبِ نظر سراپا ہے۔ اور دورنِ خلوت کی معرکہ آرائیاں ملاحظہ فرمائیے

نہ بھولے وہ شبِ بوس و کنار و آمیزش
وہ شام عربدہ آمیز و صبحِ رندانہ
پُر انگبیں دہن و دوش و دست پُر عنبر
مشام غالیہ پُر زیرِ لف بے شانہ
مٹھاس شہد کی ان میں چمک تھی اولوں کی
تھے لعلِ ناب لبِ سرخ، دانت دُردانہ
لبانِ من بمکید و زبانِ من بمزید

بزمِ بادہ کشِ تشنہ، خود سپردانہ
زباں خموش، نگاہوں میں شہرِ گویائی
کلام کرتے ہیں دل دار راز دارانہ
رسیلے لہجے میں موجِ نوائے موسیقار
سُریلے بول میں خندہ صدائے مستانہ
رنگیلے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ میں
رچی جوان بدن کی شمیمِ جانانہ

خالد مدیحِ خلوت کا شاعر ہے، اُس کا مشاہدہ نہایت گہرا ہے، خلوت میں پیش آنے والے معاملات کی اک اک ادا پر اُس کی نظر ہے اور نی کیفیات کے مرتموج کا وہ شناسا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظہیر کاشمیری ایسا ترقی پسند شاعر و نقاد کہہ اُٹھتا ہے کہ "ہمیں یہ ماننے کے لئے قطعی بار نہیں ہونا کہ یہ سب قال ہے، حال نہیں، ایسی رسیلی شاعری محض ایک ناظر نہیں کر سکتا۔" عارف عبدالمتین نے بھی خالد کی غزلوں کا جائزہ لی کرتے ہوئے اُس کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کا ذکر بڑے پیارے انداز میں کیا ہے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ فراق کے "روپ سنگھار" کی اعری سے کہیں جاندار، پُر کیف اور گوشت پوست کی شاعری خالد کے یہاں ملتی ہے۔ تین مصرعوں پر مشتمل ایک نظم ملاحظہ فرمائیے:

اکیلی سیج پہ برہن کو کیسے نیند آئے
کہاں ہے چاہنے والا جو اس کے مہکیلے
رنگیلے روپ، رسیلے بدن کو سہلائے؟

"رسیلے بدن کو سہلائے" کے ٹکڑے نے ذہنی اُتلافات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ الفاظ کم ہیں لیکن بحرِ ظلمات موج زن۔ خالد کی چشمِ نظارہ بیں نے طرح طرح کی نظارگی کی ہے، صرف پانچ مصرعوں پر مشتمل ایک نظم ملاحظہ فرمائیے

جھانکے کھڑکی سے چودھویں کا چاند
جھیلیں نس نس میں تیز کرنوں کے
لے گئی کھینچ کر پہ بستم کو
ایک بے گانی سیج کی خوشبو
ایک انجانے جسم کی چاہت

یہ صرف ایک واقعے کا بیان نہیں، افسانہ و افسوں ہے جسے حیاتی اسلوب اور لب ولہجہ کی حدت نے عجیب سرشار کیفیت سے معمور کر دیا ہے۔ "لعاب دہن" کا مزا عرب شعراء جانتے ہیں یا اہلِ عرب، ہم عجمیوں کو تو اس تصور ہی سے گھن آتی ہے۔ لیکن عبدالعزیز خالد اس ذائقے کا بھی شناسا ہے اور لعابِ لب پینے کا جواز بھی رکھتا ہے ؎

زمیں مینہ کو پیتی ہے غٹ غٹ
زمیں کی نمی کو درخت
سمندر ہوا کو، سمندر کو سورج
اُسے چاند
آخر
پیئے کیوں نہ شاعر لعابِ لبِ مُشکِ بُو؟

عبدالعزیز خالد کا اندازِ بیان، لب ولہجہ، شعری فرہنگ اُردو کے دُوسرے شعراء سے مختلف ہے۔ وُہ منفرد شاعر ہے۔ اور یہ انفرادیّت اُس کی جنسی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے۔ وُہ جرأت، انشاء، رنگین یا مصحفی کا تابع مہمل نہیں۔ اُن کی روایتوں کو آگے بڑھانے والا ہے۔ "زباں شوکر گئی" ریاض ہی نہیں ہر لکھنوی شاعر باندھ سکتا ہے۔ لیکن جنسی تلذّذ کو حیاتی اسلوب خالد ایسا عظیم فن کار ہی بخش سکتا ہے۔ اس خصوصیت کو داغ کی معاملہ بندی سے کوئی علاقہ نہیں۔ لیکن خالد کے یہاں اس انداز و معیار کے اشعار کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پہ رنگ سے زیادہ نہیں۔ اے کاش زیادہ ہوتے۔
خالد کی نظر میں انفس و آفاق میں مضامین نو کی تلاش میں سرگرداں پھرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اُس کے ایوانِ شاعری میں عالم کی رنگارنگی پیدا ہوگئی ہے۔ وُہ کسی مکتبِ فکر کا پابند نہیں۔ وُہ خود کہتا ہے ؎

حکمت کا حصُول ہے مرا نصب العین
ہر مکتبۂ فکر سے نسبت ہے مجھے

یہ رُباعی خالد کے دین و کیش کی مظہر ہے۔ اُس کی شاعری کثیری الجہات ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کا اس پر بڑا گہرا رنگ چڑھ گیا ہے۔ نیز طرزِ سخن کے ساتھ اس دبستان کی دُوسری خصوصیتیں بھی خالد کے یہاں نظر آتی ہیں۔
لغات نویسی و لغات سازی، بسیار گوئی، طول کلامی اور قافیہ ختم کر دینے کی لپک، نسوانی زبان کا استعمال اور عورت بن کر اظہارِ عشق کی ادا، قوّتِ نقد و انتخاب کی کمی۔ بہ ایں ہمہ خالد کی لکھنویت میں بھی ایک انفرادیت پائی جاتی ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ برِصغیر میں لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کا اتنا بڑا کوئی شاعر نہیں۔

جمیلہ ہاشمی

شاعرِ فردا

• کتھا یعنی کہانی کہنے والے کو کتھک کہتے ہیں۔

کہانی نظم میں ہو یا نثر میں اُس کو گا کر سُنایا جائے یا رہس کے طور پہ پیش کیا جائے وہ لفظوں میں ڈھلے یا حرکتوں کے ناتے بیان کی جائے، بیتی باتوں اور یادوں گزرے دُکھوں اور سُکھوں کا کہنا کہانی ہے۔ کہانی کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ نئی ہو کیونکہ نئے واقعات تو دُنیا میں روز نہیں ہوتے۔ قصے کو بس قصہ ہونا چاہیئے جو گلیوں اور بازاروں میں گا کر بھیک مانگنے وا لے بھی کہیں اور چوپال میں سردیوں کی لمبی سیاہ راتوں میں ال کے سامنے بیٹھ کر سُنانے والے کی داستان سُننے والوں کو مبہوت کر سکے۔ قصے صدیوں سے کسی نہ کسی رنگ میں یہاں وہاں سُنائے جاتے رہے ہیں، لکھے جاتے رہے ہیں اور عبدالعزیز خالد نے اُنہیں کو اپنا موضوع بنایا ہے

یونانی دیومالا اور اُس کی مقبلیں۔ بائبل جو کسی افسانے سے زیادہ پُرکشش ہے، تمثیلیں جن کے ذریعے زندگی اور موت کی تشریح کی گئی ہے اور اُن کے درمیان کا وقفہ جس کو حیات کہتے ہیں جو کچھ اُس میں ہوا ہے یا ہو چکا تھا سب مافوق الفطرت ہونے کے باوجود صدیوں کے فاصلے سے ہم کو حیران کر سکتا ہے۔ کہنے والا فطرت کا رمز شناس ہے۔ کتھک جو جادوئی تال اور راگ کے ساتھ ساز جاتا ہے اور بیک وقت رقاص اور موسیقار ہے وہ اپنی واردات قلب کو اُن کے پردے میں یوں چھپاتا ہے کہ سننے والا اور دیکھنے والا اُسے اپنی ہی آپ بیتی سمجھتا ہے اور اس لئے ساری آپ بیتیاں جگ بیتیاں اور جگ بیتیاں آپ بیتیاں بن جاتی ہیں۔

پُرجوش سنجیدہ، زبردست اور خوبصورت کالی داس کی شکنتلا، جائسی کی پدماوت، ملا دل کی پدماوتی، وارث شاہ کی ہیر، اور خالد کی سلوتی۔ لگتا ہے ناچ کے چکروں میں گھومتی وہ ناری کے سو روپ ہیں جو انسان کے جذبات کو سارے دائروں کو گھماتے ہیں۔ سرخوشی، رنج، غصہ، بندگی اور سنجیدگی سب کچھ ہے۔ ان میں یہ کہانیاں اگر آپ مان لیں تو میں کہوں گی کہ رامائن اور مہابھارت کی سی ہمہ گیری سے حیران کرتی ہیں۔ کالی داس کی سیاہ آنکھوں والی مالوہ کی کنواریوں سے لے کر جوان سال زخم خوردہ اور بے رحم سلوتی تک ایک ان دیکھا رشتہ ہے۔

کتھک کا انداز بیان ان داستانوں کا حُسن ہے۔ لفظ اُس کی کہانیوں میں شعلوں کی طرح لرزاں اور رقصاں ہیں۔ جھاگ اُڑاتی موجوں کی طرح خیال ایک کے بعد ایک آتے ہیں اور شاعر کو نیا ساحل جان کر اُس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ وہ ایک تھرمان کمانڈر کی طرح اُن کو قابو میں رکھتا اور مرضی سے اُنہیں آگے بڑھاتا اور پیچھے ہٹاتا ہے۔ لفظ غلام ہیں اور اُس کے تابع فرمان۔ وہ ایک عجیب شانِ بے نیازی سے اُنہیں اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ کئی ایک زبانوں کے لفظ اور خیال پرے باندھے ہاتھ جوڑے اُس کی قادر الکلامی پہ گواہی دیتے ہیں۔ شاعر کی بے نیازی اور اُس کا احساسِ امارت ہی اُسے عام لوگوں سے اُونچا اور عام قاری کی پہنچ سے دُور رکھتا ہے۔ جیسے ایوان در ایوان فاصلے اُس کے اور لوگوں کے درمیان ہوں اور ابلاغ کے لئے جہانگیری انصاف کی زنجیر تک نہ ہو۔ رسائی کے سارے راستے بند ہوں۔ سمجھ لیجئے وہ ایک مجسمہ ساز ہے جس نے اپنے مجسموں کو لفظوں کے خس و خاشاک میں چھپا رکھا ہے۔ اُس کی سلطنت کی وسعت اُس کی سرحدوں کی حفاظت کے درمیان حائل ہے۔ بیشک بہت ساری زبانوں کا علم اُس کے مطالب میں زیادہ گہرائی اور اُس کی کہانیوں میں آفاق گیری کی صفت پیدا کرتا ہے۔ وسیع مذہب اگر عمیق نہ ہو تو بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ اُن میں اپنے سامنے کی ہر شے کو بہالے جانے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے میگھنا کی سوئی ہوئی لہریں سمندر سے آتی ہوئی طوفانی پُرشور خوفناک جھاگوں سے بھری ہوئی دیوار کی طرح کی اُٹھتی ہوئی موجوں کے سامنے تنا ہو جاتی ہیں۔ یہ شاعری پُرشکوہ ہے اور ایک بڑے ایوان کا تصویر خانہ بھی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی ہے کہ خالد کس طرح مصوّر کی سی صحت اور چابکدستی کے ساتھ رنگوں کے اس میلے کو روشنی کی ان لہروں کی ذرا ذرا سی تفصیل سے سجا سکے۔

اُن کے ہاں مدھ ماتی آنکھوں والی ہندوستانی کنواریوں سے
لے کر عکاظ کے میلے میں جھم جھماتی برجستہ سخن شناس دوشیزائیں تک
ہیں۔ گہرے نیلے لبادے میں لپٹی افسوس زدہ اور قسمت پہ راضی
ہیلن سے لے کر شاہ بانو تک ہے۔ ہیرا پنے سے آشنا اور نغمے
کی حدوں کو چھوتے ہوئے سراپے تصویر کشی اور سنگ تراشی کے

نادر نمونے ہیں اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو ہماری سمجھ میں
نہ آ سکے ۔ مگر لگتا ہے یہ اشارے ابھی نائے ہیں اس ناچ کی جان ہیں
مگر یہ سنگ تراش جب ثنائے محمد عربی پہ آتا ہے تو
لگتا ہے ترساں لرزاں دربارِ رسالت میں حاضر ہے اور عشقِ محمد
کے شعلے اس کی جان کو گھلائے دیتے ہیں ۔ یہ جائے ادب ہے اور
میں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں وہاں
وہ فارقلیطا اور منمنا لے کر باریابی چاہتا ہے ۔ ایک صاحب سے
بات ہوئی وہ اپنے پرچے کا رسول نمبر نکالنے کی فکر میں تھے ۔ میں
نے کہا آپ چاہے کچھ کیجیے اقبال کے ؎

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

ان شعروں پر زیادتی نہیں کر سکتے ۔ ثنائے محمدؐ اس سے
زیادہ کیا کریں گے اور کون کر سکتا ہے کیونکہ اس کی ثنا کے ساتھ
ساتھ جذبِ دل سے اس کی میراث کی نگہداشت بھی تو ہو ۔
اتفاق کی بات ہے کہ ہم آج شہرِ اقبال میں جمع ہوئے ہیں
اور میں خالد سے درخواست کروں گی کہ وہ وقت کے تقاضے کو
سمجھیں اور اپنے سارے علم اور جذبے کو بروئے کار لائیں ۔
ہمیں اُن سے اُمید رکھنی چاہیئے کہ اب پاکستان کی دیومالا اُن کی منتظر

لہ محترمہ جمیلہ ہاشمی نے یہ مضمون "حلقۂ اربابِ ذوق"
سیالکوٹ کے زیرِ اہتمام منعقدہ "عبدالعزیز خالد
کے ساتھ ایک شام" میں پڑھا تھا جس کی انہوں
نے صدارت بھی کی ——— (ادارہ)

ہے۔ ہمارے سارے المیے، ساری شکستیں اور ہمارے ماتم۔ جو
یک شہرِ آرزو کے نہیں دُنیائے آرزو کے ہیں اُن گیتوں میں ڈھلیں
گے۔ وہ گیت جو عربی، فارسی، یونانی، عبرانی، لاطینی اور ہندی
کا عالم ہوئے بنا بھی ہماری سمجھ میں آسکیں گے کیونکہ وہ خالص
احساس اور جذبے سے وجود میں آئیں گے۔ ہمیں اب مزید مضمون
کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو اس انتشار کے بعد اُن گیتوں کو سننے کی
خواہش ہے جو دردِ ملت سے اقبال کو بے تاب کر دیتے تھے۔
خالد بیشک مصحفی کی طرح دیوان مرتب نہ کریں مگر بقول شورش
کاشمیری اُن میں سالارِ کارواں بننے کی ساری صلاحیتیں ہیں۔ اور
پھر اُن کے سمندِ شوق کو تازیانوں کی بھی ضرورت نہیں وقت کا سیل
اُن کی طبیعت کے سیل کو تھام لے گا کہ کمال نے نوازی آخر کس
دن کے لئے اُنہیں بخشا گیا تھا۔ شاعری تو جزو پیغمبری ہے۔ وہ
منو ہر گردھر بنے دیس دیس کی گوپیوں کے ساتھ بہت گھوم لئے اب اُنہیں
نہایت سنجیدگی سے غور کرنا اور اپنے کو بدلنا ہے۔ پاکستان کی اس
قوم کو اگر وہ احساسِ زیاں دے سکیں تو بہت ہوگا۔ جب یہ احساس
ہو جائے گا تو شاید کوئی دن ایسا بھی آئے کہ اُس زیاں کی تلافی
ہم کر سکیں۔ ہمارے بچے خالد کو صرف سلوگن کا خالق ہی نہ سمجھیں۔
سلوگن زندگی کے جنگل میں ایک پگڈنڈی تو ضرور ہے شاہراہ نہیں۔
کہانی لکھنے والے کو یہ خیال بھی ہونا چاہیئے کہ قصۂ خواب آور اسکندر و جم
کا قصہ بیت گیا ہے۔ ہمارے ایوانوں میں صفِ ماتم بچھی ہے
یہ صدا نسکڑتی سرحدیں جیسے سکڑتی ہوئی خلقت کی زندگی سے
تھی جانے پناہ ہو اس سیاہ رات کو گذارنے کے لئے ہمیں آتش نوا
مغنی کی ضرورت ہے۔ شعلہ بیان شاعر کی خواہش ہے جس کی صدا
ہمارے لئے جلوۂ سحر بن جائے۔

[13] خالد صاحب کیا آپ سالارِ کارواں بن کر یہ پرچم نہیں تھامیں گے؟

شہزاد احمد

عبدالعزیز خالد کی ترجمہ نگاری

شاعری بنیادی طور پر دو سطحوں پر کی جاتی ہے ۔ ایک تو مظاہر اور اس کے تعلقات کے بارے میں تاثراتی شاعری ہے ۔ یہ شاعری عمل یا ردِ عمل دونوں صورتوں میں ہو سکتی ہے جو کچھ نظر آتا ہے اس کے بارے میں منفی یا مثبت احساسات ، یعنی اخلاقی نظریات اور وہ اخلاقیات جو حکمران طبقوں سے سیکھی گئی ہوں یا حکمران طبقے چیزوں کے بارے میں جو نظریات رکھتے ہیں اس فلسفے اور اخلاقیات کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی نہ کسی سطح کی عینیت متعلق کر دیتے ہیں تاکہ واہمے کی حد تک آسودگی کا احساس موجود رہے اور انسان کے اندر بغاوت کے جذبات اگر پیدا ہوں بھی تو وہ مستقبل کی آسودگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُن کا اظہار نہ کرے اور زندگی کے دکھوں میں آسودگی تلاش کرتے کرتے مسالک رویہ اپنا لے ۔ مقصد اس سارے عمل کا یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے اس کو جوں کا توں قائم رکھا جائے ۔

البتہ بعض اصلاحات کی طرف اشارے کر دیئے جائیں ۔ ایسی اصلاحات جو اگر ہو بھی جائیں تو ان سے حکمران طبقوں کی حکومت کے اختیارات میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا ہو ۔ یہ شاعری بظاہر کیسی ہی باغیانہ کیوں نہ ہو معاشرہ میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں لا سکتی اور عام طور پر حکمران طبقات کے لئے کسی طرح کی بھی پریشانی کا باعث نہیں بنتی ۔ اس لئے حکمران طبقے اس کے متعلق منفی یا مثبت کوئی بھی ردِ عمل اختیار کریں عوامی سطح پر کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ ایسی شاعری عام طور پر فروعی اور ذاتی مسائل تک اپنے آپ کو محدود رکھتی ہے اور کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتی جو اجتماعی سطح پر محسوس کیا جا سکے ۔ لہٰذا لسانی تجربات سے لے کر راشد صاحب کی نظموں تک یہی رویہ کارفرما رہتا ہے اور حکمران طبقوں کی حکمرانی کی مدت کو بڑھانے میں شعوری یا لاشعوری طور پر معاون ثابت ہوتا رہتا ہے ۔

دوسری سطح کی شاعری محرکات کی شاعری ہے ۔ یہ چیزوں کے ظاہر کو نہیں بلکہ باطن کو دیکھتی ہے اور یہ ایسا رویہ ہے جو آسمان پر بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیکھ کر طوفان کی پیشین گوئی کرتا ہے اور چونکہ اس کا تعلق ان عوامل سے ہوتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتے اس لئے بعض اوقات اس کے محرکات کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ ان نظموں کا مقصد معاشرے میں بنیادی معاشی تبدیلیاں لانا ہوتا ہے تاکہ معاشرہ بہتر حالات میں قائم کیا جا سکے ۔ زبان خواہ کیسی ہی ہو تمثیل استعمال کی جائے یا نہ کی

گئی ہو، مطالب وہ نہیں ہوتے جو مظاہری شاعری کے ہوتے ہیں۔ ہوچی منہ کی نظموں کو دیکھنے کے بہت دور ہیں۔ بہت سے دوستوں نے اس کتاب کے بارے میں یہ کہا ہے کہ اس قسم کی شاعری تو بہت سے شاعروں نے ہمارے ہاں کی ہے۔ اُن کے اس اشتباہ کی ایک وجہ تو نظموں کا وہ دھیما لہجہ ہے جو بظاہر بغاوت کا سبق نہیں دیتا بلکہ ایک قیدی کا دکھ بیان کرتا ہے۔ مگر مختلف قیدیوں کے دکھوں میں انفرادی فرق ہوتا ہے۔ جس جیل خانہ میں ہوچی منہ قید ہے اس میں جواری بھی محبوس ہیں۔ ہوچی منہ پریشان ہے کہ اسے منفی قوتوں سے برسرپیکار ہونے کے لئے آزاد ہونا چاہیئے تھا مگر جواری خوش ہیں کہ قید خانے میں ان کو جوا کھیلنے کی آزادی ہے۔ ایسی آزادی جو جیل سے باہر نہیں مل سکتی۔

چنانچہ آزادی کے بھی دو تصور ہیں۔ حکمرانوں سے آزادی اور کھل کھیلنے کی آزادی۔ یہی فرق آج کل کے ہپی ازم اور انقلابی تحریکات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہپی ازم کی شاعری مظاہر کی شاعری ہے جو شراب اور عورت کے مقاصد کو تو لکھ سکتی ہے مگر عورت کو معاشرے میں مرد کے برابر حقوق دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ انقلابی شاعری عورت کا سراپا بیان نہیں کرتی لیکن اسے معاشی طور پر مرد کے برابر لے آتی ہے اور استحصال کے سارے راستے بند کر دیتی ہے۔

مشرق میں سیاسی آزادی اور شاعری کا آپس میں گہرا تعلق رہا ہے۔ ماؤزے تنگ اور ہوچی منہ کی نظمیں اس کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ یہ وہ شاعری ہے جس میں تخیل اور قوت عمل الگ الگ سمتوں میں سفر نہیں کرتے بلکہ فرد اور معاشرے کے مسائل کی سطحوں کو بھی ایک ہی مقام پر منطبق کر دیتے ہیں۔ خود ہمارے ہاں صوفیا نے اپنی اپنی سطح پر اسی کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ شاہ حسین سے لے کر بلھے شاہ اور میر خواجہ فرید تک آزادی کا تصور ہر طرح کے استحصال سے آزادی ہے۔ "انسان سے انسان کی آزادی" یہی جذبہ جب سیاسی شعور کے ساتھ بیدار ہوتا ہے تو قوموں کی قسمتوں کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

ماؤزے تنگ اور ہوچی منہ کے ہاں بنیادی جذبہ یہی ہے مگر اس کے ساتھ عمل کے طریقے زیادہ سائنسی اور تاریخی شعور رکھنے والے ہیں۔ یہ تاریخی ادوار کا فرق ہے۔ ماؤ اور ہو انسانی تاریخ کے لیے موثر یہ ظاہر ہوئے جب استحصال سے آزادی حاصل کرنے کا علم خاصا ترقی یافتہ ہو چکا تھا۔ ان دونوں شاعروں نے جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو تاریخی حالات انہیں تقریباً ایک جیسے ملے۔ البتہ جغرافیائی حالات قدرے مختلف تھے جنہوں نے دونوں کے لئے انفرادی مسائل پیدا کئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جب چین اور انڈوچائنا کو جاپان سے خطرہ لاحق ہوا تو دونوں رہنماؤں نے اپنے اپنے ملک کے محب الوطن عناصر کو دعوت عمل دی۔ یہ دعوت عمل صرف متفقین تک محدود نہیں تھی، بلکہ کچھ مدت کے لئے طبقاتی منافرت کو پس پشت ڈال دیا گیا تاکہ پہلے سامراج سے آزادی حاصل کی جائے پھر اس کے بعد مقامی حکمران طبقات سے آزادی حاصل کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس عمل کے دوران میں اگرچہ پہلا تضاد طبقاتی تضاد تھا مگر طبقاتی تضاد کو کبھی فراموش بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اپنے ساتھیوں پر تنقید روا رکھی گئی تاکہ منزل کی تلاش کرتے کرتے کہیں صحیح راستے کی سمت ہی غائب نہ ہو جائے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ انڈوچائنا اور چین کو جاپان سے نہ صرف خطرات تھے بلکہ جاپان حملہ آور ہو چکا تھا اور ہزار کوشش کے باوجود چیانگ کائی شک جاپان کی مدافعت کو تیار نہ تھا۔ ہوچی منہ کے لئے جاپان کے علاوہ فرانسیسی سامراج بھی ایک مسئلہ تھے۔ دونوں سامراجی طاقتیں انڈوچائنا کے ملک پر اپنا قبضہ ہر قیمت پر چاہتی تھیں۔ ان حالات میں اگر چیانگ کائی شک کی حکومت جاپان کی مدافعت کے لئے تیار ہو جاتی تو جنگ آزادی لڑنا زیادہ آسان ہو جاتا۔ چنانچہ چیانگ کائی شک کے ٹولے سے بات کرنے کے لئے ہوچی منہ نے چین کا سفر اختیار کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہوچی منہ ان ویت نامی عوام سے ملنے چین گئے جو وہاں آباد تھے۔ ہوچی منہ کا نام بھی انہوں نے اس سفر میں ہی اختیار کیا تھا جب وہ چین میں داخل ہوئے تو

علاقائی حاکموں نے ان کو گرفتار کر لیا تھا۔ اُن کے اس بیان پر کہ وہ ویت نام کی جمہوریت پسندوں کے نمائندے ہیں اور چین کے اعلیٰ حکام سے ملنا چاہتے ہیں اُن کی پوزیشن کو اور بھی مشکوک کر دیا۔ چنانچہ ان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے جیلیں تبدیل ہوتی رہیں۔ ہوچی منہ کو بیڑیاں پہنا کر بیس بیس کوس کا سفر پیدل کروایا گیا۔ کھانے کے لئے انتہائی گھٹیا چیزیں دی گئیں اور وہ بھی بہت ہی کم مقدار میں۔ چنانچہ وہ جسمانی طور پر بے حد کمزور ہو گئے مگر روحانی سطح پہاں کا ارادہ چٹانوں کی طرح غیر متزلزل ہو گیا۔ "پرواز عقاب" کی تمام نظمیں اس دور کی پیداوار ہیں۔ (۴۳-۱۹۴۲ء) یہ نظمیں جیل خانے میں نہایت خستہ کاغذوں پر لکھی گئیں۔ ان کی حیثیت بھی انتہائی ذاتی تھیں۔ یہ نظمیں عام طور پر چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ انہیں ہم رباعی تو نہیں البتہ استاد کرم کی زبان میں چوبرگے کہہ سکتے ہیں۔ یہ روسی علاقہ کی ایک روائتی ہیئت ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نظمیں ویت نامی زبان کی بجائے چینی زبان میں تحریر ہوئیں۔ وہ اس لئے کہ ہوچی منہ خواہ مخواہ اپنے محافظوں کے دل میں شکوک پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر وہ چینی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں لکھتے تو ایسا ہونا لازمی تھا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ان نظموں میں بظاہر ایک تھکا ہارا قیدی اپنی آزادی کے لئے بیقرار نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ذرا غور سے ان نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ قیدی کا نپتی بھوک پیاس، تھکاوٹ کے باوجود ایک بے قرار روح ہے جو قید کی بجائے میدان جنگ کی موت کو فوقیت دیتی ہے۔ ان نظموں میں قید خانے کے چھوٹے چھوٹے واقعات کا ذکر ہے مگر ان سے بڑے بڑے نتائج نکالے گئے ہیں۔ فطرت کے ساتھ انسان کا تعلق اس قدر گہرا ہے کہ وہ ذرا ذرا سے فطری منظر کو دیکھ کر روح کے اندر تازگی محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً کبھی بانسری کی لے شاعر کے کانوں تک آتی ہے یا آسمان کا کوئی چھوٹا سا حصہ نظر آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو پھر سے آزاد فضا میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ ساتھی قیدیوں سے اس کا رویہ اس قدر انسانی ہے کہ وہ ایک ان پڑھ قیدی کے لئے پٹیشن لکھتے وقت مروجہ القابات تک استعمال کر دیتا ہے حالانکہ وہ اپنی ذات کے لئے یہ کہنے کو تیار نہ ہوتا۔ پھر وہ نظم ...... جب ایک قیدی کی بیوی اپنے خاوند کو ملنے کے لئے آتی ہے تو شاعر جیل کے غیر انسانی ماحول کو کس بری طرح محسوس کرتا ہے۔

بے شمار باتیں ہیں جو ہوچی منہ کی نظموں کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں مگر آج کا موضوع محض ہوچی منہ کی نظمیں ہی نہیں ہیں، عبدالعزیز خالد کا اردو ترجمہ "پرواز عقاب" بھی ہے۔

ترجمے کے بارے میں عام طور پر دو مکاتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو ترجمے اصل کے عین مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر الہامی کتابوں کے ترجمے اس زمرے میں آتے ہیں۔ دوسرا مکتب فکر ترجمہ کرتے وقت تھوڑے بہت رد و بدل کو روا رکھتا ہے، وہ اس لئے کہ پڑھنے والے کو ترجمہ غیر مانوس معلوم نہ ہو۔ اس مکتب فکر کے بعض مترجم ترجمہ کرتے کرتے اصل سے دور بھی نکل جاتے ہیں اور اکثر اوقات اپنی طرف سے کچھ اضافہ یا کمی بھی کر دیتے ہیں۔ مجھے اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ عوامی جمہوریہ چین سے ویت نام کی بعض کہانیاں اردو میں ترجمہ کر کے ریڈیو پر پیش کی جا رہی تھیں۔ ایک کہانی میں بتایا گیا تھا کہ ایک مفلس ویت نامی گھرانے نے اپنے کھانے کے لئے ایک کتا پال رکھا تھا جسے اب کی اٹھا کر لے گئے۔ چنانچہ مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے اس کتے کی بجائے بھیڑ بنا دیا تو اس بات پر خاصی لے دے ہوئی کہ کتے کو بھیڑ میں تبدیل کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ چونکہ ہمارے ہاں کتے کھائے نہیں جاتے اس لئے خوردنی چیز کے طور پر کتے کا غائب ہو جانا ہمارے لئے کوئی المیہ پیدا نہیں کرتا۔ چنانچہ ہمارے لئے یہ کہانی اس صورت میں قابل قبول ہو سکتی تھی کہ وہ ہماری خوردنی عادات کے مطابق بنا دی جائے۔

شاید اسی اصول کے پیشِ نظر خالد صاحب نے ترجمے نہ صرف آزاد کئے ہیں بلکہ ان میں بہت سے مصرعوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ کوشش انہوں نے یہ کی ہے کہ نظموں کو ہماری روایت کے مطابق بنانے کے لئے ان میں بعض ردیفوں کا اضافہ کیا جائے۔ ایسے تمام مصرعے جو خالد نے خود شامل کئے ہیں بریکٹوں میں دیئے گئے ہیں تاکہ اگر کوئی قاری اصل تلاش کرنا چاہے تو کر سکے۔ اگرچہ خالد صاحب کا ارادہ نیک ہے مگر اس سے ایک بنیادی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اب ہوچی منہ کی نظموں میں اردو شاعری کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ اردو شاعری جو ابھی تک جاگیرداری اور کسی حد تک سرمایہ داری اقدار کی شاعری ہے لہٰذا بعض اضافوں سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان موجود ہے۔

میں مثال کے طور پر ہوچی منہ کی ڈائری کی پہلی نظم لیتا ہوں۔

اس کا انگریزی ترجمہ کچھ یوں ہے۔

Reciting verse has not been one
of my habits but now in
prison, what else have I to do
the captive day, I'll spend in
writing poems and singing these,
bringing near the day of freedom.

اس کا حرف بحرف ترجمہ خالد صاحب کی زبان میں کچھ یوں ہو سکتا تھا:

شعر خوانی کی مجھے عادت نہیں
لیکن اب زنداں میں میں اس کے علاوہ کیا کروں
نظمیں لکھ کر بسر کروں گا اب یہ عرصہ قید کا
اور اُن نظموں کو گاتے گنگناتے یومِ آزادی کو میں لے آؤں گا نزدیک تر

خالد صاحب نے اس نظم کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے:

شعر خوانی کی مجھے عادت نہیں۔
(گو رہا اکثر عزم دل آگہی جیں)

لیکن اب زنداں میں میں اس کے علاوہ کیا کروں؟
(بے قراری سے بھی ملتا ہے طبیعت کو سکوں
باعثِ جمعیتِ خاطر بنے شورِ جنوں
دل نہ تڑپے تو رگوں میں منجمد ہو موجِ خوں
انشراحِ صدر ہے سرکردن سوزِ دروں)
نظمیں لکھ کر سر کروں گا اب یہ عرصہ قید کا
اور اُن نظموں کو گاتے گنگناتے (اِس طرح
کارواں وقت خفتہ پا پہ شبخوں مار کر)
یومِ آزادی کو میں لے آؤں گا نزدیک تر!

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس نظم میں اردو شاعری کی روایت کس طرح داخل ہوئی۔ خالد صاحب نے نہ صرف نظم کا ترجمہ کیا ہے بلکہ اپنے خیال میں اس کے چھپے ہوئے معانی بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں نظم نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ خالد صاحب کے علاوہ جن حضرات نے ہوچی منہ کی بعض نظموں کا ترجمہ کیا ہے انہوں نے یہ التزام نہیں کیا۔ اس سلسلے میں سجاد باقر رضوی کے تراجم قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے چار مصرعوں کا ترجمہ چار مصرعوں میں کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح اضافے یا تفصیل کی گنجائش کم ہو گئی ہے۔

تراجم کو پسند کرنے والے لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں بعض تفسیر مانگتے ہیں۔ دوسرے اصل کے مطابق تراجم کو فوقیت دیتے ہیں۔ بہرحال یہ سوال موجود ہے کہ تہذیب اور خاص طور پر نظموں کے ترجمے کس طرح ہونے چاہئیں؟ بعض تو اس حد تک کہتے ہیں کہ نظموں کے ترجمے نثر میں کرنے چاہئیں تاکہ اصل میں تھوڑی بہت تبدیلی جو ردیف قافیے اور وزن کے باعث پیدا ہوتی ہے کا بھی امکان نہ رہے۔

میرا مطلب نہیں ہے کہ میں یہ کہوں کہ خالد صاحب کے ترجمے ادب میں کس مقام کے حامل ہیں۔ یہ تو نقادوں کا کام ہے۔ میرے خیال میں خالد صاحب اردو کے بہت اہم شاعر ہیں اور اردو کے علاوہ بھی کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ ان کا ترجموں کے بارے میں اپنا ایک نقطۂ نظر ہے جس سے اختلاف ممکن نہیں ہے لیکن انہوں نے جس محبت کے ساتھ یہ ترجمے کئے ہیں اور جس طرح ترجمے کرتے ہوئے پنجابی کے بعض الفاظ کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے اُس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ اس وقت جب ہمارے ملک کو آزادی کی ضرورت ہے سامراجی طاقتوں کا اثر و رسوخ ہمارے ہاں بڑھ رہا ہے۔ یہ تراجم بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ اس میں یہ جذبہ موجود ہے کہ ہم اپنی قوتوں پر انحصار کریں اور تمام محب الوطن عناصر کو یکجا کر کے پہلے استعماری بیرونی اثرات سے آزادی حاصل کریں اور ہر استحصالی نظام کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیں۔ ہوچی منہ کا تجربہ جو اَب تاریخ میں بطاہر ہم سب کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ اب چھوٹی چھوٹی قومیں بھی اپنی آزادی اور حقِ خودارادیت کے لئے دنیا کی بڑی سے بڑی سامراجی طاقتوں سے فاتحانہ جنگ لڑ سکتی ہیں۔

باقر مہدی

عبدالعزیز خالد کی شاعری

ایک ایسے شاعر کے بارے میں لکھنا خاصہ دشوار ہوتا ہے جس کو "نقادوں" نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہو اور خود شاعر نے اپنے کلام کے چاروں طرف "خاردار تار" لگا رکھے ہوں۔ اگر ایسے شاعر کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس کا مطالعہ اور اس پر تنقید دلچسپی سے لکھی جا سکتی ہے مگر عبدالعزیز خالد کے بارے میں دو ایک جملوں میں تبصرہ چند مضامین میں ضرور مل جاتا ہے جیسے ڈاکٹر سید عبداللہ کے مختصر مضمون "اردو کا دس کا ادب" (ہمایوں ۱۹۵۸ء) یا محمد حسین کے مضمون "ہماری شاعری کے نو برس" (ادب لطیف کا سالنامہ ۶۰ء) —— —— لیکن ان جملوں سے مطالعے کی تحریک بھی نہیں ملتی!

یہ پچھلے سال کا واقعہ ہے کہ میرے ہاتھ میں "زنجیر رم آہو" دیکھ کر سردار جعفری نے کہا "یہ اردو کا ایذرا پاؤنڈ ہے" ظاہر ہے یہ جملہ تعریفی نہیں تھا بلکہ ان کے خیال سے "بیحد مشکل اور مہمل شاعری" کا مجموعہ ہے۔ مگر اس فقرے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ خالد کے بارے میں ایک عجیب قسم کی عصبیت کام کر رہی ہے۔ ابھی اس واقعہ کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ اتفاقی طور سے جمیل الدین عالی سے ملاقات ہو گئی۔ اختر الایمان کے ہاں شعر و شاعری کا ذکر ہو رہا تھا میں نے باتوں ہی باتوں میں کہا کہ "خالد کی شاعری ایک چیلنج ہے" —— عالی چونک پڑے اور انہوں نے خالد کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سنانی شروع کیں۔ کیسے چار سال کے کم عرصے میں خالد نے عربی زبان سیکھی اور پھر بڑے ڈرامائی انداز سے

میمن[1] صاحب سے ملاقات کا قصہ سنایا۔ بات یہ تھی کہ خالد اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک بار ان سے ملنے گئے تو انہوں نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ اور ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ ملنے گئے اور ایک پرزے پر عربی کے چند شعر لکھ کر بھیجے اور پھر میمن صاحب سے ملاقات ہوئی ——————— حالی اپنے مخصوص انداز میں خالد کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور ہم دیر تک گفتگو کرنے کے باوجود خالد کے بارے میں کسی "فیصلے" پر نہ پہنچ سکے۔ ایسے اور بھی چند واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے میں نے خالد کی شاعری کا مطالعہ شروع کر دیا۔ چند نظمیں اور غزلیں پڑھ لینا اور کسی نتیجہ پر پہنچنا نہایت غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ شاید بیشتر لوگ اپنے ذوق کی تکمیل اسی طرح کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مقبولیت زیادہ تر ایسی شاعری کو حاصل ہوتی ہے جو بظاہر خوبصورت اور مترنم ہو جیسے ساحر لدھیانوی اور شکیل بدایونی کی بیشتر شاعری۔

ایک ایسے دور میں جب کہ ترقی پسند شاعروں کا اثر تیزی سے ختم ہو رہا ہو اور جدید شاعروں کی نظمیں ندرت، جولانیٔ طبع اور تجرباتی انداز کی تلاش کی مظہر ہوں تو سنجیدہ شاعری میں مسلسل منہمک رہنا ایک مرحلے سے کم نہیں ہے یہی نہیں کہ شہرت اور مقبولیت کے سامنے دروازے ایسے شاعر کے لئے بند ہوتے ہیں بلکہ ہمت افزائی کی ایک کرن تک ملنا مشکل نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے ان دشواریوں کے باوجود اگر کوئی شاعری جاری رکھتا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ اسے ضرور کوئی اہم بات کہنی ہے اور اس طرح خالد کی شاعری میرے لئے بھی ایک چیلنج بن گئی اور یہ مضمون اسی کا ایک جواب ہے۔

جون ایلیا نے اپنے ایک تبصرے میں لکھا ہے ؛

> "جواں سال خالد خاص تحریک کے ماتحت کام کر رہے ہیں اس تحریک کا منشا یہ ہے کہ اردو ادب کو خاص طور پر اردو شاعری کو دنیا کی منتخب ترین شاعری کی سطح کے برابر لانے کی کوشش کی جائے۔"
>
> (انشاء ستمبر ۵۹ء)

اس تبصرے سے خالد کی شاعری کے مطالعے میں کچھ مدد ملتی ہے لیکن سنجیدہ شاعری کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک شعری معیار کی ضرورت ہے کیا اردو شاعری کا مطالعہ اس معیار کی تعمیر نہیں کرتا؟ — اور اگر تعمیر کرتا ہے تو دنیا کی عظیم شاعری کارناموں کے برابر لانے کا سوال کیوں پیدا ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ خالد کے پیشِ نظر یہ بات رہی ہے کہ اردو

---

[1] میمن صاحب شعبہ عربی علی گڑھ یونیورسٹی کے صدر رہ چکے ہیں۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔

شاعری میں کتنے ہی عظیم شعری کارنامے منتقل نہیں ہو سکے ہیں اور اسی لئے انہوں نے منظوم ترجموں کے کام انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ کوشش اس لئے کہتا ہوں کہ ترجمے کا کام ایک رنگ کو دوسرے رنگ میں بدلنے کے کام سے بھی مشکل ہے ایک شعری مزاج کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ایک طرح کی نئی تخلیق سے کم نہیں۔

دنیا کے جو چند بہترین مترجم گذرے ہیں ان میں پاسترناک کا بھی شمار کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس نے اپنی زندگی کا اہم حصہ شیکسپیر کے ڈراموں کے ترجموں میں صرف کیا تھا وہ ایک مضمون میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"میرا خیال ہے (جیساکہ دوسروں کا بھی ہوگا) کہ متن سے مطابقت رکھنے کے لئے لغوی صحت یا یکساں فارم ہی کی ضمانت کافی نہیں ہے جیسے کہ تصویر کشی میں مشابہت بغیر جاندار اور قدرتی انداز کے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح مصنف کے لئے یہ ضروری ہے ویسے ہی مترجم کے لئے بھی لازمی ہے کہ وہ وہی ذخیرہ الفاظ استعمال کرے جو اس کے لئے فطری ہو اور ادبی صنعت کاری کے اسلوب سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ترجمے کو زندگی کا تاثر قائم رکھنا چاہیئے جیساکہ اصل متن میں ہو نہ کہ لفظی ــــ"

(عظیم مضامین از نوبل پرائز یافتہ ۱۹۶۰ء)

یہ اقتباس صرف اس لئے دیا گیا ہے کہ بورس پاسترناک ایسے بڑے غنائی شاعر نے مترجم کے "خطرناک رول" کو اپناتے وقت زبان کے مسئلہ کو اوّلیت دی تھی اور سب سے پہلی شرط فطری انداز بیان کی رکھی تھی تاکہ تخلیق کی زندگی دوسرا جنم لینے کے بعد بھی نہ صرف قائم رہے بلکہ شاداب بھی۔

اسی لئے اسٹیفن زویگ نے اپنی خود نوشتہ سوانح حیات "کل کی دنیا" میں تراجم کی اہمیت اور دشواری پر اتنا زور دیا تھا کیونکہ مترجم کو نہ صرف معنی کو دوسری زبان کے قالب میں ڈھالنا ہوتا ہے بلکہ ایک پیکر کی تخلیق کرنی پڑتی ہے جس کی آواز بھی متن سے ملتی جلتی ہو ــــ شاید خالدؔ نے اس دشوار گذار راہ پر چلنا اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ شاعر کی شخصیت، علمیت اور ذوق و شعور کا ایک بڑا امتحان ہے اور اس راہ میں ہر قدم پر ڈگمگانے کے ساتھ ساتھ ثابت رہتے ہوتے بھی لہولہان ہو جانے کا "یقینی خطرہ" بھی رہتا ہے۔ اس لئے میں نے ابتدا میں کوشش کا لفظ استعمال کیا تھا۔ شاید ہی کسی مترجم کو وہ عظیم مرتبہ ملا ہو جس پر لغزشوں کی تہمت نہ لگی ہو یا اعتراض نہ کیا گیا ہو ــــ اس طرح اس کی کامیابی پر ہمیشہ سوالیہ نشان لگا رہتا ہے اور اسی لئے ہر دور میں عظیم ادب کے نئے نئے ترجمے کئے جاتے ہیں

خالدؔ نے ترجمے کے لئے جو تخلیقات منتخب کیں وہ موضوع اور فارم دونوں لحاظ سے عہد قدیم کے کارنامے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے سیفو کی شاعری اور حضرت سلیمان کے نغمے ــــ

قدیم کارناموں سے اتنی والہانہ محبت کا اظہار شاید ہی کسی نئے شاعر کے کلام میں ملے گا ——
اس سے پہلے کہ ان تراجم پر اظہار رائے کروں، ایک نکتے کو اور بیان کرنا چاہتا ہوں۔
اور وہ ہے خالد کا قدیم ادبیات، اساطیر اور علم الاصنام سے لگاؤ۔ اگر یہ صرف مطالعے تک ہوتا تو بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن اس نے ان کی شاعرانہ شخصیت کی نشوونما میں نمایاں حصہ لیا ہے اس لئے یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر انہوں نے اپنی شاعرانہ فکر کی تعمیر کے لئے قدیم سرچشموں سے رشتہ جوڑنا اتنا ضروری کیوں سمجھا؟ ——

اس سوال کے کئی جواب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو عظمت کی خواہش ہے دوسرے مانے ہوئے کارناموں سے تعلق خاطر بڑھانے میں اور بھی کئی فوائد ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ خطرات بھی۔ عصری ادبی رَد سے ایک قسم کی علیحدگی یا فرار، زمانۂ حال کے مسائل کو قابل اعتنا نہ سمجھنا اور اس طرح گذرے ہوئے زمانوں کی آواز بازگشت بننے کی خواہش صدا بصحرا بن سکتی ہے۔ خالد نے "ماتم یک شہر آرزو" میں اپنے عقیدے کا یوں اظہار کیا ہے:

"راقم الحروف کا عقیدہ ہے کہ خودی زندہ و بیدار ہو، شخصیت خود گزیدہ و محکم ہو تو اثر پذیری ہمیشہ خیال انگیزی اور خاطر افروزی کا باعث ہوتی ہے۔ تخلیق کیا ہے یہی تاثر و تاثیر، اختلاط و احتراز، داد و ستد کا عمل ہی تو ہے"

یہیں نہاں خالد کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ "کائنات میں کون سی چیز بالکل نئی ہے"
اس کے پیش نظر ان کی شاعری کو جانچنے کے لئے دو معیار ایک ساتھ ابھرتے ہیں۔ کیا ایسے شاعر کے سرمایہ کو دنیا کے عظیم شعراء کی بلند سطح کے مقابلے میں رکھنے کی جرأت کرنی چاہئے۔ یا ایک ایسے شاعر کے کلام کا جائزہ لینا چاہیے جو اعلیٰ شعری اقدار کو اپنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ دوسرا معیار زیادہ مناسب ہوگا اس لئے کہ پہلا معیار نظر تو وقت کا ایسا نقاد خود ہی کرے گا اور ہمیں اس آخری سطح (گو کہ شعر و ادب کی آخری سطح معین نہیں کی جا سکتی کیا پتہ کہ شیکسپیئر سے بڑا شاعر اب بھی پیدا ہو جائے۔ اس لئے کہ عظمت کے مینار کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے) پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ خالد نے قدیم و جدید کارناموں (اس لئے کہ وہ رلکے کے نوحوں کا ترجمہ بھی کر رہے ہیں) کو نظم کرنے کی جرأت کر کے اپنے کو ایک مسلسل امتحان میں ڈال رکھا ہے جو عذاب الیم بھی ہے اور راحت عظیم بھی —— بہرحال اردو شاعری ایسے اقدام کو لبیک کہے گی۔

سیفو کی شاعرانہ اہمیت سے منکر ہونا ممکن نہیں ہے ہاں اس کو ایک عظیم شاعرہ سمجھنا آج کے ادب کے طالب علم کے لئے خاصہ دشوار ہے گو کہ اس کی مدح میں افلاطون و سقراط سے لے کر لارڈ بائرن تک کے بیانات ملتے ہیں اس کے نغمے میں یقیناً ایک رومانی حسن، ایک مدھم نغمگی اور

کہیں کہیں خوبصورت امیجری ملتی ہے مگر میرے رائے میں وہ اپنی شخصیت کی وجہ سے ایک داستان (لیجنڈ) بن گئی تھی۔ اور پھر یونانی بیحد حسن پرست ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مبالغہ اور فنون کو ایک طرح کی "الوہیت" دینے کے عادی ہے اس لئے ان کی آراء کو تنقید شعری کا بلند معیار قرار دینا آج درست نہیں سمجھا جاسکتا۔ جیسا کہ میں نے تحریر کیا کہ سیفو کی شاعری میں چند خوبیاں ہیں لیکن جذباتیت، ہم جنسی لذتیت اور رومانی سطحیت کی بھی خاصی کار فرمائی ہے۔ اس لئے سیفو کی شاعری دلچسپ بن سکتی ہے عظیم نہیں۔ میں ملیگر کی رائے سے متفق ہوں کہ "اس کی نظمیں مختصر ہیں مگر گلاب کے پھول ہیں"

اس کی نظموں کے مجموعہ کا خالد نے دلکش نام رکھا ہے "سرود رفتہ"۔

یہ ترجمہ اس لئے قابل مطالعہ ہے کہ خالد نے بیحد آسان، دلنشیں اور مترنم زبان میں اس کو ڈھالا ہے اور اس "الزام" کی تردید کی ہے جو ان پر اکثر لگایا جاتا ہے یعنی مشکل اور ناہموار انداز بیان۔

چند مختصر نظمیں ملاحظہ ہوں۔

نارنجی، سیمگوں، سنہری
رنگ و رامش کی دیویوں نے
دے کر مجھے پڑ بہار تحفہ
احساس نشاطِ بیکراں کا
آہستہ سے ہاتھ میں تھمایا
پروانہ بقائے جاوداں کا

یہاں رنگ و رامش کی دیویوں سے مراد ۹ میوز ہیں۔ یہ مختصر نظم سبک، رواں اور معنی خیز ہے۔ اس حقیقت سے تو انکار ممکن نہیں ہے کہ سیفو جاوداں بن گئی اور اس کی عشقیہ شاعری کا اثر کتنے ہی نامور شعراء نے قبول کیا۔ اور یہ بھی صحیح ثابت ہو گیا ہے

ہم صفحۂ ہستی سے کبھی مٹ نہ سکیں گے
رشتہ ہے شہیدوں سے حیاتِ ابدی کا
آتی ہے صدا پچھلے پہر چرخ بریں سے
کوئی نہ کوئی تم کو سدا یاد کرے گا

ایک اور نظم دیکھئے منظر کشی اور جذبات کا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہے۔

چاند کا زرد سرمریں چہرہ
قلزم نیلگوں میں ڈوب گیا

شعلۂ پروین کا بجھ کے راکھ ہوا
رات بیت گئی، گریز پا لمحے
منزلِ لند کو روانہ ہوئے
سیج سونی ہے خوابگہ تنہا
اے شبِ تار! اے دلِ رسوا!!

اور وہ کلاسیکی تغزل بھی ہے جو عشقیہ شاعری کی جان کہلاتا ہے — ایک شعر کی نظم تو کسی خالص غزل گو کا ایک شعر معلوم ہوتی ہے ؎

گرتی ہے میری پلکوں سے جو شبنمِ سرشک
لے جاتے غم کے ساتھ اسے بھی نسیم کاش

سیفو ایسی نشاط و طرب کی متوالی شاعرہ جب موت کے بارے میں سوچتی ہے تو بھی پُرلطف بات کہتی ہے۔

موت اک زشت و ناگوار شے ہے
پوچھ لو چاہے دیوتاؤں سے!
گر یہ ہوتی بہیج و خوش آیند
زندہ رہ د آپ کیوں نہ مر جاتے

آخر میں "پردہ ساز" کے عنوان سے یونانی دیویوں اور دیوتاؤں کے بارے میں مختصراً اشارات بھی ہیں تاکہ اردو شاعری کا قاری سرِ دست سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے۔ خالد اس مجموعہ میں اکثر جگہ کامیاب رہے ہیں اور کہیں کہیں تو ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

دوسرا ترجمہ "غزل الغزلات" حضرت سلیمان کے ترجموں کا آزاد ترجمہ ہے۔ یہ افسانوی حد تک دلچسپ ہے اور ایک ہی نشست میں پوری کتاب پڑھی جا سکتی ہے۔ خالد نے "اشارات" کے تحت اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ حوالوں کے ذریعہ مفہوم کو مختلف قصص سے واضح کیا ہے۔

اس میں تہذیب و تمدن سے پہلے کی زندگی کے نقوش تاریخی یادگاروں کی طرح ابھرے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے اس دور کی ترجمانی کرتے ہیں جب کہ قبائلی زندگی نے زراعتی دور میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اس میں بیباکی، والہانہ پن اور انگوروں کی لہک ملتی ہے۔ یہ نغمے واقعی نغمے ہیں جن میں آہوِ رم خوردہ کی ساری وحشت اور اسرائیلی قومی ادب عہد نامہ عتیق کی کتنی ہی کہانیاں ہیں۔

ایک حصہ ملاحظہ ہو ۔

کون ہے یہ جو بیاباں سے چلی آتی ہیں یوں
شانۂ محبوب پہ تکیہ کئے
ہاں جگایا میں نے نخلِ سیب کے نیچے تجھے
جس کو حاصل ہے شرف تیری ولادت گاہ کا
تجھ کو تیری والدہ نے جس جگہ بخشا جنم
اپنے دل میں دے جگہ مجھ کو نگینے کی طرح
اپنے بازو پر مجھے تعویذ کی مانند باندھ
عشق طاقت ور ہے مانند قضا
اور غیرت بے مروت جس طرح تحت الثریٰ
اس کے شعلے آگ کے شعلے ہیں مانند لہیب طوبیٰ
عشق کو سیل شتاباں کا بھلا اندیشہ کیا
کیا کرے گی موج سوز سرمدی کے سامنے ؟
باڑھ اسکو کیا ڈبائے گی بھلا ؟
آدمی سب کچھ اگر قربان کردے عشق میں
تو وہ ٹھہرے گا سزاوار حقارت جان لے

یہ نغمے بغیر اشارات کے اپنے اصلی معنی سے الگ ہو جائیں گے اس لئے اشارات میں خالد نے اس بات کا احترام رکھا ہے کہ وہ اپنے معنوی روابط قائم رکھیں ۔

ظاہر ہے اسکی شعری اہمیت اور مرتبے کے بارے میں کوئی حکمانہ رائے دینا نہایت دشوار ہے ۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ تبرک کے طور پر ہی سہی اس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے ۔ وہ لوگ جو قدیم زمانے کی روایات سے واقف ہیں انہیں اس کے لب ولہجے نامانوسیت کا احساس نہ ہوگا ۔ اردو شاعری کے عام قاری کے لئے بھی یہ نغمے فکر خیز ثابت ہونگے ۔

خالد نے اپنی شاعری ایک دائرہ تک محدود نہیں رکھی ہے بلکہ مختلف اصناف سخن کو آزمایا ہے اس لئے نہیں کہ ان میں سے ایک کو چن کر " اپنے خانے " میں بند ہو جائیں اور " مینا کاری " کے جوہر دکھائیں ۔ ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے اس لئے ان کے منظوم ڈراموں پر تبصرہ ذرا تفصیل طلب ہے ۔ ڈرامہ غنائی شاعری سے مختلف ہے ۔ اس میں واقعات کی ترتیب کردار نگاری مکالمہ نگاری کا فن ، زبان وبیان کے پیچ وخم ، لب ولہجہ کی نزاکتیں اور ڈرامائی فضا کے نشیب وفراز کے مراحل سے سابقہ پڑتا ہے ۔ خالد نے منظوم ڈرامہ اور شعری کھیل (پلے) ان دونوں کے فرق

کو کہیں ظاہر نہیں کیا تھا کہ انہوں نے یہ فارم کیوں اختیار کیا اس کے بارے میں چند جملے لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اس طرح ان کے ان ڈراموں کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہو گیا ہے ۔ یہ ڈرامے نہ تو اسٹیج کے لئے لکھے گئے ہیں اور نہ ہی ریڈیو کے لئے ۔ یہ مطالعے کے ڈرامے ہیں ۔ فرنسس فرگاسان نے اپنی کتاب " انسانی تخیل ڈرامائی ادب میں " دی ہیومن ایج ان ڈرامٹک لٹریچر میں ایلیٹ کے منظوم ڈراموں پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ایلیٹ دونوں کے فرق کو سمجھتے ہوئے بھی برتنے میں ناکام رہا ہے اسی لئے " کلیسا میں قتل " میں شعری حسن بھی کم ہے اور ڈرامائی عناصر بھی ۔ —— اس مسئلے پر کہ منظوم ڈرامے نثری ڈراموں کے مقابلے میں کیوں بہتر ہوتے ہیں ، ایلیٹ نے اپنے مضمون " شاعری اور ڈرامہ " میں اس پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ شاعری جن جذبات کی گہرائی اور تیزی کا پراثر اظہار کر سکتی ہے وہ نثر میں ممکن نہیں ہے اس لئے کہ شعر ان حدوں تک پہنچ جاتا ہے جہاں موسیقی کی حدیں شروع ہوتی ہیں ۔ شعری ڈرامہ انسانی عمل اور الفاظ کے اتصال سے موسیقی اور ڈرامائی کیفیات کی فضا بخوبی بنا سکتا ہے —— اس خیال پر تنقید کرتے ہوئے فرگاسان کہتا ہے :

> جب تک ایلیٹ یہ سمجھا ہے کہ ڈرامہ کا فن ایک شعری فارم نہیں ہے اور وہ بغیر نظم کے استعمال کے شعریت پیدا نہیں کر سکتا ۔ وہ ابسن اور چیخوف کے فن اور شیکسپیئر کے ڈراموں کے نثری حصوں کے بارے میں کوئی مکمل تصویر نہیں پیش کر سکتا ، اس لئے کہ آج کے دور میں پلاٹ ، کردار نگاری اور اسٹیج کی ضروریات کا لحاظ رکھنا بیحد ضروری ہو گیا ہے ۔ اور ایک غنائی شاعر کو ان مسائل سے سابقہ پڑتا ہے ۔ اسے ڈرامہ کو آرٹ کی ایک اہم صنف تسلیم کرنا ہوگا نہ کہ غنائی شاعری کا ایک حصہ —— اس لئے کہ عظیم ڈرامہ نگاروں نے اس کو اپنے اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے ۔"
>
> (انسانی تخیل ڈرامائی ادب میں ص ۱۰۴)

ہمیں خالد کے ڈراموں میں اس قسم کے مسائل سے واسطہ نہیں پڑتا اس لئے خیال گزرتا ہے کہ خالد نے اس صنفِ سخن کو بھی قدیم شعر و ادب سے والہانہ وابستگی کی وجہ سے اپنایا ہے ۔ ڈرامہ قدیم کلاسکی شاعری کی بنیاد اور مرکز رہ چکا ہے ۔ مکالمے فلسفیانہ نکات اور اخلاقی بیانات کے ترسیل کے اہم راستے قرار پا چکے تھے ۔ شاید خالد نے اس کو اپنانے میں ان مسائل پر زیادہ تفصیل سے غور و فکر نہیں کیا ہے اس لئے کہ ان کے بیشتر ڈرامے اسٹیج کی ضروریات سے معرا ہیں اور وہ ڈرامائی نظم اور منظوم ڈراموں کے درمیان کی کڑی بن کر رہ

گئے ہیں۔ ان میں قدیم ڈراموں کی پراسرار فضا پیدا کرنے کی کوشش کہیں کہیں کامیاب ہے مگر جیسا کہ ایلیٹ نے اپنے ڈرامہ "کاک ٹیل پارٹی" پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے شعوری طور سے اس بات کی کوشش کی ہے کہ شاعری ڈرامائی فضا کو کم نہ کر سکے اور اس طرح شاید اس 'کھیل' سے شاعری ہی مفقود ہو گئی ہے — خالد نے اتنی بے باکی سے اپنی "شکست" کا کہیں بھی اعتراف نہیں کیا ہے بلکہ وہ مسلسل تجربے میں مصروف ہیں — میں ان کے پہلے مجموعہ 'زرِ داغِ دل' کا بھی جائزہ لیتا لیکن خالد صاحب نے مجھے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ اس مجموعہ پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ اس لئے یہاں "سلومی" "دکانِ شیشہ گر" اور "برگِ خزاں" پر ہی اظہار خیال کیا جائیگا۔ ان تین کتابوں پر تفصیل سے لکھنے کے لئے ایک دفتر نہ سہی لیکن ایک طویل مقالے کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ پھر بھی ان کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے اس لئے کہ خالد کی شاعرانہ شخصیت میں ان کا بڑا دخل ہے۔

"سلومی" کا قصہ شہرۂ آفاق ہے اور اس موضوع پر کتنے ہی ڈرامہ نگاروں اور شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ خالد نے اس قصہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی ہے اور نہ انوئی کی طرح عہد حاضر کے کسی مسئلہ یا نکتہ کو علامتی طریقے سے پیش کیا (انوئی کی اینٹی گونی قدیم یونانی ڈرامہ نگاروں سوفوکلیز سے بڑی محبت ہے) کہانی وہی ہے کہ سلومی ہیرودیاس کی بیٹی یوحنا پر عاشق ہو جاتی ہے اور ناکام ہو کر اس کے خون کی پیاسی اور بادشاہ ہیرودیس اپنا قول ہار کر یوحنا کو قتل کرا دیتا ہے اور پھر آخر میں سلومی کو یوحنا کے ہونٹوں کو پیار کرتے دیکھا ہے اور غصے اور پشیمانی کے عالم میں اسے بھی اپنے سپاہیوں کی ڈھال سے کچلوا دیتا ہے — لیکن اگر واقعہ صرف اتنا ہو تو ڈرامے لکھنے کی اتنے شعراء و ادبا کوششیں نہ کرتے۔ اصل مسئلہ ایک حق پرست کا قتل اور محبت میں پوشیدہ نفرت کی باہمی آویزش ہے۔ خالد اس "مستفاد" ڈرامہ میں ایک پراسرار فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور یہ ڈرامہ کسی حد تک اسٹیج کی پابندیوں کو بھی پورا کرتا ہے لیکن شعری اعتبار سے اکثر جگہ سپاٹ اور ناہموار ہو گیا ہے شاید اس میں بھی وہ کمی رہ گئی ہے۔ جس کی طرح ایلیٹ نے اشارہ کیا تھا۔ بعض جگہ انداز بیان نہایت عامیانہ اور اشعار سوقیانہ ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعوری طور سے یہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے تاکہ ملکہ ہیرودیاس کی آوارگی

کا پہلو ابھر سکے۔ سلمیٰ کے حسن کو خاصی اچھی طرح پیش کیا گیا ہے مگر بجلی وہ ہے
جو خاکستر کر دے کہ نہ کہ چمک کر رہ جائے ۔ غالبؔ نے ایک شعر میں جو سماں
باندھا تھا اس کی جھلک تک نہیں ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے ؎

بجلی سی کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

البتہ ایک کردار شامی اس حسینہ کے بارے میں ایک تصویر کی چند جھلکیاں ضرور
پیش کرتا ہے ؎

شاہزادی نے چھپا رکھا ہے منہ پنکھے سے
سیمگوں ہاتھ پھڑکتے ہیں کچھ اس شدت سے
قمریاں جیسے ہوں بے تاب نشیمن کے لئے
چھاتیاں ہلتی ہیں پر تولتے پنچھی کی طرح
تتلیاں کرتی ہوں پرواز چمن میں جیسے

سلمیٰ کے لئے ایک اچھی منظر کشی کی گئی ہے وہ کہتی ہے :

چرخ پر بادل پھیلا ہے زمیں پر مخمل
چاندنی ایسے ٹھٹکتی ہے کہ پگھلی چاندی

چاند ہے پاک و خنک، جیسے کوئی دوشیزہ
کوئی منہ بند کلی کوئی اچھوتا موتی
گو کلف چہرے پہ ہے جسم ہے لیکن بے داغ
باعجز اس کے بدن کا ہے مقفل اب تک
کونے ہونٹوں کے دبانے کا ہے سوتا محفوظ
نیلے انبر پہ رواں چاند کا سیمیں بجرہ
جیسے کھیتی ہیں جواں سانولی سندر پریاں

دوسری دلہنوں کی طرح اس ابلا نے کبھی
بستر عیش کی زینت نہ بنایا خود کو
کبھی آغوش گلوگیر میں تڑپی نہ بھنچی
اس نے دیکھا نہ کبھی پنجہ و بازو کا فشار

مگر سلومی میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ اسے ایک تخلیقی کارنامہ کہا جاسکے۔ آسکر وائلڈ کا ڈرامہ بھی مزید مکالموں کی وجہ سے "غنیمت" ہے۔ حق و باطل کی کشمکش اس میں بھی ابھر کر نہیں آئی ہے اور خالد کی سلومی کا خاتمہ تو بہت ہی سوقیانہ کلام سے ہوتا ہے۔

البتہ اس موضوع پر منظوم ڈرامہ لکھ کر خالد نے میری اس دلیل کو ثابت کرنے میں خاصی مدد کی ہے کہ وہ مشہور موضوعات خاص کر جن پر مشہور ڈرامہ نگار اور شعراء نے کرم فرمایا ہے، اسے اکثر اپنے لئے چن لیتے ہیں جس سے انکی شاعرانہ شخصیت کا وہی پہلو سامنے آتا ہے جس کو پراسرار واقعات دیومالائی داستانوں اور "اہم مسائل" سے تعلق خاطر ہے۔

دکان شیشہ گر، ڈرامائی نظمیں اور منظوم ڈراموں کا مجموعہ ہے ــــ پہلا ڈرامہ "حریر رگ گل" (جو "ہم قلم میں" دکان شیشہ گر کے عنوان سے شائع ہوا تھا) کا موضوع بھی بیشتر یورپی شعراکی فکر کی جولانگاہ رہ چکا ہے۔ یہ اس مجموعے کی سب سے اچھی ڈرامائی نظم ہے۔ اسی موضوع پر شیلے کی بہترین ڈرامائی نظم "آزاد پرومے تھیس" ہے۔ اس کے پیش لفظ میں اسنے لکھا ہے کہ پرومے تھیس کی شخصیت ہی اس داستان کی دلچسپی کی مظہر ہے اور اسکو انسانی اخلاقی معیار کے علمبرداروں میں شمار کیا جاسکتا ہے جو مظلوم کا سچا، بے غرض دوست اور انسان کا "پہلا محسن" ہے۔ یہی نہیں شیلے نے ملٹن کی "جنت گمشدہ" کے ہیرو شیطان سے اس کردار کو بہتر شعری کردار قرار دیا ہے۔ اس نے 'یونانی دیوتا' پرومے تھیس کی کہانی کو اپنے خیالات کے مطابق نئے انداز سے آراستہ کیا ہے، خالد کی کہانی میں پرومے تھیس کے کردار کا صرف ایک پہلو ہی آسکا ہے۔ "تمام ممالک کی دیومالائیں اور داستانیں" کے مصنف رابنسن اور ولسن نے اس داستان کے ذکر میں لکھا ہے کہ پنڈورا نے مرتبان کھولا تو ساری آفتیں اور بلائیں نکل آئیں مگر امید رہ گئی۔ خالد نے امید کی جگہ "فریب آرزو" کی ترکیب استعمال کی ہے۔

شیلے کا یہ خیال صحیح ہے کہ اگر داستان کو ویسے ہی نظم کیا جائے تو کہانی میں دلچسپی بہت کم ہوجاتی ہے خالد نے اس پر توجہ نہیں دی اور اس موضوع کے اسی حصہ کو نظم کیا جس میں پرومے تھیس اپنے بھائی ایپی تھیس کو سمجھاتا ہے کہ دیوتاؤں سے کوئی تحفہ نہ لینا ــــ اس طرح وہ معلم اخلاق (یہاں یہ اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ خالد کو ہر شخصیت کا یہ پہلو بے حد پسند رہا ہے اسکے کردار میں ابھرتا ہے ــــ

پرومے تھیس "کے معنی میں "پیش بیں" اور ایپی تھیس "زود پشیمان" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک دورانہ نظمی ہے دوسرا جلد باز ــــ اس ڈرامہ سے پہلے خالد نے اس یونانی دیومالا کے بارے میں مختصراً اردو جاننے والوں کے لئے چند صفحات میں داستان بیان کردی ہے وہاں بھی انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ پرومے تھیس کو ہرکلیس نے اس "عذاب الیم" سے بچا لیا تھا جس میں زئیس نے اسے گرفتار کرکے مبتلا کردیا تھا ــــ بہرحال خالد کی نظم کا مقصد صرف کہانی دہرانا نہیں ہے بلکہ "نئی غلط بیانی"

کی تعبیر ال ہے تفتیش سے کرائے ہے اس طرح انسان کی کمزوری یعنی حسن پرستی نے یہ دنیا بسائی کی طرف کھلا ہوا اشارہ ہے۔

اس میں خالد کا لب و لہجہ اقبال سے متاثر ہونے کے باوجود اُن کا اپنا معلوم ہوتا ہے۔ یہی نہیں اس میں انہوں نے اپنی "اسلامی فکر" کا زئیس کی زبان سے اکثر جگہ اظہار کیا ہے۔ (سچ پوچھئے تو مجھے زئیس کا کردار پسندیدہ نہیں ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ٹرائے کی دس سالہ جنگ اسی نے کرائی تھی تاکہ انسانی آبادی کم ہو جائے اس موضوع پر ہومر کی "ایلیڈ" لکھی گئی ہے) —— شاید خالد نے اسی لئے "طین لازب" کا استعمال کیا ہے۔ کیونکہ آدم کی تخلیق بھی اسی سے ہوئی تھی۔

زئیس ہیفاسطس کے بنائے ہوئے مجسمے کو دیکھتا ہے (خدا نے بھی ایک مٹی کا پتلا بنانے کا فرشتوں کو حکم دیا تھا) اور طلاقانہ انداز سے کہتا ہے ؎

ہے ترا ساز مگر تشنۂ آہنگ ابھی
روح کا سرِ نہاں تجھ پہ عیاں ہو نہ سکا
رازِ منت کشِ اظہار و بیاں ہو نہ سکا
کس طرح کُن کی پُر اسرار صدا کرتی ہے
ایک قطرے کو گہر، ایک سطیفے کو بشر
میں نہ چاہوں تو یہ پتھر کے نگاریں پیکر
آشنا ہو نہ سکیں لذتِ بینائی سے
چمنِ دہر کے آئینِ خود آرائی سے
مسلکِ یوسفی و وضعِ زلیخائی سے
جب تک اس کو میں شناسائے تکلم نہ کروں
اس کو الہام کی بے تابیٔ جاوید نہ دوں

—— یہ ٹکڑا پر وقار لب و لہجہ کی معنی آفرینی کو اچھی طرح پیش کرتا ہے ——

اسی طرح پروے تھیس کا نظم میں "تعارف" اس کی "خود کلامی" سے ہوتا ہے خالد کی یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ منظر کشی بے حد دلکش کرتے ہیں مگر کہیں کہیں اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسکو کم و بیش اسی انداز سے پہلے بھی پیش کر چکے ہیں —— یہاں صبح کا منظر اس طرح پیش کیا ہے کہ پرومے تھیس کی دور اندیشی کا پہلو ابھر سکے ؎

نیلگوں بحرِ شفق پوش کی پہنائی میں
جھلکی مینائے سحر، کشتیٔ مہ ڈوب گئی

کہکشاں مانند ہوئی قرمزی موجیں ابھریں
رات بھر ذہن میں افکار پریشاں کا ہجوم
کسی آئندہ مصیبت کی خبر دیتا تھا
مطلعِ خور سے ابھرتے ہوئے خم دار خطوط
آج شاید نئے آلام کا مژدہ لائیں
قہرمانانِ فلک کی ستم آرائی سے
کب تلک موردِ آلام رہے گا احساس
دیدہ مطرود ہے سینہ مجروح

— یہ مصوری فکر اور رنگوں کا ایک خوبصورت امتزاج ہے اور اچھی شاعری کا ایک نمونہ کہلا سکتا ہے۔ اور اس شعر میں تو "مژدہ" کے معنی تک بدل دیئے ہیں۔ ؎

مطلعِ خور سے ابھرتے ہوئے خم دار خطوط
آج شاید نئے آلام کا مژدہ لائیں

اس لئے کہ اصلی 'مژدہ' تو یہی ہے کہ آدمی آلام سے برسرِ پیکار رہے — یہ شعر مجھے نجم آفندی کے اس شعر سے بہتر معلوم ہوتا ہے جو مجھے ایک مدت سے یاد ہے ؎

کوئی صدمہ ضرور پہنچے گا!
آج کچھ دل کو شادمانی ہے

غزل کا یہ شعر لکھنے کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ خالدؔ پر اکثر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے اشعار یاد نہیں ہو سکتے۔ بہرحال یہ اعتراض بڑی حد تک غلط ہے اس لئے کہ سنجیدہ اور علمی شاعری زبان زدِ خاص و عام نہیں ہوتی اور یوں خالدؔ کے کتنے ہی ایسے اشعار ہیں جو یاد بھی ہو جاتے ہیں۔

پرومیتھیس کی 'پرخلوص' بے غرضانہ انسان سے محبت کی خصوصیت اسکے کردار کی دلکش ترین قوت ہے جس نے اسے شعراء کا محبوب بنا دیا ہے۔ وہ اپنے کارنامے کا خود یوں ذکر کرتا ہے ؎

میرا طالع تو خلاؤں میں کہیں ڈوب گیا
وہ بھی احسان فراموش ہی نکلے آخر
دیوتاؤں سے تو پہلے کوئی امید نہ تھی
جب گھٹا ٹوپ اندھیروں نے طرب گاہوں کے
نفس کو آہنی حلقوں میں جکڑ رکھا تھا
میں نے ہی حضرتِ انساں پہ ضیا پاشی کی

سے کے ظلمت کدۂ غم میں بکھیرے انوار
دشت و صحرا کے حسینوں کی حنا بندی کی
کوہ و وادی کو دلآویزی و رنگینی دی
لیکن اس سعی سے آخر مرا لہنا کیا تھا
یہ گلوگیر خموشی، یہ عذاب جاوید
نہ تلطف، نہ مدارا، نہ نوازش، نہ نوید

لیکن خالد پنڈورا کی خوبصورتی کو لفظی جامہ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں جوش نے اپنی نوجوانی میں جنگل کی شہزادی میں جو حسن کا پیکر تراشا تھا وہ خالد کی پنڈورا سے زیادہ حسین ہے اس لئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جادوگر خود اپنے جادو سے مسحور ہے اور بس ــــ اپی میتھیس اپنی جلد بازی کا شکار بھی ہے اسی میں خودکشی بھی جیسے کہ عام انسان۔ اسی تے وہ پنڈورا کے ساتھ نئی خلد بریں کو آراستہ کرنے کا "خیال خام" رکھتا ہے۔

یہ ڈرامائی نظم اپنے موضوع اور بیان کے لحاظ سے اچھی خاصی نظم ہی نہیں ہے بلکہ خالد کی تجسس پسند فکر کی علمبردار ہے مگر کہ اس میں بھی وہی خامی ہے جو عموماً خالد کے "ڈراموں" میں پائی جاتی ہے یعنی کلائمکس نہیں تعمیر ہو سکا ہے اور خاتمہ کمزور مگر باقی ڈراموں کے مقابلہ میں یہ خامی یہاں زیادہ محسوس نہیں ہوتی اس لئے کہ نظم کا عام معیار خاصا بلند ہے اور پنڈورا، اپی میتھیس کے ذریعہ عورت اور مرد کی خصوصیات نہایت شعری انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ اسی لئے میں خالد کے اس ڈرامہ کو ان کا سب سے کامیاب "ڈرامہ" کہتا ہوں۔

ٹرائے کے موضوع پر اس مجموعہ میں دو منظوم ڈرامے ہیں ایک "لا" اور دوسرا "وفاداری بشرط استواری"۔ ایک میں موت دو یعنی ایک یونانی اور دوسرے ٹروجن کے سپاہی کو نشانہ بناتی ہے۔ اس کا موضوع یہی ہے کہ دو سپاہی الگ الگ ملکوں میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جنگجو سپہ سالاروں کی وجہ سے برسرپیکار ہیں۔ ورنہ وہ بھی عام انسان کی طرح ایک دوسرے کے دوست یعنی "سپاہی" جنگ سے عاجز رہتے ہیں اور امن کے خواہاں ــــ دوسرا ڈرامہ پیرس اور ہیلن کے عشق کے آخری دور کو پیش کرتا ہے یہی کہا جاتا ہے کہ ٹرائے کی جنگ ہیلن کی وجہ سے لڑی گئی تھی۔ اس ڈرامے کے شروع میں صرف کرداروں کے نام دیئے گئے ہیں اور خالد نے پیرس، ہیلن اور انونی کا تعارف چند جملوں میں بھی نہیں کرایا ہے۔ بہرحال

"تمام ممالک کی دیو مالائیں اور داستانیں" کے مصنف نے یہ فرض بخوبی انجام دے دیا ہے۔ پیرس پرائم اور ہیکیوبا کا دوسرا لڑکا تھا۔ پرائم ٹروجن کا بادشاہ تھا۔ پیرس کی پیدائش کے وقت اس کی ماں نے خواب دیکھا تھا کہ اسنے آگ کو جنم دیا ہے جس نے ٹرائے کو خاکستر کر دیا ہے۔ اس لئے پیرس کو کوہ ایڈا پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ شروع میں اس کی پرورش ایک ریچھنی نے کی اور پھر ایک چرواہے کے زیر سایہ وہ پروان چڑھا پیرس نام بھی چرواہے کا دیا ہوا ہے۔ اسے اسکندر بھی کہتے تھے۔ پیرس کی شادی انونی سے ہوئی تھی! انونی دریا کی دیوی سیبرن کی لڑکی تھی۔ اور اسکو چھوڑ کر پیرس ہیلن کا فریفتہ ہو گیا تھا۔ اور اسکو اغوا کر کے ٹرائے لے آیا تھا اسی لئے یونانیوں نے ٹرائے پر حملہ کر دیا تھا ـــــ پیرس زخمی ہونے کے بعد انونی کے پاس "مرہم" (بوٹیاں) کی تلاش میں بھاگا آیا لیکن اسنے علاج کرنے سے انکار کر دیا اور پیرس کے مرنے کے بعد پشیمانی کی وجہ سے خودکشی کر لی۔ اصل کہانی میں ہیلن تو اس وقت اپنے پہلے شوہر مینلاس کے پاس پہنچ گئی تھی ـــــ خالد نے کہانی میں اتنی تبدیلی کی ہے کہ ہیلن کو بھی پیرس کی تلاش میں سرگرداں دکھایا ہے۔ اصل موضوع یہ ہے کہ حسن اور وفاداری ساتھ ساتھ نہیں ہوتے، اور یہی نہیں وفا کا بدلہ بے وفائی ہی "زمانے" کا دستور رہا ہے۔ خالد کو اس "واقعے" میں پیرس کی شخصیت اور ہیلن کا مشہور کردار ہی دلکش نظر آیا ہوگا ورنہ اس میں کوئی ایسی بہت نمایاں کشش نہیں ہے لیکن ہیلن ہی (شاید) ساری کشش کا باعث ہو سکتی ہے اس لئے کہ افراڈائیٹ نے ہی پیرس کو ہیلن تحفتاً دی تھی کیونکہ پیرس نے افراڈائیٹ کو "سونے کا سیب" پیش کیا تھا ـــــ یہ ہیلن اور پیرس کے ملنے کی پہلی کڑی ہے نہ پیرس افراڈائیٹ کو سونے کا سیب دیتا اور نہ ہیلن کے عشق میں وہ مبتلا ہوتا ـــــ ٹروجن کے لوگ جنگ کی ذمہ داری پیرس پر ڈالتے تھے اور اسی لئے اس سے نفرت کرتے تھے۔ اس میں ڈرامائی فضا کی تعمیر خاصی اچھی طرح کی گئی ہے انونی اور پیرس کی جذباتی کشمکش کا "نقشہ" شوخ رنگوں کے بجائے سیدھے سادے مگر صاف انداز میں پیش کیا گیا ہے اسی لئے جیاں دار بڑا ہے کاری ہے ورنہ اچاٹ ـــــ انونی خود کلامی سے پیرس کی آواز سنکر چونکتی ہے اور اسے نڈھال دیکھ کر کہتی ہے۔ ؎

بار دگر تو اس جگہ آیا ہے کس لئے
کیا ختم ہے معاملہ پیرس کہو کہو ـــ!
کیا اب سکوں پذیر ہے اعصاب کا فشار
کیا کٹ گئی ہیں تیری گرانبار بیڑیاں
کیا تو فریبِ عشق سے آزاد ہو گیا

میں تیرا نقش پا تھی تری گرد راہ تھی
تو دل و قرار تھے کبھی ہم میں بھی چاہ تھی

لیکن اِنونی کو فوراً اس کی بے وفائی یاد آ جاتی ہے اور وہ اس سے دور کھڑی ہو جاتی ہے پیرس اس کو سمجھاتا ہے اور تنگ آ کر یہ کہتا ہے ؎

رسوا ہوا خراب ہوا مبتلا ہوا
وہ کون سی گھڑی تھی جو تجھ سے جدا ہوا

اِنونی — ممکن نہیں ہے جال کو بن کے ادھیڑنا
پیرس — آلہ بنایا اپنا مجھے دیوتاؤں نے
اِنونی — دل کا تو بے وفا تھا چنا اس لئے تجھے

—— اس طرح خالد نے اِنونی کی زبانی یونانی دیوتاؤں کی سب سے بڑی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ہمیشہ ایسے کرداروں کو آلۂ کار بناتے تھے جو کسی نہ کسی کمزوری کی علامت بن سکیں۔ پیرس بے وفائی کی، اپی میتھیس جلد بازی کی، ہیلن نفس پرستی کی —— اس میں کہیں کہیں اچھے اشعار کے حصے ملتے ہیں۔ مگر ڈرامائی فضا کو قائم رکھنے کے خیال نے خالد کی توجہ شاعری پر کم رکھی ہے پھر بھی کسی حد تک بیشتر منظوم ڈراموں سے اچھا ہے۔

مجھے اس مجموعے کی ایک ڈرامائی نظم "مشت مشرق" کا مرکزی خیال پسند آیا۔ یہ لیلیٰ مجنوں کی داستان کو نئے انداز سے پیش کرتی ہے یہاں مجنوں کا کردار عشق کی علامت ہے (عاشق کی نہیں) اور لیلیٰ حسن کی —— جو عشق کی ابتدا ہے اور اس کا ناقابلِ حصول مقصد کیونکہ یونہی آتشِ عشق برابر جلتی رہتی ہے اس نظم میں لیلیٰ جنت سے مجنوں کی تلاش میں نکلی ہے اور اس جستجو کو سات سال گذر گئے ہیں۔ پھر ایک دن صحرا میں وہ ملتا ہے لیکن لیلیٰ کو پہچان نہیں پاتا اس لئے کہ مجسم عشق خرد کی منزلوں سے کوسوں دور کا ایک غیر مرئی پیکر ہے جس کو لیلیٰ کی تلاش تک نہیں ہے بلکہ وہ تو عشق کے عرفان میں کھویا ہوا ہے۔ اس لئے لیلیٰ یہ کہتی ہے۔ ؎

لوٹا دو میرا سپنا، مرا خواب پھیر دو
جھانکا مری نگاہوں کی تاریک جھیل میں
اس کو تلاشِ خواب گریزاں تھی وا دریغ
بن دیکھے بولے پھر کہیں صحرا میں چھپ گیا
مجنوں سراب و داہمہ، لیلیٰ خیال و طیف
ہے اس جہاں میں کونسی شے کو ثباتِ حیف

کھو ئے گئے ہیں دونوں کہ دُنیا اجڑ گئی

اس نظم میں خالد نے عشق کے تصور کو اقبال سے الگ کر کے پیش کیا ہے ورنہ ان کا تصور اقبالی ہے اور وہ اکثر جگہ فرد پر طنز کرتے ہیں ـــــ شاید لیلیٰ مجنوں کے ذہنی قصے میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ وہ فلسفیانہ معیار پر پیش کیا جا سکے۔ اس کے پیش نظر خالد نے خاص کامیابی سے اپنے موضوع کو نظم کیا ہے اور اس نظم کا خاتمہ بھی بڑے ڈرامائی انداز سے ہوتا ہے۔

خالد کا دوسرا منظوم ڈراموں کا مجموعہ "برگِ خزاں" ہے۔ اس میں تین ڈرامے شامل ہیں۔ یہاں صرف ایک ڈرامے "قابیل" کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا ـــــ یہ موضوع خالد کا محبوب موضوع ہے۔ یعنی شیطان کا کردار اور قابیل کی سرکشی اور پشیمانی ـــ لیکن ملٹن اور اقبال دونوں کے شیطان کے کردار ان کے اپنے اندازِ فکر کے مطابق ہیں مگر خالد نے شیطان ویسا ہی ہوبہو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ اس کا ذکر مقدس کتابوں میں ہے اس لئے یہاں اس کی شخصیت نہ تو جاذبِ نظر ہے اور نہ ہی بلند بلکہ ایک حیلہ باز سی وہ بھی ایسا جیسے اپنی مکاری کو چھپانے کا گر تک نہ معلوم ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خالد کی تجسس اور فکر یہاں "گرفتار" نظر آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل "قصے" سے انحراف نہیں کرنا چاہتے۔ قابیل کا تحفہ خدا رد کرتا ہے لیکن اس کی وجہ تک بیان نہیں کی گئی ہے اس لئے کہ "قادرِ مطلق" اپنے اعمال کا جواز نہیں پیش کرتا بلکہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اسکے ماننے میں کوئی حرج ہو یا نہ ہو اس سے مجھے غرض نہیں لیکن منظوم ڈرامے میں اس کی وجہ سے ایک خامی آگئی ہے اور اکثر کردار یک رخے ہو کر رہ گئے ہیں اور جب تک پہلودار شخصیتوں کی کرداروں میں آمیزش و آویزش نہ ہو ڈرامائی فضا کی تشکیل بڑی حد تک ممکن نہیں ہے البتہ قابیل کا کردار اور دوسرے کرداروں سے مختلف ہے اس میں ذہنی کشمکش کے ساتھ ساتھ جرأتِ رندانہ کی صفت بھی ہے اور اس لئے وہ ایک ڈرامائی کردار بن سکا ہے ورنہ آدم و حوا اور ہابیل حتیٰ کہ خالد کا شیطان تک سپاٹ نظر آتے ہیں اور ان سے کسی قسم کی ڈرامائی عمل کی توقع تک پیدا نہیں ہوتی ہے۔ یہ تمثیل ترتیلی ہے یعنی مطالعہ کا ڈرامہ ہے اور اس مجموعہ کے تینوں ڈرامے مطالعے کے لئے لکھے گئے۔ شاید خالد نے انہیں ڈرامے کی صنف سے اس طرح الگ کیا ہے کہ یہ مکالماتی انداز کی طویل ڈرامائی نظمیں کہلائی جا سکیں اس لئے اب ان پر ڈرامے کی ذمہ داری اور پابندی نہیں رہتی اور اس میں شعری خوبیوں کو اجاگر ہونے کا زیادہ موقع ملتا ہے لیکن مکالمے اور کرداروں کی کشاکش سے ڈرامائی ماحول سا قائم ہو جاتا ہے اور یہ منظوم ڈراموں اور ڈرامائی نظموں کے درمیان کی "شے" بننے کے بجائے سیدھی سادی طویل نظمیں کہلائی جا سکتی ہیں مگر طویل نظم پر ڈرامے کے آداب کی پابندی نہ ہوتے ہوئے بھی ابتداء، روانی، منظرکشی اور

کردار نگاری یا ماحول کی تصویر کشی کلائمکس اور خاتمہ کے مراحل تو رہتے ہیں اس طرح طویل نظم بھی ایک نئی قسم کی پابندیوں سے ہر لمحہ دوچار رہتی ہے۔ خالد نے اس میں بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ اپنے موضوع کو پیش کیا ہے اور یہ یقیناً مطالعے کے لئے خاصے کی چیزیں بن گئی ہیں۔

"قابیل" تین ابواب پر مشتمل طویل نظم ہے۔ پہلا باب بیرون فردوس طلوع آفتاب کے وقت آدم حوا، ہابیل قلیمیا، یہودا اور ابلیس کے درمیان گفتگو پر مشتمل ہے دوسرے تحت الثریٰ میں اور تیسرا کرۂ ارض پر ___

یہ آدم اور حوا کے حمد سے شروع ہوتا ہے جس میں ہابیل اقلیمیا اور یہودا شریک ہو جاتے ہیں لیکن قابیل خاموش رہتا ہے اور آدم کے دریافت کرنے پر یوں گویا ہوتا ہے ؎

الم ہے میرے مقدر میں ابتہاج نہیں
مجھے نیاز فروشی کی احتیاج نہیں
عطا کیا ہے مجھے غم نے ذوقِ استغنا
مرا سکوت ہے اک احتجاج سرتاپا

___ لیکن قاری یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ کیسا غم اور کس نے غم عطا کیا ہے ___ خالد نے اپنی نظم میں اس قسم کی منطق کو جگہ نہیں دی ہے شاید اس لئے کہ اس "مقابلے" میں کیوں اور کیسے کی گنجائش نہیں ہے۔ آدم کی مسلسل مدح قدرت پر قابیل کہتا ہے ؎

قلق ہے گاہ، گہے اضطراب ہے دل کو
یہ کار زیست ہے یا سلسلہ سیاست کا
مجھے تو منتشر اجزائے کلیات جہاں
پیام دیتے ہیں آزادی و بغاوت کا

جب آدم، حوا، ہابیل اقلیمیا اور یہودا چلے جاتے ہیں تو خود کلامی کے انداز میں قابیل "زندگی" کے بارے میں ذرا تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں خالد اقبال کے تصورِ زندگی سے بڑی حد تک الگ ہو کر ایسے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جو آج کے انسان کے ذہن میں بھی لہراتے رہتے ہیں اور اس رجحان کی عکاسی نے ہی اس نظم میں تازگی کی جھلک پیدا کر دی ہے۔

قابیل کا خیال ہے کہ ؎

یہ زندگی ہے کہ منشور نامرادی کا
ہمیشہ برسرِ آزار و گوشمال و گزند
عناں گسیختہ، شوریدہ خو، فساد پسند

نہ ہوسکی کسی قانون کی کبھی پابند
وہی مقام، وہی فاصلے، وہی وحشت
یہ کاروان بلا بے درا روانہ ہے
وہی سفر، وہی واماندگی، وہی حسرت
خرد کی بخیہ گری ہے جنوں کی پردہ دری
نہ دن کو چین میسر نہ رات کو راحت
ز مہد تا بہ لحد اک گناہ بے لذت
یہ زندگی ہے کہ تعزیر جرم ناکردہ
فریب دانۂ گندم میں آ کے آدم نے
نعیم خلد سے انسان کو کیا محروم
وہ ذات جس کو خبیر و بصیر کہتے ہیں
جو جرم پوش و خطا بخش و لطف پرور ہے
خلف کو دیتی ہے آبا کی لغزشوں کی سزا
گناہ باپ کا اولاد بھگتے خمیازہ
عجب قضا ہے، عجب عدالت پناہی ہے
کھلا یہ مسئلہ اختیار و مجبوری
سمجھ سکے نہ ہم اسرار قربت و دوری
بنی ہے درد کی تصویر زندگی پوری
تمام طور طریقے ہیں تاسپرانہ
کہ دل ہے معرفتِ زندگی سے بیگانہ

— اس مصرعے پر آکر ایک جھٹکا سا لگتا ہے اور ایسا خیال آتا ہے کہ قابیل کو اپنے غم کا راز معلوم ہو گیا کیونکہ "زندگی کی معرفت سے دل بیگانہ" ہے مگر کیسی زندگی اور کس کی معرفت!

— میرا خیال ہے کہ خالد نے یہ مصرع قابیل سے کہلا کر اسے "باغی" بننے سے دور رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہابیل کے قتل کے بعد جب وہ ہابیل کا ماتم کرتا ہے تو سکون نہ سہی اُسے گناہ کی خلش ہمیشہ زندہ رکھے گی ورنہ قابیل کی موت ایک معنی میں نسل آدم کی موت بن جاتی۔ اور اب یہ ہوا کہ ابنِ آدم کی سرشت میں بغاوت اور پشیمانی دونوں کے عناصر ہمیشہ رہیں گے اور اس کی بخشش کے امکانات کے دروازے کھلے بھی رہیں گے — اس طرح جب تک درجات والے انسان جنتِ

گمشدہ پانے کی کوشش جاری رکھے گا ـــــ قابیل کا کردار بلند ہوا ہی تھا کہ کج ہو گیا اور اس آگ کی طرح آہستہ آہستہ بجھنے لگا جس کی تپش سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ ڈرامائی فضا کو روشن کرکے ہی دم لے گی مگر ـــــ

شیطان کا کردار اس نظم میں خاصہ کمزور ہے اور یہ خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی اقبال نے اسی کی زبان سے قصہ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو " کہلایا تھا یہاں تو یہ اپنی " فراست اور بغاوت " کی ملمع کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے لیکن آواز میں طمطراق ویسا ہی ہے وہ اپنا تعارف قابیل سے یوں کراتا ہے ۔ ؎

نہاد میں ہوں میں آذر سرشت میں شعلہ
دلوں کے راز قیافے سے بھانپ لیتا ہوں
کہ ہوں زمانے کا سب سے بڑا ستارہ شناس

یہاں تک ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ خالد نے بھی شیطان کے بھیس کو اس کے کردار کا اہم جزو قرار دیا ہے ـ یہی نہیں وہ ابن آدم کو بھی آدم ہی کی طرح بڑی چالاکی سے فریب دے گا اور پھر ابن آدم کو ایک نئی زمین کو بسانے کی سزا دی جائے گی مگر اسکے بعد کا مصرعہ اس کو خیال خام ثابت کر دیتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ ؎ ہے نام تو مرا ابلیس، کام ہے تلبیس

ـ اور خالد نے " تلبیس " کہہ کر شیطان میں جو دلکشی تھی وہ بھی چھین لی اس لئے جب وہ کہ کشش انکار کی تعریف بھی کرتا ہے تو بھی اسکے کردار کی تعمیر نہیں ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاغذی پیکر ہے اور بس ـــــ یہی نہیں خالد نے اس کو ایک ایسے آمر کے روپ میں پیش کیا ہے جو باغیوں کو پسند کرتا ہے مگر ان پر اپنی غلامی کی شرط بھی لگا دیتا ہے ـــــ یہاں تک کہ شیطان جب یہ کہتا ہے تو اس کی باتوں میں چمک آجاتی ہے مگر لمحاتی ؎

عمل کی حریت، افکار کی اباحت کا
میں ذوق و شوق زمانے میں عام کرتا ہوں
دلوں میں کرتا ہوں روشن چراغ خود نگری
صنم کدوں میں لٹاتا ہوں نور دیدہ وری
مقدمات تمنا، معاملات حسینوں
ہمیشہ ہوتے ہیں فیصل مری عدالت میں

ـــــ اس خامی (جس کا ذکر کیا جا چکا ہے) کے باوجود شعری اعتبار سے یہ اشعار یقیناً اچھے کہلانے کے مستحق ہیں ـــــ اور اسی مقام پر ایک اور اچھا شعری حصہ آتا ہے ؎

مرے فیوض کا اک اعتراف ہے یہ بھی

کہ ایک بندۂ آزاد خود فروش نہیں
یہی ہے مسلک ارباب اجتہاد و نظر
اسی سے قائم و دائم ہے آبروئے ہنر
یہی کہ مشرب مردان انقلاب پسند
کہ سر بلند ستاروں پہ ڈالتے ہیں کمند
تلاش رہتی ہے ایسے ہی سر پھروں کی مجھے
خرام موج ہو جن میں اور اضطراب سپند
شراب صد قدح آرزو خُم دل میں :

قابیل اپنے "سوالات" سے اور بھی زیادہ "متشائم" ہو جاتا ہے اسکے قنوطی ہونے کی وجہ اس کے سوالات میں ہی ہے بابیل نہ کچھ سوچتا ہے اور نہ اپنے ذہن کو "آزاد" کرتا ہے اسکے معنی یہ ہوئے کہ زندگی کے بارے میں سوچنا غم کی ابتدا ہے اس مسئلہ پر آج کا ایک ناول نگار البرٹ کامو بھی اسی نتیجے پر موت کے مسئلے پر غور و فکر کرتے ہوئے پہنچا تھا۔ اسکے بھی موت کے عقدۂ مشکل کی فکر میں غم کی اعلیٰ شاعری کا ترجمان بن گیا تھا مگر خالد غم کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہوئے بھی اپنی اسلامی فکر کا دامن نہیں چھوڑتے اور وہ دنیا میں زندگی کے لئے اُسے ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ دنیا فانی ہے اور فانی جگہ غم کی ہی آماجگاہ ہو سکتی ہے کاش خالد اس مسئلہ کو ذرا ہٹ کر سوچتے تو نہیں۔ اندازہ ہوتا کہ غم تو ملٹن کی "جنت کی جنت" میں بھی گھس آیا ہے اس لئے کہ آدم خواہ جنت میں رہے یا دنیا میں اُسے "غم" سے نجات نہیں اور اس طرح غم زندگی کا لازمی جزو بنکر جہد مسلسل کا علمبردار بن جاتا ہے اقبال اس "راز" سے واقف تھے اور انہوں نے اسلامی فکر کی نئی تشکیل میں اسے نمایاں جگہ دی تھی کیونکہ اس طرح زندگی و موت کے مسائل ایک دوسرے سے ٹکرانے یا ایک دوسرے پر ختم ہو جانے کے بجائے ہمیشہ جاری رہتے ہیں۔ ہاں مسئلہ کو یوں حل کرنے پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ ہم وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے تو آج ایلیٹ کی شاعری پڑھتے ہوئے بھی تو یہ خیال آتا ہے کہ ملٹن کی شاعرانہ اہمیت اور خیالات کو کم کرنے کے باوجود ایلیٹ صاحب "رومن کیتھولک" میں پناہ لینا اور "بادشاہی جمہوریت" کو ماننا ضروری سمجھتے ہیں ـــــ خالد نے اپنے کو ان مسائل سے یکسر نہ سہی بڑی حد تک الگ رکھا ہے کیونکہ وہ وہی واقعہ نظم کر دیتے ہیں جو مقدس کتابوں میں ملا ہے اور اپنے افکار کو تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہتے۔

اس نظم میں عربی شاعر متنبی کے کلام کا اقتباس بھی شامل ہے ـــــ اور یہ نظم "سوختہ دلی" پر ختم ہوتی ہے اور یہی "سوختہ دلی" نسل آدم کو ورثے میں ملتی چلی آرہی ہے مگر سکون کی جستجو کے ساتھ

ہی ساتھ — خالد کی یہ نظم ان کے شاعرانہ لب و لہجہ کو ایک معیار بخشتی ہے اور ان کے خیالات سے اختلاف کے باوجود مجھے اس نظم کی روانی، اور فکری ٹھہراؤ، امیجری اور صاف انداز کے امتزاج کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے اگر اس میں کردار کی تشکیل اور کلائمکس کا زیادہ خیال رکھا جاتا اس کے علاوہ تخیلات کی دلکشی برقرار رکھی جاتی تو یہ ایک "کارنامہ" بن سکتی تھی ویسے یہ اچھی نظموں کے زمرے میں اب بھی شامل کی جا سکتی ہے۔

"زنجیرِ رمِ آہو" خالد کی طبع زاد نظموں اور چند غزلوں کا مجموعہ ہے اس مجموعہ میں انہوں نے اپنی ایک اور کتاب "ماتم یک شہرِ آرزو" کی چند نظمیں بھی شامل کر لی ہیں کیونکہ وہ رد کر کے اب خالد اُس عنوان سے ٹالکے کے نوحوں کا منظوم ترجمہ کر رہے ہیں" ماتم یک شہرِ آرزو" کے آخر میں عرضِ حال میں اپنی ان نظموں کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

"یہ نظمیں جنہیں دل شاعر کا کنز مخفی کہنا چاہئے اس کی زندگی کی وہ مسرتیں، محرومیاں خواہشیں اور مسرتیں ہیں جو اس جہانِ رنگ و بو نے کردار الیوس بھی ہے بہیت السرار بھی قطرہ قطرہ، دجلہ دجلہ، خوشہ خوشہ، خرمن خرمن اُسے عطا کیں۔"

— یہ مجموعہ آخر میں مطالعے کے لئے رکھنے سے ایک "فائدہ" ہے اور وہ یہ ہے کہ قاری خالد کی سنجیدہ و علمی شاعری سے کافی واقف ہو جاتا ہے اور نوائے شوق پڑھتے ہوئے اُسے خیال آتا ہے کہ یہ شاعر اپنے بارے میں جو رائے قائم کرتا ہے وہ یقیناً قابلِ غور و فکر ہے۔ خالد نے اپنا تعارف، اپنی شاعری اور اپنی فکر کے اکثر رجحانات کا بیان اس میں نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ نوائے شوق ایک قسم کا "پیش لفظ" ہے جو شاعر کے عزائم اور عقائد کا اظہار ہے۔

فکرت جولاں پہ ہے عرصۂ آفاق تنگ
کیسے مقید ہے جذبِ دل بیکراں؟

ذہن کے ایوان میں خود سپرد و نیم خواب
حکمت و فن کے صنم شعر و ادب کے نگار

منزلِ فن دور ہے، عظمتِ فن دور تر
آہوئے دشتِ سخن، ہوتا ہے مشکل سے رام
مسندِ عظمت پہ ہیں خونِ جگر کے نشان
شہرتِ جاوید ہے ثمرۂ سوزِ دوام
در گہِ امید میں، میں ہوں غریب و فقیر
میری متاعِ حقیر، مایۂ تضحیکِ عام

خالقِ شام و پگاہ، ایک کرم کی نگاہ
پھرتا ہوں میں بے کلاہ۔ تاجِ بقائے دوام

اور یہ نظم ایک قسم کا دعائیہ انداز شروع سے آخر تک رکھتی ہے اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خالد کو اپنی منزل کی دوری کا شدید احساس ہے اور وہ کسی قسم کے مغالطے میں مبتلا نہیں جس کا شکار اکثر شاعر رہتے ہیں۔

اپنی ایک نظم ذکر و فکر میں "غمِ گیتی و غمِ جاناں" کی گفتگو کے بعد وہ اپنے فن کے بارے میں صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ وہ "زندان و کفن" کی شاعری کے بجائے "فکر و عمل" کی ترجمانی کرنا اپنا منصب سمجھتے ہیں تاکہ کھوئی ہوئی انسان کی عظمت واپس آجائے۔ ؎

تجربہ گاہِ حوادث میں پلا ہے مرا فن
کب تلک کرتے رہیں مدحِ اسالیبِ قدیم
ولئے بہ شیوۂ فرسودۂ ابنائے زمن
کب تلک شاہدِ نغمہ پہ سلاسل کی گرفت
کب تلک قسمتِ افکار ہیں زندان و کفن

— لیکن یہ نظم اقبال کے لب و لہجہ پر ختم ہوتی ہے اور انسان کی کھوئی ہوئی عظمت واپس لانے کا عزم کئی گوشے تشنہ رکھتا ہے کس دور کی عظمت اور کیسی عظمت؟ — کیونکہ اس مجموعہ میں ان کی ابتدائی نظمیں بھی شامل ہیں اس لئے کہیں کہیں آواز میں کچا پن بھی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر رک رک کر آہستہ آہستہ اپنی بات کہنے کے لئے دوسروں کے لب و لہجہ کو چھوڑنا چاہتا ہے اس مجموعے میں چند کامیاب اور اچھی نظمیں بھی شامل ہیں جو خالد کے اچھے طبع زاد شاعر ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور

یہ خیال آتا ہے کہ وہ دیومالائی قصص کے سہارے کے بغیر بھی اپنی فکر کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ خالد کی ایک نظم "دو آوازیں" میرے لئے ان کی "پہلی نظم" تھی جو ادب لطیف مارچ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم آج ان کی ابتدائی کوششوں میں شامل ہے مگر اس کے یہ شعر اب بھی بھلے لگتے ہیں ؎

ہمیں طلب ہے جہاں سے جہاں کا سوز و گداز
اسی تڑپ کو رہیں گے ہمیشہ شعلہ نوا
برہنہ سر تو ہیں پر ہیں رقیب گردش دہر
یہ خاکسار جہاں' بے نوا' حدیدہ قبا

"خاکستر پروانہ میں" انہوں نے اپنی "فکر" کو وجدان کی قید سے بھی آزاد رکھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ؎

جذبۂ تخلیق ہے تقلید خلق کبریا

خالد کی شاعری پر مذہبی رنگ زیادہ گہرا ہے اور فکر پر اسلامی نقطہ نظر کی مہر لگی ہوئی ہے۔ مجھے یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ کہاں تک ان کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہے یا اسنے ان کی شاعری کو "عقائد کی سنگینی" دے کر "گمراہ" ہونے سے بچا لیا ہے۔ اس لئے کہ اسکے بارے میں اس مضمون میں کئی جگہ ذکر کر چکا ہوں ـــ ہاں اسنے انہیں اکثر جگہ "اقبال کا ہمنوا" ضرور بنا دیا ہے جس سے ان کی فکر میں ندرت کی کمی اور آواز میں اثر کم ہو گیا ہے جس کی تلافی انہوں نے قدیم موضوعات کو دوبارہ شعری قالب میں ڈھالنے کی "مہم" سے کی ہے اور اس طرح اپنے شعری سرمایہ کو ایک "حلقہ" میں رکھتے ہوئے بھی "وسعت" دی ہے۔ اس مجموعہ کی نمایاں نظموں میں رسم و راہ منزلہا' اختر شناس اور غبار خاطر کامیاب کہی جا سکتی ہیں۔ رسم و راہ منزلہا' ایک آزاد نظم ہے اور اس میں بلا کی روانی ہے اس کے ساتھ ہی شعریت کا دامن اکثر جگہ چھوٹنے نہیں پایا ہے ؎

مرا ذہن کہتا ہے سب کارنامے کشادہ فضاؤں کے
مرہون منت رہے ہیں۔
سب آزاد نظموں کی تخلیق بھی زندہ
ماحول ہی میں ہوئی ہے۔
میں محسوس کرتا ہوں ایسے میں تعمیر ارژنگ مانی
و تخلیق فکر فلاطون و اقبال و غالب بھی مشکل نہیں ہے۔

یہی نہیں خالد "سربستہ حکمت" کو بھی سمجھ چکے ہیں ؎

جمال دنجابت کی سربستہ حکمت کو میں پا چکا ہوں
یہ حکمت ہے فطرت کے آزاد گہواروں میں سانس لینا

اور یہی وجہ ہے کہ جو مختلف "راہوں اور منزلوں" سے گزرنے کے بعد شاعر کو کیا ملے گا وہ تخلیقی سرمایہ اُسے عزیز ہوتے بھی لٹا دے گا ؎

جو خونِ جگر سے کماؤ گے دستِ سخاوت سے
اک دن لٹا دو گے آخر

اور یہ نظم ڈرامائی انداز سے ختم ہوتی ہے اس نظم کا خالد اپنی اکثر نظموں سے مختلف ہے۔ یہاں اس کی خود اعتمادی "عقائد" یا کسی اور کی فکر کی دامن گیر نہیں ہے اس لئے کہ وہ تجربات کو عزیز رکھتا ہے۔

میرے خیال سے اس مجموعہ کی سب سے اہم نظم غبارِ خاطر ہے جو اس کی آخری نظم بھی ہے۔ یہ طویل نظم گیارہ حصوں پر مشتمل ہے اور اس میں خالد نے بڑی آزادی سے اپنی "فکر پابند" کا کھلا ہوا اظہار کیا ہے مجھے اسکے چند حصے اپنے لب ولہجے کے سوز و گداز، منظر کشی خوبصورت امیجری اور "خاتمہ کا انداز" کی وجہ سے بہت پسند ہیں۔ نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

دستِ صبا نے کھولا منشورِ صبحگاہی
آشفتگانِ شب کو نجمِ سحر پکارا
حل ہو گئے شفق میں تاسفتگاں گردوں
مجمر میں جل بجھے ہیں اسپند دانہ دانہ

اور صبح کے منظر کے بعد شاعر اپنے دل کا سارا درد آہستہ آہستہ الفاظ میں یوں منتقل کرتا ہے۔ کہ دل کا درد باقی بھی رہے اور اظہار کا سلسلہ قائم بھی رہے۔ اور یہ حصہ یوں ختم ہوتا ہے ؎

مارِ سیاہ بن کر شانوں کو ڈس رہے ہیں
اے شامِ بدگمانی، کب دن طلوع ہو گا!

جہاں خالد کو "فکر زوالِ امت" کی دھن ہے اور وہ "فردوسِ گمشدہ" کا متلاشی ہے وہیں اس کے پانچویں حصے میں وہ تقلید کو مرگِ فن بھی کہتا ہے مگر بغاوت کا حامی بھی نہیں ہے بلکہ میانہ روی کا شیدا اور اقبال کی "شاعرانہ عظمت" کو ذوقِ بندگی کا فیضان کہتا ہے۔ یہ خوبصورت نظم اس شعر پر ختم ہوئی ہے۔

کامل اگر ہو انساں بنتا ہے دردِ درماں
ہے سوز و سازِ ایماں سرمایۂ سعادت

9 // 7 , 1

اس نظم میں خالد کی فکر اقبال کی عکاسی کرتی ہے انہوں نے مردِ مومن کے بجائے انسانِ کامل کو مستول دار رکھا ہے مگر ان کے بارے میں اقبال نے انسانی فکر کو ذرا زیادہ آزادی دی ہے (اگرچہ وہ بھی اسلامی حلقہ سے دُور نہیں جاتے) اور خالد نے اس سعادت کو بندگی کا مرہونِ منت سمجھا ہے۔

اس مجموعے میں جگہ جگہ فارسی شعراء کے اشعار بطور تضمین و اقتباس پیش کئے گئے ہیں جو یقیناً بڑا لطف دیتے ہیں لیکن ایک خامی کا کھلا ہوا اعتراف بن جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ خالد نے ان کے سہارے کو ضروری کیوں سمجھا؟ — بہرحال ان کے استعمال پر اور کوئی اعتراض ممکن ہے تو صرف یہ ہے کہ اردو کے عام قاری کے لئے ان کے ترجمے دینا چاہیے تھے تاکہ پڑھنے والے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں۔

طیورِ آوارہ میں بھی کئی اچھے حصے ہیں ایک حصہ ملاحظہ ہو۔

دفا میں شیر زباں، انجمن میں پیر مغاں
دل و نظر میں فروزاں، دفا کی قندیلیں
بہادروں کے لئے ایک گھر ہے سارا جہاں
بہادروں کی طرح ہم دفا رسے جی لیں!

— اور جو بہادروں کی طرح جینے کا حوصلہ رکھتا ہو اس کی فکر اتنی بھی محدود کیا ہو سکتی ہے جتنی کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے —!

خالد کی غزلوں میں وہ تغزل تو نہیں ہے جسے جانِ غزل کہا جاتا رہا ہے۔ پھر بھی چند "نشتر" سے ضرور ہیں ۔

تو میرے خندۂ مسرور پہ مطمئن نہ رہا
اک آرزو مرے پہلو میں سوگوار بھی ہے

پھر کوئی داستاں رقم ہو گی!
پھر کوئی دیکھتا ہے دزدیدہ

مہتاب وش نکھرتی ہیں افسردہ شوخیاں
اس چہرۂ صبیح پہ عکسِ ملال سے

واماندگیٔ دشت تحیر ہے اور میں
یہ مختصر حیات مگر مختصر نہیں

خالد کے یہ اشعار اس لئے پیش کئے گئے ہیں کہ ان کی "تنوع مزاجی" کے چند نمونے پیش کئے جا سکیں۔ انہوں نے جس روش پر بھی قدم رکھا ہے وہاں کچھ نہ کچھ کامیابی کے پھول کھل ہی گئے ہیں خواہ ان کی مہک تیز اور رنگ زیادہ گہرے نہ ہوں ـــــ میں اسے کارنامہ نہ سہی سعی پیہم کی کامیابی تو ضرور کہوں گا۔

خالد کی شاعری پر مجموعی طور سے نظر ڈالتے ہوئے ان کی زبان کا مسئلہ ابھر کر آتا ہے یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں ان کے کلام میں بے حد غریب الفاظ، ناہموار ترکیبیں، ثقیل مصرعے پائے جاتے ہیں۔ میں ان کے لئے کوئی جواز نہیں پیش کرنا چاہتا بلکہ ایک تجرباتی شاعر کے مسائل کے بارے میں مزید کہنے کی جرأت کروں گا ـ جب تک کہ الفاظ کا استعمال نہ ہو جائے اس کی خوبیاں اور خامیاں سامنے نہیں آتیں اور خالد کے یہاں بھی دونوں چیزیں موجود ہیں۔ وہ عربی اور فارسی کے نامانوس الفاظ کے استعمال میں کہیں کامیاب اور کہیں ناکامیاب رہے ہیں اس سے یہ فیصلہ کرنا کہ ان کا انداز بیان نہایت دقیق اور غیر شاعرانہ ہے صحیح نہ ہوگا اس لئے کہ ان کے یہاں سیدھے سادے دلنشیں اشعار کی بھی کمی نہیں ہے اور یوں بھی ایسے شاعر کے کلام میں یقیناً ناہمواریاں ہوں گی جو مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتا ہو، اور پھر فارسی اور عربی شاعری کا عمیق مطالعہ ہو تو اس کا اثر ناگزیر ہے۔ ان کی نمایاں خامی مشکل پسندی نہیں ہے بلکہ اجمال کی کمی ہے۔ عرصہ ہوا جوش کے سلسلے میں ایک رائے میں نے دی تھی کہ قادر الکلام شاعر کو سب سے بڑا "خطرہ" یہ رہتا ہے کہ وہ انتخاب کی نظر کھو بیٹھتا ہے چونکہ ایسا شاعر اکثر "پرگو" ہوتا ہے۔ اس لئے وہ آسانی سے اس کا شکار ہو جاتا ہے ـــــ اس طرح "قادر الکلامی" ایک "خامی" کے لئے راہ کھلی رکھتی ہے ـــــ خالد کی اس خوبی کا اعتراف بھی کرنا چاہئے کہ انہوں نے پہلی بار منظوم "ڈراموں" اور طویل نظموں کے ساتھ ساتھ منظوم تراجم کو اپنی شاعری میں بہت نمایاں جگہ دی ہے۔ میں ان کی شاعری کے لئے "بڑی اور عظیم" کے الفاظ استعمال نہیں کرتا اس لئے کہ ایک تو یہ الفاظ کثرت استعمال سے اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھے ہیں دوسرے خالد ایک تجرباتی شاعر ہیں جنہیں سعی پیہم کی عادت پڑ گئی ہے اور وہ محنت شاقہ، "فکر بلیغ" اور "سوختہ دلی" سے ایک ایسا کارنامہ تخلیق کرنا چاہتے ہیں جو شاہکار کہلایا جا سکے۔

خالد کی شاعری بڑی شاعری کے لب ولہجہ، اقدار اور معیار کے مسائل پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے ـــــ اور کیا یہ خالد کا ایک کارنامہ نہیں ہے؟ ـــــ

عاصی کرنالی

ادب کا ابوالہول

۱

میں ایک مجسمہ ساز کے پاس گیا۔ عبدالعزیز خالد کا مجسمہ بنا دو۔ اُس نے مہینے بھر کا وعدہ کیا۔ میں پھر گیا "کہاں ہے مجسمہ؟" "اُدھر پردے کے پیچھے" اس نے کہا۔ میں نے پردہ کھینچا۔ دو لمبی ٹانگیں، گزوں لمبی، پتھر کے طویل ستونوں کی طرح۔ "اتنی لمبی ٹانگیں؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔ "ہاں، بلکہ جتنی تم دیکھ رہے ہو اُتنی ہی زمین کے اندر ہیں۔ جنہوں نے جڑیں پھیلائے ہوئے"۔ "اور مجسمے کا سر کہاں ہے؟ شاید سر بنانا تو تم بھول ہی گئے؟" میں نے مجسمے کی اونچائی کی جانب دیکھتے ہوئے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "سر کے بغیر مجسمہ؟" "ٹھہرو اے شخص، میں ابھی آیا"۔ مجسمہ ساز اندر گیا۔ اور اُلٹے قدموں آکر کہا "لو، اپنی آنکھوں سے لگا لو، یہ دوربین ہے۔ اس کے بغیر تمہیں بلند چیزیں نظر نہیں آ سکتیں"۔ تب مجھے مجسمے کا سر نظر آیا۔ اتنا بڑا سر کہ میں نے کہا "مجسمہ ساز کیا یہ انسانی سر ہے" اور وہ مسکرا دیا!

۲

میں ایک خیاط کے پاس گیا "خالد کا لباس تیار کر دو"۔ اُس نے ایک ہفتے کا وعدہ کیا۔ میں موعودہ وقت پہنچا۔ قمیض، پاجامہ، بہت معمولی کپڑے کا، سلائی بھی عام سی۔ میں نے کہا "تم تو استاد مشہور ہو، یہ کیسے کپڑے ہیں؟ ایسی بے توجہی!" کہنے لگا "سارا ہنر میں نے اس پگڑی میں صرف کیا ہے۔ سونے کے تاروں سے اُسے کاڑھا ہے" پھر وہ پگڑی اٹھا لایا۔ تھان کا تھان، کہنے لگا "بڑے سر پر بڑی دستار زیب دیتی ہے۔ آپ جیسے شخص کی پگڑی بناؤں گا تو آدھ گز لٹھا کافی ہوگا۔ ویسے بھی گنجے آدمی کا کیا سر! کیا ننگی نہائے گی، کیا نچوڑے گی"۔ جب میں نے دیکھا کہ استاد کی زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے تو میں کپڑے دیا کر کھسک آیا۔

(۳)

میں ایک بڑے شہر کے بازاروں سے گزر رہا تھا۔ ایک نانبائی کی دکان پر بورڈ آویزاں تھا۔ لکھا ہوا تھا۔
"لذیذ شاہی مرغن کھانوں کی دکان"
دوسری سطر میں ذرا باریک قلم سے لکھا تھا
"کمزور معدوں والے حضرات کہیں اور تشریف لے جائیں"
مجھے معاً خیال آیا، کم بخت نے اپنے کھانوں کے پردے میں عبدالعزیز خالد کی کتابوں کی تعریف کر دی۔ میں عالم ذوق میں عبارت کو پھر پڑھا۔

لذیذ، شاہی، مرغن کھانوں کی دکان
کمزور معدوں والے حضرات کہیں اور تشریف لے جائیں

یہاں سے میرے ذہن میں ایک واقعہ آگیا۔ میں ایک بار ایک عالم سے ملا تھا۔ یہ حضرت اپنے قلم سے اپ آپ کو علامہ لکھتے تھے۔ میرے ہاتھ میں "دکان شیشہ گر" تھی۔ دیکھ کر کہنے لگے۔ "خالد کی کتاب ہے نا"؟ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور معاً علامہ پر سوال کر دیا۔ "خالد کی شاعری کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟" علامہ نے مجھ پر ایک سوال داغ دیا جو بظاہر غیر متعلق تھا۔
"یہ بتاؤ پلاؤ کے اجزا کیا کیا ہیں؟"
میں نے عرض کی "چاول، گوشت، گھی، مصالحہ وغیرہ"
فرمانے لگے "بالکل ٹھیک۔ خالد ان تمام اجزا کو ملا کر پلاؤ پکاتا ہے۔ لیکن ان اجزا کے ملنے سے خالد جو کچھ تیار کرتا ہے، وہ سب کچھ ہوتا ہے، پلاؤ نہیں ہوتا۔"
"اچھا!" میں نے متحیر ہو کر کہا۔ "یعنی آپ اجزاء کے تناسب اور طباخی کی مہارت کی بات کر رہے ہیں۔"
"آپ کچھ ہی سمجھ لیں، سارے خالص اور اصلی اور بہ افراط اجزا کے باوجود اس تیار شدہ طعام میں پلاؤ کا ذائقہ نہیں ہوتا" ۔ میں نے سکوت اختیار کیا اور چلنے کی اجازت چاہی۔
علامہ نے کہا "تمہارے پاس سکوٹر ہے مجھے بھی لے چلو، حکیم بندو کی دکان پر چھوڑ دینا۔"
"خیریت ہے علامہ"؟"
"خیریت کہاں ہے میاں۔ مریض ہوں، دائمی قبض رہتا ہے۔"

(۴)

ایک شاعر سر راہ ملے۔ میں نے کہا "حضرت! خالد کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟" انہوں نے ایک آ

سرد کھینچی۔ پھر ایک مدع کثرتِ آہ میں لپیٹ کر پڑھا۔

"تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم"

پھر کہنے لگے "کچھ وقت ہے؟" میں نے کہا "بہت سا۔" بولے "تو آؤ ایک جلسے میں چلیں، خالد کی مخالفت میں ہو رہا ہے"۔ میں نے کہا "چلو"۔ ہم ایک تنگ و تاریک اور متعفن سے راستے سے گزر کر ایک پرانی طرز کے نیم شکستہ سے گھر میں پہنچے۔ وہاں صحن میں ایک دری بچھی تھی۔ چند لوگ کہ ان کے چہرے سے حسرت اور عبرت ایک ساتھ ٹپک رہی تھی، سر نہوڑائے صمٌ بکمٌ بیٹھے تھے۔ ہم نے سلام کیا۔ ہمارا سلام ان کے سروں سے گزر گیا۔ ایک بات سے مجھے حیرت ہوئی۔ بعض حاضرین اونچی مخروطی ٹوپیاں لگائے بیٹھے تھے جیسے سرکس کے مسخرے لگاتے ہیں۔ بعض دری پر بیٹھنے کی بجائے مونڈھوں پر بیٹھے تھے۔ جہاں مسند صدارت بچھی تھی۔ وہاں ایک سیڑھی کھڑی تھی۔ خاصی بے محل لگ رہی تھی۔ شاید گھر والے رکھ کر بھول گئے ہوں۔ لیکن یہ اونچی، مخروطی، سرکسی ٹوپیاں، یہ دری کے باوجود اونچے مونڈھے۔ تب اچانک مجھ پر کشفِ حقیقت ہوا۔ یہ حضرات بے حد پست قامت تھے، بونے، ٹھنگنے اور مونڈھوں اور ٹوپیوں کی مدد سے قد بڑھانا چاہا تھا۔ لیکن کوتاہی قد تھی کہ چھلکی پڑتی تھی۔ لیکن یہ سیڑھی؟ یہ سیڑھی کے آخری سرے پر نظر گئی تو ایک کتبہ لکھا تھا

"جلسہ احتجاج"۔

"زیر اہتمام انجمن انسدادِ شہرتِ عبدالعزیز خالد"۔

اتنی دیر میں دروازے کی جانب سے ہلچل ہوئی۔ میرے ساتھی نے کہا "صدر محترم آئے ہیں"۔ صدرِ محترم داخل ہوئے۔ ہائے یہ کیا۔ طول بچک کر عرض میں تحلیل ہو گیا تھا۔ اتنے کوتاہ قد کہ چلنے کی بجائے رینگتے ہوئے آئے۔ لیکن ایک بات سب سے منفرد، نہ اونچی ٹوپی، نہ بغل میں مونڈھا محسوس ہوا کہ حقیقت پسند ہیں۔ لیکن یا مظہر العجائب یہ کیا! صدرِ محترم آئے اور سیدھے سیڑھی کی طرف لپکے اور چشم زدن میں اس کے آخری سرے پر جا بیٹھے۔ سر مبارک چھت کو چھونے لگا۔ اوپر سے آواز آئی "کاروائی شروع کی جائے"۔ سیکرٹری نے رپورٹ پڑھی۔ خلاصہ یہ تھا۔ کہ شعراء کی وادی میں ایک شخص نے کہ قبیلۂ جنات سے ہے قدم رکھا ہے اور جب سے قدم رکھا ہے اس کی سبز قدمی سے ہماری عظمت و شہرت کے باغات جل گئے ہیں، درخت سوکھ گئے ہیں۔ ظالم! دھڑا دھڑ لکھتا ہے، دھڑا دھڑ چھپتا ہے، ہاتھوں ہاتھ بکتا ہے، پڑھا جاتا ہے۔ اکاس بیل کی طرح ہمیں چمٹ کر گیا ہے۔ اس ابوالجنات کے دفینے کی کوئی تدبیر کی جائے۔

اس رپورٹ کے بعد مختلف حاضرین نے اپنی اپنی کہی اور رپورٹ کے مفہوم کی تائید کی۔ ایک شخص اٹھا، سٹیج پر آیا اور ایک کتاب بغل سے نکالی۔ کہا "یہ کلامِ خالد ہے۔ دیکھئے اس کا حشر"۔ پھر عالمِ غضب میں اُسے پارہ پارہ کر دیا۔ چھت سے صدر کی آواز گونجی "احمق! تو کس کس کتاب کو کہاں کہاں جا کر چاک کرے گا۔ اچھا بالفرض تو نے اس کے تمام ذخیروں کو آگ لگا دی تو تُو اس جن کی کھوپڑی کا کیا کرے گا۔ وہ کھوپڑی جو مضامین کی ٹکسال اور خیالات کا کمپیوٹر ہے؟" وہ شخص تڑپ کر بولا "میں اور میرے ساتھی اُسے اکیلے میں پکڑیں گے اور اس کا دھڑن تختہ کر دیں گے"۔

صدر نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "وہ یوں بھی قبضے میں نہ آئے گا۔ وہ بڑا قوی ہے۔ اُس کا بدن کسرتی ہے۔ وہ ورزش کرتا ہے۔ اُلٹے سر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہر وقت پھل کھاتا ہے۔ خصوصاً سیب اور بادام، اور روغنِ بادام مقشر سر پر ملتا ہے" آخر صدر کی رائے پر ایک ڈرافٹ تیار ہوا، اور مندرجہ ذیل فیصلے ہوئے۔

۱۔ اس کی کتابوں کا مطالعہ بند۔

۲۔ اُس کے جلسوں اور شاموں میں شرکت بند۔

۳۔ اُس کے خلاف پراپیگنڈا مہم تیز کر دی جائے

اور

ہم سب کا ایک ہی نعرہ ہو۔

خالد شاعر نہیں ہے۔

خالد شاعر نہیں ہے،

۴۔ حکما سے کہا جائے

کہ وہ روغنِ بادام بنانا بند کر دیں۔

۵۔ لاہور کے پھل فروشوں سے درخواست کی جائے

کہ اس کے گھر گلے سڑے پھل بھیجا کریں۔

آخر میں گڑگڑا کر خدا سے دعا کی گئی

کہ اے اللہ! اگر اب کے ملک میں سیلاب آئے تو سیلاب کو دو آنکھیں ضرور عطا کر دینا تاکہ وہ ٹیکسیشن کالونی کا رخ کرے۔ اور سب کچھ دریا برد ہو جائے۔

جلسہ کے خاتمے پر صاحب صدر سیڑھی سے اترنے لگے تو ٹانگ پھسل گئی۔ دھم سے نیچے گرے۔ اور سیکرٹری کی ٹوپی پر آ گرے۔ ٹوپی پچک گئی اور قد و قامت کا بھرم اور کھل گیا۔

۵

میدانِ حشر ہے۔ قیامت کی بھیڑ ہے۔ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے۔ ہر کوئی اپنے اعمال کے محاسبے میں مبتلا ہے۔ اچانک آواز آئی "ہٹو، بچو، دور باش" تب ایک شخص میرے قریب سے گزرا کہ اس کے سر پر ایک مرصع تاج تھا۔ جس کے موتی جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ پانچ موتی بڑے بڑے تھے۔ اور برقی قمقمے کی طرح روشنی کی چھوٹ ان سے چار جانب منعکس ہو رہی تھی۔ ایک موتی درمیان اور چار اطراف میں، بیچ کے موتی پر منور حرفوں میں لکھا تھا "فالتغلیط" چو طرفہ موتیوں پر مغنا، حمطایا، ماذ ماذ، طاب طاب تحریر تھا۔ وہ شخص میرے قریب سے نکلا چلا گیا، اور درِ جنت پر جا پہنچا۔ رضوان نے کہا پروانۂ راہداری دکھاؤ۔ غیب سے آواز آئی۔ یہ شخص پروانۂ شمعِ رسالت ہے۔ دروازہ کھول دو۔ وہ شخص

اندر چلا گیا۔ اور میرے گرد و پیش دیر تک خوشبوئیں اور روشنیاں رقص کرتی رہیں۔

۶

حشر ای اس بات کو ایک سال ہو چکا ہے۔ میں دوزخ میں مقیم ہوں۔ مقررہ سزائیں مقررہ وقتوں میں ملتی رہتی ہیں۔ ایک
ن فرشتے مجھے دوزخ کے اُس عقوبت خانے کی طرف ہنکا ئے لئے جا رہے تھے۔ جہاں گرز ہائے آتشیں سے ضیافت
ن ہوتی ہے۔ کہ اچانک ایک فرشتہ دوڑتا ہوا آیا اور میرے ہاتھ میں ایک لفافہ تھما گیا کہ یہ جنت سے آیا ہے۔ جلا دانِ دوزخ
ے گئے کہ خط پڑھ لو۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ عبد العزیز خالد کا خط تھا۔

" برادرم عاصی کرنالی!! افسوس ہے کہ تم سزا سے نہ بچ سکے۔ تاہم حوصلے اور صبر سے کام لو۔ خدا غفور الرحیم ہے۔
گے چند سطروں کے بعد لکھا تھا) میں جنت کی ایک بستی رحمت آباد میں مقیم ہوں۔ یہ کوچہ مداحانِ رسول کی سکونت گاہ
ہے۔ بڑے مزے سے گزر رہی ہے۔ کل ایک نعتیہ مشاعرہ ہوا۔ حضرت بوصیری نے صدارت کی۔ میں نے وہی نعت
ڑھی، جس کا مقطع تھا،

کہاں بوصیری و حسان بن ثابت، کہاں خالد
لگا ہے برمنِ ننگِ نیاگاں یا رسول اللہ

سعدی، جامی، عطار، خسرو، قدسی، گرامی، اقبال، سب نے مدحتِ رسول میں اشعار سنائے۔ میری نعت کو سبھی
نے پسند کیا۔ تم بہت یاد آئے۔ میرا کلام سنتے تو بے ساختہ داد دیتے
(آخر میں لکھا تھا)

کل ادب کالونی سے کہ ہماری بستی سے
نچ سو کوس کے فاصلے پر ہے، ایک شاعر آیا۔ کہتا تھا کہ ہم لوگ آپ کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب منعقد کرنے والے
ں۔ عاصی صاحب! میں نے جنت کے ایک سال کے قیام میں بارہ شعری مجموعے لکھ لئے ہیں، چھپ بھی گئے ہیں فردوس
پریس نے چھاپے ہیں۔ شاعر کہتا تھا، ان سب جنتی کتابوں کی تعارفی تقریب منعقد کرنے کا خیال ہے۔ اگر ایسا ہوا تو
ب تمہارے نام دعوت نامہ بھجوادوں گا۔ تم بھی یہ مقالہ پڑھنے کے لئے ضرور آنا۔ میں رضوان سے مالک کو کہلوادوں گا
یں ایک دن کی چھٹی مل جائے گی۔

میں نے خط کو چوما اور جیب میں رکھ لیا۔ اس دن سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ دوزخ کے فرشتوں
پر میرا رعب بیٹھ گیا کہ جنت سے اِس کے نام ڈاک آتی ہے۔ کوئی باعزت آدمی ہے۔ سزا میں بھی چھوٹ مل گئی۔ اب میں
ر کے مولودہ خط کا منتظر ہوں کہ کب آتا ہے اور کب مقالہ پڑھنے کے لئے جنت میں بھیجا جاتا ہوں۔

سلیم اختر

کیا آج عبدالعزیز خالد کی ضرورت ہے؟

نہ تو عبدالعزیز خالد کی ذات میں کوئی نزاع ہے اور نہ ہی اس کے خیالات میں، لیکن اس کے باوجود اس کی شاعری اچھی خاصی نزاعی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس کی وجہ اس کے خیالات کا نزاعی ہونا نہیں جس سے شاعر کی شعری دنیا کے افق پر حمد اور نعت کے چاند سورج جگمگاتے ہوں وہ بھلا کیسے انقلابی یا نزاعی ہو سکتا ہے۔ دراصل خالد کی شاعری کے لفظوں نے اس نزاع کو جنم دیا۔ چنانچہ پرداز عقاب کی تقریب میں ضمیر جعفری نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ غیر ملکی زبانوں کے تراجم تو کر لئے اب لگے ہاتھوں کچھ اپنی نظموں کے بھی ترجمے کر ڈالو!

جدید دور میں لفظ کے بارے میں فنکاروں اور ان کے ساتھ ساتھ ناقدین میں عجیب رویہ ملتا ہے۔ کچھ لوگوں نے لفظ کو سومنات سمجھا اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے جبکہ ان کے برعکس بعض نے خود کو محمود غزنوی جان کر اس سومنات کو توڑنا چاہا۔ اب یہ الگ مسئلہ ہے کہ کیا واقعی لفظ کا سومنات پاش پاش کیا جا سکتا ہے اور اگر مجھے کافر نہ سمجھا جائے تو یہ بھی عرض کردوں کہ محمود غزنوی بھی تو صرف ایک ہی بت توڑ سکا تھا جبکہ حال ہمیشہ اس کے برعکس رہا ہے۔

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانہ میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

سو لفظ کے صنم خانے آج بھی آباد ہیں اور کل بھی آباد رہیں گے۔ ان صنم خانوں میں سومنات ہے یا لات و منات — اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں تک عبدالعزیز خالد کے فنی مسلک کا تعلق ہے تو اسے بلا جھجک لفظ کے صنم خانہ کا پجاری بلکہ مہا پجاری قرار دیا جا سکتا ہے اس لئے تو عبدالعزیز خالد کی شاعرانہ اہمیت کے تعین میں اس کا شعور

لفظ اہم ترین اور بعض صورتوں میں تو اساسی کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ؟ وہ عربی فارسی کے مشکل الفاظ کے ساتھ عبرانی وغیرہ سے نامانوس اور اجنبی الفاظ کیوں مستعار لیتا ہے۔ ایسے الفاظ جن کے لئے جدا فرہنگ کی ضرورت ہو بلکہ وہ خود بھی حواشی میں ان کے معانی درج کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

آخر شعری مجموعوں کے لئے "منحمنا" اور "فارقلیط" ایسے نام کیوں رکھتا ہے، سلیس اردو میں نام کیوں نہیں سوچتا ؟ کیا اس لئے کہ ایڈلر کی نفسیات کی رو سے وہ اپنی لکنت کی SUBLIMATION مشکل اور نامانوس الفاظ کی صورت میں کر دیا ہے ؟ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوکر میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ لگے ہاتھوں خالد کا نفسیاتی تجزیہ کر ڈالوں لیکن اس کے لئے جن گہرے پانیوں میں اترنا ہوگا فی الحال وہ میرے لئے ممکن نہیں اس لئے اسے کسی اور رسالے کے خالد نمبر کے لئے اُدھار رکھتے ہوئے

میں خالص ادبی نقطہ نظر سے بات کرنے کی کوشش کروں گا۔

اردو شاعری کا اگر لفظ کے تناظر میں جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مختلف ادوار میں بحیثیت مجموعی شعراء کا رویہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ جنوبی ہند کی شاعری اور شمالی ہند کی شاعری میں آج جو ہم امتیاز کرتے ہیں تو وہ جذبہ یا موضوعات کی بنا پر نہیں بلکہ لفظوں کی بنا پر ہے۔ پھر خود شمال ہند میں بھی دہلی اور لکھنؤ اسکول میں الفاظ کے مباحث اور علم بیان کے جھگڑے اور ان کے ساتھ ساتھ مترو کات کا سلسلہ۔ یہ جہاں لسانی تغیرات کی عکاسی کرتے ہیں وہاں لفظ کے بارے میں شعراء کے بدلتے رویوں کے بھی آئینہ دار ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر پہلی مرتبہ الفاظ کے مقابلہ میں مواد کو اہمیت کا احساس کرانے کی کوشش کی گئی جس نے ترقی پسند ادب کی تحریک کے روپ میں نقطہ عروج پالیا چنانچہ ۱۹۳۶ء کے بعد ابھرنے والے ادیبوں کی اکثریت نے لفظ پر خیال کو اور اسلوب پر مواد کو شعوری طور سے ترجیح دی اتنی ترجیح دی کہ غلو کا شکار ہوکر بعض اوقات لفظ کی جمالیاتی حیثیت کو بھی مجروح کر دیا۔ پاکستان بنا تو حالات کے انتشار نے جس انتشار فکر کو جنم دیا اس نے " اینگری مین " کی صورت میں ایسے قلم کاروں کو نمایاں بھی کیا جنہوں نے اظہار کی معنویت پر بے ربطی کو ترجیح دیکر ابلاغ کی اہمیت اور ضرورت سے انکار کر دیا۔ لفظ کیونکہ معانی کی اکائی ہے اس لئے انہوں نے لفظ کو سومنات نہ سمجھا بلکہ اچھوت جانا۔ سومنات کفر کا سمبل ہے اور ایمان کیلئے چیلنج اس لئے اس کا توڑنا کار ثواب، لیکن اچھوت سمجھنے کا مطلب تو اسے اتنا نیچ اور حقیر اور گرا ہوا سمجھنا ہے کہ اس کے چھو جانے سے بھی دامن آلودہ ہو جائے گا۔ الغرض جس طرح مومن کے لئے سومنات توڑنا لازم ٹھہرا اسی طرح برہمن کے لئے اچھوت سے بچنا !

یہ مختصر ترین الفاظ میں وہ تناظر جس میں ہمیں عبدالعزیز خالد کے مشور لفظ کا مطالعہ کرنا ہوگا اس لئے وجہ میری دانست میں یہ ہے کہ عبدالعزیز خالد کی شاعری لفظوں سے لاتعلقی کے ذہنی رویہ کے خلاف ردعمل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس لحاظ سے خالد کو DEFENDER OF THE FAITH قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن کس کا عقیدہ مومن کا یا برہمن کا ؟

اس کا جواب اتنا واضح ہے کہ توضیح کی ضرورت نہ ہونی چاہئیے۔ عبدالعزیز خالد نے اپنی شعری دنیا میں لفظ کا ایک

صنم خانہ تو تعمیر کیا لیکن اس مندر کے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں۔ اگر بعض اوقات انتخاب الفاظ میں وہ غلو سے کام لیتا ہے تو اس کی وجہ سمجھنی اتنی دشوار نہیں کیونکہ ردعمل میں ہمیشہ تھوڑی سی جارحیت ملتی ہے ورنہ ردعمل کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔

آج اردو کو وسعت دینے کی تدبیریں ہو رہی ہیں اور یار لوگ یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ علاقائی زبانوں کے منتخب الفاظ کی ایک ایسی منظور شدہ فہرست مرتب کی جائے جس کے الفاظ تحریر و تقریر میں لازماً استعمال ہونے چاہئیں عبدالعزیز خالد ان کے برعکس کہہ رہا ہے کہ صرف علاقائی زبانیں ہی کیوں ہوں، عربی، فارسی عبرانی بھی کیوں نہ ہو۔ اگر اردو کا دائرہ وسیع کرنا ہے تو صوبہ پرست متعصبین کو خوش کرنے کے لئے ہی یہ سب کیوں ہو ادبی سطح پر کیوں نہ ہو۔ کیا اردو کا دائرہ صرف پشتو اور سندھی الفاظ کی آمیزش سے ہی وسیع ہو سکتا ہے۔ دیگر زبانوں کے الفاظ مستعار لینے میں کیا قباحت ہے؟

یہ دور جدید لسانی تشکیلات کا دور ہے لیکن انتخار جالب کے تجربات سے لے کر الفا المراث کو جاتی اردو تک مختلف النوع تجربات و نظریات کا محاکمہ کرنے پر اس رجحان کی اساس زبان کے بارے میں منفی رویہ استوار نظر آتی ہے۔ یہ لسانی مشکلات مُحتسب بن کر اوامر کے بجائے نہی پر زیادہ زور دیتی ہیں جبکہ ان کے برعکس زبان کے بارے میں عبدالعزیز خالد کا طرز عمل مثبت قرار دیا جا سکتا ہے اس لئے کہ وہ نظریہ ساز نہیں بلکہ تخلیقات کے روپ میں زندہ مثالیں پیش کرتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ تم ایسے الفاظ استعمال کرو بلکہ وہ خود استعمال کر کے ان الفاظ سے وابستہ معانی کے لئے نئے تلازمات اجاگر کرتا ہے اور نئی اصوات کے لئے نئے آہنگ سے اردو زبان کو بالعموم اور شعری اسلوب کو بالخصوص روشناس کرانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اردو زبان میں مختلف ادوار کے تلفظ اور املا کی جو سہولت ملتی ہے عبدالعزیز خالد اس سے دل کھول کر فائدہ اٹھا رہا ہے اور یوں زبان کے امکانات EXPLORE کر رہا ہے۔ اگر کل کو اس کی شاعری کے حوالے سے ایک بھی نیا لفظ مروج اور مقبول ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ عبدالعزیز خالد کی سعی مشکور رہی۔

آج ہمعصر شعراء میں عبدالعزیز خالد اپنے مخصوص شاعرانہ اسلوب اور شعور لفظ کی بنا پر ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کر چکا ہے اسے لفظ کا فوبیا نہیں بلکہ وہ بھونرے کی مانند لفظ لفظ کو دیکھتا سونگھتا اور اس کا رس چوستا نظر آتا ہے۔ شاید بھونرے کی تشبیہ خاکہ ہے ثقہ انسان کے لئے اچھی نہ لگے لیکن اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا یوں سمجھئے کہ عبدالعزیز خالد کے اندر کا بھونرا خالد بن کر منڈلاتا پھرتا ہے زبانوں کے گلشن میں، لفظوں کے خیابانوں میں وہ ان کی نامانوس مٹھاس لئے ہمارے لئے ذائقہ کے نئے معیار بنا دیتا ہے۔ مجھے یہی ادا بھاتی ہے اور اس میں مجھے اس کی شاعری کی افادیت اور حیثیت ایک شاعر اس کے وجود کا جواز نظر آتا ہے

بقیہ، ص۱۰۲ سے آگے

کیوں نہ ہو مقبول التماسِ محمدؐ
جبکہ ہے از خود خدا کو پاسِ محمدؐ

عیدِ دل و دیدہ ہے جمالِ محمدؐ
منظرِ گلزار ہے خیالِ محمدؐ

حق سے ہم آہنگ ہے زبانِ محمدؐ
شاملِ شانِ خدا ہے شانِ محمدؐ

ناسخِ ادیانِ کلُ ہے دینِ محمدؐ
خیرِ صُحف مصحفِ مبینِ محمدؐ

رکھتی ہے بیتاب آرزوئے محمدؐ
ہے دلِ زندہ کو جستجوئے محمدؐ

غرض سے "فارقلیط" سے "ممطایا" تک خالدؔ کا شعری سفر ایک مسلسل سفر ہے۔ جس میں شاعر کو کہیں واماندگی کا احساس نہیں ہوتا۔ البتہ کبھی کبھی قاری کا سانس ضرور پھول نے لگتا ہے۔ اور یہ ہے بھی فطری بات کہ عام قاری تو اُس سطح کو بھی نہیں چھو سکتا۔ جو خالدؔ کے فکر و فن کی اساس ہے۔ بہرحال اردو نعت گوئی کے میدان میں کمیت و کیفیت اور مقدار و معیار دونوں کے اعتبار سے اس وقت خالدؔ کا کوئی ہمسر نہیں۔ اور پھر یہ سفر تو ابھی جاری ہے۔ دیکھئے آئندہ "ماذ ماذ" کی صورت میں خالدؔ شعری دنیا کو کیسے عظیم نعتیہ صحیفے سے مالا مال کرتے ہیں۔

طفیل دارا

عبدالعزیز خالد ــــ ایک جائزہ

احسان دانش اور احمد ندیم قاسمی کیطرح عبدالعزیز خالد بھی ایک بزرگ اور بھاری بھرکم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم المرتبت انسان بھی ہے یہ تینوں قدآور شاعر اپنے معاشرے کی برائیوں اور خامیوں کی مکمل بیخ کنی کے خواہاں ہوتے ہوئے بھی" انقلابیوں" کیطرح اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا خون نہیں بہاتے۔ یہ حضرات ولی تو نہیں لیکن اتنے نیک ضرور ہیں جتنا کہ کسی مصلح قوم و وطن کو ہونا چاہیئے۔ ان کے افکار پاکیزہ، اظہار بیباک اور مستفرادامن حیات سرگوئی کی علامات سے پاک اور روزمرہ کے ذوق و اشغال (احسان دانش کی حقہ نوشی اور ندیم کی سگریٹ نوشی سے ہٹ کر) جملہ منفیات سے منزہ ہیں۔ ان کا یہ انداز حیات تقلیداً نہیں بلکہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اخلاق کشی کے نتائج اور منشیات کے عواقب سے آگاہی پر مبنی ہے۔ میرے نزدیک یہ اچھے اور اعلیٰ انسان پہلے ہیں اور اچھے اور اعلیٰ شاعر بعد میں۔ یہ شاعر یا اچھے اور اعلیٰ شاعر نہ بھی ہوتے تو اچھے اور اعلیٰ انسان ضرور ہوتے۔ آج کل جبکہ ہمارے فنکار لوگوں کی ریس میں نعرے تو فلک بوس لگاتے ہیں اور عملاً زمین چاٹتے رہتے ہیں، احسان دانش اور احمد ندیم قاسمی اور عبدالعزیز خالد ایسے بلند پایہ اور دو شاعروں کی عملی زندگیاں ہمارے لئے باعث فخر اور دوسروں کیلئے قابل تقلید ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں نہایت خلوص اور محبت کیساتھ احسان دانش، احمد ندیم قاسمی اور عبدالعزیز خالد کی زندگیوں کے قدموں میں ڈال رہا ہوں۔ خالد ایک باغ و بہار اور اپنی ذات میں انجمن آرا انسان ہے۔ اس کے گل گوں چہرے پر گل بو بشاشت ہر وقت کھیلتی رہتی ہے۔ مطالعہ اور غور و فکر نے اسے ایسی عالی ظرفی پیدا کردی ہے کہ کسی بھی بات پر چیں بہ جبیں نہیں ہوتا۔ کسی کے خیال سے اتفاق ہو تو اسے اپنا مترا نہ گم گشتہ سمجھ کر اٹھا لیتا ہے، اور اگر کسی امر میں ہم آہنگی نہ ہو تو یہ کہہ کر کوئی دوسری بات شروع کر دیتا ہے کہ اپنا اپنا خیال ہے۔

پروفیسر خالد بزمی نے ایک مضمون اس کی شاعری پر کچھ اعتراضات کئے ہیں جن میں ایک دو عربی زبان کے سہواً استعمال کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس نے اپنی ذات کو الگ رکھتے ہوتے اسے ایک علمی مسئلے کے طور پر لیا اور سمجھا اور جن امور کی صحت اس کے ذہن نشین ہوگئی انکی اس نے درستی بھی کی اور (بقول خالد بزمی) خالد بزمی کو فون پر بتا بھی دیا۔ یہ بڑا انسان اور کتنا عالی ظرف شاعر ہے۔

خالد پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے، مگر میں نے کبھی اور کسی حالت میں بھی خالد کو نہ تو اپنی تعریف پر خوشی سے پھولتے ہے اور نہ کسی تنقیص پر برا مانتے پایا وہ یہ نہیں کہتا کہ اسے اور اس کے کلام کو اسی نظر سے دیکھا جائے جس سے وہ خود اسے دیکھتا ہے

بلکہ وہ اس حقیقت کا سو فیصد عملاً شاہد ہے کہ دوسروں کو پورا حق ہے کہ اسے اپنی نظر سے دیکھیں اور اس کے کلام کو اپنی سوچ سے پرکھیں اور پھر جو رائے بھی چاہیں قائم کریں۔ ہاں! وہ تعصب کو کسی صورت بھی نہ پسند کرتا ہے اور نہ برداشت۔ یہ اس کی شخصی اور فنکارانہ عظمت کی منہ بولتی دلیل ہے۔

وہ دوسروں کا مناسب احترام کرتا ہے مگر یہ احترام اس لئے نہیں کہ اس کی شخصیت پر چڑھایا ہوا کوئی خول ہے اور وہ اس طرح جواباً دوسروں سے احترام کروانا چاہتا ہے۔ وہ دوسروں کا احترام کر کے انہیں کوئی قرض نہیں دیتا بلکہ ان کا حق ادا کرتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ خالد اپنے دفتر میں اپنے سفید ریش بزرگ چپراسی کا وہی عزت اور احترام دیتا ہے جو اس عمر کے شخص کو ملنا چاہیئے۔

خالد مجلسی آداب کیساتھ ساتھ اپنے دلی فرائض سے بھی پوری طرح عہدہ برآ ہونا خوب جانتا ہے۔ مجھے دو بار اسکی ہمراہی میں لاہور سے باہر جانے کا اتفاق ہوا ہے، جہاں اس کے ساتھ شامیں منائی گئیں۔ ایک دفعہ لائل پور میں اور دوسری دفعہ سرگودھا میں صرف اس خیال سے کہ وہ ہمیں سفر پر لے جا رہا ہے اس نے راہ میں ہمارا ایسے خیال رکھا جیسے کوئی مشفق ماں اپنے بچوں کا۔ راہ میں موٹر ول کے ہراڈے پر ہمارے لئے یوں کھانے پینے کا اہتمام کرتے تھے جیسے ہم بچے ہوں اور کھانے پلانے میں ایسے پر لطف و پرخلوص اصرار کا مظاہرہ کرتے تھے کہ انکی بات ماننا ہی پڑتی تھی۔

خالد سے ملیں تو وہ اسی طرح مختلف موضوعات پر گفتگو کرے گا جس طرح عموماً ہم کرتے ہیں۔ اگر اس دوران میں اس کی شاعری کا تذکرہ بھی آجائے تو وہ دیگر موضوعات کی طرح اپنی شاعری کے ذکر سے بھی رواداری میں گزر جائے گا۔ میں نے کبھی نہ تو اسے اپنی شاعری کے پروپیگنڈہ کرتے سنا ہے اور نہ ہی اس کے لئے پریشان دیکھا۔ کیونکہ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو بھی چند غزلیں یا کچھ نظمیں لکھ کر اور کان پر قلم رکھ کر ادیبوں اور شاعروں کے گروہ میں آ بیٹھتا ہے۔ اسکی بیشتر گفتگو کا محور اپنی شاعری کی ناقدری اور ریڈیو ٹیلی ویژن، رسالوں وغیرہ کی سرد مہری کا ہوتا ہے۔ خالد مذکورہ اداروں سے بے نیازی کا اظہار نہیں کرتا مگر وہ ان کیلئے بے چین بھی نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ سمجھتا ہے کہ ان کے بغیر وہ شاعر نہیں رہے گا، یا اس کی شعری تخلیق متاثر ہوگی وہ بنیادی لحاظ سے کام پر ایمان رکھتا اور کہتا ہے کہ کام آج نہیں تو کل اپنی پہچان کروا لیا کرتا ہے۔

خالد اپنی ذہنی اور کسبی صلاحیتوں اور اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے معاشی سہولتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنے جسم و روح کے رشتے کو قائم رکھنے کے لئے اپنے دفتری فرائض کی ادائیگی کے علاوہ اپنی سوچوں اور صلاحیتوں کو مجبوراً کہیں دوسری جگہ صرف نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ میرے علم و آگہی کیمطابق وہ نمایاں طور پر صرف دو کام کرتا ہے ایک منصبی فرائض کی ادائیگی اور دوسرے شاعری۔ اس کے اپنے قول کے مطابق وہ دفتر سے گھر لوٹ کر اور تعطیل کے روز اپنا سارا وقت پڑھنے لکھنے میں بسر کرتا ہے۔ کیونکہ گھرانہ مختصر ہے (میرے علم کیمطابق ایک لڑکی جس کی شادی ہو چکی ہے اور ایک لڑکا) اسلئے ادھر سے بھی کافی فراغت میسر آجاتی ہے۔ خالد اس سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنی تخلیقات کے ڈھیر لگاتا جاتا ہے۔ کچھ لوگ طنزاً کہا کرتے ہیں کہ خالد ہر مہینے شاعری کی ایک نئی کتاب بازار میں لے آتا ہے۔ میں اس امر کا ذکر طنزیہ نہیں بلکہ فخریہ کروں گا کہ اردو شاعری میں ایک ایسی ہستی بھی ہے جو اس کی گود کو گوناگوں رنگوں کی شاعری سے مالا مال کر رہی ہے۔ اس کی اس زود نویسی کو معاصرانہ نہیں بلکہ مستقبل کی آنکھ سے دیکھنا درکار ہے ــــ ہاں! یہ درست ہے کہ اس زود نویسی کی وجہ سے خالد اپنے بہت

[redacted]

سے خیالات کو شعری رنگ میں پوری طرح نہیں رنگ پاتا۔ مگر اس کے باوصف اگر اس کے کلام میں سے وہ حصہ منتخب کر لیا جائے جو شاعری کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہو تو خالد کے اس کلام کے بارے میں بھی یہ کہنا پڑے گا۔

لنکا سے جو نکلا سو باون گز کا

خالد کی اس گوشہ نشینی سے جہاں اس کے علم اور شعری تخلیق میں قابلِ رشک حد تک اضافہ ہو رہا ہے وہاں اسے ایک بھاری نقصان کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے میرا مطلب ہے کہ خالد کا تعلقات عامہ کا علم صفر کے برابر ہے کیونکہ لوگوں نے اس بات کو پرکھے بغیر درست تسلیم کر لیا ہے کہ یہ دور پروپیگنڈے کا دور ہے اس لئے لوگ کسی بات یا چیز سے واقف ہو کر اسکی تشہیر کرنے کے بجائے اس کی تشہیر سے متاثر ہو کر اس بات یا چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج خالد کو وہ شہرت یا مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جس کا وہ مستحق ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ شاعر جو شعری عظمت کے لحاظ سے خالد کے گھٹنے تک بھی نہیں پہنچتے۔ تعلقات عامہ کی بنا پر شہرت اور مقبولیت میں خالد کے سر سے بھی گزوں اونچے ہیں۔ یہ جدا حقیقت ہے کہ خالد اردو شاعری میں دوامی مقام پیدا کر چکا ہے اور مذکورہ بالشتیے اپنے پروپیگنڈہ سے باہر کچھ بھی نہیں۔

میں خالد کی گوشہ گیری کے حق میں نہیں ہوں اسے اس خول سے باہر نکل کر میل ملاپ کو وسیع سے وسیع تر کرنا چاہئے اس سے لوگوں پر اسکی شناخت کے نئے نئے دروازے وا ہوں گے اور اس کے قریب اور اس کے حلقے میں آنے والے لوگ بھی اس سے مستفید ہوں گے۔ یوں خالد کی شمع سے کئی اور شمعیں روشن ہو سکیں۔ خالد پھر خالد نہیں رہے گا بلکہ خالد ایک مکتبِ فکر ہو گا جس طرح کہ احمد ندیم قاسمی کر رہا ہے۔ وہ شاعروں میں ایک قد آور شخصیت ہے، جس کے قریب آ کر کئی دوسرے جوان اور نوجوان بھی اپنے قد بڑھانے کا فن سیکھ رہے ہیں۔ میری رائے میں خالد کو بھی چاہیے کہ وہ جو ایک بلند اور گھنے شجر کی طرح ہے دوسروں کو بھی اپنے سائے میں لے کر انہیں بلند اور گھنا بنانے کی راہ پر چلنے کے ہنر سے آشنا کرے۔ دریا کے پانی کا وہ حصہ بہت مفید، پیارا اور نمو پرور ہوتا ہے جو مختلف ندی نالوں کی صورت دریا سے جدا ہو کر کھیتوں کی پیاس بجھاتا ہے۔

خالد زندگی اور موت، حسن و قبح سب سے بخوبی واقف ہے، مگر وہ زندگی اور حسن کا شاعر ہے۔ لوگوں پر موت اور قبح مسلط کرنے کے حق میں نہیں وہ نہ تو زندگی سے پیار کرنے کی تبلیغ کا نعرہ لگاتا ہے اور نہ حسن پر دیوانوں کی طرح سب کچھ نچھاور کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اپنے کلام میں وہ گلشنِ حیات کے ایک ایک کونے، ایک ایک پھول بلکہ گھاس کے ایک ایک تنکے کی سیر کرتا اور کراتا ہے اور اس طرح زندگی کا ذکر کرنے کے بجائے اس کے ہر چھوٹے بڑے رخ کو فلم کی طرح سکرین پر پیش کرتا ہے اسی طرح حسن کے سلسلے میں وہ اس کے مختلف النوع پہلوؤں بلکہ باریکیوں میں اترتا ہے عورت کے حسن میں خصوصیت سے دلچسپی کا ذکر کرتا ہے، مگر اس ذکر میں وہ اس مقام پر جا کر رک جاتا ہے جس سے آگے بڑھنے پر مرد اوچھا اور عورت بے وقار ہو جاتی ہے۔ خالد اپنی معاشرتی اقدار کا احترام کرتا ہے وہ حسن پرست ہے ہوس پرست نہیں۔

خالد کے زبان و اظہار کی طرح اس کے خیالات بھی توانا اور پروقار ہیں وہ کہیں بھی مسکنت یا بے بسی کا اظہار نہیں کرتا وہ زندگی میں پیش آنے والی دشواریوں اور مصیبتوں سے آگاہ ہے مگر ان کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکتا وہ انہیں سرنگوں اور زیر کرنے کا قائل ہے۔

خالد کی شاعری تبلیغی یا مقصدی شاعری نہیں وہ چاہے، ترقی پسند تحریک کے اصولوں کے مطابق ترقی پسند نہ ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ان معنوں میں ترقی پسند ضرور ہے جن معنوں میں میر، نظیر اکبر آبادی، غالب اقبال وغیرہم ترقی پسند ہیں۔ کیونکہ ترقی پسند کا مطلب کسی خاص گروہ کے نظریے کی تبلیغ و تشہیر نہیں بلکہ اپنی روحِ عصر کو اس طرح ایمانداری سے فنکارانہ انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے کہ اس سے انسانوں کے لئے ایک تابناک اور پرامید مستقبل جنم لے سکے۔ خالد کی شاعری اس اصول پر پوری اترتی ہے۔

موضوعاتی لحاظ سے خالد ایک بسیار جہتی شاعر ہے۔ اسکی ساری شاعری پر کام کرنا جوئے شیر لانا ہے۔ نعت میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ترجموں میں اس کا اپنا ایک جداگانہ باب ہے۔ اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے لسانیات اور تلمیحات کے بعض بہت ہی وسیع و عمیق سمندروں میں اترنا از بس ضروری ہے، جو کہ ایک عام پڑھے لکھے انسان کے بس کا روگ نہیں۔ اقبال کی طرح اسکی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے بھی کچھ مختلف افراد کو اپنے اپنے میدان میں جداگانہ کام کرنا ہوگا۔

اِختیار

یہ پُر اسرار و نگاریں کائنات
ہے اک ایسی رنگ بھومی کی طرح
حسبِ برگ و ساز تا حینِ حیات
ہر کوئی جس میں اداکاری کرے
اب یہ اس کے ذوق پر ہے منحصر
بے دلی سے بھیس بھر کر سوانگ کا
سر دُھنے، شکوے کرے، آہیں بھرے
یا نشاطِ زیست کا افسانہ خواں
داستاں گو سرچہ باوا باد کا
اس کشاکش کو سمجھ کر ناگزیر
خامشی سے، تمکنت سے، صبر سے
سہل و صعب اچھے بُرے ہر پارٹ کو
حُسن کارانہ شعور و شوق سے
وہ ادا کرنے کی عادت ڈال لے ———— عبدالعزیز خالد

وزیری پانی پتی

آفاق گیر موضوعات کا شاعر

عبدالعزیز خالد کے حق میں صرف یہ کہہ دینا کہ وہ ایک قادرالکلام شاعر ہیں ان کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ قدامت پسند ... قادرالکلام اس شاعر کو کہا جاتا ہے جو تمام مروجہ کلاسیکی اصناف سخن غزل، رباعی، قطعہ، مستزاد، مخمس، مثنوی، مرثیہ اور مسدس وغیرہ میں طبع آزمائی کرچکا ہو خواہ اس نے کسی بھی صنف میں اپنے حقیقی شاعر ہونے کا ثبوت نہ دیا ہو۔ خالد کی شاعری آفاق گیر موضوعات کی شاعری ہے۔ فکری تنوع اور دلآویزی اسلوب کی شاعری ہے۔ میں نے انہیں صرف قادرالکلام شاعر کہنے سے گریز کیا ہے اور انہیں صرف معریٰ نظموں اور غیر پابند شاعری کا شاعر قرار دینے سے بھی مجھے اختلاف ہے۔ دراصل خالد حسن وصداقت کے شاعر ہیں اور حسن وصداقت بھی ان کے یہاں زمان ومکان کی پابندیوں سے آزاد ہیں وہ ہر قدیم وجدید صداقت پر ایمان لاتے اور حسن کو خواہ کسی رنگ میں اور کہیں بھی ہو "سرمایۂ جاں" قرار دینے پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ ہر حسن بے صداقت میں صداقت اور ہر صداقت بے حسن میں حسن پیدا کردینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اناجیل کے قصص اور توریت کے افسانے نظم کرتے ہیں جس کا مقصد اسرائیلیات ونصرانیات کی تبلیغ ہرگز نہیں ہے۔ اسی طرح وہ قرآن مجید اور گیتا سے اکتساب حسن وصداقت کرتے ہیں اور اس سے ان کی مراد مفسر قرآن یا ویاساگر اور مہا شاستری کہلانا اور بن جانا بھی نہیں ہے۔ وہ شاعر ہیں ابدی حسن اور دائمی صداقتوں کے شاعر انہیں یہی کہلانا اور سمجھنا چاہئے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں "دور تعقل اور توجیہ" سے قبل کے ستین وقرون کے حالات سے کیوں اتنی دلچسپی ہے اور صرف حکایات بنی اسرائیل کے کرداروں ہی سے اس درجہ کیوں متاثر ہیں۔ آخر جدید دنیا میں تو ہر طرف حسن وصداقت کے مظاہر موجود ہیں۔ وہ ان سے تاثرپذیری کی صلاحیت کیوں نہیں رکھتے۔ اس قسم کے سوالات ان کے کلام کا سرسری جائزہ لینے ہی سے پیدا ہوسکتے ہیں لیکن امعان نظر سے دیکھنے کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ وہ جدید دنیا کے عقلیت پسند لیکن پراگندہ حواس انسانوں کو سکون وطمانیت سے ہمکنار دیکھنا چاہتے ہیں۔

غالب انگریزی، عربی، ہندی (شاید سنسکرت بھی) وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں انہوں نے ان زبانوں کی ادبیات، مذہبیات اور انسانیات کا بڑا عمیق مطالعہ کر کے کلاسیکی مزاج پیدا کیا ہے۔ اس کلاسیکی مزاج کو سمجھے بغیر غالب کی شاعری کو سمجھنے کی ہر کوشش سعی رائیگاں ثابت ہوگی۔ اس سلسلے میں ذرا جدید و قدیم بحث پر بھی غور کر لیجئے۔ عورت کے حسن کی رعنائیوں اور بیوفائیوں سے مسحور ہو کر مبتلائے مصائب ہونے کے واقعات ہر دور میں ملتے ہیں۔ زمانۂ جدید میں تازہ ترین واقعہ برطانیہ کے وزیر جنگ جون پروفومو اور کرسٹائن کیلر کے معاشقے کا ہے جس کی بناء پر وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ہیرالڈ میکملن کو مستعفی ہونا پڑا اور وزیر جنگ قعر مذلت میں گر گئے۔ عورت کی بے وفائی کی بناء پر اسی قسم کے "مرگ عبرت" عہد قدیم کے سمسون کو بھی دوچار ہونا پڑا تھا جس نے دلیلہ کے حسن کی تاب آزمائیوں اور عطر آگینوں سے متاثر ہو کر اپنی "قوت خداداد" کا راز اس پر منکشف کر دیا تھا اور نتیجتاً نور بصارت سے محروم ہو کر قید اور موت سے ہمکنار ہوا۔

غالب کا کلاسیکی مزاج عبرت عشق کی تمثیل کے لئے کسی جدید فسانۂ تعشق کی بجائے زمانۂ قدیم کی اس داستان کی طرف رجوع کرتا ہے جو ہزاروں سال سے یہودی اور نصرانی معتقدات کا جزو بن گئی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بائبل یا توریت کی کسی "کہانی" کو منظوم کر دینا کون سا عظیم کمال شاعری ہے۔ اس سلسلے میں آپ اس نظم کا تھوڑا سا حصہ ملاحظہ فرمائیں جو بعنوان "طلسم زندگی" غالب نے اپنے ترتیلی تشکیلات کے مجموعہ "ورق ناخواندہ" میں درج کی ہے۔ یہ نظم سمسون و دلیلہ کے معاشقے سے متعلق ہے۔

اندھا سمسون (جس کی آنکھیں دلیلہ کی کج ادائی اور بیوفائیوں کی وجہ سے نکال لی گئی ہیں) غازہ کے زندان بلا میں مقید ہے۔ اس کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

آج اغیار کے نرغے میں ہوں درماندہ و زار
میرا اقبال فرومایۂ ذلت ہو کر
جسم کی تاب و تواں آنکھ کی دولت ہو کر
آج غازہ میں ہے مزدور طرب گاہ رقیب
وقت زنجیر و رسن، عربدۂ زار تضحیک
یہی مقصود مشیت تھا مری بعثت سے؟
میری تخلیق سے صانع کا یہی مقصد تھا
بزم اغیار میں یوں نقش بہ دیوار بنوں
یوں غلامانۂ تب و تابِ سلف کو بیچوں!

بنی یعقوب کی آزادی کا پرچم لےکر
صاعقہ وار فلسطین پہ جو جھپٹا ... تھا
لیث اشبال کے ہمراہ اجم میں جیسے
ایک ہی لغزش مستانہ میں سب کھو بیٹھا

اور پاداشِ تمنا میں ادا کرنا پڑا
اس زیاں کوش کو سرمایۂ چشمِ حیراں
آہ اندوہ نگاہِ غلط انداز بتاں
کرے آفاق کو جو کار گہہِ شیشہ گراں
لیکن اس ذلت و رسوائی کا شکوہ کس سے
میری لغزش کی مکافات ملی ہے مجھ کو
دام ہمرنگِ زمیں تھا، یہ نہ سوچا میں نے
زلفِ مشکیں کی عنایات سے بےخود ہو کر
آندو خیز اداؤں کے لٹے میں کھو کر
ایک معشوق جواں سال کا پا کر ایما
بے ساختہ برجستہ صداقت دربستہ
تن رویینہ کی حکمت کو کیا بے پردہ

سمسون نے اپنی روئیں تنی کا راز دلیلہ پر منکشف کر دیا، جو اس نے اس کے دشمنوں کو بتایا۔ اس انکشاف راز کے بعد ناقابل شکست سمسون ایک بے دست و پا انسان کی طرح بے بس ہو گیا۔ فلستیوں نے انتقام لینے کی غرض سے اس کی آنکھیں نکال دیں اور اسے زندان بلا میں مقید کر دیا۔

کس قدر نازک و پرکار تھا فیضانِ ازل
اسم اعظم کو مری زلف میں محصور کیا

سمسون کی قوت عظیم کا راز اس کے بالوں کی سات لٹوں میں پوشیدہ تھا، دلیلہ کو اس راز سے آگاہ کر دینے کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر کیا جا چکا ہے۔ اب ذرا سمسون کی انفعالیت اور پچھتاوے کا حال بھی سنیئے ,

میں ۔ طاقت ۔ د
زینِ عظمت ۔

اور آتا نہیں بوست ۔
یں زیں اور بھی شیں یہ سید ۔
زند کا لی ہی زندانِ سیہ میرے لئے
گلعذاروں کے نمرتے ہوئے جسموں کی بہار
سمن اندام نگاروں کا خرام گل نار
آیۂ ثابت و سیار ہے جن کا دیدار
اب ہمیشہ کے لئے ہو گئے مجھ سے روپوش
عرصۂ زیست میں اب چارۂ غم کیا ہوگا
کون بہلائے گا ایام کی ویرانی کو؟

غالباً ایک طویل نظم کا یہ مختصر اقتباس خالدؔ کی قوتِ نظم کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ دراصل کسی خیال یا موضوع میں عظیم شاعری کو وجود بخشنے کی صفت موجود نہیں ہوتی بلکہ یہ صرف اور صرف قوتِ بیان ہی کا کرشمہ ہے جس کی بناء پر فرسودہ خیالات اور پیش پا افتادہ موضوعات شاعرانہ عظمت و اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔

اقبالؔ کی نظم "مسجد قرطبہ" اس لئے عظیم نہیں ہے کہ وہ مسجد قرطبہ سے متعلق ہے بلکہ اسکی عظمت کا راز یہی ہے کہ وہ اقبال کی ہے۔ اسی طرح خالدؔ کی ان تمثیلی نظموں کا راز یہ نہیں ہے کہ اسرائیلیات و نصرانیات سے ماخوذ ہیں بلکہ انکی اہمیت کی بنیاد یہ ہے کہ وہ خالد کی نظمیں ہیں۔

"ورقِ ناخواندہ" میں خالد کی پانچ طویل تمثیلی نظمیں شامل ہیں اور ہر نظم کے ہر حصہ کا یہ حال ہے کہ

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

چنانچہ ایک مختصر سے مضمون میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتا کہ ہر نظم کے کچھ اشعار اقتباساً پیش کئے جائیں اسی طرح چند محدود صفحات میں خالد کے آرٹ پر تفصیلی اظہارِ خیال بھی دشوار ہے۔ غزل کے ناقدین کا مشغلہ بہت آسان ہے۔ فلاں شعر میں فلاں قافیہ خوب نظم ہوا ہے۔ مطلع میں ایطائے جلی ہے مقطع میں تعلی جائز ہے۔ فلاں

میں وحدت الوجود کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے دوسرے مصرع میں نسب وصل کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ آخری شعر ... سمات کا آئینہ دار ہے لیجئے تنقید تما تندلین شاعری سے اس طویل نظم باعث پر طرل کو احساس جانے میں ... [illegible]

خالد کی شاعری حس حسن کو پیش کرتی ہے وہی اس کا ... اور حسن معنویت کو ... وہی اصل معنو... [illegible] حسن ومعنویت اس انداز سے پوشیدہ نہیں ... محفوظ ... رہے کہ ان کی منظومات پر جس تدرجی غور کیا جائیگا اسی قدر ان کے حسن ومعنویت میں اضافہ ہوگا۔ یہی ... شاعری کی خصوصیت ہوتی ہے۔

خالد آزاد نظم لکھتے ہیں۔ طویل تمثیلی نظمیں قوافی کی متحمل بھی نہیں ہوسکتیں تاہم وہ "بے خواب کواڑوں" کا ذکر کرتے ہیں نہ "بے روح دریچوں" کا۔ ان کے یہاں پروپیگنڈے کا عنصر ملتا ہے نہ ترقی پسندوں کے "منز لوجہ اسالیب" (DICTATED PATTERNS) کا۔ وہ اس قسم کی شاعری نہیں کرتے مثلاً:

سمت بدلی جا رہی ہے سُرخ فوج

ایک اژدر حسین، ایک مار احمریں

سرخ فوج ہے رواں، سرخ فوج ہے رواں

ایشیا ہمارا آقا ہے

خالد کے یہاں جنسی کجروی اور مراق کا وہ عنصر بھی نہیں ہے جو میراجی اور سلام مچھلی شہری وغیرہ کے لئے باعث امتیاز ہے۔ ان کے یہاں قومیت پرستی کا وہ انداز بھی نہیں ہے جس کے تحت ایک ہندوستانی (آقبل تقسیم ہندوستان) شاعر نے لندن کی کسی نائٹ گرل کے لب سے لپٹتے ہوئے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ اس طرح ... انسانوں کی غلامی اور مصائب کا انتقام لے رہا ہے۔ خالد نے اپنا اسلوب، اپنی فضا اور اپنے معیارات فکر و نظر خود ہی پیدا کئے ہیں۔ وہ کسی کی تقلید کرتے ہیں نہ تتبع۔ وہ جمال پرست ہی نہیں حقائق پرست بھی ہیں اور جس طرح جمال وحقیقت زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہوتے ہیں اسی طرح انکی شاعری "جدید وقدیم" مبحث سے الگ ہیں۔

قدامت پسندی انسان کے کلاسیکی مزاج کا ایک خاص عنصر ہے وہ اپنے دور کے عظیم واقعات اور عظیم شخصیتوں سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا صدیوں پیشتر کے واقعات اور شخصیتوں سے۔ وہ ظالم کو چنگیز اور ہلاکو سے تشبیہ دینا پسند کرتا

ہے ہٹلر اور مسولینی سے نہیں وہ یونان کی دیو مالائی حسینہ ہیلن کے گیت گانا پسند کرتا ہے ۔ ایلزبتھ ٹیلر کے نہیں۔ وہ اس سیتانی پہلوان کا استعارہ قوت سمجھتا ہے جس کے متعلق خود اس کے خالق نے کہا ہے ۔

منش کردہ ام رستم پہلواں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

لیکن دنیا کے سب سے زیادہ پرقوت انسان " کا ایٹم بم کے متعلق کچھ نہیں کہتا ۔ وہ زمانہ ماضی تاریخ کی بالائی (رومانٹک) جنگ مہابھارت کی ہر تفصیل ذہن میں رکھنا پسند کرتا ہے لیکن ۱۹۰۰ء کی پہلی اور دوسری عظیم جنگوں کی تاریخ سے قطعاً نا آشنا ہے ۔ خالد کے یہاں ہی ہمہ گیر اور ہمہ رس آفاقی مزاج ملتا ہے

پاکستان اور ہندوستان میں دو قسم کی شاعری موجود ہے اول وہ جو ان ممالک میں تعلیم عام نہ ہونے کی بنا پر مقبول ہے دوسری وہ جو تعلیم کے عام اور معیاری ہو جانے کے بعد مقبول ہو گی ۔ خالد کی شاعری مؤخرالذکر قسم ولوع سے تعلق رکھتی ہے ۔

عبدالعزیز خالد

بڑھتی ہے سر شام بے قراری
اندوہ نہیں امر اختیاری!
بھادوں کی جھڑی جاڑوں کی بھادٹ
دل چاک کرے ہر بوند سے کٹاری
وہ زلف سیہ رخ پہ ہے پریشاں
یا چھا گئی ہے ابر نو بہاری
برپا رہے طوفان باد و باراں
کرتے رہے خوار غم گساری
ہونٹوں میں حلیمی بھی سرکشی بھی
دو لخت دکھے تو یہ نامہ کاری
تخلیق ہے دشوار شعر آساں
تحسین ہے ادراک و حسن کاری!

فارقلیط سے حمطایا تک

عبدالعزیز خالدؔ دنیائے شعر و ادب میں اب کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ اُن کے نام سے خالص علمی و ادبی حلقوں کے علاوہ اب عام پڑھے لکھے آدمی بھی آشنا ہونے لگے ہیں۔ اور اُن کی اس شہرت و مقبولیت کی وجہ جہاں اُن کی عالمانہ شاعری اور ان کا بلند آہنگ اور پُرشکوہ اُسلوب ہے۔ وہاں ایک بڑی وجہ اُن کی نعتیہ شاعری بھی ہے۔ جو انہیں ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

نعت اگرچہ ہیئت کے لحاظ سے کوئی باقاعدہ صنفِ سخن نہیں۔ لیکن موضوع کے اعتبار سے یقیناً یہ ایک اہم صنفِ ادب ہے۔ اس لئے کہ اس کا موضوع مولائے کل، ختم الرسل، سرکارِ دوجہاں، نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح و ثنا ہے۔ اس صنف کا آغاز تو کائنات کے آغاز ہی سے ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ سب سے پہلا نعت گو خود خداوند کریم ہے۔ جو ازل سے اپنے محبوبؐ کی ثنا خوانی میں مصروف ہے۔ حضور نبی کریمؐ کے عہدِ مبارک میں بھی شعراء نے یہ سعادت حاصل کی۔ اور عربی ادب میں کعب بن زہیرؓ، عبداللہ بن رواحہؓ اور حسّان بن ثابتؓ اور ان کے بعد امام بوصیریؒ کا نام اس سلسلے میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ فارسی میں بھی کئی شاعر نعت کے میدان میں نامور ہوئے۔ ان میں خاقانیؔ، جامیؔ، سعدیؔ، قدسیؔ، اور امیر خسروؔ ہیں۔ اُردو میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو۔ جس نے ایک آدھ نعت نہ کہی ہو۔ لیکن کچھ نام ایسے بھی ہیں۔ جنہیں نعت گوئی کی ادبی شہرت حاصل ہوئی۔ ان میں کرامت علی شہیدی، غلام امام شہید، محسن کاکوروی، امیر مینائی، ظفر علی خاں، شاہ نیاز بریلوی، احمد رضا خاں بریلوی، حسن رضا خاں بریلوی، بیدم وارثیؔ، اکبر وارثیؔ، اور دلو رام کوثری کے علاوہ دورِ جدید میں حمید صدیقی لکھنوی، بہزاد لکھنوی، حفیظ جالندھری، ضیاءالقادری، ماہر القادری، محشر رسول نگری، عبدالعزیز خالدؔ، حافظ لدھیانوی، حفیظ تائبؔ، اعظم چشتی،

[illegible] خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اور ان سب [illegible]
[illegible] مقام کا [illegible] ہے کہ ہم انہیں دور حاضر کا سب سے بڑا نعت گو
شاعر [illegible] ان کا وہ اسلوب خاص ہے جو ایک ہم عہد نعت و شعرا میں ایک انفرادیت
[illegible] کل [illegible] کے دو نعتیہ
[illegible] نعتیہ [illegible] کی صورت میں [illegible] ہے۔

[illegible] اور [illegible] کے سبب [illegible]
[illegible] اور [illegible] میں بھی [illegible] مقامات [illegible]
[illegible] کے علاوہ [illegible]
ہوتا ہے [illegible] اور بیان کی پاکیزگی اور [illegible] کے باعث [illegible]
اس کے تاثر کے [illegible] میں گم ہو کر رہ جاتا ہے [illegible] اور [illegible] زبان [illegible] ملتی ہے یہاں ان
[illegible]

یہی سانسوں کا سہارا

شہنشاہ لولاک و مولائے [illegible]
تو میرے تخیل سے بھی ماورا ہے

تری ذات فخرِ بنی نوعِ انساں ہے
تو صلِ علیٰ خیرِ خلقِ خدا ہے

طبیعت میں دل سوزی و دل نوازی
تو دلگیر کے دردِ دل کی دوا ہے

رقم ہیں صحیفوں میں القاب تیرے
تو یٰسین و طٰہٰ میں طلعت نما ہے

"فارقلیط" زبان و بیان کا ایک شاہکار اور ایک عہد آفریں نظم ہے۔ اردو کی یہ طویل ترین نعت دنیا کے عظیم نظموں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ یہ نظم سات حصوں پر مشتمل ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ہی زمین میں سینکڑوں اشعار کا ایک وسیع سمندر ہے۔ جو موجیں مار رہا ہے۔ لیکن تشنگی پھر بھی محسوس ہوتی ہے۔
یہ نعت اردو کی دوسری نعتوں سے اس لیے بھی ممتاز و منفرد ہے کہ مدح رسول ﷺ کے علاوہ یہ عہد رسالت کے بعد کی اسلامی تاریخ کے کئی اہم واقعات کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ گویا یہ صرف نعت کی حد سے آگے نکل کر تاریخ کے دائرے میں جا داخل ہوتی ہے۔

"فارقلیط" سے خالد کا جو شعری سفر شروع ہوتا ہے۔ "منحمنا" اس کی دوسری منزل ہے۔ یہ بھی ان کی ایک طویل نعت ہے۔ لیکن اس میں اشعار کی تعداد "فارقلیط" سے کم ہے۔ اندازِ بیاں "فارقلیط" سے بھی پر شکوہ، بلند آہنگ اور مشکل ہے۔ یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور ایک غیر مسروف طویل نظم ہے جسے ہم محسن کاکوروی کے معروف قصیدہ لامیہ کے بعد اردو کا معروف قصیدۂ میمیہ کہہ سکتے ہیں۔ اس نظم کا اختتام خطۂ پاکستان کے لئے دعا پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہی ارض پاک شاعر کی تمام تر آرزوؤں، امنگوں اور تمناؤں کی مرکز ہے۔ پہلے باب میں وصفِ رسول ﷺ ہے اور آخری چار بابوں میں ملتِ اسلامیہ کی بدحالی اور اخلاقی بے راہروی کا احوال بڑے پر درد اور الم انگیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں بھی "فارقلیط" کی طرح حضور نبی کریم ﷺ سے تخاطب کا انداز ملتا ہے۔ زبان یہاں بھی عربی و فارسی آمیز اور تلمیحات سے پُر ہے۔ اور اس کے اشعار میں بہتے دریا کی سی روانی نہیں۔ بلکہ ایک ٹھہراؤ اور نغمگی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

مطاعِ آدم و انجم، مُطاعِ لوح و قلم
محمد اُمیٔ محبوبِ کبریا صلعم

محمد انجمنِ کن فکاں کا صدر نشیں
محمد انسرِ آفاق و سرورِ عالم

حمود و حامد و احمد محمد و محمود
کریم و میرِ کرام و مکرم و اکرم

وہ لایموت سراجِ سُبل امامِ رُسل
امیرِ قافلۂ سخت کوشِ اہلِ ہمم

جبیں و جمال و کامل مکمل و اکمل
ستم زدہ بشریت کا محسنِ اعظم

نشاطِ نغمۂ داؤد و لحنِ باربد کے
ہیں وقف ساز دلِ پر ترے بالِ سماع و صوت و نغم

اس سفر میں "حمطایا" خالد کی موجودہ منزل ہے۔ یہ ان کا تیسرا نعتیہ مجموعہ ہے۔ جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ "حمطایا" بھی "فارقلیط" اور "منحمنا" کی طرح حضور کے اسمائے گرامی میں سے ایک ہے۔ جس کے معنی خالد کی زبان میں ہیں۔ حرام کام سے انسان کو روکنے والا

فارقلیط سے حمطایا تک خالد کے شعری سفر کو دیکھیں تو ہمیں اس منزل تک ایک خوشگوار ارتقاء کی صورت ملتی ہے۔ فارقلیط اور منحمنا اگر دو طویل نظموں کی صورت میں ہیں۔ تو "حمطایا" ستائیس مختلف طویل و مختصر نعت کا مجموعہ ہے۔ یہ نعتیں معروف بھی ہیں اور غیر معروف بھی۔ لیکن معروف نعتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ نغمگی اور ترنم کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہیں۔ پھر ہماری نعتیہ شاعری کی روایت سے بھی یہ نعتیں قریب ہیں۔ کہ ایک تو زبان پہلے کے مقابلے میں سادہ اور آسان ہے۔ دوسرے زیادہ تر نعت کی معروف روائتی ہیت یعنی غزلیہ ہیت میں ہیں۔ ان نعتوں میں بھی کہیں کہیں مشکل الفاظ و تراکیب کا استعمال ہوا ہے۔ لیکن ایسے کہ بار محسوس نہیں ہوتا۔ کہیں ژولیدگی یا ابہام نہیں۔ جو مضمون ہے وہ شاعر کے دل سے نکل کر قاری کے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے اس لئے کہ جذبے کا سچا بیان ہے۔ یہاں بھی فقط مدح و ثنا ہی نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک معنی خیز مقصدیت بھی ملتی ہے۔ عربی الفاظ و تراکیب کے علاوہ یہاں بھی بعض مقامات پر قرآنی آیات اور احادیث نبوی نظم کی ہوئی ملتی ہیں۔ مگر اس طرح کہ عربی زبان نہ جاننے والا قاری بھی کم از کم اشعار کے صوتی حسن سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اور لطف لیتا ہے۔ مثلاً

وَجْهُكَ كَاَنَّهٗ قِطْعَةُ قَمَرٍ
سرِ فاراں سے جو طلوع ہوا

اے حبیبِ خدا لئے رحمت
لَاشَرِیْكَ لَكَ وَلَا نِدًّا

کون تیرے سوا مونسِ غم
اَنتَ مَولَانا اَنتَ سَیِّدُنَا

خالدؔ صحیح معنوں میں ایک عاشقِ رسول ہیں۔ انہیں حضور کے نام نامی سے اتنی والہانہ محبت وعقیدت ہے کہ مدح وثنا کے عالم میں ان کا قلم حضورؐ کے لئے ایک سے زیادہ اسماء والقاب کا ذکر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اور پھر ان توصیفی ناموں کا ایک دریا بہنے لگتا ہے۔ مثلاً اس نعت میں جسے اُسلوبِ بیان کے اعتبار سے" تمطایا" کی بہترین نعت کہا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

نفسی نفسی کہیں سب رسول اور تو اُمتی اُمتی
قولِ فیصل ہے تیرا اَنَا لَھَا قیدِ لَیسَ بعدی نبی

تیری مدح وثنا میں زباں کو تکلم کا یارا نہیں
اے نزاری، مجازی، تہامی، متقی، مزکی، زکی

جانِ بیت وحرم اے جمیل الشیم اے شفیع الاُمم
تو مقدس، مطہر، معطر، منور ہے اے ابطحی

صاحبِ قابَ قوسین ومعراج وتاج وبُراق وعَلَم
لکھی کلکِ ازل نے ترے نام کونین کی سروری

تو ہے عزِ عرب تو ہے فخرِ عجم۔ عینِ جود وکرم
اے خطیبِ اُمم وافی وشافی و کافی و مکتفی

تو کریم و مکرم، مقدم تو عنوانِ لوح و قلم
تو اجیر و شہیر و شہید و وجیہ و نصیح و نجی

تو ہے کہف الوریٰ تو ہے صدر العلیٰ تو ہے نور الہدیٰ
تو ہے بدر الدجیٰ تو ہے شمس الضحیٰ کیا خفی کیا جلی

مصطفیٰ مجتبیٰ منتقیٰ ہادی مہدی ہے بُدیٰ
صالح و مصلح و سید المرسلین و عفو و ولی

تو ہے مشہود و مامون و موصول و مختار و بر و مبر
تو ہے بالغ، مبلغ، تو طیب، مطیب، صفوح و صفی

تو ہے اکلیل و حید و مدثر و خاتم الانبیاء
تو مذکر، مبشر، مؤمل، بشیر و نذیر و تقی

تو ہے مصباح و مفتاح و ذو فضل و ذو عزت و ذو قوۃ
تو ہے یٰسین و طٰسین و طٰہٰ و حید و احد و نقی

اول و آخر و ظاہر و باطن و اُمّی اَولیٰ، امین
تو قریب و منیب و ادیب و امام و حکیم و حفی

یونہی آواز دیتا ہے خالدؔ لواحِ مدینہ سے مجھے
جس طرح آئے کوہ ندا کی صدا یا اخی یا اخی

مولانا محمد جان قدسیؒ کی ایک نعت فارسی کی چند مقبول نعتوں میں سے ایک ہے۔ خالدؔ نے اس معروف نعت کے اشعار کی تضمین کچھ اس انداز سے کی ہے کہ تضمین کا حق ادا کر دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اے کہ تو خاصۂ خاصانِ خدائے اکبر
اے کہ تو بدرقۂ بحر و بر و جن و بشر

دے صدا کس کو یہ فریادیٔ تفتیدہ جگر
اپنے دیوانۂ مسکیں کو فراموش نہ کر

"چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی"

کروں پلکوں سے ترے روضے کی جاروب کشی
وجہ آسودہ دلی ہے یہی شوریدہ سری

وَجہُکَ فِی نَظَرِی کُلَّ غَدَاۃٍ وَّ عَشِی
جلوۂ دوست سے یوں سیر نگاہیں نہ کبھی

"سیّدی اَنتَ حبیبی و طبیبِ قلبی ہے
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی"

عربی کے مشہور مصرعے "صلی اللہ علیہ وسلم" کو ٹیپ کا مصرع بنا کر بہت سے شعراء نے نعتیں کہی ہیں خالد نے بھی اپنے انداز میں اس مصرعے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک بند دیکھئے ؎

اُس کو کہتے ہیں حمطایاؐ
کوئی نہیں اس کا ہم پایہ
جسم کا اس کا نہیں ہے سایا
صلی اللہ علیہ وسلم

خالد کو حضورؐ کی مداحی پر فخر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ؎

میرے سارے زمزمے ہیں اس صدا کی بازگشت
جس صدا کے لحن میں شامل ہے تنزیلِ خدا

یہی وجہ ہے کہ خالد نے اپنے فکر و فن کو نثارِ راہِ پیمبرؐ کر رکھا ہے۔ چنانچہ عموماً اُس کی پوری شاعری اور مخصوص طور پر اُس کی نعتیہ شاعری حضورؐ سے سچے قلبی عشق کا والہانہ اظہار ہے، یہ اشعار دیکھئے ؎

نثارِ راہِ پیمبر ہے فکر و فن میرا
میں عندلیبِ نوازش ہوں وہ چمن میرا

زمن سے ہم میں ہے اک فصلِ دوستی کا رشتہ
میں اُس کا آہوئے رم خوردہ وہ ختن میرا

جہاں سے رستہ فردوس کو نکلتا ہے
وہی ہے اے مرے اہلِ وطن، وطن میرا

بغیر اُس کے میں تنہا ہوں نامکمل ہوں
ہے وہ ندیمِ نو و ہمدمِ کہن میرا

اُسی کی ضو سے ہے ظلماتِ کن فکاں روشن
اُسی کی لو سے ہے سینہ کرن کرن میرا

اور آخر اس میدان میں اپنے عجزِ فن کا اظہار یوں کیا ہے۔ ہے

حریفِ نعتِ پیمبر نہ ہو سکے کوئی
وفورِ عجز سے ہے سر بہ سجدہ فن میرا

اور اس تمام عجزِ فن کے باوجود بیان الفاظ کی شوکت اور اظہار کی رفعت ملاحظہ کیجئے۔

ہے لقب جس خوش نفس کا مازاغ و طاب طاب
اُتری جس اُمی پہ بامِ عرش سے اُم الکتاب

وہ متقی، مکتفی، مکی، تہامی، ابطحی
ذکر جس کا مرہمِ زخم و سکونِ اضطراب

صادق و صدق و مصدق، نور و مصباح و سراج
جس کو بخشا حق نے ختم المرسلین کا خطاب

کس سے ہو اس کے مقامات و محاسن کا شمار
آج تک کس نے کیا بارش کے قطروں کا حساب

ناصر و منصور و مستنصر، غیاث و غیث و غوث
گردشِ دوراں کا نباض و نقیبِ انقلاب

یہی گردشِ دوراں کا نباض اور نقیبِ انقلاب خالد ہی کا ممدوح نہیں۔ خود خدا کا بھی ممدوح ہے۔ خالد اسلام کو تمام نظام ہائے عالم سے بہتر اور نوعِ انساں کے تمام دکھوں کا واحد علاج سمجھتے ہیں۔ اور پیغمبرِ اسلام حضور نبی کریم کی ذاتِ پاک ان کے نزدیک جمہوریت کی علمبردار، ستم زدہ، بشریت کی محسنِ اعظم اور ظلم و جبر سے کراہتی ہوئی انسانیت کی نجات دہندہ ہے۔ حضورؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں سے

تری بعثت نظامِ زر کی رحلت
تری آمد سے شیطاں سہمگیں ہے

ولادت تیری استحصال کی موت
شہادت تیری استیصال کیں ہے

تری موجودگی سے ظلم و جبر
ہوس تنگ، آمریت خشمگیں ہے

یا رسول اللہ کی ردیف میں ان کی ایک نعت درد و سوز و آرزو مندی کی مکمل تصویر ہے۔ چند اشعار دیکھئے

غریب و دردمند و سوختہ جاں یا رسول اللہ
میں خالد ہوں ترا ادنیٰ ثنا خواں یا رسول اللہ

تن آساں، ناتواں، آلودہ داماں بے سروساماں
میں کس منہ سے کہوں خود کو مسلماں یا رسول اللہ

نظر بیمار کی جیسے پڑے تیمارداروں پر
بہت تکلیف میں ہے نوعِ انساں یا رسول اللہ

"حمطایا" کے آخری حصے میں ایک ایسی بحر میں پوری بارہ نعتیں خالد نے کہی ہیں، جو اردو میں عام طور پر مستعمل نہیں۔ اور اُردو داں حضرات کے لئے تقریباً نامانوس اور مشکل ہے۔ مگر ایک ہی ردیف میں قافیے بدل بدل کر اتنی کامیاب نعتیں انہوں نے لکھی ہیں کہ ان کی قادر الکلامی کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ ایسی چند نعتوں کے صرف مطلعے دیکھئے ۔

اک عجمی زمزمہ سرائے محمدؐ
میں ہوں ازل تشنۂ لقائے محمدؐ

بڑھ کے شمس و قمر سے ہے تاب محمدؐ
پردۂ انوار ہے حجاب محمدؐ

غائتِ غایات ہے نمودِ محمدؐ
معنیٔ معنی ہے ہست و بودِ محمدؐ

(باقی بر صفحہ ۱۸)

یونس احمر

عبدالعزیز خالد کی شاعری

خالد کی شاعری کی ہمہ گیر خصوصیات پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت پر بھی کچھ لکھا جائے کیونکہ بھرپور شخصیت ہی بھرپور شاعری کو جنم دے سکتی ہے - خالد کی متین، سنجیدہ اور خاموش طبیعت، ادب اور فن سے ان کی والہانہ شیفتگی، حصول علم کے لئے ان کا جنون، کلاسیکی ڈراموں اور داستانوں پر ان کی گہری نظر- یہ وہ چند ایسی خصوصیات ہیں جو انکی شخصیت میں رچ بس گئی ہیں - خالد قول و فعل میں جمود نہیں حرکت کے قائل ہیں، کیونکہ حرکت ہی زندگی کے حسین خد و خال کو نکھارنے میں مدد دیتی ہے - یہی وجہ ہے کہ کافی ہاؤس میں ادب کے موضوعات پر بے مقصد گفتگو کرنے کی بجائے وہ اپنا قیمتی وقت تخلیقی کاموں میں صرف کرتے ہیں کیونکہ انکے خیال میں وہ لوگ جو محض ادب کا کھوکھلا نعرہ لگا کر ادب کے چودھری بنے ہوئے ہیں دراصل وہی اسکی ترقی و ترویج میں بھاری رکاوٹ ہیں اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اچھا ادب عرق ریزی چاہتا ہے، لگن، جذبہ، محنت اور سپردگی چاہتا ہے - اچھا ادب خالی خولی باتوں، نعرہ بازیوں، کافی ہاؤس میں نکتہ چینیوں اور مضحکہ خیز ریلوں سے پیدا نہیں ہوتا- زندہ و پائندہ اور صحت مند ادب کی تخلیق کوئی بازیچۂ اطفال بھی تو نہیں -

شاعری اصنافِ ادب میں بڑی نازک، لطیف اور حسین صنف ہے - اس کے حسن میں چار چاند لگانا اور اس کو ایسے پیرہن میں سجانے کے لئے جس سے اسکی لطافت و نزاکت مجروح نہ ہو ایسی ہی شخصیت چاہیئے جس کا قلب گداز ہو - جس کی آنکھیں شب تار کی دبیز چادر کو تار تار کر کے لعل و گہر ڈھونڈ نکالیں اور جس کا احساس اتنا تند و تیز ہو کہ اسکو اپنے دل کی ہر دھڑکن میں دوسروں کے دلوں کی دھڑکنوں کا اندازہ ہو سکے - خالد کی شخصیت ان ہی صفات سے عبارت ہے - انھوں نے اپنی شاعرانہ زندگی کی مختصر مدت میں اردو کے شعری ادب کو ان جواہر پاروں اور گہر ریزوں سے سجایا جنکی چمک دمک آخر تاریکیوں کو اجالا دے ہی گئی - ان کا آہنگ منفرد ثابت ہوا، انکی آواز پہ آخر کان کھڑے ہو ہی گئے۔ اور پھر ان کے وہ چند نقاد جنکی دوربین نگاہوں میں انکی شاعری کا کوئی مقصد نظر نہ آتا تھا بالآخر یہ کہتے سنائی دینے لگے ——" خالد بڑا سخت جان نکلا —" انکی سخت جانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف سمتوں سے جارحانہ تنقیدوں کی آندھیوں میں بھی انہوں نے اپنی شاعری کا چراغ روشن رکھا اور ہونٹوں پہ ہمیشہ ظفرمندانہ مسکراہٹوں کی گلکاریاں ہوتی رہیں -

خالد کی بالغ نظری اور ژرف نگاہی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو تیسرے درجہ کی کوئی چیز نہیں دی۔ اپنی تخلیقات کے علاوہ انھوں نے زندہ زبانوں کے ان ہی ادب پاروں کے ترجمے پیش کئے جن کا شمار ادبِ عالیہ میں ہوتا ہے۔ اچھے ادب کے انتخاب کیلئے اچھی نظر اور ستھرا ذوق چاہیئے۔ انھوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی کہ ادب کے پرستار" ان کی کاوشوں اور عرق ریزیوں کا خیرمقدم کس خندہ پیشانی سے کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان کے تحت الشعور میں یہ نازک حس پیدا ہو جاتی تو میں سمجھتا ہوں کہ جس انداز میں ان کی تصنیفات پر تنقیدیں ہوئی ہیں وہ اس سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتے اور پھر کبھی ادھر کا رخ کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

ان کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ خالد ایک دم طوفان کی طرح نہیں آئے۔ وہ چونکہ نرم روی اور نرم گفتاری کے قائل ہیں اس لئے ان کی شاعری بھی آہستہ خرام آئی۔ ان چھوٹی چھوٹی لہروں کی طرح جو نصف النہار کی تیز دھوپ میں پیدا ہوتی ہیں یا پھر نسیمِ سحری کی مانند جو ہولے ہولے چلتی ہے اور فضا کو گلوں کی خوشبوؤں سے عطربیز بنا دیتی ہے۔ ان کا سن پیدائش ۱۹۲۷ء ہے لیکن حیرت ہے اس بات پر کہ زندگی کے اس قلیل عرصہ میں انھوں نے اردو کے شعری ادب کے دامن کو اس قدر معرکہ آرا تصانیف سے کیسے بھر دیا۔ اگر قیامِ پاکستان کے بعد سے اردو ادب کا ایمانداری سے جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اچھے ادب کی تخلیق کی کیا رفتار رہی ہے اور کس نے کیا اور کتنا لکھا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ دو چار شاعروں کے علاوہ کسی نے اس صنف کو شدت سے نہیں اپنایا۔ جب اس صنف کو شدت سے اپنانے اور اس میں تپ کر کندن بننے کی بات آتی ہے تو بلا مبالغہ اور بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ خالد اس میدان میں تنہا نظر آتے ہیں۔ مہا کوی ٹیگور کے بقول

"زندگی کی خوشی کام میں ہے۔ کام میں ایک عجیب لذت ہے۔ یہ لذت تکمیلِ حیات میں ممد و معاون ہے۔" خالد کا بھی یہی نظریہ ہے۔ چنانچہ اسی خیال کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب" زنجیرِ رم آہو" میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

روز و شب کام کرو ذوقِ عمل سے سرشار
جذبۂ شوق پہ الزام نہ آجائے کہیں
دیکھنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں
یہ نہ سمجھو کہ کوئی دیکھنے والا ہی نہیں

اسی کتاب میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

لذتِ کار سے خورشیدِ سحر بن جاؤ
خطِ تقدیر جلیبا ہے تو کیا ہوتا ہے
روز و شب گردشِ پیہم میں رہو پھر دیکھو
پردۂ غیب سے کیا چہرہ نما ہوتا ہے

خالد کا آہنگ منفرد ضرور ہے لیکن ایسا نہیں کہ اسے سن کر دل نہ دھڑک اٹھے۔ وہ جولانگاہِ حیات میں ایسے مغنی ہیں جن کی نوائے جانفزا سے سورج کی تاب و تابش بھی برف کے سانچے میں ڈھل جائے۔ ان کے لبوں سے ماورائی گیتوں کا چشمہ نہیں پھوٹتا بلکہ ان کا دل اسی خاک اسی آب و باد کے گیت گاتا ہے۔ ان کی آنکھیں اس کائنات کے گوناگوں مناظر سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار خالد سے جب آفاقی اور ماورائی دنیا کی باتیں ہو رہی تھیں تو انہوں نے ٹیگور کے اس خیال پر اردو کو دیئے۔ سلوی میں خالد کی شاعری ملاحظہ ہو۔

سیل دباراں سے کبھی بجھ نہ سکے ہجر کی آگ
تن بدن شعلۂ خس پوش سے کیونکر نہ جلے
بزمِ ہستی میں ہے ہر قہقہہ پیغامِ بکا
زمزمہ، نالۂ مرغانِ شب آہنگ بنے
کیوں نہ تڑپی ترے سینہ میں تقاضا بن کر
آرزوئے پرِ سیمیں دزدِ دست افشار
ہوسِ نقرۂ مہتاب و طلائے خورشید

ان اشعار میں جذبات کی کتنی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے اور کتنے حسین انداز میں۔ خالد پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا گیا ہے کہ وہ بہت مشکل پسند شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں چاند کی ٹھنڈک اور گلوں کی خوشبو نہیں۔ وہ دانستہ ایسے ایسے نامانوس اور مشکل الفاظ و استعارے استعمال کرتے ہیں کہ شاعری کا حسین روپ مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اوپر جو اشعار میں نے پیش کئے ہیں ان میں چاند کی ٹھنڈک اور گلوں کی خوشبو بھی ہے۔ ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو نامانوس ہو۔ ہاں کہیں کہیں وہ مشکل پسند ضرور نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سہل نگاری انہیں نہیں آتی۔ شاعر کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے قارئین کو کچھ سوچنے پر مجبور کرے۔ اس کے علاوہ جن ڈراموں کو انہوں نے اردو میں پیش کیا ہے ان کی فضا اور ان کے ماحول کی مناسبت سے وہ ایسا کرنے پر مجبور بھی تھے۔

"مرد ِرفتہ" میں یونانی شاعرہ "سافو" کے جذبات خالد کی زبان سے سنیئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ ان کی شاعری میں رس اور نکھار ہے یا نہیں۔

چاند کا زرد مرمریں بجرہ
قلزمِ نیلگوں میں ڈوب گیا
شعلۂ پرویں کا بجھ کے راکھ ہوا

رات بھیگی، گریزپا لمحے
منزلِ نور کو روانہ ہوئے
سیج سونی ہے خوابگہ تنہا
اے شبِ تار! اے دلِ رسوا!

سر دھنا تھا۔ جس میں انہوں نے کہا ہے۔

" میں اپنی زندگی کا رس اسی خاک، دھرتی اور گھاس پر نچوڑنا چاہتا ہوں۔ وہ لوگ جو دھرتی کی گود کے قریب ہیں، جو اس دھرتی پر پہلا قدم اٹھاتے ہیں اور اس کی گود میں چلے جاتے ہیں۔ میں ان سب کا دوست ہوں، میں شاعر ہوں، میں کوی ہوں۔" اسی خیال کو انہوں نے اپنے اس شعر میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

سورج سے نہ لو روشنی کی بھیک
جگنو کی طرح چمن میں چمکو

(کلکِ موج)

سورج جو آگ اگلتا ہے اور جگنو جس کی شبِ تار میں جلتی بجھتی روشنی کاروانِ آہستہ خرام کو راہ دکھاتی ہے۔ سورج آتشِ نمرود کا تصور پیش کرتا ہے۔ اور جگنو گلزارِ خلیل کا۔ اس شعر میں خالد کی شاعری کا سارا پس منظر نظر آتا ہے۔

منظوم ڈرامے

اردو میں ویسے ہی اچھے ڈراموں کا فقدان ہے پھر جائیکہ منظوم ڈرامے۔ خالد کو اگر منظوم ڈراموں کا سرخیل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جذبات اور تعصبات سے ہٹ کر اگر اردو میں منظوم ڈراموں کا تجزیہ کیا جائے تو بلاحیل و حجت یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ خالد سے پہلے منظوم ڈراموں کی طرف اتنی شدت سے کسی نے توجہ نہیں دی ہے۔ انہوں نے اس صنف کو نہ صرف اپنی شاعرانہ اور فنکارانہ صلاحیتوں سے نکھارا اور سنوارا بلکہ اس خیال کی تردید بھی کر دی کہ منظوم ڈراموں سے اردو کا دامن خالی ہے۔ سلومی، دکانِ شیشہ گر، برگِ خزاں، ورقِ ناخواندہ ان کے چند منظوم ڈرامے ہیں۔ خالد نے جہاں کہیں اور جب کبھی عشق اور محبت پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے جذبات کی ہنگامہ خیزی اور خیالات کی شوریدہ سری اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ بنیادی طور پر خالد شاعرِ حیات ہیں جس میں عشق، حسن اور محبت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میرے اس خیال کی تصدیق " ورقِ ناخواندہ" کے گیتِ رنجِ رائیگاں" سے ہو جاتی ہے۔ مدہ کی زبانی انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا ہے۔

ملی نہ عشق کو توفیقِ عاقبت بینی

تباہ کرتا ہے کانٹوں سے ذوقِ گلچینی
شمیمِ ناز کو یکساں ہے زہر و شیرینی
نوائے مطربِ وابستۂ بہار نہیں
جمالِ غنچہ پابندِ گلعذار نہیں
مرے خلوص کو اندیشۂ زوال نہیں
ہوس پرستیِ محبوب کا ملال نہیں
جہاں میں زخمِ تمنا کا اندمال نہیں

گل نغمہ

خالد نے بنگال کے مہاکوی ٹیگور کی امر کتاب "گیتانجلی" کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ بڑی ہی جرأت کا کام تھا۔ اس کوشش میں بھی وہ کامیاب رہے ہیں۔ میں یہاں قارئین کی دلچسپی کیلئے اصل اور ترجمہ دونوں پیش کرتا ہوں۔

اِے بار جانتے دی تے ہبے آمار اِیَ تَرَی
قی رے بوَ شے جائے جے بیلا، مَوری گو مَوری
پھُول پھوٹا نو شارا گورے بنتو جے گیونس سے
نئے جھورا چھُولیپڑ الا بولو کی کوری
جَل اُڈ ئے چے جل چھلیئے ڈھیوا اوٹھے چے ڈورے
مَر مَورئے جھوَرسے پاتا بیمن تورو مورے

ترجمہ

نالاب ندی میں مجھ کو چھوڑ دینی چاہیے
وقت ساحل پر گذرتا جا رہا ہے رائیگاں سے
حیف مجھ پر! کیا کروں گا میں یہاں سے
جا چکی فصلِ بہار
گل کدوں میں سناتی ہے خزاں
ایک میں سینے سے لپٹائے ہوئے
باسی پھولوں، خشک مرجھائی ہوئی کلیوں کے ہار
محوِ انتظار

ارتضیٰ عزمی

شکست کی آواز

کائنات ایک آہنگ کا ظہور ہے۔ یونانی دیومالا اور ہندو فلسفہ سے قطع نظر اسلامی روایات کے مطابق بھی کائنات کی تخلیق "نغمۂ کن" سے ہوئی ہے۔ یہاں "کن" کو نغمہ سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس لفظ میں بڑی غنائیت ہے۔ جونہی یہ کائنات آفریں جوہر کانوں کے پردوں کو چھوتا ہے تو ذوقِ سماعت میں لاشعوری طور پر کچھ عجیب قسم کی لہریں سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جن کو اگر ہم بہ اعتبار ہیئت نغمہ نہیں کہہ سکتے تو غنا سے الگ بھی متصور نہیں کر سکتے۔ شاید یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی کہ اس مادی ترقی کے دور میں کوئی سائنسدان علمی دلائل سے یہ ثابت کر دے کہ کائنات میں ایک آہنگ کارفرما ہے جس کی حقیقت آفاقی ہے۔ جو کائنات کی ہر ایک چیز میں جاری و ساری ہے۔ جس کی ابتداء ازل اور انتہا ابد ہے ؎

بنا جس کی اٹھی ہے شاعری ؎
رچا ہے نغمہ جس کے بام و در میں
مری نورِ نظر اس پاک گھر میں
فغاں بیجا ہے تیمون بے محل ہے

شعر و غنا کی تعریف کے باب میں شعراء، ناقدین اور دیگر صاحبانِ فکر و نظر نے زمانۂ قبل مسیح سے لیکر دورِ حاضر تک مختلف نظریے پیش کئے ہیں اور اپنے نظریات کی تائید میں مختلف دلائل بھی۔ کوئی شعر کو غیب کی آواز، الہام یا کسی دیوی کا بردان سمجھتا ہے۔ اور کوئی اپنی شکست کی آواز، اپنے خونِ جگر کی تخلیق یا اکتسابی فن مانتا ہے اور یہیں سے ادب میں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی کبھی نہ ختم ہونے والی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت صبا اکبرآبادی کے اس شعر (مطلع) پر

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ صولت جعفر صاحب نے آخر میں فرمایا ہے "یہاں ایک بات میں اور آپ کو بتا دوں کہ اردو شاعری میں اب تک عکس کی آواز نہیں تھی۔ غالب نے بھی صرف اتنا کہا :-

نے گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

فانی نے تو بالکل صاف صاف کہا ہے :

ہوں مگر کیا ؟ یہ کچھ نہیں معلوم
میری ہستی ہے غیب کی آواز

یعنی انسان کی اپنی کوئی آواز نہیں سمجھی گئی۔ اس کا اپنا وجود شکست کی آواز سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس شعر میں شاعر نے عکس کی آواز کہہ کر یہ بات بھی کہنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی بھی اپنی ایک الگ آواز ہے۔ وہ خدا کا اس حد تک تابع نہیں ہے کہ آواز بھی مستعار ہو۔

یہ اتفاق ایک اعتبار سے عجیب بھی ہے اور مسئلہ انگیز بھی کہ "سرودِ رفتہ" کے مطالعہ کے دوران خواجہ صاحب کا مذکورہ ارشاد میرے ذہن میں گونجتا رہا اور برابر مجھے دعوتِ فکر دیتا رہا جس کی وجہ بظاہر اس حسنِ اتفاق کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب نے بھی غالب کے شعر کا حوالہ دیکر ایک بات کہی ہے اور عبدالعزیز خالد نے بھی 'سرودِ رفتہ' کی ترتیب و تزئین میں غالب کے اسی شعر سے نمایاں کام لیا ہے اور سیفو کے غنائیوں کو فنکارانہ انداز سے اردو کے شعری قالب میں سمو کر 'گلِ نغمہ' جیسا معنی خیز اور حسین عنوان دکھا ہے۔ مزید براں 'پردۂ ساز' کے تحت یونانی دیو مالا کے ان اساطیری کرداروں پر محققانہ انداز میں تاریخی روشنی ڈالی ہے جو سیفو کے کلام میں حوالے اور تلمیح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، جن کو سمجھنے کے بعد سیفو کی شاعری (نظموں) کا پس منظر پورے طور پر اجاگر ہو جاتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر اس لیے ناگزیر ہو گیا کہ خواجہ صولت جعفر صاحب کے یہاں اور 'سرودِ رفتہ' کے عنوانات پر مسلسل غور و فکر کرنے سے غالب کے شعر کا طلسم مجھے اپنے ذہن پر کھلتا ہوا محسوس ہوا اور میں نجانے کیوں اس طرح بے ارادہ اچھل پڑا جیسے کوئی اندھیری رات کا مسافر بجلی کے یک بیک چمکنے سے چونک پڑتا ہے۔ غالب نے ایک شعر میں کہا ہے ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

میرے نزدیک اس شعر میں "میں ہوں' ——— اپنی شکست کی آواز" دونوں ٹکڑے ہی مذکورہ شعر کی حیثیت معنوی

اور مجموعی فضا پر غالب آتے ہیں اور اسی رعایت سے گنجینۂ معنی کا طلسم بھی۔

شارحینِ غالب نے مرزا کے دوسرے متعدد متنازعہ فیہ اشعار کی طرح اس شعر کی تشریح بھی اپنے اپنے ذوق و نظر کے مطابق کی ہے۔ مگر "سرود دفتہ" کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور اس شعر کے بارے میں ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی ہے جو شاید بعض حضرات کو چونکا دینے والی ہو کہ غالب نے اپنے اس شعر میں اپنے نظریۂ فن کا نہایت بلیغ و جامع اور فنکارانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے شاعرانہ وجود (ہستی) یعنی خالقِ شعر "میں" کو "گلِ نغمہ" اور "پردۂ ساز" کا مرہونِ منت نہیں مانتا بلکہ اسے اپنی شکست کی آواز سے تعبیر کرتا ہے جو اسکی اپنی آواز ہے کسی اور کی یا الہامی چیز نہیں ہے۔ یہ وہ گلِ نغمہ نہیں ہے جو کسی عالمِ مثال کے پردۂ ساز کی پیداوار ہو یا کسی دیوی نے برتان کیا ہو۔ یہ تو خود فنکار کے سازِ وجود سے پھوٹا ہوا نغمہ ہے جو اُسکی روح کی گہرائیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اُسے کسی غیر کی آواز تصور کرنا الہام اور فن دونوں کی توہین ہے۔ اب ذرا غور کیجئے انسان (فنکار) کی اپنی کوئی آواز ہے یا نہیں؟ — اپنی شکست کی آواز، نعلۂ آہنگ ہے، ہے یا گلِ نغمہ، — غالب نے اپنے اس شعر میں اپنے بعد آنے والی نسلوں کو شاید یہی تنبیہ کی ہے کہ کہیں وہ اس کے دیوان کو الہامی کتاب یا اُس کی بیاضِ شعر کو صحیفۂ آسمانی نہ سمجھنے لگیں۔ ایک جگہ یہ بھی کہا ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

لیکن یہاں بھی "صریرِ خامہ" کو نوائے سروش کہہ کر خود خالقِ شعر ہونے کا اعلان کیا ہے اور اپنی شاعرانہ ہستی کو گراموفون نہیں مانا کہ جو ریکارڈ اس پر چڑھا دیا جاتے اُسی کی آواز آتے۔ پھر غیب سے خیال میں مضامین آنے کی بات بھی شاعر کے شاعرانہ وجود کی تکذیب نہیں کرتی کیونکہ یہاں غیب سے وہ معنی مراد نہیں ہیں جو اصطلاحِ عام میں لئے جاتے ہیں بلکہ غیب فنکار کے ایک وجدانی عالم کا نام ہے۔ ایک فارسی رباعی میں تو مرزا نے اس بات کا بڑے یقین، اعتماد اور کھلے لفظوں میں اظہار کیا ہے کہ اگر یہ فن سخن، کوئی دین ہوتا تو اسکی ایزدی کتاب میرا دیوان ہوتا۔ یہ سارا اعلان اسی "میں ہوں" کا ہے جو اپنی شکست کی آواز کے بھروسے پر کیا جا رہا ہے۔

رباعی

گر شعر و سخن بدہر آئین بودے
دیوانِ مرا شہرتِ پروین بودے
غالب اگر این فنِ سخن دین بودے
آن دین را ایزدی کتاب این بودے

اردو کے موقر ادیب اور عظیم نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے ایک جگہ فرمایا ہے:

بس جسے کہ ہم الہام کہتے ہیں وہ ایک وجدانی کیفیت ہے جو شاعر یا کسی اور صناع پر وقتاً فوقتاً طاری ہوتی رہتی ہے یہ حالت ہمیشہ قائم نہیں رہتی ۔ شاعر کو بار بار ایسی شاعرانہ بلندیوں سے گر کر سطح عام پر آنا پڑتا ہے جہاں اگر وہ عوام الناس کی طرح اپنی ذاتی زندگی کے پھندوں میں الجھ جاتا ہے ۔ یعنی شاعر کی دو ہستیاں ہوتی ہیں ۔ ایک تو اس کی ذاتی ہستی اور دوسری شاعرانہ ہستی ” شاید اسی اسی وجدانی کیفیت کو سیفو نے بہ شعور طور پر الہام سمجھا اور یہی نہیں بلکہ اس کیفیت کے اظہار کیلئے جن الفاظ کو اس نے اپنا آلۂ کار بنایا انھیں بھی الہام حقیقی سے تعبیر کیا ہے ۔

الہام حقیقی نے کیا ہے جنہیں تخلیق
کرتی ہوں الفاظ سے تحریر کا آغاز
ہوتا کہ مرا شعر طرب خیز و فسوں ساز

یہی وہ معنی خیز اور نازک مقام ہے جہاں سے فنکاری میں اک ایسے باب کا آغاز ہوتا ہے کہ بسا اوقات خود فنکار کو الہام اور اپنی آواز میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے ۔ بہرحال اس مسئلہ انگیز سلسلے میں فنکار کے ذاتی عقائد سماجی حالات اور مذہبی حالات کا بڑا دخل ہوتا ہے ۔ اس لئے اگر سیفو نے اپنے ہنر کو زمزمہ و معنی کی دیویوں کی بخشش کہا ہے تو اپنے عہد کے عقائد و حالات کی ترجمانی کی ہے کیونکہ ” قدیم یونانی ادبیات کے ہر شعبہ کو کسی نہ کسی دیوی یا دیوتا سے منسوب کرتے تھے “ ۔

زمزمہ و معنی کی دیویوں نے فرمائی
میری عزت افزائی اور یہ ہنر بخشا

یہاں مجھے اس بات کے اظہار میں کوئی باک نہیں ہے کہ اگر عہد عتیق اور یونانِ قدیم میں زمزمہ و معنی کی دیویوں نے رنگین آواز سیفو کو ہنر بخشا تھا اور اس کی عزت افزائی فرمائی تھی تو دورِ جدید بالخصوص مشرق میں اس کی قدر افزائی زمزمہ و معنی کے ایک دیوتا کی مرہونِ منت ہے اور وہ ہیں اپنا ایک منفرد لب و لہجہ رکھنے والے فنکار ـــــ عبدالعزیز خالد
مدیر انتساب ” سرودِ رفتہ “ پر تبصرہ کرتے ہوتے بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں ۔ فاضل تبصرہ نگار نے عبدالعزیز خالد کی سیفو کے فن اور طریق فن کی نہایت بلیغ و دلکش انداز میں وضاحت فرمائی ہے ، جو فکر انگیز بھی ہے اور معنی خیز بھی ۔ مصنف اور مترجم دونوں کے نظریاتِ فن میں تطبیق دینے کیلئے ایک ایسا انوکھا انداز اختیار کیا ۔ جو دو آتشہ کیفیت کا حامل ہے اور اس امر کا مقتضی ہے کہ اسے یہاں مختصراً نقل کر دیا جائے ۔

الہام حقیقی نے کیا ہے جنھیں تخلیق

کرتی ہوں ان الفاظ سے تحریر کا آغاز
ہوتا کہ مرا شعر طرب خیز و فسوں ساز

"نہ جانے کیوں" جب میں یہ شلف پڑھتا ہوں تو میرے ذہن میں یونانی فکر کے مشرقی مرکز بغداد کی وہ خاص بحثیں تازہ ہو جاتی ہیں جنھوں نے کچھ عرصے کیلئے اس عہد کے علمی، مذہبی اور سیاسی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ ہم ان معرکوں میں فن کی ایک خاص تعبیر پاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی تعبیر ہے جس کی تخلیق فن ایک قسم کی بازیابی سے عبارت ہے، کچھ ایسی بات ہے جیسے کلمات ذہنِ شاعر سے ماورا ایک مستقل وجود رکھتے ہیں۔ اس طرح شاعر جب اپنا کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو دراصل وہ اس کو اپنے طور پر دریافت کرتا ہے۔ عبدالقادر بیدل نے کائنات کا جو ادبی نظریہ پیش کیا ہے وہ بھی اسی قبیل کی ایک چیز ہے "کرتی ہوں، ان الفاظ سے تحریر کا آغاز۔۔۔" سیفو کے یہ الفاظ، عبدالقادر بیدل کے کلمات، فیثاغورث کے اعداد اور لیبنز کی وحدات وغیرہ (MONADS) سے کس قدر مشابہ ہے۔ خالد کی سیفو ایک خاص اعتبار سے فکری انداز نظر کی شاعرہ ہے۔ وہ بظاہر کائنات میں ظہور تکمیل کی طالب ہے اور ہر شے کو کمال سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتی ہے ۔

آ کہ اے میرے بربط پر فن
بولتی جیتی جاگتی شے بن

یہ محض اتفاق ہے کہ سیفو کو مترجم بھی ایسا ملا ہے جسے ذہنی طور پر سیفو کا عاشق یا محبوب ہونا چاہئے۔ سیفو کی طبیعت میں طرح طرح کے انحرافات پائے جاتے ہیں اور تقریباً اسی قسم کے انحرافات خالد کی فطرت میں بھی موجود ہیں۔ بہرحال میں نے احتیاطاً یہ بات کہہ دی ہے ممکن ہے کہیں کام آجائے۔ بہرحال وہ ایک دوسرے کے کافی مشابہ ہیں۔ خالد بھی معنی کی طرح لفظ کو نامیاتی وجود قرار دیتے ہیں۔ فن ان کے نزدیک ایک زندہ اور حساس قسم کی ہستی ہے۔ اسی لئے انھوں نے تخلیق فن، تخلیقی کرب پر ان گنت نظمیں لکھی ہیں۔ وہ فن کو تقریباً حیات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ فن کی یہ تعریف ان کا نظریۂ فن بھی ہے اور فن بھی۔ سیفو ان کے نزدیک شاعرہ نہیں ایک شعر بھی ہے۔ فن کے اس زندہ اور جیتے جاگتے تصور نے اُن کی شاعری میں زندگی کی عظیم ترین معنویتوں کو سمیٹ لیا ہے۔ یہ اندازِ نظر اپنی اصل اور اساس کے اعتبار سے دراصل یونانی ہے۔ قدیم یونانی ادبیات کے ہر شعبے کو کسی نہ کسی دیوی یا دیوتا سے منسوب کرتے تھے۔ ان کو تاریخ، ادبیات، حکمت، حسن و عشق غرض ہر شے میں ایک الوہی شعور کارفرما نظر آتا تھا۔ سیفو کے مترجم خالد لاشعوری اور شعوری طور پر اسی ہمہ گیر معنویت اور سریت سے متاثر ہیں اور اسی لئے وہ اس ترجمہ کو تخلیقی شاہکار بنانے میں کامیاب ہو سکے۔

"سر دو رفتہ" کا ہر مصرع سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کامیابی کا سبب یہی نظری اشتمالیا اندازِ نظر کی مماثلت ہو جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس مجموعۂ سخن کے حسن کے فروغ کا باعث

خالد کا دل گداختہ ہے ۔ خود سیفو کے خیال کے مطابق عروسانِ ادب جابر و خودکام ہیں۔ جنہیں اہلِ ہنر کا ریاض اور سوزِ جگر ہی رام کر سکتا ہے ؎

ہیں گرچہ عروسانِ ادب۔ جابر و خودکام
کرتا ہے انھیں رام ریاضِ اہلِ ہنر کا
ہے شہرتِ پائندہ صلہ سوزِ جگر کا
یہ دولتِ بیدار یونہی ہاتھ نہ آئی

اس لئے وہ چاہے غیرتِ ناہید دزہرہ مرتبت یونانی شاعرہ سیفو ہو ـــ یا ـــ اردو شعروادب میں طرزِ بیدل کے طرح کار عبدالعزیز خالد ہوں جب تک وجدان و فکر کی بیکراں موجوں سے شکست کی آواز الہامِ حقیقی کا نغمۂ پرسوز بنکر زندگی کے سازسے نہ پھوٹے ، فنکار کو اپنے خونِ جگر کا صلہ دولتِ بیدار و شہرتِ پائندہ کی صورت میں نہیں ملتا ۔ خیابانِ سخن کی پگڈنڈیاں دیدۂ بیدار کی اوس ہی سے مہکتی ہیں اور مشامِ جاں کو تھوڑی دیر کیلئے ہی سہی احساسِ نشاطِ بیکراں سے ہمکنار کر دیتی ہے ۔ یہ بھی فنکاری کی ایک اجتماعی علت ہے جس کا عبدالعزیز خالد کو شدید احساس ہے ۔

پروفیسر مجنون گورکھپوری نے کیا خوب کہا ہے" انسان کے مقاصد اور داعیات اور نظامِ قدرت کی طرف سے جو جبر اس پر عائد کیا گیا ہے دونوں کے درمیان سخت تصادم ہے ۔ اس جبر و تصادم سے آزاد ہونے کی خواہش آدمی کے اندر شروع سے کام کرتی رہی ہے ۔ اسی خواہش کا اظہار فنکاری ہے ، خارجی دنیا کو اپنی فرد رلوں اور خواہش کے مطابق بدلنے کی کوشش فنکاری ہے ۔ فنکار حقیقت پر التباس عائد کر کے خارجی اسباب و مؤثرات کو اپنے ذہنی سانچے میں ڈھلتا ہے ۔ فنکاری کی ترکیب میں اجتماعی اور انفرادی دونوں عناصر شامل ہوتے ہیں ۔ فنکار ایک دور اور ایک معاشرہ کی مخلوق فرد ہوتا ہے ۔ لیکن وہ ایک فرد بھی ہوتا ہے ۔ جب ایک مرتبہ اس کا ایک کردار بن گیا اور اس نے ایک مستقل اور منفرد اکائی کی صورت پائی تو اسی کی تمام شخصی خصوصیات اس کے جسمانی افعال و حرکات میں بروئے کار آئیں گی ۔ فنکاری بھی ایک واحد اور منفرد شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے اور اسکی تمام انفرادی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے ۔ اگر فنکار صالح کردار کا مالک ہے اور فطری شخصیت رکھتا ہے تو اسکی تخلیقی اختراعات اور زمانے کے میلانات کے درمیان کوئی تفاق نہ ہوگا بلکہ وہ اپنے دور اور اپنے معاشرے کے غلط اور تخریبی میلانات پر بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ قابو پا جائے گا ۔ اور ان سے بلند ہو کر خود اپنے ماحول پہ اپنا نقش جمائے گا ۔ ایسی ہی شخصیتوں نے تواریخ میں ناقابلِ فراموش یادگاریں چھوڑی ہیں ، جو آنے والے دور کیلئے تکر و عمل کے میدان میں شمعِ راہ بنی ہیں ۔ خالد کے ہاں اس فنکارانہ جہد و پیکار کا عمل برابر جاری ہے وہ شعوری طور پر بتدریج ارتقائی منزلیں طے کر رہے ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہیں ۔ ان کے فن میں روایتی اور ترقی پذیر عناصر ، ہم آہنگ ہو گئے ہیں ۔ ان کے تخلیقی کارناموں کے ساتھ ساتھ سرودِ رفتہ اسکی زندہ مثال ہے ۔ فنی لحاظ سے بھی یہ ایک کامیاب تجربہ ہے جس سے خالد کے گہرے شعور ، موضوع کے ساتھ فنکارانہ خلوص اور انکی دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے ۔ سرودِ رفتہ ،

ایک ایسا پرانا پردۂ ساز ہے جس سے جواں فکر خالد نے نیا گل نغمہ پیدا کیا ہے جو کم از کم اردو شاعری میں بالکل نئی آواز ہے۔ آیئے اب ذرا اس نورس آواز کو سنیئے جو طرب خیز بھی ہے اور فسوں ساز بھی۔

آ کے اے میرے بربطِ پُرفن
بولتی، جیتی جاگتی، سُنے ..ن

ہم صفحۂ ہستی سے کبھی مٹ نہ سکیں گے
رشتہ ہے شہیدوں سے حیاتِ ابدی کا
آتی ہے صدا تیغ کے بہر جرعۂ بریں سے
کوئی نہ کوئی تم کو سدا یاد کرے گا

نہاں ہے قربتِ جمال میں عجیب آگ سی
کہ جس طرح شرار بافتہ حریرِ سنگ ہو

تین چیزوں سے محبت ہے مجھے
روشنی سے، حُسن سے اور دھوپ سے

گرتی ہے میری پلکوں سے جو شبنم رشک
لے جائے غم کے ساتھ انہیں بھی نسیم کاش

آواز گھٹ سی جاتی ہے محرابِ نطق میں
کس منہ سے ماجرائے دلِ مبتلا کہوں

میری زلفیں جن کا دھوون تھا سیاہی رات کی
آج یوں لگتی ہے جیسے چودھویں کی چاندنی

کہہ چکے ہیں دانت منہ کو خیرباد

ہونٹ سیتے پڑ گئے روٹھا ہوا درد بلیغ
لوچ وہ گھٹنوں میں ہے نا آنکھ میں ہے وہ چمک
خواب بکھر کر رہ گئی آئینہ بندی شوق کی

شیب سے لیکن کہاں کس کو گریز
خود خدا بھی عاجز و ناچار ہے
وقت کے سنگین کہسار و مریز
اس زمانے کا یہی دستور ہے
رات کرتی ہے تعاقب صبح کا
روشنی کی دو گھڑی رونق کے بعد
پھیل جاتا ہے اندھیرا چار کھونٹ

میں ہنگام عروج سرخوشی
ٹوٹ جاتی ہے سریلی بانسری
کتنی ارزاں و گراں ہے زندگی
اک سرود پرفغاں ہے زندگی

رفتہ رفتہ اس اپنی آواز کا پرسوز لہجہ ایک فلسفی آہنگ اور سادگی سے اختیار کر لیتا ہے اور کائنات پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

چاند کا زرد مردہ پیکر
قلزم نیلگوں میں ڈوب گیا
شعلہ پرور کا بجھ کے راکھ ہوا
رات بھیگی گزر گیا لمحے
منزل نور کو رواں ہوئے
سیج سونی ہے جوانگر تنہا
اے شب تار اے دل رسوا

یہاں پہنچکر خالد کے انداز فکر اور احساس جمال کی داد نہ دینا فن کی ناقدری ہی نہیں بلکہ اپنے اوپر ظلم کرنے کے مترادف

ہوگا۔ ہرچند کہ ان کی طبیعت مشکل پسند بھی اور وہ اپنی علمیتی وامتیازی شخصیت کے ساتھ ادبیات عالم کے ایک متبحر عالم بھی سہی لیکن اس کے باوصف ان کے یہاں تفکر و تغزل ساتھ ساتھ ملتا ہے ۔ ان کے کلام میں سوز و درد بھی ہے اور ساز و آہنگ بھی، شگفتگی بھی ہے اور روانی بھی، ان کی فکر رسا اور ان کا ذہن آئینہ کی طرح صاف اور فنکارانہ شعور کا حامل ہے ۔ وہ نہایت سادہ و پرکار اور بلیغ انداز میں بڑی چابکدستی احتیاط اور سلیقہ کے ساتھ اپنی دولت بیدار میں روز بروز اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں ؎

نہ ہو سلیقہ تو دولت رفیقہ نادان
اگر ہوں دونوں میسر تو عشرت دو جہاں

غالباً دورِ ماسبق میں سیفو کی نظموں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تھا جسے عربوں نے اپنی پرجوش اور ولولہ انگیز شاعری کے مقابلہ میں روکھی پھیکی جان کر قابل اعتنا نہ سمجھا تھا اور نظرانداز کر دیا لیکن یہ امر اردو زبان و ادب کیلئے فالِ نیک ہے کہ وہی نفس سیفو کی نظموں کو جو بقول ملیگ کے "مختصر ہیں ـــ مگر گلاب کے پھول" جنکی خوش رنگ پتیاں امتدادِ زمانہ کی دستبرد سے مرجھا کر اپنا رنگ و بو کھو چکی تھیں اور ہواؤں میں بکھر چکی تھیں انہیں عبدالعزیز خالد جیسے باشعور اور کلاسیکی ادب سے دلچسپی رکھنے والے شاعر نے اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنے خونِ جگر کا رنگ اور اپنے فنکارانہ خلوص کی مہک عطا کر کے قابل قدر چیز بنا دیا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ "سرودِ رفتہ" پر ترجمہ کا گمان تک نہیں ہوتا بلکہ مترجم کا ایسا تخلیقی کارنامہ معلوم ہوتا ہے ۔

احتشام انصاری اکبر آبادی نے مورخہ ۲۶ ستمبر ۵۹ء کو ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے "سرودِ رفتہ" پر تبصرہ نشر کرتے ہوئے خالد اور ان کی تحریک سے متعلق مختصر الفاظ میں بڑی قیمتی معلومات فراہم کر دی ہیں ۔ فرماتے ہیں :-

" عبدالعزیز خالد صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک باخبر صاحب قلم ہیں ۔ فارسی اور عربی کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کی صحیح لذت سے بھی آشنا ہیں ۔ ہر ادارہ کی اپنی اہلیت فن کو جلا بخشتی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ تخلیقات کے ذریعے خالق کے ذہن و فکر کی گہرائیوں کا جائزہ آسانی سے لیا جا سکتا ہے ۔ لیکن خالد کے قد اور منصب کا اندازہ اگر تخلیقات پر رائے زنی سے پہلے ہی کر لیا جائے تو نقد میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے ۔ خالد کے قد اور شخصیت کا اندازہ جن لوگوں کو ہے وہ ان کے منصب اور مسلک سے آگاہ ہیں کہ خالد بے نیازانہ طور پر اردو شاعری میں ایک نئی تحریک کو رواج دے رہے ہیں ۔ اس تحریک کا مطالعہ ادب شناسی سے گہرا تعلق رکھتا ہے جس کا اندازہ خالد کے کلام سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے ۔ خالد کے قد اور منصب کا صحیح اندازہ تو کوئی انہیں کے قد اور منصب کا شخص لگا سکتا ہے ۔ میں تو یہاں صرف اسی قدر کہنے کی جسارت کروں گا کہ عبدالعزیز خالد کی شاعرانہ ہستی اپنی جگہ پر ایک طویل و مسلسل اور طرحدار نظم ہے جس کی ہر سانس ایک فردوسی آہنگ بھی ہے اور شکست کی آواز بھی ۔ ان کا فن دانش و تخیل کے حسین ترین امتزاج کا سنگم ہے جہاں قدیم و جدید اور آسمان و زمین ملتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی وہ افق ہے جہاں سے ادبِ عالیہ کا سورج طلوع ہوتا ہے ۔ فکر و نظر کا یہ اتحاد زندگی آموز بھی ہے اور حیات افزا بھی اور خالد کی تحریک بھی جو اپنی بھرپور معنویت کے ساتھ پرکشش انداز میں ابھر رہی ہے اور جس کیلئے خالد ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بلند ہو کر شب و روز مصروفِ عمل نظر آتے ہیں :

عبدالعزیز خالد

میں اس ارضِ سیہ کا سودائی
ساتھ ہی چاند کا تمنائی
غمِ دنیا و فکرِ ما فیہا
سرو برگِ جنوں رسوائی
چرخِ زنگار گون و مینا رنگ
گوہر افروزِ نورِ بینائی
ہے بہشت اک مقام روح افزا
حور، غلمان، سبزہ، تنہائی
گل لالہ معانقِ ریحان
عاشقوں کی امید بر آئی
عود و عنبر کی منقلیں روشن
نغمہ پیرا رباب و شہنائی
با ادب، با ملاحظہ ہشیار
دست بستہ کھڑے ہیں مجرائی
لہ نخرہ شیوہ نہیں شریفوں کا
غمزۂ علم کیا، ہرجائی

لہ بڑے بڑائی نہ کریں بڑے نہ بولیں بول
رحمن ہیرا کب کہے لاکھ ٹکا ہے مول

خانمان

خورشید رضوی

عبدالعزیز خالد کی ایک نظم

اُردو ادب پر عربی ادب کے اثرات یوں تو بہت قدیم ہیں جن کی تحقیق ایک مستقل بحث کا موضوع بن سکتی ہے لیکن یہ اثرات بلا واسطہ نہ تھے ۔ بلکہ فارسی ادب سے گزرتے ہوتے اس طرح اردو تک پہنچے تھے جس طرح سورج کی روشنی چاند کے وسیلے سے زمین تک آتی ہے ۔ یہ بات اردو ادب کے آغاز سے لیکر موجودہ زمانے تک کے سارے سرمایۂ شعر پر صادق آتی ہے جس میں اقبال کو بھی یکسر مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ہر چند ان کے فن پر عربی ادب کے اثرات باقی سب شعراء سے بڑھ کر نمایاں ہیں تاہم انہوں نے بھی اس ضیاتے نظارہ سوز کو یکسر عریاں کر ڈالنا مناسب نہیں سمجھا ۔ غالباً عبدالعزیز خالد وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے عربی ادب کا پرتو براہ راست اور بلا واسطہ اردو ادب پر ڈالنا شروع کیا ۔ چونکہ اردو کا مزاج عجم کی وساطت سے بنا تھا لہٰذا خالص عربی آہنگ کو اردو میں ڈھالنا بیاڑ ڈھونے کے عمل سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا ۔ یہ بہت انوکھی اور بڑی مشکل کوشش تھی ۔ لہٰذا اس میں ناکامی کے امکانات کامیابی سے کہیں زیادہ تھے ۔ عبدالعزیز خالد بھی اس ناکامی سے اپنے دامن کو یکسر بچا کر نہیں لے جا سکے ۔ اُن کی بات بسا اوقات بہت بوجھل ہو گئی اور ان کے نامانوس لہجے ، تلمیحات کی اجنبیت اور ذخیرۂ الفاظ کی غرابت نے اُن کے قارئین کا حلقہ بہت تنگ کر دیا ۔ اور ان پر یہ پھبتی بھی کسی گئی کہ اگر وہ دوسرے شعراء کے کلام کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنے کلام کا ترجمہ بھی کر ڈالیں تو زیادہ مناسب ہوگا ۔ کہنے والے کی بات بھی کچھ زیادہ غلط نہ تھی لیکن عبدالعزیز خالد کا بھی اس میں کچھ قصور نہ تھا ۔ منفرد ہونا بجائے خود ایک المیہ بھی ہوتا ہے ۔ اقبال نے بھی کہا تھا

نواز حوصلۂ دوستاں بلند تر است
سخن سرا شدم آنجا کہ ہیچ کس نشنید

ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ عبدالعزیز خالد کی کوششیں ایک ایسے تند و تیز طوفانی دھارے کی مانند ہیں جس کا خروش اوائل میں یقیناً پریشان کن ہوتا ہے لیکن جو بعد میں بہنے والے نرم اور سبک دریاؤں کے لیے پُر امن گزرگاہیں بنا جاتا ہے اور کناروں پر زرخیز مٹی کے ڈھیر چھوڑ جاتا ہے

میں اس اعتبار سے اردو ادب کے ایوان میں جناب خالد کو خوش آمدید کہتا ہوں کہ انھوں نے اردو ادب کے دائرے میں بہت وسعت پیدا کی ہے جو آئندہ ادب پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتسم کرے گی ۔

ان کے اشعار کے ترجمے کی تجویز کچھ اتنی مناسب نہیں ۔ واقعی اگر ان کے اشعار کی تفہیم کی جا سکے تو اہلِ ذوق کچھ نئی شرابوں کے ذائقوں سے آشنا ہو سکیں گے اور یقیناً اس میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا ۔ میں آج تجربے کے طور پر ترجمے کی ایک ایسی کوشش کرتا ہوں ۔ میں نے اس مقصد کے لیے ان کی جس نظم کا انتخاب کیا ہے وہ نسبتاً ان کے تازہ ترین رنگِ سخن کی آئینہ دار ہے اور جو اس بات کی غماز ہے کہ خالد کا جادۂ سفر رفتہ رفتہ ایک ایسا آہنگ نکال رہا ہے جو ممکن ہے کسی روز عرب اور عجم کی درمیانی خلیج پر ایک پل کا کام دے سکے ۔ پندرہ شعر کی یہ نظم یوں ہے

گیا آرزوئے ہم آغوشیٔ نگار کر کے
تو رستہ مرگِ محبت کا اختیار کر گئے
نہ درد کا کہیں درماں نہ زخم کا کہیں مرہم
خرابِ ہجر کے کیسے اکیلے پار کر گئے
ہوئے دشت میں ہے رہروِ صدائے جرس کا
ہے دل بھی پا بہ رکاب اس کا انتظار کر گئے
نہ مجھ میں کوئی فضیلت نہ مجھ میں کوئی کرامت
کہاں تلک اک گلِ بے رنگ و بو سے پیار کر گئے
خدا کرے کہ باندازۂ خمار ہو نشہ
خدا کے بعد بذاتِ خود انکسار کر گئے
کبھی تو آ پہنچے دہ ساخت سبب کہ تم
حسابِ بیش و کم عمرِ مستعار کر گئے
یہ موت کا نکلا معجزۂ ...
زبانِ شاہ کا نیا اب بھی ... کر گئے

ہم اہلِ بیانِ سخن نغمہ سنجِ حسن رہیں گے
بنو رد جیلہ ہمیں تم ذلیل و خوار کرو گے
کسی بھی حرفِ جنون و فسوں کو آڑ بنا کر
ہمیں معتقد و مصلوب و سنگسار کرو گے
ہمیں عبید بن ابرص ہمیں ہیں سرمد دیگر
ہماری بوقلمونی کا کب شمار کرو گے
سحر ہیں نابغہ و ذوالقروح شب متنبّی
مٹاؤ گے تو ہمیں عالم آشکار کرو گے
غلام شعر بھی کہلائیں ہم خدائے سخن بھی
خزاں کے رنگ سے اندازۂ بہار کرو گے
زہیر ہم ہیں ہرم بن سنان تم تو ابد تک
عمر کی ہے یہ سند ہم پہ افتخار کرو گے
ہیں شوق مست عمر بن ابی ربیعہ و خنسا کہ
یہ نشہ مے کا نہیں، اس کا کیا اتار کرو گے

اس نظم میں پہلی نظم طرفہ، متلمس اور بادشاہ حیرہ عمرو بن ہند سے متعلق ہے۔ طرفہ دورِ جاہلیت کے عظیم ترین شعراء میں شمار ہوتا ہے سبع معلقات میں امرؤ القیس کے بعد دوسرا معلقہ طرفہ ہی کا ہے۔ چھبیس برس کی عمر میں اسے حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند نے قتل کرا دیا تھا۔ اس کی لطافتِ سخن اور جوان مرگی کے باعث اسے عرب کا KEATS تصور کیا جاتا ہے۔ متلمس اس کا ماموں تھا اور خود بھی ایک مسلم الثبوت شاعر تھا۔ طرفہ پر عمرو بن ہند شاہ حیرہ کے عتاب کے کئی اسباب بتائے گئے ہیں جن میں ایک یہ ہے اور اسی طرف عبدالعزیز خالد نے اشارہ کیا ہے۔

ایک روز طرفہ بادشاہ کی بزمِ شراب میں شریک تھا کہ بادشاہ کی بہن نے کہیں اوپر سے جھانکا۔ طرفہ نے اس کا عکس اپنے جام میں دیکھا۔ طرفہ ایک طرف لاابالی، لذت پرست اور منچلا نوجوان تھا اس نے برجستہ کہہ ڈالا ؎

أَلَا يَا أَيُّهَا الظَّبْيُ الَّذِي يَبْرُقُ شَنْفَاهُ

وَلَوْ لَا الْمَلِكُ الْقَاعِدُ قَدْ أَلْثَمَنِيْ فَاهُ

"آہ۔ یہ غزالِ رعنا جس کے کانوں کی بالیاں دمک رہی ہیں۔ اگر بادشاہ سامنے بیٹھا ہوا نہ ہوتا تو ضرور وہ مجھے اپنے بوسۂ دہن سے کامیاب کر چکا ہوتا۔"

بادشاہ کا دل جوشِ غضب سے لبریز ہو گیا۔ لیکن وہ اس بات سے خائف تھا کہ طرفہ اور اس کا ماموں متلمس ایک دوسرے کے حریف ہیں اور اگر طرفہ کو قتل کرا دیا گیا تو متلمس مسلسل اس کی ہجو کرے گا۔ لہٰذا اس نے اپنے بغض کو ظاہر نہ ہونے دیا اور طرفہ اور متلمس دونوں کو بیک وقت راستے سے ہٹانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ پہلے پہل متلمس کو کچھ شبہ گزرا لیکن عمرو بن ہند نے ظاہری طور پر ایسا حسنِ سلوک جاری رکھا کہ طرفہ اور متلمس دونوں کے دل سے کھٹک نکل گئی۔ بعد ازاں ایک روز اس نے دونوں سے کہا "شاید تم دونوں وطن کی یاد میں اداس ہو گئے ہو"۔ طرفہ اور متلمس کا وطن بحرین تھا انہوں نے کہا "ہاں" بادشاہ نے دونوں کو الگ الگ ایک فرمان بحرین میں اپنے گورنر کے نام دیا اور کہا جاؤ یہ دکھا کر اپنے اپنے انعامات وہیں سے وصول کر لینا۔

متلمس ایک جہاندیدہ آدمی تھا۔ اسے اس نامۂ شاہی سے فساد کی بو آتی تھی۔ دونوں ان پڑھ تھے۔ متلمس مصر ہوا کہ کسی سے یہ خط پڑھوا کر دیکھ لئے جائیں لیکن طرفہ فرمان کو چاک کرنے پر راضی نہ ہوا۔ آخر متلمس نے اپنا خط حیرہ کے ایک لڑکے سے پڑھوا لیا اس میں لکھا تھا کہ متلمس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے زندہ دفن کر دیا جائے۔ متلمس نے یہ نوشتۂ قضا ایک ندی میں پھینک کر راہِ فرار اختیار کی۔ یہیں سے عربی میں "صَحِیْفَةُ الْمُتَلَمِّسِ" کی مثل مشہور ہوئی جو ایسے وقت میں بولی جاتی ہے جب کوئی شخص خود اپنے ہاتھوں میں اپنی موت کا پروانہ لئے پھرتا ہو اور اس سے بے خبر ہو اور اسی کی طرف عبدالعزیز خالد نے اشارہ کیا ہے ؎

خریطہ[1] موت کا نکلا صحیفۂ متلمس
زبانِ شاہ کا کیا اب بھی اعتبار کرو گے

طرفہ بدنصیب تھا اس نے اس انکشاف کے باوجود فرمانِ شاہی کو چاک نہ کیا اور بحرین کا سفر جاری رکھا جہاں کے گورنر نے بالآخر اسے عمرو بن ہند کے فرمان کے مطابق قتل کر دیا۔ طرفہ نے آخری خواہش یہ ظاہر کی کہ اسے سیرابی کی حد تک شراب پلائی جائے اور بعد ازاں اکحل نامی شریان کا منہ کھول دیا جائے تاکہ تمام خون بہہ جائے اور اس کی موت بے خبری کے عالم میں واقع ہو جائے۔ اب اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوبارہ ان اشعار پر غور کیجئے۔

---

[1] "خریطہ" تھیلے کو کہتے ہیں۔ اگر خالد صاحب اس کی بجائے "نوشتہ" کا لفظ استعمال کرتے تو زیادہ آسان اور برمحل ہو جاتا۔

نصیب ہے طرفہ زمانے میں ماجرا طـرفہ کا
تم آل عمرو[1] ہو ہم پر بھی یونہی وار کرو گے
ہم ایلہان سخن نغمہ سنج حسن رہیں گے
بنور دجیلہ ہمیں تم ذلیل و خوار کرو گے
کسی بھی حرف جنون و فسوں کو آڑ بنا کر
ہمیں مقید و مصلوب و سنگسار کرو گے

دوسری تشریح طلب تلمیح عبید بن الابرص کی ہے ۔ یہ بھی دور جاہلیت کا صاحب دیوان شاعر ہے ۔ اور یہ بھی طرفہ کی طرح حیرہ ہی کے ایک اور بادشاہ " المنذر بن ماء السماء " کے حکم سے تقریباً یکساں حالات میں قتل ہوا ۔ روایت ہے کہ اس بادشاہ کے دو ہم نشین " خالد بن المضلل " اور " مسعود بن کلدہ " تھے ۔ کسی بات پر ناراض ہو کر اس نے نشے کی حالت میں ان دونوں کو زندہ دفن کر دینے کا حکم دے دیا ۔ ہوش آنے پر بہت پشیمان ہوا اور ان دونوں کی قبر پر دو لاٹیں تعمیر کرائیں جن کو " الغریان " کہتے تھے ۔ بعد ازاں سال میں دو تاریخیں مقرر کیں جن میں سے ایک " یوم نعیم " " خوش بختی کا دن " اور دوسری " یوم بؤس " یعنی " سختی کا دن " کہلاتی تھی ۔ یوم نعیم میں جو سب سے پہلے اسے نظر پڑتا اس کو وہ اعلیٰ نسل کے سو اونٹ عطا کرتا اور جو کوئی یوم بؤس میں سب سے پہلے سامنے آ جاتا اسے " ظربان " نامی ایک بدبودار جانور کا سر پیش کیا جاتا اور بعد ازاں اسے ذبح کر دیا جاتا اور اس کے خون سے " الغریان " کو لیپا جاتا ۔ ایک عرصہ یہ دستور جاری رہا ۔ پھر یہ اتفاق ہوا کہ یوم بؤس میں مشہور شاعر عبید بن ابرص اس کے سامنے آ گیا ، بادشاہ نے کہا

" هَلَّا كَانَ الذَّبْحُ لِغَيْرِكَ يَا عُبَيْدُ ؟"

" عبید ! کیا ذبح ہونا تیرے سوا کسی اور کا مقدر نہیں ہو سکتا تھا ؟ "

عبید نے کہا

أَتَتْكَ بِحَائِنٍ رِجْلَاهُ "

" اجل رسیدہ کے اپنے قدم اسے تیرے پاس لے آتے ہیں "

منذر نے کہا

" مرنے سے پہلے مجھے کچھ شعر سناؤ "

عبید نے جواب دیا

حَالَ الْجَرِيضُ دُونَ الْقَرِيضِ "

---

[1] لفظ " عمرو " میں واؤ بولنے میں نہیں آتی ۔ اس کا تلفظ " عَمر " ہے ، یعنی عین پر زبر اور میم ساکن

"غم واندوہ کی گلوگیری، شعر کی راہ میں حائل ہو چکی ہے ۔
اسی طرح سے کچھ اور بھی سوال جواب ہوئے جو ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے ۔ آخر کار بادشاہ نے کہا "موت تو ناگزیر ہے ۔ اگر میرا بیٹا نعمان بھی یوم بؤس میں میرے سامنے آ جاتا تو یقیناً میں اسے ذبح کروا دیتا ۔ ہاں اپنی موت کے لئے خود انتخاب کر لے "اکحل" یا "ابجل" (رگوں کے نام) یا شہ رگ ۔
بالآخر اسے بھی طرفہ کی طرح شراب پلا کر اور فصدیں کھول کر ہلاک کر دیا گیا ۔ یہی وہ عبید بن ابرص ہے جس کی طرف عبدالعزیز خالد نے اشارہ کیا ہے ۔

بعد کے اشعار میں نابغہ ، ذوالقروح اور متنبی کا ذکر ہے ۔ نابغہ دورِ جاہلیت کا اور متنبی عباسی دور کا مشہور و معروف شاعر ہے ۔ ان دونوں کا تعارف کسی نہ کسی حد تک ہمارے ہاں موجود ہے ۔ البتہ "ذوالقروح" تشریح طلب ہے ۔ یہ معروف شاعر امرؤ القیس کا لقب ہے ۔ ذوالقروح کا مطلب ہے "زخموں والا" امرؤ القیس کا باپ حُجر، کندہ کا بادشاہ تھا اور بنو اسد اس کی رعایا تھے روایت ہے کہ جب بنو اسد نے حُجر کو قتل کر ڈالا تو امرؤ القیس باپ کا قصاص لینے کی غرض سے قیصرِ روم سے امداد لینے قسطنطنیہ پہنچا لیکن قیصر کے دربار میں بنو اسد کا ایک شخص طماح نامی موجود تھا ۔ اس نے امرؤ القیس کے خلاف قیصر کے کان بھرنے شروع کر دیئے کہ یہ ایک بدکردار شخص ہے اور قادر الکلام شاعر ۔ یہاں سے واپس جا کر عرب میں آپ کی لڑکی سے معاشقے کی داستانیں نشر کرے گا ۔ اس پر قیصر نے امرؤ القیس کو ایک لشکر دے کر عرب کی طرف روانہ کیا اور بعد ازاں زہر میں بسا ہوا ایک خلعت بھیجا جو اسے راستے میں موصول ہوا ۔ جونہی اس نے یہ خلعت پہنا اس کے جسم میں جا بجا زخم ہو گئے اور انہی زخموں کی تاب نہ لا کر وہ انقرہ کے قریب مر گیا ۔ زہر میں بسے ہوئے خلعت کی یہ اسطور یونانی دیو مالا میں "جیسن" اور "میڈیا" نیز "ہرکولیس" "نی سس" اور "ڈیا نیرا" کی اساطیر سے بہت مماثلت رکھتی ہے ۔ الغرض انہی مہلک جراحتوں کے باعث امرؤ القیس کو "ذوالقروح" کا لقب ملا جس کی طرف خالد صاحب نے اشارہ کیا ہے ۔

سحر ہیں نابغہ و ذوالقروح شب متنبی
مٹا گئے تو ہیں عالم آشکار کر گئے

"غلام شعر" کی ترکیب بھی تشریح طلب ہے ۔ عرب کے بعض شعراء اپنے شعر کی نوک پلک سنوارنے میں بہت محنت سے کام لیتے تھے ۔ مثلاً زہیر کے بارے میں روایت ہے کہ وہ چار ماہ میں ایک قصیدہ کہتا تھا پھر چار ماہ اس کی کانٹ چھانٹ پر صرف کرتا تھا بعد ازاں چار ماہ صرف خاص خاص احباب کو دکھا کر مشورہ کرتا تھا اور آخر ایک برس کے بعد اسے منظر عام پر لاتا تھا اسی لئے اس کے اس نوع کے قصائد کو "حولیات" یعنی "سال بھر میں کہے گئے" کا نام ملا ۔ مشہور قدیم عالم و نقاد "اصمعی" نے اس طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا :

"زهير والحطيئة واشباههما من الشعراء عبيد الشعر لأنهم نقحوه و
لم يذهبوا به مذهب المطبوعين"

یعنی "زہیر اور حطیہ اور اسی قبیل کے دوسرے شعراء تو "شعر کے غلام" ہیں ۔ کیونکہ وہ اس کی کاٹ چھانٹ میں مبتلا رہے اور فطری شعراء کی سی روش اختیار نہیں کی ۔"

اصمعی کی اسی ترکیب "عبید الشعر" کی طرف خالد صاحب نے "غلام شعر" کہہ کر اشارہ کیا ہے ۔

غلام شعر بھی کہلائیں گے ہم صداتے سخن بھی
خزاں کے رنگ سے اندازۂ بہار کرو گے

اس کے بعد "زہیر" "ھرم بن سنان" اور "حضرت عمرؓ" کی تلمیح آئی ہے۔ زہیر کا ذکر ابھی آپ نے سنا۔ وہ دورِ جاہلیت کا ایک سلیم الطبع اور سنجیدہ مزاج شخص تھا۔ جس کا کلام پُند حکیمانہ اقوال سے پُر ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس کا کلام بہت پسند تھا۔ دورِ جاہلیت کا ایک قبائلی سردار ھرم بن سنان بھی اس کے فن کا بہت معترف تھا۔ زھیر نے اسکی مدح میں بہت سے قصیدے کہے جو آج تک یادگار ہیں۔ ہرم بڑا سخی آدمی تھا۔ روایت ہے کہ اس نے قسم کھائی تھی کہ زہیر جب بھی اس کی مدح کرے گا وہ ضرور اسے انعام دیگا اور جب بھی کسی شے کا سوال کرے گا وہ ضرور اسے عطا کرے گا اور جب بھی اسے سلام کریگا وہ اسے غلام یا لونڈی یا گھوڑا بخشے گا۔

زہیر ایک خوددار اور غیور انسان تھا وہ ہرم بن سنان کی بخشش کی کثرت سے شرمسار رہنے لگا۔ چنانچہ جب کسی مجمع میں ہرم کو دیکھتا تو کہتا ؎

"اِنعموا صبَاحًا غیرَ ھرم ۔ وخیرَکم استثنیتُ"

"سب کو سلام صبح ۔ سوائے ہرم کے اور یاد رہے کہ میں نے تم میں سے بہترین شخص کو مستثنیٰ کیا ہے"

شہرۂ آفاق نعتیہ قصیدہ "قصیدہ بردہ" میں امام بوصیریؒ نے بھی زہیر اور ہرم کی تلمیح استعمال کی ہے ؎

وَلم أُرِد زھرۃَ الدُّنیا التی اقتطفت
یَدَا زھیرٍ بما اثنیٰ علیٰ ھرمٖ

"حضورؐ! میں دنیا کی اس بہار کا طلبگار نہیں ہوں
جس کی گل چینی زہیر کے ہاتھوں نے
ہرم بن سنان کی مدحت کے عوض کی"

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار ہرم کی اولاد میں سے ایک شخص سے کہا "مجھے کچھ ایسے شعر سناؤ جو زہیر نے تمہارے خاندان کے بارے میں کہے ہیں۔

جب اس نے سنائے تو آپ نے فرمایا" زہیر تمہاری مدح کرتا تھا اور بہت خوب کرتا تھا" اس نے کہا" امیرالمومنین! ہم بھی اسے انعام دیتے تھے اور بہت زیادہ دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا" جو کچھ تم نے اسے دیا وہ فنا ہو گیا مگر جو کچھ اس نے تمہیں دیا وہ باقی ہے"

اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے زہیر کے بیٹے سے کہا
" وہ پوشاکیں جو ہرم بن سنان نے تمہارے باپ کو پہنائی تھیں، کیا ہوئیں؟"
اس نے کہا" زمانے نے انہیں بوسیدہ کر دیا" فرمایا" لیکن جو پوشاکیں تمہارے باپ نے ہرم کو پہنائیں زمانہ انہیں بوسیدہ نہیں کر سکا"

اس تلمیح کو خالد صاحب نے یوں سمیٹا ہے ؎

زُہَیر ہم ہیں، ہرم بن سنان تم، تو اب تمہ
عمرؔ کی ہے یہ سند ہم پہ انتظار کرو گے

آخری شعر میں خالد نے خود کو عمر بن ابی ربیعہ سے مشابہ قرار دیا ہے جو ایک رومانی طبیعت رکھنے والا دل پھینک جادو بیان شاعر تھا جس کے سر سے تاکنے جھانکنے کا سودا اور دل سے شوقِ رخ نکو کبھی نہ جا سکا۔

ہیں شوق مست عمر بن ابی ربیعہ و خالد
یہ نشہ ہے کہ نہیں؟ اس کا کیا اتار کرو گے

آخر میں سوئے ادب کی معافی چاہتے ہوئے خالد صاحب کی خدمت میں خلوص کے ساتھ یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر چند اُن کے آہنگ میں ایک خوش آئند ارتقاء کا سُراغ مل رہا ہے تاہم عربی ادب ـــ (یا دیگر آدابِ عالم) ـــ کے اثرات براہِ راست اردو میں منتقل کرنے کا اُن کا یہ عظیم الشان شعری تجربہ ہنوز ایک یکجان تخلیق میں نہیں ڈھل سکا۔ یہ لخت لخت عناصر (SPARE PARTS) کا ایک مجموعہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ تجربہ اس وقت تک اپنی صحیح منزل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک یہ لخت لخت عناصر معدوم ہو کر ایک نئے کل میں اس طرح ظہور نہ کریں جس طرح چمن چمن کے برگ و گل کا عرق زنبورِ عسل کی جانکاہ ریاضت سے شہدِ خالص کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خالد صاحب جیسے منفرد اور انتھک فنکار سے اس منزل تک رسائی کی توقع بجا طور پر رکھی جا سکتی ہے۔

عبدالعزیز خالد

صریرِ خامہ

رہین زر نہیں فن کار کی ہنرمندی
سفارشات سے سوزِ نہاں نہیں ملتا
کنارِ بحر پہ غواص گرد پہ تنبل ہے
کہ بے دُعا گہرِ شاہگاں نہیں ملتا
شکستِ شیشۂ دل کی دعا نہیں ہوتی
فسادِ زخمِ جگر کا نشاں نہیں ملتا
کوئی مقام بھی ناممکن الحصول نہیں
کوئی مقام بھی بے امتحاں نہیں ملتا

اکرام ہوشیارپوری

افکارِ پُرکار کا شیفتہ

اب خالد صاحب کے بارے میں یہ بات بیان کرنا تو کوئی نئی بات نہیں کہ وہ ایک عظیم شاعر ہیں یا شاعرِ امروز و فردا و دیگر دانائے راز ہیں۔ یا کوئی یہ کہے کہ اُن کی شاعری میں ہمہ رنگی و ہمہ جہتی پائی جاتی ہے۔ بلکہ اُن کے کلام میں تمام زبانوں اور دنیائے ادب کے اکثر کلاسیکل اور جدید اساتذہ کے کلام و زبان و بیان کا رنگ ڈھنگ اور انگ پوری طرح جھلکتا ہے۔ اُن کے یہاں خارجیت داخلیت اور داخلیت خارجیت آپس میں گلے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُن کا مطالعۂ زبان و ادب وسیع ہے۔ وہ ایک منفرد بے مثال قادر الکلام شاعر ہیں۔ یہ تمام باتیں ان کے بارے میں اکثر نقاد حضرات مختلف تنقیدِ ادب کی کتب و رسائل میں فرما چکے ہیں اور ان کے متعدد خاص نمبر بھی چھپ چکے ہیں۔ بہ مجموعی طور پر سب کچھ درست ہے۔ میرے پیشِ نظر خالد صاحب کی نئی تخلیقات میں سے ایک شعری مجموعہ "حدیثِ خواب" ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں صرف اسی کی روشنی میں بات کروں گا۔ اس کتاب میں بھی حسبِ معمول کچھ اشعار ایسے ہیں۔ جن کو پوری طرح سمجھنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ خالد صاحب کا ایک خاص اور منفرد رنگ ہے جس کے سمجھنے کے لئے قاری بھی اُنہی جیسا اعلیٰ اور ایک معیاری علم رکھنے والا ہونا لازمی ہے۔ ان کے پورے کلام کو سمجھنے اور اس سے کماحقہ استفادہ کرنے اور راہنمائی حاصل کرنے کے لئے خالد صاحب جیسا ہمہ دان و ہمہ زبان ہونا چاہیے۔

جہاں تک "حدیثِ خواب" کا تعلق ہے میرے اپنے محدود مطالعے میں ان کی جتنی تخلیقات آ چکی ہیں۔ مجھے یہ شعری مجموعہ اُن سب سے زیادہ متاثر کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ شاعر کی بھرپور شخصیت اور شاعری کا جس شخص کو مطالعہ کرنا ہو اُسے "حدیثِ خواب" لازماً پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔ یہ میرا ذاتی تاثر ہے۔

اس تخلیقی شاعرانہ شاہکار میں وہ ہر چیز بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ جو اُن کی ذات، شخصیت اور ان کے شاعرانہ کمال میں جاری و ساری ہے۔ سب سے پہلے جس نظم نے مجھے متاثر کیا وہ "یاد دیئے" ہے۔ یہاں نظم کا بھرپور تاثر موجود ہے۔ نظم کے شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے قبل میں تمام نظم نگاروں میں علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، مصطفٰے زیدی، حفیظ جالندھری اور احمد ندیم قاسمی اور احسان دانش سے زیادہ متاثر تھا۔ میں ان لوگوں کے کلام سے اپنی تشنگی دور کرتا رہا۔ لیکن جب سے میں نے خالد صاحب کی نظم کا مطالعہ کیا ہے تو مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ان نظم نگاروں کی روایت کو خالد صاحب نہ صرف

برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ اس میں نئے الفاظ و تراکیب، استعارات و تشبیہات کا وافر ذخیرہ کر کے اسے آگے بڑھا رہے ہیں۔ اور اس میدان میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھا رہے ہیں۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ وہ کس مقام پر سرفراز ہوں گے۔ وہ اقبالؔ و جوشؔ اور میر و غالبؔ کی شاندار شعری وادبی تحریک کے ایک منفرد اور عظیم نقیب کی حیثیت سے جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ جن حد بندیوں اور رسوم و قیود و لسانی و بیانی اصولوں کے اعتراضات کچھ "اہلِ زبان" اُن کی شعرگوئی اور مشکل پسندی پر کرتے ہیں۔ یہاں آ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ان اعتراضات کی رکاوٹوں اور رسوم و قیود سے بالاتر ہیں۔ یہ شاعر تو زبانِ شعر و ادب میں ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہیں جس میں زبان و بیان کے بے بہا اور بے شمار جواہرات ہونے کے ساتھ ان گنت دوسری چیزیں بھی موجود ہیں جو کہ ایک سمندر میں ہونی چاہئیں۔

نظم "یاد ہے" کے پہلے بند پہ آپ غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ اُن کے یہاں وہ تمام جدید شعری خصوصیات موجود ہیں جو آج کل کی نوجوان نسل کے شاعروں کے ہاں لازمی سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً ؂

گفتگو کرتی ہیں دل سے یونہی یادیں تیری
جس طرح خواب میں اُبھرے کوئی سرگوشی
لے گیا لوٹ کے جو گنجِ گرانمایۂ دل
بے وفائی میں وفادار ہے وہ ہرجائی
رات بھر دل جلے تاریکی و تنہائی میں
ہائے کس سے کہوں، بیرن بنی رُت برکھا کی؟
تو نے مجبور کیا اپنی محبت پہ مجھے
ورنہ اے دشمنِ جاں! میں تو نپٹ الھڑ تھی!

اس نظم کے بعد سب سے نمایاں خصوصیت جو ان کے کلام میں ہر جگہ موجود ہوتی ہے وہ اُن کی نظم "تسخیرِ قمر" میں پوری آن بان سے پائی جاتی ہے۔ وہ خصوصیت حمد و نعت کی ہے۔ یہاں مجھے یہ ضرور کہنا پڑتا ہے۔ کہ خالد صاحب جو کچھ بھی ہیں خواہ وہ نظم کہیں یا غزل، قطعہ یا رباعی، ہر صنفِ سخن میں حمد و نعت کا رنگ ڈھنگ اور اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت کی ترنگ اور قرآنی شان ضرور موجود ہوتی ہے۔ اس نظم میں بھی تسخیرِ فطرت کا تصور پوری طرح ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اور یہاں بھی شاعر کا قلم اُسی صاحبِ معراج کا ثناخواں ہے۔ جس نے علم و عرفان کا زور دکھایا ہے۔ اور صاحبِ علم و عمل کو گنبدِ گرداں پر پہنچتے دکھایا ہے۔ اعلیٰ کردار اور عقل و علم و حکمت کے اشارے کئے گئے ہیں اور اس کے بغیر زمانے میں آشوب و فساد کا دور دورہ دکھایا ہے۔ علم و اخلاق کی افادیت سے عاری ہونے پہ انسانیت کے لئے آزار اور سزا کا موجب قرار دیا ہے۔ وہ اپنی نظم "تسخیرِ قمر" میں فرماتے ہیں۔ ؂

گر نہ کردار کے ہاتھوں میں ہو طاقت کی زمام

جو خودی سے نہ کسی خیر کی صورت پیدا
عقل حکمت سے ہو بے بہرہ تو آشوب و فساد
علم اخلاق سے عاری ہو تو آزار و سزا

اس کے بعد جس غزل پر جا کر میری نظر ٹھہری اس میں شاعر نے عاشق و معشوق کے درمیان مختلف حالتوں کا موازنہ بڑے عظیم شاعروں، فطری و قدرتی فن کاروں کی طرح اظہار کیا ہے جس میں نئے انداز میں اپنی شخصیت اور فن کی خود اعتمادی اور عزتِ نفس اور پاسِ ناموس کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں روایت کی اہمیت کے ساتھ روایت کا عنصر بھی شامل ہے۔ غزل گوئی میں بھی یہ شاعر یکتا ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ اکثر ان کی غزلیں بھی نظموں سے مُرملاتی نظر آتی ہیں۔ دراصل نظم و غزل دونوں میں برابر تغزل، ترنم، تفکر، تصوف و فلسفہ کی خوبصورت اور شاندار آمیزش ہے اور یہی چیز ان کی ہمہ رنگ ذات و شخصیت کی آئینہ دار اور فن کی معراج ہے۔ اکثر مقامات پر غزل، نظم، حمد و نعت، تصوف و فلسفہ آپس میں شیر و شکر ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس غزل کے شروع کے اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

میں افکارِ پُرکار کا شیفتہ
تو مشتاقِ معشوقِ مشوق کا
تپِ جستجو، گرمیٔ آرزو
مری زندگانی نشید و نوا
کبھی ہوش و دانش کبھی جوش و جذب
غذا میری حمد و درود و دعا
غذا مست زندہ شہیدِ سخن
لہو سے جلاتا ہوں فن سکا دیا

آگے اسی غزل میں فرماتے ہیں ؎

تو فی رو رہا جو اچھوتے خیال
ملاتا ہوں کے میں زلالِ بقا
نہ پہچانے وہ سجدۂ شعر کو
عبادت ہے شاعر کی لحن و غنا

معیارِ شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی روایتی غزل اور اس انداز سے ہٹ کر ایک نیا خیال انوکھا تصور اور اچھوتا فکر اور سوچ پائی جاتی ہے۔ ایک دوسری غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہر کمینہ عشق کا بھرتا ہے دم

اک ستم یعنی کہ بالائے ستم
علم کا سیلاب ہے حکمت ناقص
لوگ کہتے ہیں بہت کرتے ہیں کم

عیب اپنے کس کو آتے ہیں نظر
کھا لے وہ دامانِ مریم کی قسم

ظلم کے بے انت ہے انداز روپ
پیشوائی جن کو دیتی ہے جنم

کس طرح حاصل ہو اطمینانِ قلب
اے زبوں تجھ دینار و درم
یہ جذبہ تنوں میں سمٹ کر رہ گئی
دولتِ بیدارِ اقوام و اُمم

ان کی غزلیات میں بھی تمام عصری تقاضوں کا گہرا پَرتو ہے اور زندگی کے بدلتے ہوئے حالات واقعات اور مسائل کا پورا پورا احساس رچ بسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی کردار کی نفسیاتی کیفیات اور شخصیتوں کے ظاہر و باطن اور قول و فعل میں تضاد کی بھرپور اور مکمل عکاسی ملتی ہے۔ اس طرح "حدیثِ خواب" کی غزلوں اور نظموں میں یہ رنگ بڑھ چڑھ کر ظاہر ہوا ہے۔ یہ انداز خالد صاحب کی ایک نظم "ہم" میں زیادہ نمایاں ہے۔ ویسے تو یہ اثر ہر جگہ لیکن یہاں خاص طور پر ان کا لہجہ میر، اقبال، غالب کے اکثر اشعار کی صدائے بازگشت بن جاتا ہے جس کو انہوں نے نئے انداز میں پیش کیا ہے۔

بڑی نعمت ہے بے برگ و نوائی
سر و ساماں لٹا کر شادماں ہیں

خالد صاحب نے اس شعری روایت کا شدید احساس پوری طرح جم کر آیا ہے۔

نہیں عرضِ ہنر کا ہم کو سودا
فقط سوزِ دروں سے نغمہ خواں ہیں

ہر اک جابر کے آگے سرکشیدہ
ہر اک بے دست و پا کے پاسباں ہیں

ہمارے ہم قدح بوذرغفاریؓ
ابوبکرؓ و عمرؓ پیرِ مغاں ہیں
جفاکو مژدۂ مرگِ مناجات
وفا کو یادِ یارِ مہرباں ہیں

اُردو، ہندی، پنجابی، فارسی اور عربی ادبیات پر [illegible] وسیع نظر کے باعث اکثر تاریخی ادبی و تلمیحی اشارے و کنائے اُن کے کلام میں خودبخود ہاتھ باندھے چلے آتے ہیں۔ ان [illegible] نہاں ہیں وہ دوستی کے بھیس میں دشمنی کرنے والے افراد کے چہروں پر سے اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجربات شاعر کی زندگی میں فی الواقع گذرے ہیں۔
نام نہاد اہلِ زبان کے بارے میں یوں اظہار کرتے ہیں۔

لگے یوں دوستوں کے جمگھٹے میں
کہ جیسے دشمنوں کے درمیاں ہیں
تکلف برطرف اربابِ اُردو
برے بس نام کے اہلِ زباں ہیں

یہ قلبی و ذہنی [illegible] وکیفیات شاعر کے یہاں اس وجہ سے دکھائی دیتی ہیں کہ ہمارے یہاں بدقسمتی سے ادبی و علمی تحریکوں میں تعمیری و تخلیقی کام کرنے کی بجائے ذاتی قسم کے اور محدود و متعصب ذہنوں کی وجہ سے جو تعصبات پائے جاتے ہیں اور جو لوگ ابھی تک اپنے محدود ذہن اور سوائے اپنی ذات کے خول کو توڑ کر باہر نکلنے کے لئے تیار نہیں اور وہ کوئی تخلیقی کام کرنے سے عاری ہیں۔ مختلف سیاسی حربوں سے بغیر کوئی کام لئے اپنا نام بڑے ادیبوں اور نقادوں میں شامل کروا کے محض اپنے قد کو بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں اور خود کو اہلِ زبان سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں بھی "حدیثِ خواب" کے شاعر نے یہاں اکثر اشعار میں اشارے کئے ہیں۔ ایسے لوگ خالد صاحب کی صرف مشکل گوئی یا عربی دانی کو نشانہ بنا کر شعروادب کے پارکھ اور نقاد بننا چاہتے ہیں۔

میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے اس شاعر پر اُن کی پُرگوئی یا بسیار نویسی و زود نگاری کو سامنے رکھ کر اُن کی طویل غزلوں اور نظموں کا حوالہ دیتے ہیں "حدیثِ خواب" کی مختصر بلکہ مختصر ترین نظمیں جن میں بعض صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ اور اپنی جگہ پوری اور مکمل نظم کا پختہ تاثر اور مفہوم لئے ہوئے ہیں ایسے لوگوں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاعر نے یہ مختصر ترین اور جدید ترین نظمیں لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ قدیم و جدید ہر صنفِ سخن میں شعر کہنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور ہر لحاظ سے ہر نئے زمانے میں ہر نئی صنفِ شاعری اور ہر نئی سوچ اور فکر کا ہمیشہ کے لئے ساتھ دے سکتے ہیں، بدلتے ہوئے تقاضوں، ادبی و شعری رجحانات و میلانات کے دوش بدوش چلنے کی ہمت و جرأت رکھتے ہیں۔ "حدیثِ خواب" کی ان نظموں میں "تمام عمر"، "سالگرہ"، "خاموشی"، "خزاں کا چاند"، "سائبان"، "پکار"، "چپ"، "کہاں"، "سوال وجواب"، "بتاؤ" وغیرہ نے اس لحاظ سے مجھے بہت متاثر کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ ان سب میں اگر کوئی نظم مقابلتہً طویل

ہے تو وہ "برزخ" جس کی THEME موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے عنوان ہی اتنا وسیع ہے کہ یہ مختصر نظم میں سمویا نہیں جا سکتا۔ ویسے بھی غزل کے مقابلے میں نظم موضوع کے اعتبار سے وسیع ترین صنفِ سخن ہے۔ میرے نزدیک خالد صاحب کی طبع اور ان کے مزاجِ شاعری میں ایک جوار بھاٹے، زیر و بم اور ہلچل کی سی کیفیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ اچانک مختصر ترین نظم لکھتے لکھتے اپنے موضوع یا خیالات کے وفور اور جوشِ طبیعت کے اعتبار سے کہیں کہیں بے قابو سے ہو جاتے ہیں اور اکثر ایسے موقعوں پر انہیں ایک وسیع کینوس کی ضرورت ہوتی ہے لیکن "برزخ" باوجود ایک طویل نظم ہونے کے "حدیثِ خواب" کی نظموں میں ایک نمائندہ نظم ہے اور یہ تمام عصری شعری روایات اور جدید ترین اصنافِ نظم کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ساتھ ہی نئے اور نوجوان نسل کے شاعروں کی راہنمائی بھی کرتی ہے، ان کے لئے نئی سوچ اور لگن عطا کرتی ہے۔ نظم "برزخ" میں شاعر نے محبوب کی جن مختلف حرکات و سکنات، اداؤں اور مجبوریوں کا ذکر کیا ہے اور اس کی ان گنت حالتوں کو دکھایا ہے وہ ان کی شعری زباندانی کا ایک مسلّم ثبوت ہے اور یہاں جگر مراد آبادی کی ایک طویل اور مسلسل غزل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

تنِ شب تاب کو زلفوں سے چھپاتی چُھپتی
ڈھانپتی، کھلتی، جھجکتی، جُھکتی
چاپ پر چونکتی، آہٹ پہ اُٹھلتی، رُکتی
صبح کی طرح اُمگتی، ہنستی
شام کی طرح سُلگتی، بُجھتی
شرم سے ہولتی، لاجوں مرتی

اسی نظم کے آخر کے حصے میں ایک بند میں کچھ اس طرح سراپا نگاری میں الفاظ و تراکیب اور تشبیہ و استعارات کا ایک دریا امڈتا اور لہریں مارتا نظر آتا ہے۔

یونہی سرگوشیاں کرتی، یونہی تکتی جھکتی
بدُ فشاں جگنوؤں کو سحر زدہ سی تکتی
خود بخود روٹھتی، آپ منتی
شاخ کی طرح لچکتی، تنتی
زلف کی طرح بگڑتی بنتی
بات کی طرح اُلکتی کٹتی
کبھی بڑھتی، کبھی پیچھے ہٹتی

پھر اسی نظم میں یک مستزاد کی صنعت میں نیا تجربہ ظاہر ہوا ہے۔ ایسی کوشش سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آج کی شعری دنیا کا کو لمبس ہر قسم کے روایتی شعری ورثے سے پوری طرح متاثر اور آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ نئے تجربے کرنے میں بھی بہت سے نئے اور نوجوان شاعروں سے کندھے سے کندھا بھڑاتے ہوئے اس میدان میں بھی سب سے آگے نکلنے کی کوشش

میں ہے۔ اس قسم کی مثال آپ کو مندرجہ ذیل اشعار میں نظر آئے گی ۔

پیاس کی طرح ترستی ــــــــــ ملکاہ
کوک کی طرح تپکتی ــــــــــ اِیکو
لونگ کی طرح مہکتی ــــــــــ تیرضاہ
شعر کی طرح لپکتی ــــــــــ سیفو
راز کی طرح دھڑکتی ــــــــــ زیبو
اوس کی طرح ڈھلکتی ــــــــــ پارو
تاج کی طرح دمکتی ــــــــــ ڈیڈو
لاج کی طرح سمٹتی ــــــــــ ناجو

اس کے بعد جب میں "حدیثِ خواب" کا مطالعہ کرتے کرتے آگے بڑھتا ہوں تو میری نظر ایک نظم "شاعر کی تلاش" پر جاکر رک جاتی ہے، جہاں خالد صاحب کا لب ولہجہ اور پُر کیف روانی ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو خود شاعر کے منصب اور اُس کے فنکشن کا پورا پورا احساس ہے۔ اور وہ شاعر کے صحیح مقام و منصب کی تلاش میں کوشاں ہیں اور ساتھ ہی اس بات کا احساس بھی پوری شدت سے ملتا ہے کہ شاعر کو یہ نعمت سوائے قدرت کے ودیعت کرنے کے بازاروں میں میسر نہیں آتی ۔ ؎

شبابِ حسن میں شاعر تلاش کرتا ہے
سپردگی کی ادا، جذبۂ فریفتگی
اس ابلۂ ازلی کو خبر نہیں شاید
یہ جنس ڈھونڈے سے بازار میں نہیں ملتی

شبابِ حسن میں شاعر تلاش کرتا ہے
نیاز مندیٔ فن، بندگیٔ خوش سخنی
زمانے بھر سے الگ مانگتا ہے دیوانہ
فروغِ شمعِ شبستاں سے سوزِ پروانہ

اس کے علاوہ وہ شعر و شاعری کے فطری عمل اور ردِّ عمل کے بارے میں یوں رطب اللسان ہیں ؎

ہر شے میں شاعری ہے بشرطیکہ آنکھ ہو
گو کیف و کم کا کھیل ہے سحرِ سخنوری

پھر آج کے شاعر کو ایک نصب العین، ایک منزل اور ایک اعلیٰ و ارفع مقام حاصل کرنے کے لئے نشاندہی بھی کرتے ہیں ۔ وہ الفاظ و معانی دونوں کی اہمیت سے باخبر ہیں ۔ تخلیق و فن میں حسن و خوبی اور حقیقت و اصلیت، زندگی کے ٹھوس

اور مستقل حقائق کی طرف اشارے کرتے ہیں اور کلام شاعر میں روح عصر کا بھی احساس دلاتے ہیں ؎

الفاظ مختصر پہ معانی ہوں تہ بہ تہ
تخلیق فن میں حسن بھی ہو روح عصر بھی

اس کے ساتھ ساتھ خالد صاحب کی نظم و غزل میں بہائے عشرت امروز اور تپ فردا کا ذکر بھی آتا ہے۔ شکوہ و شکایت معاشرہ اور دور کے بارے میں بھی موجود ہے۔ یہاں آکر بے ساختہ حکیم فرزانہ مرزا غالب کے چند شعر یاد آتے ہیں جن میں یہ اثر پایا جاتا ہے "آبر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے"۔ خالد صاحب کے یہاں یہ مصرع "بنائی کس لئے یا رب ایسی دلربا دنیا" اور غالب کا مصرعہ "شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" وغیرہ میں خالد صاحب اور غالب کے اشعار میں ایک مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ مشابہت وہ ہے جو سر عبدالقادر صاحب کو "بانگ درا" کا دیباچہ لکھتے وقت مرزا غالب اور علامہ اقبال کے یہاں بھی محسوس ہوئی تھی۔ ایسی بہت سی مثالیں خالد صاحب کے یہاں کالی اشعار میں محسوس ہوتی ہیں۔ ؎

حدیث دل کہوں تمثیل و استعارہ میں
کہاں ان آنکھوں کا بیں مان کر ہوا رسوا

بے خطر آگ کے سمندر میں
کود جاتے ہیں صاحب ایمان

ان کی شاعری میں محض خیالی اور تصوراتی کیفیات ہی نہیں بلکہ یہاں تو نظم و غزل کے لباس میں زندگی کو کامیاب بنانے اور کامیابی حاصل کرنے کے بہترین گر اور اخلاقی درس بھی ملتے ہیں ؎

کوئی بڑا نہ بنا استخواں فروشی سے
فروغ جس کو ملا جد و جہد ہی سے ملا

یہاں آکر ہمیں ان کے یہاں "پدرم سلطان بود" کی نفی اور علامہ اقبال کی تعبیر خودی اور تسخیر فطرت و کوشش ناتمام کی آواز بھی سنائی دے جاتی ہے۔ جہاں وہ اپنی عزت نفس اور انا کی حفاظت میں کوشاں نظر آتے ہیں ؎

نہیں ہے شہرت و آسودگی بہائے ہنر
کرو نہ نفس کی خاطر ضمیر کا سودا
کرے ہمیشہ تلاش طرائف حکمت
بیان و شعر کا دلدادہ، حسن کا شیدا

خالد صاحب علامہ اقبال کی طرح آہ سحر گاہی اور بیداری شب کے اثرات سے بھی کافی حد تک متاثر نظر آتے ہیں اور وہ رنگ کے ذائقہ خاص کے قائل نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی تو انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اتر کر یوں اظہار کرنے لگتے ہیں کہ انسان کی طبع اکراہ سے رم کرتی ہے۔ دیانت کے تحفظ اور فتنے کے زمانے میں عبادت کو ایک ہجرت قرار دیتے ہیں اور اس لحاظ سے ایک اچھے شاعر کو وہ تعبیر زندگی کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ فرار کا راہی نہیں مانتے ؎

شاعر ہے وہی دیدۂ معنی نگراں میں
دِل ہائے شکستہ کی جو کرتا ہے مرمّت

سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کو حرفِ ملامت مہمیز کا کام دیتا ہے۔ گویا وہ نام نہاد نقادوں اور حرف گیروں کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ اپنی دھن کے پکے ہیں اور اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہوں گرچہ مکلّف، متکلّف نہیں خالد
اخلاصِ عمل ہی کو سمجھتا ہوں کرامت

ایک غزل میں خالد صاحب علم و حکمت و دانش کے نافع ہونے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں: گویا وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ یہ حقیقت اُن کے اِس شعر سے پوری طرح سامنے آتی ہے ؎

ہم اُسی علم کے طالب ہیں جو نافع ہے
جو نہ سینے کو اُجالے، ہے وہ دانش بیکار

ایک دوسری غزل میں وہ زندگی سے فرار اور بے زاری کے بہت خلاف نظر آتے ہیں۔ وہ ہر ذی روح کو دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں اور صاحب علم و فن ہونے کو وقارِ انسانیت خیال کرتے ہیں۔ اسی غزل کے چند شعر اسی انداز میں کہے گئے ہیں ؎

بے ہنر ہونے کے باعث راندۂ آفاق ہو
سیکھ لو گر علمِ اسرار تو سلیمانی کرو

کوہ و صحرا و چمن فطرت کے ہیں دانش کدے
دے خدا توفیق تو جذبِ جہاں گردی کرو

آتی ہیں راہِ طلب میں اکثر و گھمٹ گھاٹیاں
خود بخود کٹ جائیں گی گھاٹیاں چلتے رہو

تم کہاں جاؤ گے آخر زندگی سے بھاگ کر

خیر و شر کی جنگ میں جم کر دلیرانہ لڑو

دکھ کے جنگل سے گزرتی ہے سکونِ دل کی راہ

خارزارِ درد سے لذت کے پھولوں کو چنو

اسی غزل میں کچھ ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں ۔ جن میں جد و جہد اور سرگرمی کو زندگی کا لازمہ قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ انہوں نے فلسفۂ غم کو ایک انوکھے اور اچھوتے انداز میں پیدا کیا ہے ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کی ہمہ رنگی اور ہمہ دانی کے اثر سے جہاں پر انہوں نے بہت سے قدیم و جدید شعراء کے زبان و بیان اور شعری سرمایہ کو اپنی ذات اور شاعری کا حصہ بنایا ہے ۔ وہاں کچھ الفاظ و تراکیب ایسے بھی استعمال ہوئے ہیں جن کو میں ذاتی طور پر صرف خالد صاحب کے ہی کہہ سکتا ہوں جو صرف اور صرف اُن کے اپنے ہیں اور وہ ذخیرۂ الفاظ و تراکیب و تشبیہات و استعارات اردو شاعری میں بے شک ایک گراں قدر اضافہ ہیں ۔

جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ غم شاعر کے یہاں ایک فعال اور خلاق قوت بن کر ظاہر ہوا ہے ؎

غم کی خلاقی کا ہے ہر صاحبِ بینش گواہ

سرخوشی درکار ہے تو آرزوئے غم کرو

ایک اور شعر میں وہ محض اُن لوگوں کی طرف ایک واضح اشارہ پایا جاتا ہے جو اپنی ذات ، شخصیت اور عزتِ نفس کو بھلا کر محض کسی دوسرے کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو مٹا کر دوسرے کا تابع مہمل بن جانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں ؎

دوست بن لیکن کسی کا تابعِ مہمل نہ بن

پرتوِ خورشید میں مانندِ شبنم گم نہ ہو

پھر ان کی غزل میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں حسن و عشق ، فکر و عمل ، حکمت و فلسفہ ، علم و دانش اور تصوف و معرفت کی جھلکیوں کے ساتھ شاعر اپنی ذات کے احساس اور انا و عزتِ نفس کو بالکل نہیں بھولا ۔ اسے آپ خود اعتمادی کا نام بھی دے سکتے ہیں ۔ یہ طرزِ احساس ، میر تقی میرؔ ، غالبؔ اور اقبالؔ کے یہاں بھی اُبھرتا رہا ہے اور خالد صاحب انہی کے ہم قدم ہوتے ہوئے اسی بات کا اظہار کرتے ہیں ؎

ہے مرا ایک تخیل ہمدمِ روح القدس

لخت لخت اشعار کو آیاتِ وجدانی کہو

اور اُن کا دل تربت کی لذت سے آشنا بھی ہے۔ اور کبھی پرانی صحبتیں بھی انہیں یاد آ جاتی ہیں جب اُن کا دل ایک حسن ظاہر پر فریفتہ ہوا کرتا تھا۔ یہ پختگی شاعر کی زندگی، سوچ اور فکر میں بڑی آزمائشوں اور تجربات کی بھٹیوں سے گزر کر پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اپنے فن کے لئے کذبِ مقال ایک عار تصور کرتے ہیں۔ یہاں وہ اسی وجہ سے زیادہ تر ذہنی و قلبی واردات و کیفیات کے شاعر نظر آنے لگتے ہیں ؎

عار ہے فن کے لئے کذبِ مقال
مجھ پہ جو بیتا وہی مَیں نے کہا

اس کے علاوہ اُن کی غزل میں پرانے چراغوں کی جگہ نئے چراغ بدلنے کی طرف بھی کافی اشارے پائے جاتے ہیں جس کی صدا صاحب افسانہ و افسوں لگاتے رہتے ہیں۔ یہاں شاعر کے ہاں یہ احساس بھی بھرپور انداز میں سامنے آیا ہے کہ وہ اس زمانے میں زندگی کو ایک تالاب کے پانی کی طرح ٹھہرا ہوا اور رُکا ہوا خیال نہیں کرتے بلکہ وہ زندگی کے ہر لمحے کو نیا اور اچھوتا سمجھتے ہیں۔ اور اسی نظریے کے مطابق وہ اپنی زندگی اور شاعری دونوں کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوتے ہیں ؎

جو چاہو کرد اس ورقِ سادہ پہ تحریر
ہر لمحہ جو آتا ہے اچھوتا ہے نیا ہے

اور یہ بھی نہیں کہ وہ محض حکیم فرزانہ بننے پر تُلے ہوئے ہیں بلکہ اُن کی غزل میں تمام روایت کی روح رچی بسی ہوئی ہے۔ وہ تمام رومانویت جو متغزلین کے یہاں کرشمہ سازیاں کرتی رہی ہے یہاں بھی باندازِ دیگر موجود ہے ؎

راتوں کو نکلتا ہے کبھی چاند کے ہمراہ
وہ چہرہ کہ دیکھے جسے جگ بیت گیا ہے

دل کیوں نہ غزل شیوہ غزالوں سے ہو مانوس
جانِ اہلِ سخن کی گرو ناز و ادا ہے

ہونٹوں میں کھینچ آیا ہے نشہ سارے بدن کا
آنکھوں میں خراباتِ مغاں کی فضا ہے

لیکن میں یہ بات کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ خالد صاحب کے یہاں غزل میں بھی زیادہ رنگ و آہنگ فکری ہے۔ اس لئے یہاں یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ہمہ صفت و ہمہ رنگ شاعر کے کلام کو ہم تنقید و تبصرہ کے ایک پلڑے میں رکھ کر نہیں تول سکتے۔ یہاں تو ہمہ جہت اور ہمہ رنگ اشعار آپ کو مل سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس بوقلمونی اور رنگا رنگی میں ہر رنگ دوسرے رنگ سے جدا اور منفرد کیفیت اور حالت لئے ہوئے ہے اور یہ تنوع و تازگی تہ در تہ چلی آتی ہے۔

ناموس کی ہو بات تو غنچے کی طرح تنگ
دِل ورنہ باندازِ گُل آغوش کشا ہے

ہے فہم سے مافوق پُر اسرارئ تخلیق
مرمر اگر آہنگ میں ڈھل جائے صبا ہے

پچھلے پہر اٹھ کر کرے سرگوشیاں رب سے
خالد جو نظر آتا ہے کچھ اُس سے سوا ہے

اسی شاعر کی غزل میں محبوب کی شاہ گامی اور محبت داستان در داستان آئی ہے اور یہ محبت یادِ یار مہربان بن کر جلوہ گر ہوئی ہے۔ جن محبوبوں سے بھی ان کی گاڑھی چھنتی تھی اب ان طرحداران دلبر سے انہوں نے کُٹی کر لی ہے۔ وہ اپنے خوابوں سے سرگوشی کے انداز میں اور رازدارانہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ اور "حدیثِ خواب" کے آخری حصہ میں مختصر نظموں کے سلسلے میں " اے کون آ " " تغیر" کے بعد ایک نظم " شام" کے عنوان سے ہے جس میں شاعر ایک وسیع کینوس کے بغیر اظہار نہ کر سکا اور اس نظم میں پھر وہی روانی جو عموماً ایک پہاڑی ندی میں ہوتی ہے پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے سامنے وہی زبان و بیان کا حکمران شاعر اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خالد صاحب ہزاروں شاعروں میں پہچانے جا سکتے ہیں۔ اور عابد علی عابد جیسے اساتذہ کی یاد کو تازہ کر دیتے ہیں۔

شفق آلود، شعلہ رُو، چنچل سے
غازہ گالوں پہ آنکھ میں کاجل
آتشِ حسن اُس پہ آتش مَے
کسے چھم چھم سرور سے چھاگل
ساحر آنکھوں کا میکدہ چھلکے
چال جیسے کہ جل ترنگ بجے
اپنی چنری پہ یوں ستارے جڑے
شبِ وعدہ میں جیسے وصل کا پل

زبان و بیان کے بارے میں صرف اتنی سی بات کافی کچھ کہہ دینے کے مترادف ہوگی کہ اُردو زبان کے اِس مرصّع ساز نے اپنی شاعری میں ایسی بندشِ الفاظ سے کام لے کر ہر زبان کے وہ موتی جڑ دیئے ہیں جو اُردو شاعری کے تاج میں ہمیشہ چمکتے اور دمکتے رہیں گے۔

شاعر نے اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنی بولی یعنی پنجابی زبان کو بھی کسی زبان سے پیچھے نہیں رہنے دیا۔ اس کی مثالیں ان کے اشعار میں ایک قدرتی جوش و جذبہ کے بہاؤ اور روانی میں پنجابی الفاظ و تراکیب آگئے ہیں۔ مثال کے طور پر "متاں" چھاتک اور گُٹی جیسے الفاظ کا استعمال کرنا۔ اور کہیں تو اپنی مٹی کی کشش اور زمین کی بُو باس کا یہ جذبہ اور اثر اتنا زور پکڑ گیا ہے۔ کہ کہیں کہیں پورا مصرعہ ہی پنجابی میں لکھ جاتے ہیں۔

قیمت جو پوچھی لولی، کہ بولی لگائیے
محرم نہ ملیا ایس جوانی دے مان دا

اب میں حدیثِ خواب کی آخری غزل تک پہنچ چکا ہوں اور یہاں آکر مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ خالد صاحب کے کلام میں مسلسل ارتقاء ہے۔ ٹھہراؤ، جمود اور یکسانیت کا نام تک نہیں۔ یہاں آکر وہ میرِ کارواں کو بھی پیچھے چھوڑتے نظر آتے ہیں۔ اب وہ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں اُن کا کام اب آہ و فغاں سے ہے۔ اور اس مقام پر کھڑے ہو کر وہ اصل فن کو بھی اِسی طرف دعوت دیتے ہیں۔ کہ وہ فن کے ارتقا کے سلسلے میں اپنے اندگرد خاص قسم کے دائرے اور حد بندیاں نہ لگائیں

بہت کچھ اور بھی درکار فن ہے
مجھے کہنا ہے یہ اہلِ زبان سے

اور وہ اپنے کلام کے بارے میں بڑے وثوق سے یہ کہنے پر بھی تیار ہیں کہ ــــ

صدا کانوں میں آتی ہے جرس کی
دمِ فکرِ سخن جانے کہاں سے

قلم ہے شہپرِ جبریل سے گویا
تعلق ہے ہمیں بھی لامکاں سے

آخر میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس خسرو شاعری نے بعض نظمیں اور غزلیں کچھ اس انداز میں لکھی ہیں۔ کہ امیر خسرو دہلوی کے یہاں تو ہندی و فارسی کی آمیزش تھی اور خالد صاحب کے کلام میں ہندی پنجابی، اردو اور عربی زبان وادب کی پیوندکاری پائی جاتی ہے۔ خالد صاحب اپنی ذات میں ایک تغزل ایک ترنم ہیں۔ وہ ایک لحن و غنا کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ اکثر مقامات پر انہیں ایک آتش بجاں شاعر اور ایک خدامست درویش بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اشعار میں سوزِ دروں کی نغمہ نوائی اور اجڑے معبدوں کی سوز خوانی ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس زندانیٔ فکرِ جہاں کے یہاں پوری انسانیت کے لئے فکر اور درد پایا جاتا ہے۔ اور یہ افکار پرُ کار کا شیفتہ شاعر انہی اوصاف و کمالات کے باعث اردو شعر و ادب کے آسمان پر ہمیشہ جلوہ گر رہے گا۔ اور یہ شہیدِ سخن اپنی ذات میں ایک منفرد اور الگ جہاں شاعری لئے ہوئے ہے۔

یہ رسمِ زمانہ ہے۔ کہ ہر اہم عصر کے بارے میں نکتہ چینی اور حرف گیری جاری رہی ہے۔ لیکن خالد صاحب جیسے فن کار اور شاعر ہمیشہ ان چیزوں سے بالا و بلند تر رہ کر اپنی پرواز میں مگن ہیں۔ آنے والا کل خود بتا دے گا کہ وہ کتنے بڑے اور عظیم شاعر ہیں۔ میں آخر میں انہی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

ــــ

آج جو آبلہ سمجھ کے مجھے ٹھکراتی ہے
کل یہ دُنیا مرے دروازے پہ دستک دے گی

عبدالعزیز خالد

غم کر نہ شکستِ آرزو کا
یہ جانِ اُمید بھی ہے دھوکا
رکھ زُہد و وَرَع سے رشتہ محکم
کر فسق و فجور بھی گوارا
اے رہنِ تجرّد و تبتّل
کر ملکِ خدا کا بھی نظارا
اے معتکفِ خُمِ توکل
تسلیم و رضا کو تو نہ سمجھا
ہے استغنا تو در حقیقت
سیفِ بیکار لا و الّا!
کھیلو گے تو ہار جیت ہوگی
بس کھیل ہی کھیل کا ہے ثمرہ
ہے علم تحفظ و تذکّر
میثاقِ الست کا اعادہ
آنکھوں کو ہے حسرتِ تفکر
دل مانگے لذّتِ نظارہ
ہر کوئی مُرائی و ریائی
ہر چیز مُذبذب و مُطّلا
دلگیر و ملول کیوں ہے ناداں؟
اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی؟
سمجھو آواگون کے چکّر
برزخ کے مقامِ پست و اعلیٰ
اتنی ہے حقیقتِ تناسخ
کرتے ہیں قریب رفتہ رفتہ

مٹی ہے کثافتِ عناصر
مٹی کا مکاں ہو جب شکستہ
بندھن کٹیں ایک ایک کر کے
ہے دیر گسل نگارِ دنیا
تا ہو سکے درخورِ تجلّی
آئینۂ دل کو کر مجلّا
رضوانِ بہشت ہے لطافت
ہو لاکھ کوئی حسین و رعنا
جب تک نہ ہو طاہر و مطہر
پروانہ ملے نہ داخلے کا
نروان و نجات و رستگاری
منزل گہِ جاں کا استعارہ
کر عیش کہ پھر نہ مل سکے گی
یہ جنّتِ آب و گِل دوبارہ
ہم خیرِ کثیر کے ہیں طالب
اے ربِّ تبارک و تعالیٰ!

تحسین فراقی

دیومالا اور عبدالعزیز خالد

میرے تمام ترانوں کے
جدا جدا رنگ آہنگ
باہم ایک ہی دھارا بن کر
بحرِ سکوت کی سمت بہیں
جیسے کونجوں کی ڈاریں طرفِ نیاز عشق کریں

_____ گلِ نغمہ ص: ۳۰۴

عبدالعزیز خالد کے شعر کی حدود و ثغور لامحدود ہیں۔ غیر ملکی ادبیات کے تراجم میں اس کی مہارت بے حد قابلِ قدر ہے۔ پرانی دیومالاؤں سے لے کر تناسخ خواجم تک اور طبعزاد تخلیقات سے لے کر متنفاد زاویوں تک خالد کے یہاں بوقلمونی اور رنگارنگی کی ایک دنیا آباد ہے۔ اس نے یونانِ قدیم، چین و ماچین، قدیم ایران و توران اور ہندی دیومالاؤں کا ذکر کثرت سے اپنے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں کیا ہے۔ جن مجموعوں تک راقم کی رسائی ہو سکی اور جن میں کثرت سے ان دیومالاؤں کا تمثیلی، تشبیہی اور تلمیحی استعمال یا خالد کے دیومالائی نظریات کا ذکر ہوا ہے، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:
دشتِ شام، دکانِ شیشہ گر، حدیثِ خواب، کفِ دریا، زنجیرِ رمِ آہو، ملکِ سبح، گلِ نغمہ، منحمنّا، فارقلیط، لحنِ مریدِ سرود نو دقتہ، برگِ خزاں، اور مزمورِ میرمغنی۔

سوال یہ ہے کہ ان دیومالاؤں کے اردو ادب میں تعارف اور تسلسلِ استعمال کا جواز کیا ہے؟ اس کے جواب میں خالد نے دیومالا کے متعلق اپنے موقف کو اپنی تخلیقات میں واضح کیا ہے اور بحیثیت مجموعی ان نظریات کے اسی اجمال کو تفصیل کے ساتھ ماہرینِ علم الاساطیر کے حوالوں سے آئندہ سطور میں پیش کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ دیومالا کے متعلق خالد کے نظریات وہی ہیں جو

آج کے دور کے ماہرین علم الاصنام کہے ہیں۔
آئیے! سب سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ خالد کا نظریۂ اساطیر پسندی کیا ہے؟ کہتے ہیں:

دم خوردۂ افکار مجرد ہیں حواس
زخمۂ زن ساز تفکر احساس!
جوئۂ اساطیر و تمثیل کو بیکار
تلک الامثال نضربها للناس

—— ابن مریم ص: ۱۷۵

مری خامہ ہے گویا نوائے آدونیس
قلم کی نوک سے ہوتا ہے زمزمہ پیدا
مزاج شعر ازل سے ہے دیومالائی
سمند فکر کو افسانہ تازیانہ ہوا!
ادب ہمیشہ کرے ترجمانی جمہور
ادب ہے آئینۂ حال و ماضی و فردا

—— دشت شام ص: ۸۳ – ۸۴

اسی مجموعے کے ص ۱۲۲ کی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں جو اس کی ماضی کی طرف مراجعت کا جواز پیش کرتے ہیں:

حال میں زندہ ہے ماضی اسے مردہ نہ کہو
جو نیا ہے وہ پرانا جو پرانا وہ نیا
دہی ہومر جیسے یونان کی انجیل کہیں
ہم پیالہ تھا تمثال ازل میں مرا

—— دشت شام ص: ۱۲۲

متقدمین جن کے پیکر خیال میں خواہش کی گرم نازکی العدیک فکر جن تریضا کی سرعت ہو۔ ایسے لوگ خالد کے خاطرِ فکر کی مرغوب غذا ہیں:

یونان کے جزیرے و بغداد کے محلے
وہ مفکر بپا وحشی وہ فلسفی کہاں ہیں؟

وہ رنگ و بو کے رسیا، وہ زندگی کے عاشق
روح القدس کے ہم فن وہ ساحری کہاں ہیں؟

______ کلکِ موج ص: ۱۲۱

کیسے جہان معنی بین السطور میں ہیں
دیدہ وروں نے دیکھا ہر جا جہانِ دیگر
آئی حدیثِ رفتہ پیغامِ شوق بن کر
ماضی کے تذکروں میں ملتا ہے لطفِ صحبت

______ زنجیرِ رم آہو ص: ۳۱۶

عزلت گزینِ عالم کو بھی لگا ہے یاد کر
لے اساطیرِ قدیمی سے بھی درسِ زندگی

______ کلکِ موج ص: ۱۸

اساطیر کو مت جان تو افسون افسانہ
ہے اور اک حقیقت کی یہ اک رمزِ یگانہ

______ ایضاً ص: ۹۳

سر بہ سر ہو کون ان سے کہتے ہیں دیو مالا
عہدِ طفولیت کے قصے کہانیاں ہیں

______ ایضاً ص: ۱۱۹

مندرجہ بالا اشعار سے خالد کا نظریہ اساطیر بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اجمالاً یوں کہا جا سکتا ہے کہ خالد نے اساطیر کو افسانہ و افسون اور عہدِ طفولیت کی داستانیں کہنے والے کم نظر اصحاب سے قطع نظر حکمت و دانش، رنگینی و رعنائی اور رنگ و بو کے مصادر و منابع کے طور پر سمجھا اور برتا ہے۔ خالد کے نزدیک شاعر وہی ہے جو روایات و روایات دونوں کا نقاد اور پارکھ ہو۔ اسے معانی سے سروکار ہونا چاہیے اور ظواہر کا پابند نہیں ہونا چاہیے:

شاعر نہیں جو مستِ مےِ ذات نہیں
نقادِ روایات و روایات نہیں
رکھتا ہو جو معانی سے سروکار فقط
ہیں قشر پرست اصطلاحات نہیں

——— لحنِ مرمر ص: ۲

پھر یہ بھی کہ سینکڑوں ہزاروں دیو مالاؤں کے قاری خالد نے اپنے انتخابی اعجاز کو کام میں لاتے ہوئے ان اساطیر میں سے (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) اکثر ایسے قصوں کی طرف اشارات کئے ہیں جو اس کے نزدیک انسانی سفرِ زندگی میں سنگِ میل کا کام دے سکتے ہوں۔ خالد جدّت کا امین تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ روایات کا نقیب بھی ہے۔ عالم آب و گِل میں جو بھی حسین اور مفید شے نظر آتی ہے خالد اسے چن لیتا ہے۔

بے نفس داستان میں ہوتے بھی اسے
شاعر ملک عجب بنا بیٹھے

——— لحنِ مرمر ص: ۳

ان حقائق کے علاوہ اپنی نسل جمع کے حوالے سے بھی شاعر جیسا کہ اس کی شناخت واضح ہو رہی ہے اس کے متعلق لکھا ہے: "اساطیر پسند ذہن" اور "اسرار طلب مزاج" پایا ہے۔ لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ اساطیر پسند ذہن اور اسرار طلب مزاج پانے پر کوئی فرد لیبر بھی گرد و تازگی اور حوصلہ مندی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ خصوصاً اس صورت میں جب ساحر کو تنقید بیانات کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہو۔ وہ شاید یہی سبب ہے کہ شاعر نے اپنے اعلان میں بڑے اعتماد و بھروسے و طرح سے اپنے اسرار پسند ہونے کا اعلان کیا ہے اور اس اعلان کے پس پردہ از فرشتہ ترشتہ و بجز خالد کی بھی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے:

مجھ کو ذہن میں حکایات مرے
قصہ ہائے ہند و یونان و عجم

——— حدیثِ خواب ص: ۶۰

مرے پہلو میں دھڑکتا ہے دلِ حسن پرست
انفعالات و مشاعر پہ نہیں زور مرا
ذکرِ رحمٰن پہ ناب حمزاتِ لسیقات
آج تک نعمت نہ سخن سلمان نہ ہوا

——— حدیثِ خواب ص: ۱۲۲

شب تاب شفق کے پیچھے ہیں کہیں
ہم سنتے ہیں پیراؤں کے پاؤں کی چاپ

——— لحنِ مرمر ص: ۶۰

رہتی ہے سدا عفوِ الٰہ کی طلب
زنگ سے آئینہ ہے دل پہ درب
ہوں بندہ بشر، سو بھٹک جاتا ہوں
اغفرلی خطیئتی و جہلی یا رب

——— لحنِ مریم ص: ۱۵۱

اے جانِ عزیز غالبِ گوشہ نشیں
گو اپنی نظر میں ہوں سبک ننگ نہیں
گھر بیٹھے جہانیاں جہاں گشت بنا
ہے فاتحِ اقطارِ سماوات و زمیں

——— لحنِ مریم ص: ۲۵۶

دشتِ شام میں غالب نے پنڈی داس کے افکار کو اردو شعر کا جو جامہ پہنایا ہے وہ خود اس کے قامت پر بڑا موزوں بیٹھتا ہے:

جمنا کنارے کون بجاتا ہے بانسری
گوکل جو گوپیوں کا دھنک رنگ شہر ہے
اس کی جو آنکھوں میں اور اس کے ہونٹوں میں کون
ہر اک رسمسا کے بجاتا ہے بانسری
پھرتا ہے آگ موہ کی میرے شریر میں

——— دشتِ شام ص: ۱۸۸

ذکرِ مرگِ آدم میں حدیثِ خواب اور لحنِ مریم کے، خرافات زدہ آگہی کو اور نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ جس سے غالب کی بوقلموں شخصیت کا رنگ اور چوکھا نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ نظم آئینہ میں لکھتا ہے:

کتنے نیرنگ بہ آغوش ہیں میرے احوال
میری ہر صبح تلون میں نہیں رنگِ ثبات
میں نے مغلوب کیا رکھا ہے ان لوگوں کو
مجھ کو کہتے ہیں جو درویشِ ملکوتی صفات

آہ یہ سادہ نقش لوگ مگر پا نہ سکے
کہ ان انوار میں ظلمات کی آمیزش ہے
جن نگاہوں سے کہ تقدیس کی لو پھوٹی ہے
ان میں اہرمن و یزداں کی بھی آویزش ہے

——— زنجیر رم آہو ص: ۱۵۸

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہ شب ہائے الف لیلیٰ
افسانہ و حقیقت جن میں رواں دواں ہیں

——— کلک موج ص: ۱۱۷

خالد کے اساطیر پسند ذہن کی اس سے قوی برہان کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے ترجمے کے لئے منجمد اور کلاسیکی دور موجودہ تخلیقات سے سیفو کو چنا اور اس کے فنی خلوص، اس کی شعری سادگی اور اس کے لطیف جذبات و احساسات کو بڑی خوبی سے اردو میں "سرود رفتہ" کے نام سے منتقل کیا۔ اس کتاب میں جو دیو مالائی حوالہ جات ملتے ہیں ان پر ایک سرسری نظر آپ بھی ڈالتے چلیں: زیوس ، ہرمیس ، الحسان الثلاث ، نریٹس ، پوسیڈن ، ہیڈز ، ہیرا ، ہیبا ، ہرکولیس ، ڈیمیٹر ، افروڈیٹا ، کیوپڈ ، ہیلن ، مزدا تھیٹس ، چاند ، دینس ، ہیکوبا ، لیڈا ، ڈائسکوری اور کلائیم نسٹرا (دو بہنیں) منی لاس ، ہرمین ، پیرس ، آرفیس اور یوری ڈس لارل (ڈفنی) اپالو ۔ فلاجیلا (جس کا ذکر مزید برمغنی میں بھی کیا ہے) پرکتی ، نیوبیز ، پافوس (ہیکس) کاڈموس ، مرکری ، پرومیتھین ، اڈونس ، شیمپیان اور گریا ۔ اور یہ فہرست بھی مکمل نہیں۔ یہ کردار "سرود رفتہ" کے علاوہ ان کتابوں میں بھی جن کا ذکر اس مضمون کی ابتدا میں ہوا، بیشتر طور پر علامتی انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔

"سرود رفتہ" کا ذکر آیا تو جی چاہتا ہے کہ جون ایلیا کی چند سطور نقل کر دی جائیں جن سے خالد کے یونانِ قدیم کی سرزمین سے لگاؤ پر روشنی پڑتی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"فن کے اس زندہ اور جیتے جاگتے تصور نے ان کی شاعری میں زندگی کی عظیم ترین معنویوں کو سمیٹ لیا ہے۔ یہ اندازِ نظر اپنی اصل اور اساس کے اعتبار سے یونانی ہے۔ قدیم یونانی ادبیات کے ہر شعبے کو کسی نہ کسی دیوی یا دیوتا سے منسوب کرتے تھے۔ ان کی تاریخ، ادبیات، حکمت، حسن و عشق، غرض ہر شعبے میں الوہی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ سیفو کے مترجم لاشعوری اور شعوری طور پر اس ہمہ گیر معنویت اور سریت سے متاثر ہیں اور اسی لئے وہ اس ترجمے کو شاہکار بنانے میں کامیاب ہو سکے۔"

——— تحریریں ص: ۳۱۳

اس مضمون کی ابتدائی سطور میں لکھا گیا ہے کہ خالد نے دیو مالائی قصوں کو صرف تصرف گوئی کی خاطر استعمال نہیں کیا جیسا کہ بعض نقادوں نے نشاندہی کی ہے بلکہ ان اساطیر کے داخلی شواہد اور ان کا محل استعمال بتاتے ہیں کہ ان کا مقصد تبصرۂ حیات ہے اور جب میں لفظ حیات استعمال کرتا ہوں تو اسے اپنی تمام تر رعنائیوں اور بد صورتیوں، اپنی خیر اور اپنے شر، اپنے انوار اور اپنے ظلام کے جامع کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ "سرد رد رفتہ" کے پردہ ساز کے حصے میں خالد نے بعض دیو مالائی کرداروں کی جو ترمیم کی اور ان کے جو قصے بیان کئے ہیں ان کے بین السطور فطرت انسانی میں خیر و شر کے تصادم اور خالد کے جذبۂ اصلاح کی کارفرمائی صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ خالد نے ان دیو مالائی قصوں کی نو دریافت سے دراصل تبصرۂ حیات ہی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ذیل کے اشعار میرے مزعومہ دعویٰ کی تصدیق کریں گے :

سفر کردہ سفینت سندباد دریائی سے
ہیں تجربات و حوادث معلم ثانی
تہی رہے نہ ہمیشہ کمان ایالوکی !
شریکِ غالب فرزانگی ہے نادانی

——— حدیثِ خواب ص : ۱۴۶

پہلے شعر میں تجربات و حوادث کو معلم ثانی کہہ کر خالد نے ایک بلیغ اور زندہ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ اور دوسرے شعر میں انسانی خیر میں فرزانگی و دیوانگی کا جو عنصر شامل ہے اس کی نشاندہی کی ہے۔ خالد کی ان آراء سے شاید ہی کسی سلیم الطبع اور صائب الرائے شخص کو انکار ہو۔

قوت و طاقت اور اقتدار اعلیٰ انسان کو اکثر اوقات متکبرانہ اور متشدد بنا دیتا ہے۔ یہ وہ عام اور روشن حقیقت ہے جس پر تاریخ ماضی کے اوراق اور خود زمانہ موجود کے احوال شاہد عادل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خالد نے اسی امر واقعہ کو یوں بیان کیا ہے :

سرکشں دو موسیٰ پہ تشدد کریں کنس و فرعون
طاقت انساں کو بنائے متکبر و جبار
ہم اسی علم کے طالب ہیں کہ جو نافع ہے
جو نہ سینے کو اجالے ہے وہ دانش بیکار

——— حدیثِ خواب ص : ۱۵۲

ہماری جوانی کے دن ہیں بہاروں کی حکومت کے دن
پرومیتھیس کی طرح ہم بھی لیں دیوتاؤں سے ٹکر

کیا ادیب کا شعر جہدِ حیات، حمایتِ حق اور جذبۂ خدمتِ بنی آدم کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ پرومیتھیس جس نے کوہِ اولمپس میں داخل ہو کر سورج دیوتا کی آگ کی رتھ سے شمع روشن کی۔ دہکتے ہوئے ایک کوئلے کو سانس بادیان میں چھپایا اور یہ آگ انسان کے حوالے کر دی۔ پھر زیوس کے حکم سے اُس کو کاکیشیا پر باندھ دیا گیا اور ڈنک بار کے بعد ایک گرفتہ عذاب سے دوچار کیا گیا۔ خلوص و ایثار کا یہ جیتا جاگتا مظہر جس نے اذیت ناک مزاحمت کے باوجود بشر کو تہذیب و تمدن کی برکات اور علوم و فنون کی سعادت اور خود شناسی کا راز سمجھایا۔ کیا پرومیتھیس کے کردار کے ایمانی تشخص سے خاور نے ہم زبان ہو کر سامراج کی طنابیں کھینچنے، جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے اور معاشرے کے مقدس فریضے کی ادائیگی کا درس نہیں دیا؟

اسی قبیل کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں جو شرحِ حیات کے مظہر ہیں اور جہاں انسانیت کو حقیقت کی منزل کے لئے سنگِ میل قرار دیا گیا ہے:

ہر منظرِ زندگی سے الفت ہے مجھے
افسانۂ رازِ حقیقت ہے مجھے
حکمت کا حصول ہے مرا نصب العین
ہر گوشۂ فکر سے الفت ہے مجھے

——— لحنِ سرمد ص : ۵۱

پر ہے گھونسلہ جس دم بیٹھایا
شعبدہ ہے کیا چرخِ بزرگ دہقاں

——— مزمورِ مغنی ص : ۱۸۹

یہ محوِ ترنم نہیں عندلیب
ہے نوحہ کناں دخترِ بیداد ہوں

——— ایضاً ص : ۲۲۲

دختر شاہ یوں سے یہاں مراد فلا میلا کا دیو مالائی کردار ہے۔ پروکنی کی بہن، پروکنی کے خاوند کے ہاتھوں اپنی عصمت لٹوا کر اور اپنی زبان کٹوا کر مظلومیت کی تصویر بن جاتی ہے۔ پھر انتقام کی دیوی کا روپ لیتی ہے اور پروکنی کا جابر خاوند پرند کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس تمثیل کے پردے میں دراصل ظلم و جبر کو اپنے کیفر کردار کو پہنچتے دکھایا گیا ہے[1]۔
کچھ شعر اور دیکھئے:

کرے کون زہ بندی حسن کی کماں
وہی پاس جس کے ہو علم فنوں

—— نزول ص: ۱۳۵

ہر عصر و داں کا پرولی تھیس
مریض عطش، غرق دریائے خوں

—— ایضاً ص: ۱۷۹

وہی اہل فن، فن کے اعجاز سے
ہمیشہ جواں مثل اینڈیمون[2]

—— ایضاً ص: ۲۲۲

مطلب اسطورۂ سسی فس کا
زندگی جہد و جہد پیہم ہے

—— کلک موج ص: ۱۸

بالطبع شاعر ہے وہ ذی آتش[3]
جلنے میں اس کو ملتی ہے راحت

—— ایضاً ص: ۲۳

میں اپنی آگ میں جلتا ہوں مثل ہومیتاد[4]

---

۱ تمثیل کے لئے ملاحظہ ہو مرد بدنت ص: ۱۱۴ — ۱۲۰ ۲ ENDYMION ۳ پرولی تھیس ۴ ققنس

[redacted]

الم پرست کو ہے مایۂ نشاطِ الم

——— منحنا ص : ۹۰

آئینوں میں شکل پرستیوں کے
دیکھو عکس سیہ دروں کا
بن جاؤ گے ورنہ پتھر
یہ نکتہ ہے زندگی و فن کا

——— کاکِ موج ص : ۱۲۶

بن میں رُکے قدیم روایات
لفاظِ روایت و درایت
جل اپنی آگ میں ہمیشہ
ققنس کی طرح ہے فن کی فطرت

——— ایضاً ص : ۴۴

شاہ باشی اے عشق خوش سودائے ما کا نعرۂ حق خالد نے بھی بلند کیا ہے اور دیو مالا سے استدلال کیا ہے :

عشق ہر چیز سے طاقتور ہے
ملک الموت بھی اس سے ہارے
دیکھنا چاہو تو پوری دس کو
پوچھنا چاہو تو ساوتری سے

——— کفِ دریا ص : ۵۳

یہ اور اسی قبیل کے ابھی بیسیوں اشعار ہیں جن میں خالد نے زندگی کے حقائق و دقائق کی نشاندہی دیو مالا کے پردے میں کی ہے۔ قلم کی کوتاہی، نفسی اور قرطاس کی تنگ دامانی اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ تذکرۃ المصدر اشعار میں مستعمل دیومالائی کرداروں کی تشریح بھی کر دی جاتی تاکہ کہانی کے پس منظر میں خالد کے استخراجِ حکمت کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا۔

"تاہم مندرجہ بالا شواہد اور مباحث سے واضح ہو گیا ہوگا کہ دیو مالا کو بھی تنقید و تہذیب حیات کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان مباحث کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دیو مالا ہے کیا؟ اور یہ کہ خالد کا تصورِ دیو مالا آج کے ماہرینِ اساطیر سے کہاں تک مماثل ٹھہرتا ہے۔

"تخلیقی عمل" کے ایک باب ـــــ "تخلیقی عمل دیو مالا کی جنت میں" کی ابتدائی سطور یوں شروع ہوتی ہیں:

"اسطور یا متھ یونانی زبان کے لفظ مائی تھوس سے ماخوذ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے "وہ بات جو زبان سے ادا کی جائے" یعنی کوئی قصہ یا کہانی۔ ابتداً اسطور کا یہی تصور رائج تھا لیکن بعد ازاں کہانی کی تخصیص کر دی گئی ـــــ یوں کہ اسطور اس کہانی کا نام پایا جو دیوتاؤں کے کارناموں کے متعلق تھی یا ان شخصیتوں کی مہمات کو بیان کرتی تھی جو زمین پر دیوتاؤں کی مانند تھیں۔ نے اسطور اور مذہب میں فرق قائم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذہب (جس سے اس کی مراد مذہب کا قدیم تصور ہے) ان رسوم پر مشتمل ہے جو خدا یا دیوتا کی عبادت سے متعلق ہوتی ہیں اور جو اس بابرکت عمل کا تتبع کرتی ہیں۔ جو ابتداً کسی دیوتا یا مقدس ہستی نے سرانجام دیا تھا۔ دوسری طرف اسطور دیوتا کے اس عمل کی کہانی کو بیان کرتی ہے۔ مثال کے طور پر رام لیلا اور دسہرہ کے موقع پر جو کچھ ہوتا ہے وہ رام اور سیتا سے منسوب کہانی کے مطابق تو ہے ہی مگر اس کا ڈرامائی حصہ مذہبی رسوم کی ایک صورت ہے۔ جبکہ اس ڈرامائی حصے سے متعلق کہانی اسطور کے زمرے میں آتی ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسطور مذہب سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ وہ ابتدائی تخیل ہے جو ارتقاء کے کسی مرحلہ پر ایک تخلیقی انکشاف کی صورت میں انسان پر نازل ہوا اور جسے برقرار رکھنے کے لئے اسے مذہبی رسوم خلق کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی" ـــــ وزیر آغا، تخلیقی عمل میں: ص ۵۱

اسطور کے مذہب سے قدیم تر ہونے یا پھر اولین مذہب ہونے کی شہادت دیگر ماہرینِ اساطیر کے یہاں بھی ملتی ہے۔ مثلاً پروفیسر اڈولف ہولم "تاریخ یونانِ قدیم" میں لکھتے ہیں:

"بادی النظر میں ان قصوں سے نہایت ہی قدیم زمانے کا پتہ چلتا ہے اور ہم ان کو یونانیوں کے اول ترین مذہب پر محمول کر سکتے ہیں۔ یونانی دیوتاؤں کو بھجن سنا کر اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔"

ورلڈ سکوپ انسائیکلوپیڈیا کی آٹھویں جلد میں دیو مالا کی تعریف و توضیح ان الفاظ میں ملتی ہے:

"مائتھالوجی یونانی لفظ ہے جس کا مفہوم اساطیر کا علم اور اس کے متعلق تحقیق و تدقیق ہے۔ بنیادی طور پر یونانی اساطیر ان بیانات کی نمائندگی کرتی تھیں جو دیوتاؤں اور نیم دیوتاؤں کے مابین یا پھر انسان کے ساتھ ان کے تعلقات اور برتاؤ سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ بعد ازاں یہ اصطلاح (مائتھالوجی) صرف یونانی نظریۂ تخلیق ہی کے لئے نہیں بلکہ ان تمام غیر تاریخی واقعات کے لئے استعمال ہونے لگی جو سماجی اکائیوں (از قسم قبائل، اقوام) میں ظہور پذیر ہوتے تھے۔"

"بعض اوقات بعض اساطیر کی روایات ایک ہی مشترک نمائندے کی مظہر ہوا کرتی تھیں جو مختلف افراد کے گروہ ہوں

میں اتحاد کا ردعمل ادا کرتا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اساطیر کی اہمیت تاریخی اور نفسیاتی ہر دو اعتبار سے فزوں سے فزوں تر ہو جاتی ہے۔"

مندرجہ بالا تعریفات سے واضح ہوا کہ آج مائتھالوجی صرف یونانی اساطیر و اسرار ہی کے لئے مخصوص نہیں رہی بلکہ کم و بیش تمام اقوام کے غیر تاریخی یا نیم تاریخی واقعات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ مصری، بابلی، ایرانی، یہودی، لاطینی، فن لینڈ اور آئس لینڈ کی اور ہندی، چینی، جاپانی، امریکی، میکسیکی اور نزدیک (وسطی اور جنوبی امریکی) دیو مالاؤں کا ایک طویل سلسلہ جو بالا سطور کی تصدیق کرے گا۔

اگرچہ ایک نقاد کے نزدیک دیو مالا، لوک گیت اور مذہب کی دیو مالا کم ہے اور آرکی ٹائپ امیجری کے نامناسب استعمال سے پیدا شدہ ایک قسم کی دوسری صورت حال سے زیادہ قریب ہے۔ تاہم دیو مالا کو علم الانسان کے حوالے سے بھی جدید شعراء خصوصاً ایلیٹ نے اپنی ویسٹ لینڈ میں استعمال کیا ہے۔[2]

سوال یہ ہے کہ آج کے جدید دور میں "قبل از تاریخ کے ان قصے کہانیوں" کی کیا اہمیت بنتی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے دیو مالا کے متعلق بعض کلاسیکی علما کی متعصبانہ رائے اور تحریک احیاء العلوم کی دیو مالا کی نو دریافت کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تحریک احیاء العلوم کا عہد دریافت کا عہد تھا۔ اس نے صرف امریکہ ہی کا کھوج نہ لگایا اور سورج کے گرد زمین کی گردش ہی کا راز دریافت نہ کیا بلکہ اس نے یونانی علوم و فنون اور دیو مالا کی بھی بازیافت کی۔ دیو مالا کو پہلے پہل اووڈ، ورجل، ہوریس اور مابعد کے ان مصنفین کے اوراق میں تلاش کیا گیا۔ جنہوں نے ایک عرصے دیو مالا میں اپنا یقین و اعتماد کھو دیا تھا۔ یہ مصنفین انہیں صرف قصے کہانیاں سمجھتے تھے۔ جنہیں صرف سوال میں لانا مناسب نہ تھا۔ یہ قصے زیادہ سے زیادہ ادب کے مرکزی موضوعات بننے کے لئے موزوں تھے۔ قطع نظر اس کے کہ دیو مالا اور زندگی کے باہمی رشتوں کو تلاش کیا جاتا۔ ان قصوں کو حقائق زندگی سے فرار کی ایک خوشگوار پناہ گاہ بنا دیا گیا۔ ہر وہ شاعر جو شہر کی بے کیف زندگی سے اکتا جاتا۔ جل پریوں اور جنگل پریوں کی صحبت میں پناہ لے کر اپنے تخیل کے دشت زار میں سرگشتہ کرنے لگتا۔

چنانچہ کلاسیکی علماء کی سوچ کا اندازہ رہا کہ اصنامیات اور دیو مالائیں ان کی تخیل کی پیداوار ہیں اور خواب نیم شبی کے مترادف ہیں۔ سترھویں صدی کے اطالوی فلسفی وائیکو VICO کا خیال تھا کہ ہرکولیس (جس کے بازو پہاڑ کو سر کر سکتے تھے) اور لیکرگس اور رومیولس (دو مصنفین) جنہوں نے ایک عام انسان کی طرح طبعی زندگی میں صدیوں کا سمجھنے والا کام مکمل کر ڈالا تھا دراصل اجتماعی اذہان کی پیداوار تھے۔ جب لیٹر نے انسان نما دیوتاؤں کی تخلیق کرنا چاہی تو بقول وائیکو اس نے ایک فرد واحد میں تنہا ذہن کے خیالات کو متشکل کر دیا۔ صدیوں کے خالص ادبی مطالعات کے باعث دیو مالا کا یہ غلط تصور

---

۱ مرجہ ہو کر ان سے کہتے ہیں دیو مالا عہد طفولیت کے قصے کہانیاں ہیں (خالد) "

۲ David, Daiches: Critical Approaches to Litt P. 168

اپنی جڑیں اتنی گہری لے جا چکا ہے کہ اسے ایک دن میں اکھاڑ پھینکا نہیں جا سکتا۔ بعد میں اس تصور کی جڑیں یونانی۔ رومی سرزمین سے مشرق کی جانب پھیل گئیں۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ تحریکِ احیاءِ العلوم نے جہاں یونانی علوم و فنون کا کھوج لگایا وہاں یونانی دیومالا کی نو دریافت بھی کی۔ بعد ازاں اس تحریکِ نو دریافت کے اثرات بڑھتے چلے گئے۔ چنانچہ بیسری صدی کے ماٸتھالوجی اور علم الانسان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ فریزر کی خدمات اس ضمن میں ناقابلِ فراموش ہیں۔ فریزر نے "شاخِ زریں" کے جنوری ۱۹۱۴ء کے دیباچے میں لکھا:

"میں قدیم دیومالا کے سوالات کی طرف جس قدر زیادہ مائل ہوتا ہوں ان سوالات کے شافی جوابات میں خود کو اتنا ہی محدود پاتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہم دیوانے جو ان ناقابلِ حل سوالات کے جوابات کے لئے اپنی عمریں گزار دیتے ہیں، سسی فس[1] کے مماثل ہیں جو بڑی قوت سے پتھر کو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچاتا، اور دوسرے ہی لمحے وہ پتھر لڑھک کر پھر سے وادی میں آ گرتا۔ یا پھر دینوس DANAUS کی بیٹیوں کی طرح ہیں جن کے مقدر میں چھلنی لگے برتنوں میں پانی اپڑیلنا، پانی کا بہہ جانا اور دوبارہ اسی عمل لاتِ مسلسل میں مصروف رہنا لکھا ہے"۔

دیومالا کے مزاج شناسوں کا قول ہے کہ دیومالا نظیر کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہ نہ تو فرصت کے لمحات گزارنے کی ایک ‌ ‌ ‌ ہے اور نہ ہی مظاہرِ فطرت کی ذیل میں صرف عمیق اور مجرد فکر کی آئینہ دار۔ اگر ایسا ہوتا تو ان دیومالاؤں سے کم دلچسپ شاید ہی کوئی دوسری چیز ہوتی اور شاید کوئی دوسرا دیو بھی چاند، سورج اور کائنات کی تخلیق پر اتنی ہی روشنی ڈال سکتا جتنی خود دیومالا نے ڈالی ہے۔

ہندی ماٸتھالوجی پر بعض کتابیں مرقعات اساطیر تک محدود ہیں جو یونانی دیومالا سے مماثل ہیں ـــــ ایسی دیومالائیں جن سے اچھی کہانیاں جنم لے سکتی ہوں اور جن میں فن کے امکانات پوشیدہ ہوں۔ باقی ماندہ کہانیوں پر دوسری کوڑی کی تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔ ایسا ہی "تنکارات تشدد" یونانی علماء کے یہاں بھی ملتا ہے کہ وہ بے کیف اساطیر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ بے کیف اساطیر حقیقی ہوتی ہیں اور وہ قوتِ لاہوت، محبت، اور تسلسل وانزائشِ حیات کے وظائف سے متعلق ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ـ علماء غیر حقیقی مگر بظاہر خوشنما اساطیر پر جلدوں کی جلدیں لکھ ڈالتے ہیں۔

فی الحقیقت دیومالا فکر کی تصورِ حیات کی حامل ہے لیکن بدقسمتی سے دیومالا اور "افسانہ طرازی" ایک دوسرے کے ہم معنی سمجھ لئے گئے ہیں۔ شاید یہ اس لئے کہ اس کے ساتھ کچھ روایات منسلک ہو گئی ہیں جو ہمارے لئے قابلِ اعتنا نہیں۔ ہمیں تو اساطیر کے اصلی اور حقیقی معانی تک رسائی حاصل کرنا ہوگی ـــــ ایک مقدس کہانی ـــــ کہانی جو حق سچ ہونے کا تاثر دیتی ہے اور جو تحقیق و تدقیق کے بعد بنیادی عوامل کے اعتبار سے صحیح تو معلوم ہوتی ہے، اگرچہ تفصیلی پہلوؤں کی

---

[1] ۔ مطلب اسطورۂ سسی فس کا ‌ ‌ زندگی جد وجہد پیہم ہے، خالد، کلکب مورج ص : ۱۸

صورت میں اس کی ہیئت کچھ بگڑ ہی کیوں نہ گئی ہو۔ وہ اس اساطیر، رسوم و رواج کا صحیح ریکارڈ پیش کرتی ہیں۔

اگرچہ ہر اسطورہ فرضی ہے تاہم یہ اسطورہ خواہ وہ یونانی ہو یا ہندی، مصری ہو یا نصرانی۔ ایک تاریخی بنیاد کی حامل ضرور ہوا کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تاریخی اساس انفرادی مرضیات کے پیشِ نظر کم و بیش یا مکمل طور پر مستور ہو گئی ہو۔ اس کی سچائی کا اظہار عموماً علائم یا تماثیل کی صورت میں ہوتا ہے۔ حقیقت کی رمزی ترجمانی کے بھی مخصوص اسالیب ہوا کرتے ہیں جن میں سے بعض کا تجزیہ فرائڈ نے کیا ہے۔

لیروسیکس (Larousex) کی ناموس الاساطیر کے ابتدائیے میں رابرٹ گریوز نے دیومالا کے دو اہم مقاصد کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے نزدیک دیومالا کا پہلا مقصد تو ان پیچیدہ سوالوں کے جواب مہیا کرنا ہے جو مثلاً بچے اکثر پوچھتے ہیں: "دنیا کس نے تخلیق کی؟ یہ کیسے ختم ہوگی؟ پہلا انسان کون تھا؟ موت کے بعد روحیں کہاں جاتی ہیں؟ ان سوالوں کے جواب مختلف دیوتا مہیا کرتے ہیں جنہیں تخلیق و تحفظ ادراک کا منصب ملا ہوا ہے۔

دیومالا کا دوسرا مقصد بقول گریوز موجودہ سماجی نظام اور رسوم و رواج کا جواز مہیا کرتا ہے۔

جہاں تک ان دو مقاصد میں سے اول الذکر کا تعلق ہے یہ سوال ابتدائے آفرینش ہی سے ان کے لئے معمابنے رہے ہیں ان سوالوں کے جواب مذاہب نے بالعموم اور دینِ اسلام نے بالخصوص اور بالصراحت مہیا کئے ہیں لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ دیومالائیں دراصل یونانیوں کی اولین مذہبی سوچ کی نمائندہ کہی جا سکتی ہیں اور اس اعتبار سے انسانی فکر کے کھوج اور اس کے تدریجی ارتقاء کا پتہ فراہم دیتی ہیں۔ اور اسی لئے یہ آج کے دور میں بھی لائقِ اعتنا ہیں۔ دوسرے یہ کہ آج کی سماجی رسوم کے پس منظر میں ان داستانوں کی کارفرمائی کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ پہلے دیومالا کا مطالعہ کرنے اور اس کے بعد اس کے ماخذ کا کھوج لگانے کی بجائے ہمیں چاہیئے کہ پہلے اس علاقے کا بالمقابلہ جغرافیائی اور تہذیبی مطالعہ کیا جائے جس میں ایک مخصوص دیومالائی قصے نے جنم لیا ہے۔ اس طریق پر دیومالا اپنی وضاحت خود کرے گی۔ وزیر آغا نے بھی اسی طرزِ تحقیق کی توثیق کی ہے۔ مثلاً تخلیقِ کائنات کے عمل کے ضمن میں لکھتے ہیں:-

"تخلیقِ کائنات کا عمل مختلف اساطیر میں مختلف کہانیوں کی صورت میں بیان ہوا ہے اور ان میں سے ہر کہانی اس ملک کے جغرافیائی حالات سے متاثر نظر آتی ہے جس میں اس نے جنم لیا۔ بعض امور میں اشتراک بھی ہے کیونکہ وہ انسان کے بنیادی اور اجتماعی مشاہدے کے متعلق ہیں"۔ ——— تخلیقی عمل ص: ۹۴

فاضل مصنف نے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر بابل اور شنار کے بارانی خطوں کی مثال پیش کی ہے۔ یہاں زمین اور آسمان کا بارانی طوفان کی یک رنگی سے باہر آکر اپنی اپنی الگ الگ حیثیت میں ظاہر ہونا عام مشاہدے کی بات ہے۔ چنانچہ اہلِ بابل کے یہاں تخلیقِ کائنات کا عمل بھی پیہم بارش کے بعد زمین و آسمان کے علیحدہ علیحدہ اکائیوں کی صورت میں نظر آنے کے عمل

لہ اساطیر کو مت جان تو افسون و فسانہ ہے اور اک حقیقت کی یہ اک رمزِ یگانہ کلکِ مورخ ص: ۹۳

سے مماثل ہے (وزیر آغا) اسی طرح یونان کا علاقہ چونکہ سطح مرتفع تھا اور یہاں ضیا باری شمس سے زیادہ ابر باراں کی ضرورت رہتی تھی۔ اس لئے اسی ارضی ضرورت کے پیش نظر زئیس کو بارش کے دیوتا کا منصب سونپا گیا۔

ابھی ذکر ہوا کہ مختلف گروہوں کے جغرافیائی حالات جتنے زیادہ مختلف ہوں گے۔ اس تناسب سے ان کی اساطیر مختلف ہوں گی تاہم ان جغرافیائی اور تہذیبی تمیزات و اختلافات کے باوجود مختلف دیو مالائیں بعض امور میں اشتراک کی حامل بھی نظر آتی ہیں مثلاً کائنات اور ماہیت کائنات کا سوال "انسانی سائیکی میں نمایاں طلب کی حیثیت سے ابھرا تھا۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ قدیم زمانے کے قریب قریب ہر ملک میں کائنات کی ابتدا سے متعلق کوئی نہ کوئی اسطور ضرور موجود رہی ہے" انسان نے تخلیق کائنات کے عمل کو اپنی تخلیق سے مماثل قرار دیا اور بحیثیت مجموعی ہر اسطور کا پہلا حصہ ابتدائی بے ہئیتی سے متعلق ہے۔ اس کے بعد طوفان کا ذکر ہے اور پھر کائنات کی از سر نو تخلیق کا تذکرہ۔ خلاصہ یہ کہ یہ دراصل ناموجود سے موجود کے جنم لینے کا ایک عمل ہے (وزیر آغا)

چونکہ عبد العزیز خالد کے یہاں یونانی اور اس سے کسی قدر کم ہندی دیو مالا کا بیشتر ذکر ہوا ہے اس لئے پہلے یونانی دیو مالا سے تخلیق کائنات کی کہانی بیان کی جاتی ہے۔

ہسیوڈ (HESIOD) تھیوگنی (THEOGONY) میں ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح اتھاہ محض (ناموجود) یا انتشار (CHAOS) سے گیا یعنی دھرتی نے جنم لیا اور اس نے ان تمام دیوتاؤں کو جنم دیا جن کا آغاز یورینس سے ہوتا ہے۔ اور جس نے دھرتی کو پوری طرح اپنی آغوش میں ڈھانپ لیا (یہ عمل گویا مرد و زن کے جنسی اختلاط سے مماثل ہے) ان کے باہمی ملاپ سے خوفناک عفریت پیدا ہوئے لیکن ان کے ساتھ ہی ساتھ دیویاں بھی پیدا ہوئیں۔ جنہیں کلاسیکی دور میں ابھی تک قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تخلیق کے عمل میں بارہ طیطان (TITANS) پیدا ہوئے۔ ان میں سے سب سے آخر میں متولد ہونے والے قرونس نے اپنی ماں کی مدد سے اپنے باپ کو آختہ کر دیا اور "آقائے نام" بن گیا یورینس ایک دہشتناک اور جابر فرمانروا تھا۔ (۲) بڑا قرونس بھی باپ پر گیا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں اس کی اولاد اسے تاج و تخت سے بے دخل نہ کر دے (قرونس نے اپنی بہن RHEA سے شادی کر لی تھی) اپنے تمام بچے نگل گیا لیکن شومئی قسمت سے سب سے آخر میں جنم لینے والے زئیس (جس کا ذکر خالد کے یہاں آیا ہے) کو اس کی ماں نے ایک چال کے ذریعے بچا لیا۔ عنفوان شباب کو پہنچتے ہی اس نے قرونس کو اپنے بہن بھائی یعنی ہسٹیا، دیمیطر، ہیرا، پوسیڈن اور ہیڈیز اگل دینے پر مجبور کیا (ان دیو مالائی کرداروں کی تفصیل خالد نے سرود رفتہ کے پردۂ ساز میں دی ہے) قرونس نے تعمیل حکم کی۔ زئیس اور اس کے ساتھیوں نے مل کر قرونس اور اس کے ساتھی طیطانوں کے خلاف جنگ کر کے انہیں اندھیرے پاتال میں قید کر دیا۔ اس کے بعد خاندان زئیس کی نسل آگے بڑھی۔ جن میں سر بستہ دیوتا بن گئے مثلاً اپالو، ارطیمس، ہرمز، افرو، ایتھینیا ڈیونیسی اسس، ہیفاسٹس وغیرہ۔ ان کے علاوہ وہ لوگ جو فانی مخلوق کے ملاپ کے بعد پیدا ہوئے ہیروز HEROES کے گروہ آمادہ خاندانوں میں ظہور پذیر ہو گئے۔

پس یہ تھی وہ روداد جس کے تحت تخلیق کائنات کے بعد ایک خاندان نے دیوتاؤں کی بغاوت کچل کر کوہ اولمپس کی ابر آلود

جنہیوں پر بادشاہت کی بنیاد رکھی۔ زانسیس کی قیادت میں ہر دیوتا کو قابلِ لحاظ حد تک سلطنت یا کوئی اور اہم منصب سونپا گیا۔ پوسیڈون کو سمندر ملا اور ہیڈیز کو سلطنتِ مردگاں، جب کہ ہیرا کو بیویوں اور منگیتروں کی محافظت اور دیمیٹر کو زراعت کے مربی کا منصب ملا۔

یونانی اساطیر میں جہاں کائنات کی تخلیق کا معمہ حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں خیر و شر (زیوس اور طیطان شر کے نمائندے ہیں) کا تصادم بھی دکھایا گیا ہے (اور تصادم کا دوسرا نام زندگی ہے) اور سب سے آخر میں کاروبارِ حکومت کی تنظیم و تقسیم کا "وزارتی" عمل بھی اپنی ابتدائی صورت میں نظر آتا ہے۔

ہندی دیومالا میں بھی تخلیقِ کائنات، انسانی تخلیقی عمل سے مماثل نظر آتی ہے۔ اپنشدوں میں ابتدائی تاریکی کے راج کا ذکر آتا ہے جب صرف پانی ہی پانی تھا۔ اس پانی نے برہم کو برہم نے پرجاپتی کو جنم دیا۔ پانی ہی سے تمام اشیاء کی پیدائش کا ذکر قرآن حکیم میں بھی آیا ہے۔ اگرچہ یہاں قرآن و اپنشد میں مماثلت جزوی ہے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو واضح طور پر نظر آتا ہے کہ ابتداءً ہر فرد و بشر نے ماحول کے متعلق اپنے ردِ عمل کو اساطیر کی صورت میں متشکل کرنا شروع کیا اور تخلیقِ اساطیر گویا مذہبی نظاموں کی ابتدا تھی۔ فطری قوتوں کو مجسم کر دیا گیا اور اس طرح تخلیق کیے گئے کردار اپنے کردار کے باعث اچھے، برے یا موافق و مخالف قرار پائے۔ یہ شخصیات اپنی مخصوص حیرت انگیز قوتِ کار کے باعث الوہی خصوصیات سے متصف کر دیے گئے۔ اور انسانی معاشرے کو متاثر کرنے لگے۔ ان دیوتاؤں کی نر اور مادہ میں تقسیم (یہ تقسیم بھی انسانی معاشرے (اناث و ذکور) کی تقسیم سے مماثل ہے) جو تقریباً ہر قوم کی دیومالا میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے ان کی مخصوص صفات کے باعث تھی۔ مثلاً وہ قوت جو بہادر و سرکوب دیدہ و دیدہ کر سکتی ہو یقیناً مردانہ ہوگی۔ جب کہ ایک لطیف قوت جو الطاف و عنایات بہاروں، کرتی اور تسلسلِ حیات کا ترنم انجام دیتی ہو وہ مادہ ہوگی۔ ان طبعی و جسمانی اساطیر ہی سے رفتہ رفتہ اخلاقی اساطیر نے جنم لیا اور ان مجسم و متشکل قوتوں کو انسانی اخلاقی خصوصیات سے متصف کر دیا گیا جن میں سب سے عظیم و ارفع خصوصیات دانش و بینش، انصاف وغیرہ ہیں۔ کس قسم کی خصوصیات کس قسم کی شخصیات سے منسوب کی جاتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان خصوصیات کا اظہار ایک مخصوص قسم کے گروہ پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں اساطیر میں قومی اور گروہی اختلافات نظر آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہی متشکل قوتیں ایک شجرۂ نسب سے مربوط کر دی جاتی ہیں اور بعض خاندانی روابط کی طرح ڈال دی جاتی ہے (زانسیس ہیرا کا خاوند اور ایتھینا کا باپ ہے)

زیرِ نظر مصنف جو کلاسیکی دیومالا کا احاطہ کرتی ہیں تا ہے اس کا غالب مقصد قارئین کو عہدِ عتیق کی طرف لے جانا، اس عہد کے انسان سے روشناس کرانا اور اس کے طرزِ فکر کی نمائندگی کرتا ٹھہرتا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے روشن شناسی کوئی بات ہو کہ عہدِ عتیق کا انسان خواہ وہ آج کی نیوگنی کا ساکن تھا یا قبل از تاریخ کے جنگل کا باسی، کبھی ایسی مخلوق نہیں رہا جو اس عالم سیف و سنگ کو روشن تخیلات اور دلکش تصورات سے آباد کرتا رہے۔ عہدِ عتیق کے جنگل میں بد روحوں اور جن پریوں کا نہیں وحشت کا راج تھا۔ جس کا توڑ ساحرانہ رسوم کی ادائیگی یا دیوتاؤں کے غضب سے بچنے کے لیے قربانی ہوا کرتی تھی۔ انسان نے (خصوصاً یونانیوں نے) محسوس کر لیا تھا کہ ان سے بالاتر بھی بہت سی قوتیں موجود تھیں اور یہ کہ ان قوتوں کا مظہر گرد و پیش کے مظاہر

ردّ و بدل اور قدرتی واقعات کی تبدیلی سے ہوتا ہے۔ یونانیوں کے ذہن میں بھی یہ تخیل پیدا نہ ہوا کہ ایسا خدا ہے واحد بھی موجود ہے جو جملہ ہیولائے فطرت پر کلیتاً حاوی ہے یا وہ یک و تنہا جملہ مخلوقات و کائنات پر قادر ہے۔ یونانیوں کی دنیا مناظرِ فطرت کی گوناگونی سے مرصع تھی اور اس کے ساتھ ان کی فطرت میں تمثیل و تشبیہِ الٰہی قائم کرنے کا خاص ملکہ تھا اس لئے یہی اسباب ان کے کثرت پرست (POLYTHEISTS) بننے کا جواز مہیا کرتے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ حقیقت اور تصورِ حقیقت سے منقطع دیو مالا صرف اسی معاشرے میں زندہ رہ سکتی ہے جو خود حقیقت سے دور جا چکا ہو۔ جہاں دولت کی اتنی فراوانی ہو کہ یہ ایک اشرافیہ کو قائم رکھ سکے تاکہ یہ جماعت زندگی کے عریاں اور تلخ حقائق سے دور رہ کر ذہنی بازیگری کے لئے وقف ہو جائے۔ ارسطو کے نزدیک کام کے بجائے آرام ایک شریف آدمی کا نادیۂ حیات تھا۔ چنانچہ دیو مالا جب اس سٹیج پر پہنچ جائے تو اس کی موت یقینی ہے۔ دیو مالا کو ان بازوؤں سے مائل ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ جن سے کام نہیں لیا جاتا اور جو سوکھ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ افلاطون کی تمثیلیں دیو مالا کی نشاۃ ثانیہ کی ایک کوشش تھیں۔ موصوف نے انہیں تہذیبِ نفس اور اصلاحِ اخلاق کے لئے استعمال کیا۔ تاہم یہ تمثیلیں یونانی دیو مالا کو جانبر نہ کر سکیں۔

افلاطون نے دیو مالا کو نئی حیات بخشنے کے لئے، جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، اپنی مشہور تمثیلیں برتیں۔ اس سے ملتی جلتی کوشش اشور بنی پال نے (افلاطون سے قبل) بھی کی۔ اشور بنی پال، نینوا پر ۶۶۸ ق م میں حکومت کرتا تھا۔ اشوری فرمانروا (سمیری) ادبیات کا بے حد مداح تھا۔ مگر اس نے افلاطون کی طرح (سمیری یا بابلی) دیو مالا کو تمثیلی لباس تو نہیں دیا لیکن بجنسہٖ ان کے تحفظ کا سامان فراہم کر دیا۔ اس کے محل سے ایسی پختہ تختیاں دستیاب ہوئی ہیں جو ایک ہی جسامت اور شکل کی ہیں اور ان پر سمیریوں اور بابلیوں کی کہانیاں (اساطیر) کھدی ہوئی ہیں۔

یہاں مجھے کارلائل کا ایک مشہور فقرہ یاد آ رہا ہے جو دیو مالا کے متعلق اس کے نظریے کی وضاحت کرتا ہے۔ اس کے خیال میں:

"To the mean person the myth means little, to the noble person much ——— "carlyle"

کارلائل نے یہ جو یقیناً خطابت کے جوش میں نہیں کہا ہوگا بلکہ اس اعلان کے پیچھے اس کا رچا ہوا دیو مالائی شعور دکھائی دیتا ہے۔ اردو ادب میں غالب کے یہاں دیو مالا کا پیہم استعمال بھی اس کے انسانیاتی شعور کا مظہر ہے۔

اس سے قبل کہ دیو مالا کی لٹریری اہمیت اجاگر کی جائے، ضروری ہے کہ اس کی سماجی افادیت کی وضاحت کی جائے۔ گزشتہ سطور میں دیو مالا کی مختلف تشریحات کی ذیل میں اگرچہ جزوی طور پر دیو مالا کے سماجی وظائف کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن یہ اشارے ذرا تشریح طلب ہیں۔

دیو مالا، رسوم اور سماجی تنظیم دراصل باہم ناقابلِ انفصال انداز میں مربوط ہیں۔ چنانچہ ان کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ دیو مالا اور کرامات کو واقعات کی نسبت رسومات کے علم کے قابلِ اعتماد ذرائع کہا جا سکتا ہے اور یہ بات واضح

ہے کہ رسوم سے ثقافت کا خمیر اٹھتا ہے[1]۔ میلی نوسکی (MALINOWSKI) نے دیو مالا کے اسی سماجی پہلو کو مندرجہ ذیل سطور پر یوں ابھارا ہے :

"میرا دعویٰ ہے کہ داستانوں کی ایک ایسی قسم بھی موجود ہے جنہیں مقدس سمجھا جاتا ہے اور جنہیں رسومات، اخلاقیات اور سماجی تنظیموں کی صورت میں متشکل کیا جاتا ہے۔ یہ داستانیں قدیم تمدن میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ داستانیں صرف اس وجہ سے زندہ نہیں کہ یہ دلچسپ، غیر حقیقی یا پھر حقیقی ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ یہ اپنے ماننے والوں کے لئے قدیم عظیم اور موزوں تر حقیقت کی نمائندہ ہوا کرتی ہیں اور ان کے ذریعے انسان کی زندگی، اس کی سرگرمیوں اور اس کی تقدیر پر روشنی پڑتی ہے۔ ان داستانوں کا علم انسان کو رسوم، اخلاقی اعمال اور ان کی ادائیگی کے محرکات و مقاصد سے آگاہ کرتا ہے۔"

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں MYTH AND RITUALS کے زیر عنوان میلی نوسکی ہی کے حوالے سے لکھا ہے: "مختصراً اساطیر کا مقصد روایت کو مستحکم کرنا ہے۔ قدیم واقعات کی ارفع، بہتر اور زیادہ مافوق الفطرت حقیقت کی طرف اس کا رخ موڑتے ہوئے اس کو قدر اور وقار عطا کرتا ہے"۔ اساطیر ہی سے مذہب، المیہ اور رومانس جنم لیتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اساطیر انسان کی عمیق ترین خواہشات، اس کے اندیشے، اس کے آمال و احساسات اور اس کے جذبات کو چھوتی ہیں۔ دیو مالا سماجی نظام کی توثیق کرتی ہے۔ اس کا جواز مہیا کرتی ہے اور فن رقص کے اظہارات سے لے کر قانون شعاری (LEGALISM) تک اس کی رسائی ہے۔

قدیم انسان کے یہاں حیات اور ذی نموی (حیوانی اور نباتی) کا سلسلہ ایک ناقابل تقسیم وحدت کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ زندہ رہنا اور تسلسل حیات کی کوشش کرنا، خوراک کھانا اور افزائش نسل کا سامان کرنا ــــ یہ قدیم انسان کی بنیادی ضروریات تھیں اور یہی رہتی دنیا تک موجودہ اور آنے والے انسانوں کی بنیادی ضروریات ہیں اور رہیں گی۔ ان بنیادی ضروریات میں بعض دیگر چیزوں کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے تاکہ زندگی کو زیادہ خوبصورت اور پرکشش بنایا جا سکے۔ تاہم جب تک مذکورہ بنیادی ضروریات اور مطالبات پورے نہیں ہو جاتے، نوع انسانی کا وجود معرض خطر میں رہتا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر جب ہم مصری شہنشاہوں کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے یہاں حیات اور اس کے لوازمات لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ مصری شہنشاہ ایک مذہبی رہنما اور ایک اچھا حکمران ہوا کرتا تھا۔ وہ دیوتاؤں کا اوتار تصور ہوتا تھا۔ وہ زمین کو زرخیز کر کے گندم و جَو کی فصلیں اگاتا اور درختوں میں پھل پیدا کرتا، جانوروں کے گلوں اور سمندروں یا دریاؤں میں مچھلیوں کی افزائش کا اہتمام کرتا۔

دیو مالا کا حیات و کائنات سے رشتہ صرف یونان تک ہی محدود نہیں بلکہ ہندی دیو مالا کا دور بھی اس ضمن میں یونانی دیو مالا سے بہ تمام و کمال مشابہ ہے۔ ایک قدیم برہمن کے نزدیک بھی جو چیز   بالشان تھی۔ اس کا نام حیات ہے ــــ صرف جینا ہی نہیں بلکہ اچھی طرح جینا اور پھر جسمانی قوت سے محظوظ ہونا۔ زندگی کے لئے خوراک ضروری ہے۔ امراض اور مصائب سے بچنا ضروری ہے

---

[1] فی الحقیقت نہیں سوختنی رسم و رواج   بنتا ہے انہی سے تو ثقافت کا مزاج ــــ لحن مرید

اور تسلسلِ حیات کے لیے صحت مند اولاد کا ہونا بھی ضروری۔ رگ وید کے پہلے بھجن کی روشنی میں ایک برہمن کی تلاش "دولت، خوشحالی، اور بہادروں کی کثرت" کے مترادف تھی۔ وہ سوما دیوتا سے بیماری سے نجات، طویل عمر اور دشمن کے مقابل مدد کے لئے دعا کناں رہتا تھا۔

یہاں ضمناً اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اگر ہمیں حقیقی ہندی دیو مالا (اس دیو مالا کا نہیں جو لٹریری روزش سے عبارت ہے) کا مطالعہ کرنا ہے۔ اور ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دیو مالا ایک وسیع کائنات کے لئے کیا معنی رکھتی ہے تو ہمیں رامائن اور دشنو پران کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اس سنسکرت سے جو مردہ ہو چکی تھی اُس سنسکرت کی طرف رجعت کرنا ہوگی جو ۱۰۰۰ ق م یا اس سے بھی کچھ پہلے تک ایک زندہ زبان تھی۔ یہ زندہ زبان ویدک تھی اور اس کا مزاج کلاسیکی سنسکرت سے قطعی مختلف ہے۔ یہ زبان سادہ اور منتقیم تھی اور اس کا مقصد وحید ابلاغ تھا نہ کہ ادبی مہارت کا مظاہرہ ——— اور ابلاغ کی سماجی اہمیت سے شاید ہی کوئی منکر ہو۔

دیو مالا کا تسلسلِ حیات سے تعلق اب تک واضح ہو گیا ہوگا لیکن اس تعلق کی ایک جہت رمزی اور علامتی بھی ہے۔ وزیر آغا اپنی معرکتہ الآرا کتاب "اردو شاعری کا مزاج" کے آخری باب میں لکھتے ہیں :

" انسانی دیو مالا کی لاتعداد کہانیوں کے پسِ پشت ایک ہی کہانی کی کڑیاں موجود ہیں۔ یہ کہانی سورج کے برآمد ہونے آسمان پر سفر کرنے، رات، سمندر یا اژدھا کے منہ میں اترنے اور وہاں ایک نئے سورج میں ڈھل کر اگلی صبح دوبارہ طلوع ہونے کی ایک کہانی ہے لیکن سورج کے طلوع و غروب کی یہ کہانی دراصل علامتوں کے روپ میں جنسی فعل ہی کو پیش کرتی ہے۔ بچے کا رحم مادر سے جنم لینا، ایک مرد کی صورت اختیار کرنا، عورت سے ہم کنار ہونا (حیاتیاتی طور پر ہمکنار ہونے کا عمل موت کو قبول کرنے کی ایک صورت ہے مثلاً شہد کی نر مکھی جنسی اتصال کے فوراً بعد مرجاتی ہے) عورت کے رحم میں نطفہ چھوڑنا اور پھر اس نطفے کے ذریعے اس کی تجدید کرنا، یہی وہ داستان ہے جس نے شمسی دیو مالا کی علامتوں میں خود کو عام طور سے دہرایا ہے۔ اردو شاعری بھی دیو مالا کی اسی ازلی و ابدی کہانی کے مختلف ادوار کو پیش کرتی ہے۔

——— اردو شاعری کا مزاج ص : ۴۲۵

یہاں میں ضمناً یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ انیسویں صدی میں جب دیو مالا پر تحقیق و تدقیق شروع ہوئی تو کئی سالوں تک شمسی دیو مالا کو تمام دیو مالاؤں کی توجیہہ و ترجمانی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ چنانچہ میکس مولر کو اس دبستان کے سربراہ کا درجہ حاصل ہے۔ اردو میں وزیر آغا اسی دبستان سے متعلق نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بقول ایڈتھ ہملٹن آپ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ ہمیں ہر دیو مالائی ہیروئن میں چاند یا سپیدۂ سحر اور ہر مرد کی زندگی میں شمسی دیو مالا تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔[۵۱]

" دیو مالائی داستانوں اور اسی قسم کی بے شمار اساطیر کے آج تک زندہ رہنے اور اظہار و اسلوب کی منہاجات کو خوبصورت اور جامع بنانے کی وجہ صرف یہی نہیں کہ شاعروں، نقاشوں اور عالموں کے دلوں میں ان کی جگہ ہے بلکہ بنیادی طور پر ان کی زندگی کا

---

[۵۱] Edith Hamilton, Mythology, P: 19

باعث خود ان کی دو آبیت ہے۔ یہ دیو مالائیں انسانی تجربات کی تجسیم کرتی ہیں اور تجربات اپنی مبادیات میں نہ بدلتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک تاریخی تجربہ بھی اگر بعض فردی خصوصیات سے منحرف ہو جائے تو وہ دیو مالا کا روپ دھار سکتا ہے۔ وولڈ سکوپ انسائیکلوپیڈیا کی آٹھویں جلد میں اسی حوالے سے لکھا ہے "پس یہ صحیح نہیں کہ اسطور ہمیشہ افسانہ ہوا کرتی ہے۔ جس کی حقیقی بنیاد ناپید ہو۔ مثلاً وہ یونانی اسطور جس میں بتایا جاتا ہے کہ پرومیتھیس (خالد نے انسان کے اس محسن اور سورج بنسی خاندان کے اس فرزانہ و زندہ مرد کا ذکر شرح و بسط سے دکان شیشہ گر میں کیا ہے) نے انسان کو دیوتا آتش عطا کرنے کے باعث سزا پائی، واقعی اسطور (افسانہ) ہے لیکن یہ داستان اس تاریخی سچائی کی مظہر فردوس ہے۔ جس کے مطابق انسان نے قبل از تاریخ کی کسی صورت میں آگ جلانے کا فن سیکھا۔ اس ایک ڈرامائی کردار میں تلاش آتش کی عام کہانی ملخص ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اگرچہ اس خدمت کے عوض سزا ملنے کی کوئی تاریخی شہادت یا منطقی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ کسی اہم کام کا بیڑہ اٹھانا خواہ اس کی نوعیت جسمانی ہو یا ذہنی۔ آنے والی اذیت کا سبب بن سکتا ہے۔

پس اسطور کا حقیقی اور خصوصی مقصد (جوں حرف حق بلند شود دار بے شود) حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی اہم تاریخی واقعے اور کسی عام انسانی تجربے کا خوبصورت امتزاج"

انسانی تجربات و نفسیات کی تجسیم یونانیوں کے یہاں بڑے خوبصورت اور پرکشش طریق میں ملتی ہے جس کی ایک مثال اوپر درج کی گئی۔ شاید اسی لیے خالد کو ماضی کی اس عظیم قوم سے بے پناہ محبت ہے۔ خالد کی طبع زاد تخلیق "دشت شام" کی ایک نظم "سراب" میں خالد قاری کی توجہ "خاکِ پاکِ یونان" کی طرف مبذول کراتا ہے۔ ارض یونان کو "خاکِ پاکِ یونان" کہنا ہی دراصل خالد کے اس سرزمین سے والہانہ لگاؤ اور اس کی نابغہ ہستیوں سے ربطِ قلبی کی واضح شہادت ہے۔ ذیل کی سطور ملاحظہ ہوں :۔

وہ دیکھو وہ خاکِ پاکِ یونان
یہ علم و ہنر کی سرزمیں ہے
ایتھنز کے شہر آرزو میں
لوگوں کے ہجوم کو بکو میں
قندیل بدست دیو جانس
انسان کو تلاش کر رہا ہے

دشت شام ص: ۱۱۳

اور سکندر یونانی کے اس معاصر دیو جانس کلبی ہی پر کیا موقوف، یونان کے اغلب عہد شعوری طور پر انسان دوست اور انسان آشنا عہد رہا ہے۔"

"اور یونانی اور رومن دیو مالا کا بھی یہ معجزہ ہے کہ یہاں کی آباد دنیا کے باسی انسان نما اور آدم صفت ہیں۔

ہرکولیس، جس کی تمام زندگی عفریتوں کے خلاف ایک مسلسل جنگ تھی (اور یہ جنگ خیر و شر کے تصادم سے مماثل ہے اور جس کا ذکر آگے آئے گا) کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہر تھیبس (THEBES) میں اس کا باقاعدہ گھر موجود تھا۔ جزیرہ سسلی کے چشمے آج بھی ہرکولیس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جہاں افرودیتا (خالدہ نے موصوفہ کا ذکر سو دو رفتہ کے ص ۱۰۲ پر کیا ہے) سمندر کے جھاگ سے پیدا ہوئی تھی۔ پر دار گھوڑا پیگاسس (جس کے مٹن اور خالدہ دونوں ہیں) تمام دن فضا میں گھومتے پھرتے، جب کہ رات کو ایک آرام دہ اصطبل میں پہنچ جاتا۔ چنانچہ یہ سکونتی مقامات ان دیو مالائی کرداروں کو حقیقت آشنا کر دیتے ہیں۔ اگرچہ کہانی میں ان زمینی مقامات کا اندراج کچھ بچگانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قیاس کیجئے کہ یہ پس منظر بظاہر کتنا حقیقی اور کتنا معقول نظر آتا ہے۔ بمقابلہ اس جن کے جو چراغ کو رگڑنے پر کتم عدم سے ظہور پذیر ہوتا ہے اور جب اس کا مفوضہ کام ختم ہوتا ہے تو نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے"۔

——— ایڈتھ ہملٹن، مائیتھالوجی، ص ۱۷

اگرچہ من حیث القوم یونان پر بھی بربریت کا ایک دور گزرا تھا لیکن یونانی دیو مالا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے ابتدائی وحشیانہ پن سے کس قدر بلند ہو چکے تھے۔

ناممکن ہے کہ یونان کا ذکر ہو اور ہومر کی کوہ پیکر شخصیت زیر بحث نہ آئے۔ خود عبدالعزیز خالد خاکِ پاکِ یونان کے ساتھ ہومر کی شخصیت سے بھی اپنے ذہنی رابطے اور تخیلی سفر کی کڑیاں ملاتا ہے:

"ری ہومر جیسے یونان کی انجیل کہیں،
ہم پیالہ تھا خمستانِ ازل میں مرا"

——— دشتِ شام ص: ۱۲۲

چنانچہ ضروری ہو گا کہ اجمالاً دیکھ لیا جائے کہ ہومر کو یونانی اساطیر میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ اور خود اس کی شخصیت کہاں تک آج کے ادب کے قاری کے لئے قابلِ توجہ ہو سکتی ہے۔

احیاء العلوم کے علماء نے ماہرینِ علم الاصنام کے بعد آدم ہومر سے بہت کچھ سیکھا۔ ہومر کا زمانہ ایسکیلس سے بھی پہلے کا اور قیاسی عہدِ اصنامیات کا ہے۔ ہومر کی شخصیت خاصی متنازعہ فیہ ہے۔ پروفیسر اڈولف ہوم نے "تاریخ یونانِ قدیم" پر اسی بحث کو یوں اٹھایا ہے:

" لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہومر نامی کوئی شخص کبھی ہوا بھی ہے یا ہومر کے اشعار بالکلیہ زمانہ مابعد ہی میں مرتب کئے گئے تھے؟ یہ مسئلہ ایک مدت سے زیرِ بحث رہا ہے۔ ایف اے۔ ولف کہتا ہے کہ یہ کہاں ممکن ہے کہ الیاڈ اور اوڈیسی جیسی نظمیں نویں صدی ق۔م میں مرتب کی گئی ہوں۔ جب یونان میں فنِ تحریر کا اس قدر کم چرچا تھا..... لاخمان نے محض

انکار و تنقید سے آگے بڑھ کر انہوں نے تنقید کرنے میں اس امر کی طرف ہماری توجہ مبذول کی ہے کہ الیاڈ میں بہت سی جگہ جوڑ دیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت سی نظمیں تھیں جو باہم پیوست کر دی گئی تھیں۔ اس قسم کے الحاق کے ساتھ ہی ماخذ نظم کے مختلف حصوں میں باہمی تضاد پایا جاتا ہے۔ دیگر علماء نے ہومری نظموں کی تنقید جمالیاتی اعتبار سے کی ہے۔ لاخ مان نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ نظمیں جن کا ایک دوسرے سے غیر مربوط ہونا وہ پہلے ہی ثابت کر چکا تھا، دو اس مختلف اشخاص نے کہی ہوں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نظمیں ابتداً ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ نہ تھیں تو بہت جلد ان کے ٹکڑے مفرد ہو گئے ہوں گے۔ ان نظموں کی اشاعت آہستہ نظمیں پڑھنے سے نہیں بلکہ حفظ دہرانے سے ہوئی ہو گی اور عوام الناس بجائے پورا قصہ سننے کے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سننا زیادہ پسند کرتے ہوں گے۔ اس لئے اگرچہ بالفرض یہ سب ایک مکمل نظم کے مختلف اجزا رہے ہوں تاہم ان کے علیحدہ علیحدہ پڑھے جانے سے ان میں فرداً ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی ہو گی جس کی وجہ سے ہر ایک جز نے اپنی جگہ ایک مستقل نظم کی صورت اختیار کر لی جو بعض دیگر حصوں سے بالکل علیحدہ اور بے تعلق ہو گئی اور چھٹی صدی ق۔م میں والی ایتھنز، پی سستراتوس Pisistratus کے حکم سے یہ اشعار ایک دوسرے سے منسلک کئے گئے۔ اس وقت ممکن ہے مختلف اجزا میں یہ فرق قائم رہا ہو۔ ایلیاڈ کا اول تا آخر ایک ہی مقصد معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح اوڈیسی ایک مکمل و مہذب تصنیف ہے اور گو ممکن ہے اس قصے میں بھی وسعت دی گئی ہو لیکن اس کا خیال فرد واحد ایک شخص ہی کے دماغ سے نکلا ہو گا۔"

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر ایلیاڈ اور اوڈیسی کا خالق ایک ہی شخص ہو سکتا ہے تو ان دونوں کے اسلوب میں فرق کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فرق دراصل نفس مضمون کا پیدا کردہ ہے۔ ایلیاڈ میں جنگ کے حالات منظوم ہیں۔ اوڈیسی میں سفر کے، مختلف ممالک کے عجیب و غریب قصے، لوگوں کی کہانیاں اور اس قوم کے حالات بھرے پڑے ہیں جو ایسے مقامات پر بسیرا رکھتی ہے جسے بجائے شہروں اور قصبوں کے دیہات کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"یہ امر بھی متنازعہ فیہ ہے کہ ہومر کس صدی میں ہوا۔ کم از کم ہیروڈوٹس کا تو یہ بیان ہے کہ وہ نویں صدی ق۔م میں تھا۔ اس کی بابت مختلف روایات مثلاً نابینائی، اس کی سیاحت عالم، اور خیوس سے جزیرے لوس میں اس کی ترکا ہونا۔ ان سب باتوں کی تعریف کہانی سے زیادہ وقعت نہیں۔"

—————— اوڈلف سوم

ہومری اشعار میں قدیم زمانے کی وہ روایات اور یادداشتیں مدون ہیں جنہیں ہم ابتدائی تاریخ یونان کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مرکزی واقعات بہرحال صحیح ہوں گے تاہم یہ معلوم نہیں کہ کون سی بات سینہ بہ سینہ محفوظ کر لی گئی اور کون سی ایجاد کی گئی۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ یونانی دیو مالا جو ان اشعار میں منظوم ہے تاریخی اعتبار سے بھی مدون ہو سکتی ہے۔

خاک پاک یونان اور اس کے عظیم فرزند ہومر، نیز یونانی دیو مالا کے خصوصی دلچسپی کی کچھ اور وجوہات بھی غالب کے ان تلاش کی جا سکتی ہیں۔ غالب کو وطن یونان کا احسان قدر دان تھا کہ خود کو مامون الرشید کے مماثل سمجھتا ہے جس نے اپنے عہد میں یونانی تصنیفات کو عربی میں منتقل کروایا:

میں بھی ہوں مانند ماہوں کے اسیرالکاذیب
لیکن ہوں دادنتہ فکر و فن یونانیاں

اور خالد کے "فکر و فن یونانیاں" ہونے کی منجملہ دوسری وجوہات کے جن کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے، ایک وجہ ان تخلیقات کی لٹریری اہمیت بھی ہے۔ بلفنک نے اپنی دیو مالا میں سخن گسترانہ لکھا ہے :

"روم اور یونان قدیم کے مذاہب ناپید ہو چکے ہیں۔ آج کوہ اولمپس کے معروف دیوتاؤں کا ایک جیتا جاگتا شخص بھی پیرو نہیں۔ آج کے دور میں ان دیوتاؤں کا تعلق مذہب کے دبستان سے نہیں بلکہ ذوقِ صحیح اور فنِ لطیف سے ہے۔ یہیں ان کا مقام آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ وجہ یہ ہے کہ ان اساطیر کا قریب ترین ربط ادب و فن کی بہترین قدیم و جدید تخلیقات سے ہے۔ اور ان تخلیقات کی وجہ سے ان اساطیر کو ندرِ طاقِ نسیاں نہیں کیا جا سکتا۔"

Brulfinch ______

اردو ادب میں یونانی فکر و فن کے شیدائی جوش ملیح آبادی اور جعفر طاہر بھی رہے ہیں۔ جوش اپنی نظم پابہ زنجیر میں :

نہ کہسار میرے
نہ میدان میرا
نشیمن روشن پہاڑی ہے میری
ازل سے ہیں اس برجِ مکاکیشیا کا
پرومی تھیس ہوں

____ سے کہہ کر دیو مالا کے علامتی امکانات واضح کرتے ہیں اور جعفر طاہر نے عبدالعزیز خالد کے منظوم تراجم ہی کی طرح پگمیلیان اور کلاپٹیا کی اسطور کو منظوم کر کے فنِ لطیف کی انتہائی بلندیوں کو چھوا ہے۔ اور تو اور لینن ایسا ترقی پسند اور لمحۂ موجود کا ادب کرنے والا انقلابی بھی دیو مالا کا قتیل نظر آتا ہے۔ لکھتا ہے :

"THE CONTOURS OF A NEW WORLD, THE WORLD OF SOCIALISM ARE LYING BEFORE US IN THE SHAPE OF THE SOVIET REPUBLIC. IT IS NOT SURPRISING THAT THIS WORLD DOES NOT COME INTO BEING READYMADE, DOES NOT SPRING FORTH LIKE MINERVA FROM THE HEAD OF JUPITER[1]

---

1 On Defense of The Socialist Motherland, P. 52.

عبدالعزیز خالد نے بھی دیومالا کے تشبیہی و علامتی استعمال سے بہت وسیع کام لیا ہے اور اس طرح اردو ادب جس کے دامن میں کوہِ سینا، فاران، طور، یدِ بیضا، خضر، تیشۂ فرہاد، قیس و لیلیٰ، اور ان جیسی کئی چنی تلمیحات تھیں، کو اقبال کے بعد سب سے زیادہ وسعت دی ہے۔ خالد کی یہ خدمت لسانی تشکیلات کے ضمن میں بے حد وقیع ہے۔ اور اردو ادب کی کوئی تاریخ بھی اسے نظرانداز نہیں کر سکے گی۔ اگرچہ مجھے یہ کہنے میں بھی تامّل نہیں کہ ان تلمیحات کے استعمال میں رچاؤ کی وہ کیفیت نظر نہیں آتی جس سے ایک فن پارہ تاثیراتی وحدت کا روپ دھار لیتا ہے اور تلمیح شعر کا جزوِ لاینفک بن جاتی ہے۔ میرے اس تاثر کا باعث شاید ان تلمیحات کی غرابت بھی ہو۔ یہ تلمیحات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مانوس ہوتی جائیں گی اور ان کی غرابت، غیریت اور نامانوسیت کا احساس کم ہوتا جائے گا بدیں کہ لسانیات کے مزاج سے تھوڑا سا بھی واقف شخص بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ آج کا غریب لفظ کل کا مانوس لفظ ہو سکتا ہے۔ زندہ زبانیں جہاں جدت پسندی کے عمل سے دوچار ہو کر متروکات کو بھی اپنے تقاضوں کی تسکین کے لیے استعمال کرتی رہتی ہیں وہاں اپنے دامن سے امتدادِ زمانہ کے ساتھ مانوس الفاظ و تلمیحات بھی بعض اوقات جھاڑتی رہتی ہیں اور میری دانست میں زبانوں کی تطہیر و تہذیب اور اخذ و قبول کا لاشعوری اور بے ساختہ عمل جاری رہتا ہے۔ خالد کی شعری تراش میں جہاں یہ تلمیحات رنگین دھاگوں کا کام دے کر اس کو منفرد اور خوشنما بنانے میں ممد ثابت ہوتی ہیں وہاں بعض اوقات ان رنگین دھاگوں کے کثرتِ استعمال سے حسنِ تناسب بھی مجروح ہوتی نظر آتی ہے اور جس سے شعریت کا خون بھی ہوتا ہے لیکن خالد کو اردو کے مخصوص لسانی مزاج کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی خالد کے دیومالا کو تشبیہی اور علامتی انداز میں استعمال کرنے کی۔ قارئین مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کر کے اردو ادب پر خالد کے احسانات کا جزوی اندازہ کر سکتے ہیں :

اب ہفتخوانِ رستم و دستاں کو بھول کر
لکھو ترانہ ہائے عزیزانِ تیرزن
مقدر، ظفرکاب، تہمتن تن رجوری
بجوپے گیو، جس کے لیے کھیل ہے لُبن

ـــــــــ خروشِ خم ص : ۳۸

کرم کو عطا، برگ و نوا، صبر و عزیمت
شمسون کی شہ زوری و لقمان کی حکمت
طالوت کا اجلال، سلیمان کی سطوت
یحییٰ کی خود آگاہی و یوسف کی سکینت

ـــــــــ " " : ۴۸

خزاں نے قافلۂ نوبہار لوٹ لیا
دروپدی پہ دوشاسن نے ہاتھ کیا ڈالا
اتار لی بھری محفل میں آبرو اس کی

——— خروشِ خم ص: ۸۱

ہمارے سر کے تھے دو سینگ مشرق و مغرب[1]
اسی لئے تو ہمارا لقب تھا ذوالقرنین[2]

——— " " : ۸۵

خروشِ خم ہی کی مشہور نظم " فلسطین چلیں " میں سابقہ وزیر اعظم اسرائیل (دنتز میوّن) کے انجام کے متعلق یوں پیش گوئی کی ہے :

ع زندہ ہی عالم اسفل میں اتر جائے گی

عالم اسفل وہی ہے جسے ہندی دیومالا میں پاتال اور یونانی اعتقادات میں (Hades) کا نام ملا ہے۔ پھر اسی نظم میں عرب ممالک کو جو اسرائیل سے برسرِ پیکار ہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ اگرچہ قوت کے اعتبار سے اکلیز ہی کی طرح ناقابلِ تسخیر ہیں لیکن اسی اکلیز کی طرح ان کے یہاں غیر مرئی عسکری کمزوری بھی ہو سکتی ہے۔ جسے دشمنوں اور جاسوسوں کی نظر سے بچانا ضروری ہے۔ اور خود جس کا شعور بھی لازمی ہے۔ اکلیز کی ماں اسے دریائے سٹائکس میں غوطے دے دے کر اس کے جسم کو ناقابلِ جراحت بنا چکی تھی۔ مگر چونکہ ایڑی جس کو پکڑ کر وہ یہ عمل جاری رکھتی۔ پانی نہ لگنے کے باعث ناقابلِ جراحت نہ ہو سکی۔ اس لئے اس کے مخالف حریف نے ایڑی پر تاک کر نشانہ مارا اور یوں اکلیز کو زخم لگا کر اسے شکست سے ہمکنار کر دیا۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ذیل کی سطور پڑھنے سے ایک نیا لطف ملتا ہے :

اے اکلیز تہمتن بن، ور دئیں تن
جذبہ و جوش بجا اور بجا شورِ بدن
اپنی ایڑی کو بچا لیکن

——— خروشِ خم ص : ۱۲۹

---

[1] : اشارہ مغربی و مشرقی پاکستان کی طرف [2] جس طرح ذوالقرنین کا تشخص ابھی تک مؤرخین و مفسرین کے نزدیک متنازعہ فیہ ہے اسی طرح پاکستان کا تشخص بھی ڈانواں ڈول رہا اور شائد آج تک ہے یہ امر ہمارے لئے باعثِ ننگ ہے ——— (محسن)

اپنی ایڑی کو بچا نہ سکی، اس ایک مصرعے میں ترغیب و تنبیہ اور پیش آمدہ خطرات کی کتنی خوبصورت نشاندہی کی ہے۔
اسی مجموعے کے ثانی حصے میں مجید امجد مرحوم کے متعلق نہایت بلیغ مصرعہ لکھا ہے جس سے دیو مالا کے فنی امکانات واضح ہوتے ہیں۔ لکھا ہے :

وہ جس کا کلبۂ احزاں تھا میوز کا معبد

یہاں مجید امجد مرحوم کی فنکارانہ عظمت کے پیش نظر اس کے غربت کدے کو عروسانِ شعر و ادب (میوز) کی عبادت گاہ قرار دیا ہے۔ فنونِ جمیلہ کی یہ دیویاں مجید امجد پر واقعی بڑی مہربان تھیں۔ یوں بڑے بڑے اونچے فنکاروں نے ان دیویوں سے تخلیقِ فن کے سلسلے میں استمداد کیا ہے۔ طربیہ خداوندی کا خالق اور بیاترچے کا عاشق دانتے کہتا ہے :

"ہاں اگر وہ دیویاں میری شاعری کی مدد کریں جنہوں نے ان فیون کے لئے تھیبس کی فصیلیں بنانے کو پتھر جمع کئے تو میرے الفاظ واقعات کے بیان سے بھٹکنے نہ پائیں گے"

غیب سے مضامین آنے والے، فن کے اس الوہی تصور کا احساس خالد کو خود اپنی شاعری کے بارے میں بھی ہے :

لکھائے کتاب بہار وخزاں
نگارِ سخن حیرتِ پرفسوں

—— مزمور ص : ۱۸۸

دیگر :

رہیں میوز مجھ پہ سدا مہرباں
تپاں کریں مجھ پہ ناز وفسوں

—— " " : ۲۸۴

املا کرائے شعر مجھے فن کا دیوتا
فلک پر میوز محو نغمہ سنجی
تہہ چرخ بریں خالد غزل خواں

—— کفِ دریا ص: ۱۶۰

"حدیث خواب" میں اپنے اور محبوب کے ربطِ باطنی کو نوبہ نو انداز میں انہی دیو مالائی حوالوں سے اجاگر کیا ہے۔ یہاں ہندی روایت کے پیش نظر اظہار عشق کی نوعیت نسائی ہے :

تو نند لال ہیں رادھا تو کرشن ہیں میرا
ہیں ساتھی تو کیوپڈ، تو شیو، ہیں پاربتی

——— حدیث خواب ص : ۸

تو ستیہ وان ہے میرا، ہیں تیری ساوتری

——— " " : ۸

گلاشیا ہوں ہیں، پگمیلین لقب تیرا

——— " " : ۹

ہیں تیری پاربتی اور تو مرا شنکر

——— " " : ۱۱

تو نیل کنٹھ ہیں گوری، تو شیام ہیں گوپی
تو دیوتا ہے مرے من کے سونے مندر کا

——— " " : ۱۲

تو ہیری شہر ہیں تیرے لئے تو سستی ہے
تری سلومی دسیفو : تری قلوپطرہ

——— " ص ۱۸

وزیر آغا کے تشبیہی استعمال کے کچھ اور منفرد نمونے ملاحظہ ہوں :

یوں بانسری کی لے پہ تڑپتی ہیں گوپیاں
جس طرح ناگ جھومیں سپیرے کی بین پہ
ابر دیکھتے ہوئے کہ کسان کا دیوتا
تاریک تر گناہ سے خوشبو سے نرم تر

——— کف دریا ص : ۱۳۲

خوشنما زلفیں جبیں کی سنہری پشم سے

شیر کی دائیں ہیں کیسے کاٹتا، ہاتھی کی چال

——— ،، ،، : ۱۴۳

ساغر نگسار جو بڑھے ترے لب

آ تشنگی کا ساز ہاتھ ساقیا!

——— ،، ،، : ۱۵۲

میں اپنی آگ میں جلتا ہوں مثلِ مرسیفاد

الم پرست کو ہے مایۂ نشاط الم

——— سمستا، ص: ۹۷

عمرِ دوبارہ کی دلیل ہے دل شاعر کا

علم و احساس و تخیل کا ذخیرہ اندوز

——— دشت شناس : ۲۷

معاشرے کی تہذیب و اصلاح کرنے والے اور انسانیت پر احسان کرنے والے، اپنے جذبۂ بہبود و اصلاح کے باعث منفی قوتوں سے ایذا پاتے رہے ہیں۔ خالد بھی خود کو ایسے ہی مصلحین میں شمار کرتا ہے۔ وہ خود کو پرومیتھیس قرار دے کر آج کی بین الاقوامی فضا میں بالعموم اور ملکی سطح پر بالخصوص شدت کے ساتھ نظر آنے والے اجتماعی حبس، گھٹن اور جبر کو رمزی اور ایمائی انداز سے یوں بیان کرتا ہے:

میں جدید دور کا پرومیتھیس

حریقِ عطش، غرقِ دریائے خوں

——— مزمور، ص: ۱۷۹

خالد نے زنجیرِ آہو کی بعض نظموں میں دیومالا کے حوالے سے بڑی خوبصورت تلمیحیں استعمال کی ہیں۔ قسمی ناپید ڈبا

۱؎ اس داستان اور اسی طرح آرفیس اور یوریڈیس اور سٹبری اور ان کی تلاش کے قصے کو مشہور ماہر علم الاصنام پیر تھ ملٹن نے ایسی داستانیں قرار دیا ہے جو موسم سرما کی طویل رات گزارنے کیلئے سنائی جاتی ہیں اور جو کسی امر کی بھی تشریح نہیں کرتیں۔ ماہنامہ وجی ص ۱۹

اکبر و اصغر اور طارق و جوزا نامی ستاروں کا منظر ملاحظہ کیجئے:

مچی ہے چار طرف دھوم دہن لیلا کی
کہ جھاگ کھیلتی ہیں گرد بیاباں کنہیا کی

• • •

اڑن کھٹولوں پہ جس طرح اپسرائیں ہوں
سنہرے شانوں پہ اڑتی ہوئی گھٹائیں ہوں

—— زنجیر رم آہو، ص ۲۰۹-۲۱۰

تاہم بعض جگہ خالد دیو مالا سے تشبیہی استعمال کی دھن میں غیر موزوں انداز بھی اختیار کر جاتا ہے۔ وہ ایسا طرزِ تشبیہ اپناتا ہے جو منطقی ہے جو ڈرامائی ہوتا ہے مثلاً ایک نظم اختر شناس میں ایک جگہ ستاروں کے جھلملانے کا منظر بیان کرتے ہوئے ستاروں کے آسمان کے پہلو میں جگمگانے کو راون و سیتا سے تشبیہ دیتا ہے جو بالکل نہیں جچتی۔ علاوہ ازیں چار پانچ مصرعوں پر مشتمل اس منظر کا کوئی مجموعی تاثر نہیں بن پاتا:

ہیں تارے اس طرح آئینہ بند چرخ بریں
کہ جیسے زلف دراز خوشبو صبا کے دامن میں
کہ جیسے بیتے پراگندہ گھر کے دامن میں
کہ جیسے غمزدہ سیتا، کسنا دراون میں

زنجیر رم آہو، ص: ۲۰۸

تاہم مجموعی حیثیت سے خالد نے دیو مالا کو اپنے فن کی تخلیق و تہذیب کے لئے مشاطہ کے طور پر برتا ہے اور وہ اس میں خاصا کامیاب رہا ہے۔

ابھی کچھ صفحات پہلے ذکر ہوا کہ یونانی دیو مالا کی جڑیں انسانیت میں بڑی قوت سے بڑی گہرائی تک پیوست ہیں۔ لیکن اس اہم حقیقت کے ذہن نشین کرنے کے لئے یونانی تمدن کا شرح و بسط سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ ایڈتھ ہیملٹن لکھتی ہے:

"لوگ عام طور پر معجزۂ یونان کی بات کرتے ہیں۔ اصطلاح درحقیقت عالم پیر کی اس نشاطِ ثانیہ کی مظہر ہے جو یونان کی بیداری کے باعث ممکن ہوئی۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ اولین عہد کے قدیم یونانی شعراء میں ایک نیا آدرش ابھرا جو اس سے قبل کبھی پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن یہ آدرش اس کے بعد کبھی معدوم نہ ہوا۔ یونان صحنِ دنیا میں آیا تو خود انسان کائنات کا مرکز بن گیا۔ یہ انسانی فکر میں ایک عظیم انقلاب تھا۔ یونان میں انسان نے سب سے پہلے محسوس کیا کہ انسان کیا ہے۔"

—— مائتھالوجی، ص ۱۴-۶

شاید اسی انسان نوازی ہی کا شاخسانہ ہے کہ یونانیوں نے اپنے دیوتا اپنی ہی صورت پر خلق کئے۔ اگرچہ "تراشیدم صنم بر صورتِ خویش" کے مزالوہی اور عبرانی وغیرہ دانی مفکرات سے انکار نہیں لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یونان میں یہ صورتِ حال گویا مذہبی ادبیات کی مظہر بھی تو یہی بات اس تشبیہی تصورِ ذاتِ باری کا ایک جواز بنتی ہے۔ جس جین ہیرلیسن کے بقول "ہر انسان اپنی آدمیت کے مزاج کے پیشِ نظر صورت گری کرتا ہے لیکن بعض لوگوں کے ذہن میں یہ صورت واضح اور صاف صورت میں موجود ہوتی ہے لیکن بعض دوسروں کے یہاں دھندلی، لڑکھڑاتی ہوئی اور بے جان سی۔ اس ذیل میں یونانی بہت عظیم صورت گر تھے ——— انتہائی بڑے صورت گر کہ ان کی مثال آج کے دور میں بھی نہیں ملتی اور شاید یہی باعث ہے کہ ان کی دیومالا آج کے دور میں بھی زندہ ہے۔"

یونانیوں سے اوّل کے صنم تراش اگرچہ اپنے زعم میں انسانی شکل ہی کے مانند اجسام تراشتے تھے لیکن یہ بے حد غیر انسانی ہوا کرتے تھے۔ مصری اور عراقی اصنام کا یہی حال تھا۔ ان کے مقابل یونانی بتوں کو رکھ کر جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ فطری اور حسن کے حامل یہ یونانی اجسام کس قدر زندگی سے معمور ہوتے ہیں۔

اہلِ یونان کے جمالیاتی "تشخص" کا اندازہ ہیگل کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے کہ مجرد اشیاء، محسوس اشیاء ہی کے ناظر میں جانی جا سکتی ہیں۔ یہ قول روحِ یونانی تھا۔ قدیم دنیا میں یونان ہی وہ ملک تھا جہاں لوگ اپنی خواہشات کی تسکین اپنے اردگرد کی اشیاء میں ڈھونڈتے تھے۔ سنگ تراش اکھاڑے میں پہلوانوں کو مقابلہ کرتے دیکھتا تو محسوس کرتا کہ ایک مضبوط، گٹھے ہوئے کسرتی جسم سے زیادہ جاذب اور کوئی چیز نہیں۔ اسی لیے وہ "اپالو" کو تراشتا تھا۔ یونانی فنکار اور شعراء کو مرد قامت اور مضبوط اجسام میں بے پناہ حُسن نظر آتا تھا۔ سو سرزمین پر بھی دیوتا بے حد دلکش اور خوبصورت تھے ——— حسین نوجوانوں اور دوشیزاؤں کے روپ میں وہ جنگلوں، دریاؤں اور سمندروں کے باسی تھے ——— سوہنی دھرتی اور چمکیلے پانیوں میں رہتے تھے۔ پس غالب ایسے شاعر زہرہ نگاہاں اور لوگا کے شائق کی یونانیوں سے مماثلت بے جواز نہیں۔

پھر یہ بھی کہ یونانی دینیات میں سحر اور ٹونے ٹوٹکے کا دخل بہت کم نظر آتا ہے۔ یہاں شیطانی جادوگر اور ڈھڈو جادوگرنیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ سرسی (خالد نے اس ساحرہ کا خروشِ خم میں بڑا خوبصورت علامتی استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص: ۸۹) اور میڈیا البتہ دو جادوگرنیاں ملتی ہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ یہ بھی حسین اور طرحدار ہیں کریہہ المنظر نہیں۔

ایک اور قابلِ غور امر یہ ہے کہ دیومالا خیر و شر کا تصادم بھی پیش کرتی ہے۔ شر کے نمائندہ عفریتوں کے بغیر ہیرو کے لیے یہ دنیا بیکار محض تھی۔

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

چنانچہ ہیرو ہمیشہ ان بلاؤں پر فتح پاتا ہے۔ وزیر آغا اس ضمن میں لکھتے ہیں:

در اصل اساطیر کا انسانی ہیرو اپالو دیوتا کی طرح ہے۔ اور اس کے مقابلے میں آنے والا بنیادی طور پر پائی تھون ہے۔ ہیرو جب پائی تھون سے برسرِپیکار ہوتا ہے تو نیکی اور بدی (اہرمزا اور اہرمن) کی ازلی و ابدی جنگ کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اور پھر اس جنگ کی آگ سے پوتر ہو کر باہر آجاتا ہے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ اسطور انسان کی داخلی جنگ ہی کا خارجی مظہر ہے۔ اصل ڈراما تو انسان کی ذات کے اندر کھیلا جاتا ہے[1]۔"

—— تخلیقی عمل ص ۹۹ — ۱۰۰

نیکی، بدی اور خیر و شر کا تصادم اپالو اور پائی تھون کے مابین ہی نہیں زالئس اور دوسرے گناہ کے مرتکب افراد کے درمیان بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ زالئس کا معیار خیر و شر اتنا ارفع نہیں اور اس کا اطلاق خود اس کی ذات پر نہیں ہوتا۔ تاہم وہ دروغ گو، عہد شکن اور مُردوں کے ساتھ بد سلوکی کے مرتکب افراد کو سزا دیتا ہے۔

آئیے اب لگے ہاتھوں یہاں خالد کے دیومالائی ماخذات کا جائزہ بھی لیتے چلیں۔ وہ عظیم قلمکار جن کے ذریعے دیومالا خالد اور ہم تک پہنچی ہے، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ہومر، ان تمام کا سرخیل ہے، جس کی تصانیف کا تفصیلی جائزہ پیچھے لیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد ہسیود کی تھیوگنی مکمل طور پر ذینیات سے بحث کرتی ہے۔ تھیوگنی تخلیقِ کائنات اور دیوتاؤں سے متعلق تفصیلات کی ذیل میں بے حد اہم ہے۔ اس کے بعد پنڈار (PINDAR) کا نام آتا ہے۔ جو قومی تہواروں کے موقعوں پر کھیلے جانے والے کھیلوں کے بیان کے ساتھ ساتھ دیومالائی حوالے بھی دیتا جاتا ہے۔

پنڈار کے ہم عصر دوسرے المیہ نگار شعراء، سوفوکلیز اور یوری پڈیز کے ساتھ ساتھ ایسکی لس کا نام بڑا اہم ہے۔ یہ ڈراما نگار علم الاصنام کے سلسلے میں انتہائی ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ عظیم طربیہ نگار ارسٹوفینز بھی اکثر دیومالائی حوالے دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یورپ کے پہلے مؤرخ ہیروڈوٹس اور افلاطون فلسفی (تمثیل) کے یہاں بھی ایسے حوالے ملتے ہیں۔

تقریباً ۲۵۰ ق۔م کے اسکندری شعراء کے ہاں بھی دیومالا سے بحث ملتی ہے۔ لیکن ان کے یہاں ہسیود یا پنڈار کی سی گہرائی نہیں۔ مابعد کے مصنفین میں لوسین وغیرہ کو اہم مقام حاصل ہے۔

اووڈ منظومات و ذینیات کی انسائیکلوپیڈیا ہے اور خالد نے اس سے خوب خوب حوالے دیئے ہیں۔ اووڈ نے تقریباً تمام قصص بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ وہ اکثر کہانیوں کو نہایت عمدگی سے بیان کرتا ہے۔ لیکن بقول ایڈتھ اس کے ہاتھوں میں یہ کہانیاں جو اموُ واقعی کی حیثیت رکھتی تھیں بازیچۂ اطفال بن گئیں، مزاحیہ بن کر آگئیں، اور اکثر و بیشتر جذباتیت اور لفاظی سے زیر بار۔

---

[1]: آہ یہ سادہ منش لوگ مگر پا نہ سکے،
کہ ان انوار میں ظلمت کی بھی آمیزش ہے
جن نگاہوں سے کہ تقدیس کی لو پھوٹی ہے
ان میں اہرمن و یزداں کی بھی آویزش ہے

—— زنجیرِ رم آہو، ص ۱۵۸

روسی مستقبل میں وردیل نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ وہ دیو مالا کا قائل نہیں تھا لیکن ان قصوں میں انسانی فطرت کے مظاہر اسے بھی نظر آتے تھے۔ چنانچہ یونانی المیہ نگاروں کے بعد تنہا وہ شخص ہے جس نے ان دیو مالائی کرداروں کو حیات نو بخشی۔

اور اب آخر میں آؤٹ لائن آف لٹریچر سے چند سطور نقل کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ یہ سطور دیو مالا کی اہمیت اور اس کے دور رس اثرات کی مظہر ہیں۔

" دیو مالا والدین کے لہو کے مانند تمام تر دنیا ادب میں سرایت کر چکی ہے ـــــ ادب جس میں دیو مالا آج بھی شیریں ترین اور نہایت مستقل حیثیت کی حامل ہے ـــــ دیو مالا نے اپنے اندر لاتعداد عہد سمیٹ رکھے ہیں۔ اسے ادب وفن کی اوزون (آکسیجن کی مخصوص شکل) کہا جا سکتا ہے۔ حروف ابجد کا جو تعلق لفظوں سے یا لفظوں کا جو ناطہ اظہار فکر کی زبانی یا تحریری جہتوں سے ہے ویسا ہی تعلق دیو مالا کو شاعری سے ہے۔ اور خالد بھی تو اول تا آخر شاعر ہی تو ہے۔

؎ میں فقط شاعر ہوں!

زرخیز دھرتی کی دیویوں نے صرف ہیوز ہی کو عزت نہیں دی، آج کے عظیم شاعر خالد کو بھی اعزاز بخشا ہے۔

دن چڑھے میرے گھر آ کے کہنے لگے
سب سے چھوٹا کمرہ بس ہم لیں گے یہاں
اس کے بدلے ساتھ دیں گے اے مہربان
تیری بھگتی میں تیری پوجا پاٹ میں
اس کی کرپا سے ملے گا جو بھی ہمیں
عاجزانہ ہم اسے کر لیں گے قبول!

جم گئے وہ ایک کونے میں بعد ازیں
صورتیں معصوم شکلیں مسکین تھیں
رات کے تاریک پردے میں بوالفضول
بے وضو درّانہ معبد میں گھس گئے
جو چڑھاوے بھی چڑھے تھے اتھار پر
ظالموں نے اپنے قبضے میں کر لئے

قربان گاہ ALTAR ـــ ۵

قیصرہ خانم

عبدالعزیز خالد کی شاعری

ترکِ مئے ممکن ہے ترکِ عشق بھی
شاعری لیکن ہے میری زندگی

عبدالعزیز خالد نہایت وسیع القلب، وسیع النظر اور صاف گو قسم کے آدمی ہیں۔ ایک شاعر، ایک ادیب اور ایک انسان کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند ہے۔ خالد کی شاعری یا ان کے فن کو سمجھنا اور اس کا تنقیدی جائزہ لینا خاصا مشکل کام ہے۔ اس کی بنیادی وجہ خالد کی مشکل پسندی کے علاوہ خالد کی طبیعت کا تنوع ہے۔ انہوں نے شاعری کی کسی ایک صنف میں طبع آزمائی کی ہوتی تو شاید اتنی مشکل پیدا نہ ہوتی لیکن خالد کی یہی انفرادیت اور خصوصیت ہے کہ انہوں نے خود کو محدود نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فن مختلف رنگوں سے بھرا ہوا ہے اور اس کے ہر رنگ میں قوس و قزح سے زیادہ کشش اور جاذبیت موجود ہے۔ اس میں سنجیدگی اور متانت کے علاوہ شگفتگی، دلآویزی اور علم کی گہرائی بدرجہ اتم موجود ہے۔

خالد کے نظامِ فکر میں صرف ان کی اپنی ذات، شخصیت یا تخلیقی جبلت ہی کارفرما نہیں بلکہ ان کے نظامِ فکر کی جڑیں ان کے اپنے ہمعصر علم و ادب کے علاوہ کلاسیکی ادب میں بھی دور تک پہنچی ہوئی ہیں۔ خالد محض عظمتِ رفتہ ہی کے شاعر نہیں بلکہ وہ حال اور مستقبل کی صداقتوں کے نقیب بھی ہیں۔ اس کے کلام میں شعوری اور لاشعوری کشمکش نہیں ملتی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ایک واضح نصب العین بھی موجود ہے۔ وہ محض زلف و رخسار کا ذکر کرنے کے بجائے لوگوں میں عقل و خرد اور شعور و ادراک کی دولت بانٹتے ہیں اور انہیں باشعور بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تنہا شاعر ہیں جنہوں نے اردو شعر میں ڈرامے کو نہایت سلیقے سے سمویا ان کی ڈرامائی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف کلاسیکی ادب کے تراجم پر اکتفا نہیں

کہا بلکہ بیشتر ان موضوعات پر اپنی تخلیقات کی بنیاد ہی استوار کیں۔ انہیں عام طور پر مشکل پسند شاعر تصور کیا جاتا ہے کیونکہ ان کے ہاں بہت سی زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں جو عام لوگوں کے لئے عام فہم نہیں ہیں اور جسے سمجھنے کے لئے مختلف زبانوں کا جاننا ضروری ہے۔ خالد کا ادبی نقطۂ نظر بڑا صحت مندانہ ہے۔ وہ انسان کو رجائیت اور عمل کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسان کی عظمت اور شکوہ کا عکس ہے یہ حقیقت ان کو اپنے کرداروں کے لئے پرشکوہ الفاظ تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ زندگی کو ایک ڈرامے کی شکل میں دیکھتے ہیں اور دنیا کو ایک سٹیج کی حیثیت سے۔ اسی لئے منظوم ڈرامہ انکی محبوب صنف ہے۔ ڈرامے کی طرح وہ نظمیں اور غزلیں بھی مخصوص انداز میں لکھتے ہیں۔ خالد کی شاعری فن اور شخصیت کا دلآویز امتزاج پیش کرتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے ہاں فن کا فروغ اور شخصیت کا ارتقاء ایکدوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلتے ہیں ہم ان کی ذات کی ایک ایک پرت سے کماحقہ آگاہ ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل روائتی غزل کی طرح ہمیں مختلف بلکہ متضاد سیرتوں کے افکار و جذبات کی عکاس بن کر بیک وقت کفر و ایمان، قنوطیت و رجائیت رندی و پرہیزگاری، ہوس و عشق، بداخلاقی و خوش اطواری، بے حمیتی و خودداری کی آماجگاہ دکھائی نہیں دیتی بلکہ اس میں ایک ایسی ہم آہنگیٔ فکر و جذبہ اور یگانگت احساس و نگاہ پائی جاتی ہے جو صرف اس ہستی کا طرۂ امتیاز ہوسکتی ہے جس نے اپنے آپ کو اوصافِ حمیدہ کا آئینہ دار بنانے کے لئے نظریاتی اور عملی ہر دو سطح پر شدید ریاض کیا ہو، کیونکہ اسے علم ہوتا ہے ؎

فیض فیاض ہے بقدرِ ریاض
شرحِ صدر ابتدائے عرفاں ہے

مجموعی طور پر خالد کی شاعری میں حکمت و ادراک اور شعور و عرفان کی بیشتر مثالیں موجود ہیں

شعر کیا حکمت و ادراک نہیں
کیا نہیں شعر شعور و عرفاں

عبدالعزیز خالد نے غزل میں نئی راہیں منتخب کی ہیں وہ روایات کا احترام ضرور کرتے ہیں۔ لیکن اس کے اسیر نہیں۔ انہیں اقبال کی طرح نئی نئی ترکیبات و تلمیحات وضع کرنے میں بہت لطف محسوس ہوتا ہے۔

کلیمی میں نہ ہو رنگِ خطا بہت
کہ ہے یہ سوزِ دل کا کھیل سارا

ہے جزوِ اعظم ایماں محبتِ انساں
نہیں ہے مردِ مسلماں کو شاید اسکی خبر

شاعری میں غزل کی صنف بہت ہی لطیف شئے ہے جو شاعر کی ذات کی مکمل عکاسی کرتی ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ غزل ذات کے اظہار کی مکمل آئینہ دار ہے۔ اظہارِ ذات کا تعلق براہِ راست ہمارے وجدان سے ہوتا ہے اور خالد کی غزل میں شاعرانہ تخیلی بصیرت اور بے تصنع و برجستہ وجدان کا اظہار موجود ہے۔ خالد کی شاعری اس لحاظ سے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے کہ ہماری شاعری کو تخیل اور احساس کے مخصوص دائروں سے نکال کر علم و فکر کی وسعتوں میں لے جانا چاہتی ہے اسی طرح خالد کی غزل بھی اگرچہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے غزل کے تسلیم شدہ ڈھانچے کے مطابق ہے لیکن اسکی معنویت اس کی انفرادیت کی عکاس ہے۔ غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

ہوا ہے کس کا جگر خوں بجھا ہے کس کا چراغ
شفق کی آگ میں شامل ہے کس کے دل کا دھواں

ہوا کے رس میں تجھے گھونٹ گھونٹ پیتا ہوں
گلِ بہار کی خوشبو میں سونگھتا ہوں تجھے

سحر کی پلکوں سے ڈھلتا ہے رات کا کاجل
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں ایک اک کر کے

میں مثل تاروں کے شب بھر سفر میں رہتا ہوں
میں منتظر ہوں مگر انتظار کس کا ہے

ایسے اترا کے نہ چل اے صنمِ حشر خرام
جسم پہ ناز نہ کر خاک میں مل جائے گا

اے دل کہاں ہیں تیری پرانی محبتیں
تھا حسنِ ظاہری پہ تو کتنا فریفتہ

برپا ہے اس میں فرض و محبت کی کشمکش
خالد کا دل ہے درد کی لذت سے آشنا

کون واقف تھا دلوں کے بھید سے
کشمکش نے راز افشا کر دیا

خالد کی غزل میں تغزل کے شاندار نمونے بھی ملتے ہیں

ازل کی صبح سے شام ابد تک
محبت داستاں در داستاں ہے
کوئی عالم ہیں از خود رفتگی کے
ہر اک عالم جہاں اندر جہاں ہے

خالد کی شاعری کا ایک اور امتیازی وصف اسکی بے پناہ غنائیت ہے۔ ان کا کلام پڑھتے ہوتے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ قدم قدم پر حرف و صوت کا جادو جگا رہے ہوں۔ خالدؔ عام طور پر اپنے جذبات و افکار کی ترسیل کے لئے اس قدر سبک لطیف و جمیل طریقہ اپناتے ہیں کہ ہمیں ایک مہذب اور شائستہ انسان کی آسودگی بخش سرگوشی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اکثر رمز و کنایہ کا سہارا لیکر اظہار کرتے ہیں۔

کہیں بدنام نہ ہو یار عزیز اس ڈر سے
شاعر ابہام و کنایہ میں کہے بات اپنی

البتہ بعض مقامات پہ وہ قصداً اس ڈھکے چھپے انداز کو خیرباد کہہ کر کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

بت شکن ہوں میں بت فروش نہیں
مجھے حکم شکست زنداں ہے

جو زباں پہ ہے وہی دل میں ہے

ہمیں آتی نہیں ظاہرداری !

یہ اتہام لگایا براہِ حسد
وگرنہ خالدِ خوددار میں غرور کہاں

روح ہے آزاد میری جسم گو پابند ہے
نام ہے خالد مرا، بندہ ہوں اپنے نام کا

یہ اشعار خالد کے بت شکن، راست گفتار، خوددار اور آزاد رو ہونے کا احساس بخوبی کرواتے ہیں۔ ان کے کلام کی ایک اہم نمایاں خوبی ان کا احساسِ تنہائی ہے مگر یہ احساسِ تنہائی بڑا تعمیری ہے جو انسان کو بتدریج قنوطی اور سنکی بنانے کی بجائے استقلالِ طبع عطا کرتا ہے۔

مضبوط پہاڑ سے زیادہ
وہ ایک چٹان کی طرح تھا

خالد کی بصیرتوں سے لبریز شاعری ان کے بیکراں مطالعہ کی بھی غماز ہے۔ انہوں نے دنیا بھر کے ادبیاتِ عالیہ کا مطالعہ کر رکھا ہے اور اس مطالعہ کی خوشبو ان کے کلام میں ہر جگہ اپنی رعنائی اور روشنی کا احساس دلاتی ہے۔ اس وسیع و عریض مطالعہ نے جہاں خالد کے شاعرانہ فکر و احساس کو مستند ملوثات سے مستفید کیا ہے۔ وہاں ان کے اندازِ بیان کو بھی بے مثال تنوع اور لاجواب پرکاری کا حامل بنا دیا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

وہ لوط کی بیوی ہو کہ یا نوح کا بیٹا
ہر شخص ادا کرتا ہے کفارۂ عصیاں !

یہ کارخانۂ دہر کا قائم ہے عدل و رحم پر
دیتے ہیں سب کو تول کر روزِ جزا سود و زیاں

مرتبہ شناسی اس کا مذہب ماسوا سے کیا غرض
کمبخت ابن الوقت ہوتا ہے مگر رطب اللساں

مٹی سے مصیبت کبھی اگتے نہیں دیکھی
سب نیک و بد دھرے اعمال کا ثمرہ :

سچ جھوٹ کی صورتیں ہیں یکساں
ہر شے کو منافقانہ پرکھو

یہ اشعار ایک ایسے شاعر کے نکرِ نظر کا اعجاز ہیں جو زندگی کے متنوع تجربات بے کراں مشاہدات اور لامتناہی مطالعات کا مالک ہے اور فن کے ایک ایسے مقامِ ارفع پر کھڑا ہے جہاں اسے فن کے اعتبار سے امام اور نکرِ نظر کے لحاظ سے عارف کہا جا سکتا ہے ۔

خالد مستند بصیرت کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند بصارت کا بھی مالک ہے ۔ جو لوگ خالد کی شاعری کو روکھی پھیکی شاعری سے تعبیر کرتے ہیں ان کے سامنے تخیل کی شادابی اور طراوت کا عملی اور ناقابلِ ستائش ثبوت پیش کیا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کیا جاتا ہے کہ یہ شادابی اور طراوت کسی ہوس کار کی تردامنی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ۔

خالد کی غزلیات کے مطالعہ کے دوران میں جو چیز قاری کو سب سے زیادہ اپنی طرف کھینچتی ہے وہ اس کا حسیاتی پہلو ہے ۔ بصارت اور سماعت کی حسوں سے وہ بالخصوص استفادہ کرتے ہیں ۔

کالی ساری میں لپک پنڈے کی
جیسے گھنگھور گھٹا میں بجلی
مدھ بھری نیند سے ماتی آنکھیں
جسم سے پُھوٹ رہی ہو جیسے
جیسے ہیں جزر و مد سمندر کا
سحرِ فرعون تیری آنکھوں میں
سنگِ مرمر کی طرح جلد بدن کی بے داغ
نقرئی طشت پہ سورج کی شعاعیں رقصاں
جھلمل جھلمل بدن کا سوتا
لہرائیں لٹیں کمر سے نیچے
اے چاند اگر تو اس کو دیکھے

کوٹھے پہ کبھی اکیلے سوتے
تیرے چہرے کا رنگ فق ہو
تو اپنی سب آن بان بھولے

گھنیرے کنج دھڑکتے دلوں کے راز سنیں
سکوتِ شب میں ہے آوازِ پا، لبِ گویا
یوں بلبلیں شاخوں پہ چہکتی ہیں کہ جیسے
پا زیب پہن کر بتِ سرمست غزل خواں
دلِ آشفتہ سودا بربط
نگۂ چشمِ خمار میں، مضراب
آگ بوسوں میں راگ لفظوں میں
تجھ میں آئی کہاں سے یہ قدرت
حسن انداز میں، سخن گو آنکھ
پیار کے لمس کا بدن پیاسا۔

حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جسم و روح کے سلسلے میں بڑا متوازن طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ طرزِ عمل اس ضابطۂ حیات کی دین ہے جو روح اور اس کے مسائل کو فوقیت دینے کے باوجود جسم کو تیاگ دینے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ اسکی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے مطالبات کی تکمیل کو لازمی قرار دیتا ہے تاکہ معاشرہ افراط و تفریط کا شکار نہ ہو جائے۔ عبدالعزیز خالدؔ نے روح کے تفوق پر اپنے ایمان اور لذتیت سے اپنی بیزاری کا اظہار اپنے ایک شعر میں بڑے واشگاف طریقے سے کیا ہے۔

بن ترجماں تو بنی آدم کی روح کا
لذت کا جو شکار ہو بے کار وہ ہنر

ان تمام خصوصیات کے علاوہ خالد کا اہم اور اعلیٰ کارنامہ ان کی لغت گوئی کا منفرد اور خوبصورت انداز ہے۔ کلامِ پاک کی آیات کو جس خوبی سے خالد صاحب نے سمویا ہے اور تضمین کی ہے اس کا جواب نہیں۔ خالدؔ کو اسلام اور نبی کریمؐ سے بے پناہ عشق ہے اور اس کے اظہار کیلئے انھوں نے اکثر عشق کی زبان عربی کو اپنایا ہے۔ عبدالعزیز خالدؔ کی شاعری کا بیشتر حصہ عربی سے مزین ہے کہ وہ اس کے مزاج اسکی وسعت بلکہ اس کی لذت سے آشنا ہیں۔

خالدؔ کو عربی، اردو، فارسی، سنسکرت، ہندی، عبرانی، یونانی، انگریزی، پنجابی اور پشتو پر عبور حاصل ہے

اور آج کل کشمیری، بلوچی اور سرائیکی کو بھی بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اپنی شاعری میں جگہ دے رہے ہیں۔ "منار تقلیط" آپ کی عظیم تخلیقی نظم ہے جو تیرہ سو چوراسی اشعار کی نعت مسلسل ہے جس میں رسول پاکؐ کی سیرت سے لیکر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت تک کے اہم حالات و واقعات کو مستند کوائف کے ذریعہ نہایت عقیدت و احترام کیساتھ پیش کیا گیا ہے اور اس پر بھی شاعر کے عجز و انکسار کا یہ عالم ہے

کہاں نعت و نامِ رسولِ تہامیؐ
کہاں وہ زبان جو کہ لکنت زدہ ہے

نعت گوئی نہایت مشکل فن اور مرحلہ ہے۔ حضور صلعم کے وقار و احترام کو ملحوظ رکھنا کوئی آسان بات نہیں لیکن "منار تقلیط" جیسی طویل نعت سے بھی ان کا جذبۂ عقیدت و شیفتگی تشنۂ کام رہا اور انھوں نے "منحمنا" کے نام سے چار سو چوالیس اشعار کی ایک اور نعت مسلسل کہہ ڈالی۔ اس میں قرآن و احادیث اور تاریخی تلمیحات جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ اندازِ بیان میں روانی اور لہجے کی گرمی قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔

وہ عبدہٗ وہ رسولہٗ وہ اسمہٗ احمدؐ
کتاب و حکم و نبوت کا خاتم و قائمؐ
حمودٌ و حامدٌ و احمدٌ محمدٌ و محمودٌ
کریم و میر کرام و مکرم و اکرم

خالد بنیادی طور پر اسلامی روح کے شاعر ہیں۔ نظموں کے علاوہ اس کی غزلوں میں بھی حمد و نعت کیساتھ اسلامی فکر کی مثالیں ملتی ہیں۔

امام و نور و ہدایت ہے ذکر و رحمت ہے
دمِ طلوع تلاوت سے دل کو تازہ کروں

پچھلے پہر اٹھ کے کرے سرگوشیاں رب سے
خالد جو نظر آتا ہے کچھ اس سے سوا ہے

نامِ احمدؐ پہ فدا ہے خالد
کر گیا نام یہ بے نام و نشان

"ذوالجلال" عبدالعزیز خالد کی پہلی تصنیف تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے ان کی "سرودِ رفتہ"، "غزل الغزلات"، "دکان شیشہ گر"، "برگِ خزاں"، "ورق ناخواندہ"، "گل نغمہ"، "زنجیر رم آہو"، "کلاک موج"، "ماتم یک شہر آرزو"، "کفِ دریا"، "پرواز عقاب"، "رخ وشِ تم" وغیرہ بائیس کتابیں شائع ہوئیں۔ جو ان کے منفرد اسلوب اور منفرد شاعرانہ مزاج کو پیش کرتی ہیں۔ ان کے منظوم تراجم، غزلیں، نظمیں، گراں مایہ نعتیں ہمارا ادبی سرمایہ ہیں اور انھوں نے جو تخلیقات پیش کی ہیں انھیں ہم دنیا کے کسی بھی ادب کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کیلئے جس تندہی اور دیانت سے کام لیا ہے اسکی مثال نہیں ملتی۔ ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ شاعری کا جنجال بن کر میری صحت تباہ کر رہی ہے پھر بھی میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں شاعری ترک نہیں کر سکتا۔!!

عبدالشکر چغتائی

سہل گو اور مشکل گو شاعر

پورے نو عبدالعزیز خالد کی شخصیت حلقۂ ادب میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ لوگ انہیں شاعرِ اعظم کے نام سے جانتے اور مانتے ہیں لیکن میں اُن کا تعارف جس زاویے سے کرانا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے انداز سے ایک الگ پہلو ہے۔ دُنیا انہیں شاعروں کی پہلی صف میں رکھتی ہے۔ لیکن شاعر ہونے کے ساتھ وہ ایک بہت بڑے عالم بھی ہیں۔ ایک ہی آدمی میں بہت سی انواع کا جمع ہونا ایک معجزہ ہے۔ اگر آپ خالد صاحب کی تعلیم پر نظر ڈالیں تو وہ ادب سے بالکل مختلف ہے۔ اگر ان کی سروس دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے پیشے کا ادب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ کہاں انکم ٹیکس اور کہاں شاعری۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرتی طور پر وہ نابغۂ روزگار ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں یہ ملکہ بچپن سے عطا کیا ہے۔ ایک ملاقات پر انہوں نے خود فرمایا کہ "میرا پیشہ تو روزی کا ایک ذریعہ ہے۔ میرا کام پڑھنا اور لکھنا ہے" وہ صرف عظیم شاعر ہی نہیں، کئی زبانوں کے ماہر بھی ہیں۔ انہیں ان سب زبانوں پر مکمل اختیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مختلف زبانوں کے لفظ ملتے ہیں۔ جنہیں عام آدمی کے لئے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ خالد مشکل گو شاعر ہیں۔ اصل میں خالد کو سمجھنے کے لئے خالد جیسی علمیت بھی چاہیے۔

خالد کو مشکل گو ہونے کے ساتھ ساتھ سہل گو شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ان کے کلام کے اُس حصے کی وجہ سے ہے جو عام آدمی کی سمجھ میں جلدی آجاتا ہے۔ گویا ایک ہی شخصیت میں دو مختلف پہلوؤں کا یکجا ہونا ایک بڑی بات ہے۔

عبدالعزیز خالد شاعر ہونے کی وجہ سے نہایت حساس دل رکھتے ہیں۔ شاعر کی قوتِ مشاہدہ ایک ہی ساعت میں سات آسمان پار کر لیتی ہے۔ شاعر کا ہاتھ معاشرے کی نبض پر ہوتا ہے۔ ایک عظیم شاعر کا کلام قوم کے مُردہ ڈھانچے میں روح پھونک سکتا ہے۔ یہ خوبی خالد میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نحر و غم خُم میں ڈھلتے ہیں۔

حبُ الوطنی کا حق ، بڑھ چڑھ کے ادا کردو
جاں دادۂ جاناں ہو ، جاں نذرِ وفا کردو

خالد نے زندگی کے ہر شعبے کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے ۔ ایسا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے ۔ وہ عاشقِ رسول ہیں ۔ حضرت محمدؐ کی شان میں لکھنے کا حق انہوں نے ادا کر دیا ہے ۔ اُن کے دل میں قوم کا درد ہے ۔ قومی ، ملی نظمیں ، کہ کر انہوں نے مردہ قوم کو غفلت کی نیند سے جگانے کی کوشش کی ہے ۔ انہوں نے قدیم یونان ، روم کے قصّوں کو اپنے نوکِ قلم کی زینت بنایا ہے ۔ دیوتاؤں کی کہانیوں کو بڑے ہی پیارے انداز سے پیش کیا ہے ۔ تاریخی واقعات ہوں یا جدید حالات خالد نے انہیں بہترین انداز میں بیان کیا ہے ۔ اُن کے کلام میں غزلیات کا حصّہ بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے ۔ فرماتے ہیں ؎

اُسے چوما کتاب کی مانند
پیار میں احترام شامل تھا

یہ وہ مختلف زاویے ہیں ۔ جن سے خالد کی شخصیت کو پرکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے کلام میں انوکھے پہلوؤں کا اکٹھا ہونا اُن کی عظمت کی دلیل ہے ۔

نرالا آہنگ اور چھوتا اسلوب عبدالعزیز خالد کی شاعری کی خصوصیات میں سے ہیں ۔ ان کے کلام میں عربی فارسی اور ہندی الفاظ اور تلمیحات کی پیوند کاری اس قدر نمایاں ہے کہ ابتداء میں بہت کم لوگوں نے ان کی ادبی حیثیت کو درخورِ اعتنا سمجھا ۔ عام تاثر یہ تھا کہ ان کے کلام میں جذبہ کار جاذکم اور لفظی رعب داب زیادہ ہے ۔ لیکن جب ان کا اسلوب کھل کر سامنے آیا تو وہ لوگ بھی جو شروع میں ان کے اسلوب پر چونکے تھے اُن سے متاثر ہونے لگے ۔ معروف ادیب و نقاد کامل القادری نے اس کتاب میں خالد کی شخصیت اور فن پر اس تفصیل سے لکھا ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا ۔ کامل کا اندازِ نگارش بہت دل کش ہے ۔ اُنہوں نے قارئین کو خالد کے حالاتِ زندگی سے روشناس کرنے کے علاوہ ان کے فنی محاسن سے متعارف کرانے کے لئے جو اسلوبِ تحریر اختیار کیا ہے ۔ وہ اس امر کا شاہد ہے کہ خالد ایسے قادر الکلام شاعر کے فن کو موضوعِ بحث بنانے کے لئے نقاد بھی کامل القادری جیسا ادیب ہی ہونا چاہیے ۔

اسلم کاشمیری

خیالات

احمد ندیم قاسمی

کرشن موہن

ڈاکٹر قمر رئیس

ڈاکٹر زرینہ ثانی

مشفق خواجہ

ابو سلمان شاہجہان پوری

وفا راشدی

راسخ عرفانی

رفیع اللہ شہاب

ایف ایم سالک

اے کیو فردوسی

زبیدہ زیب

تشنہ عالمتاب

سلطان سبحانی

خورشید احمد افروز

خیالات

احمد ندیم قاسمی (لاہور)

ماہنامہ "تحریریں" نے "عبدالعزیز خالد نمبر" نکال کر اس حقیقت کا اعتراف و اعلان کیا ہے کہ بعض شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی ہمہ جہتی اور ہمہ رنگی کو محض ایک نمبر میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔ لاہور کا ایک ماہنامہ "سیارہ" اس سے پہلے ایک ضخیم خالد نمبر نکال چکا ہے مگر خالد صاحب کی شاعری اور شخصیت میں اتنا تنوع ہے کہ "تحریریں" کی طرف سے ایک اور "خالد نمبر" کی اشاعت کا جواز بہر حال موجود تھا اور اس رسالے کے مرتبین نے اس جواز کو عملاً ثابت کر دکھایا ہے۔

عبدالعزیز خالد اردو شاعری میں اس لحاظ سے ایک نئی آواز ہیں کہ انہوں نے نئی لسانی تشکیل کے پردے میں مروجہ الفاظ اور ان کے مروجہ مفاہیم کی من مانی توڑ پھوڑ کی بجائے اردو میں ہندی، پنجابی، فارسی، عربی بلکہ عبرانی تک کے الفاظ کچھ اس طرح رائج کئے ہیں کہ ان الفاظ کو فرداً فرداً دیکھیے تو اجنبی اور اردو کے لئے ناقابلِ برداشت معلوم ہوں گے، مگر انہیں خالد کے اشعار کی لڑی میں پرویا ہوا دیکھیے تو وہ اس زبان کا حصہ معلوم ہوتے ہیں اور ان کی اجنبیت صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ وہ پہلی بار استعمال ہوئے ہیں۔ اردو زبان میں نئے الفاظ، اور ان کی مدد سے نئے مفاہیم، اور ان کی مدد سے خیالات و احساسات کی نئی نئی پرتوں کے اظہار کے لئے جو متعدد سہولتیں عبدالعزیز خالد نے فراہم کی ہیں، وہ انہی کا حصہ ہیں کہ بہت کم شعراء ایسے ہیں جنہوں نے مختلف زبانوں کا مطالعہ اتنی لگن سے کیا ہو اور ساتھ ہی اس مقصد سے بھی کیا ہو کہ مروجہ الفاظ و تراکیب کو بدشکل بنانے کی بجائے اردو کے دامن کو نئے سے نئے الفاظ سے مالا مال کر دیا جائے۔ اردو شاعری کی ڈکشن میں واضح اور قابلِ لحاظ اضافے سب سے پہلے مرزا غالب نے اور ان کے بعد علامہ اقبالؒ نے کئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اردو کو بڑے بڑے شاعر نصیب ہوئے ہیں مگر سبھی نے اردو شاعری کی مروجہ ڈکشن یا زیادہ سے زیادہ حافظؒ و سعدیؒ کی فارسی شاعری سے کسبِ فیض کیا ہے۔ اس دور میں یہ اعزاز و امتیاز عبدالعزیز خالد کے حصے میں آیا ہے کہ انہوں نے مشکل گوئی کے طعنوں سے بے نیاز ہو کر اردو شاعری میں مزید نئے الفاظ کے خزانوں کے در کھول دیئے ہیں۔ وہ ان الفاظ کو شاعری میں سلیقے کے ساتھ استعمال کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں مگر اب ان کے بھرپور استعمال کا فرض ان جدید نظم گو شعراء کا ہے جنہیں اردو زبان جذبہ و احساس کے اظہار کے لئے ناکافی معلوم ہوتی ہے اور وہ رائج الفاظ سے ہمہ وقت برسرِ پیکار رہتے ہیں اور یوں شاعری کم کرتے ہیں اور شاعری کے ساتھ

اق۔ یا۔ ہ کرتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کی ایک درخشندہ خصوصیت نے مجھے ہمیشہ بے حد متاثر کیا ہے بلکہ یہ تاثر بعض صورتوں میں تحسین سے ... تی بدل جاتا ہے۔ یہ فن کے ساتھ ان کی بے پناہ اور بے کنار ... لیکن اس خصوصیت ... اور بھی قابل تحسین ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی بھی بہت باقاعدگی اور قابلیت سے ادا کرتے ہیں ... کہ بعد ان کے پیش نظر صرف مطالعہ ہوتا ہے یا تخلیق۔ ساری بات ایک خاص طرح کے مزاج کی ہے مگر حیرت ہوتی ہے ... کے مزاج کا آدمی ہمارے درمیان اس شان سے موجود ہے کہ اس کی سرگرمی اور لگن کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ... کی شخصیت کے بارے میں نمبر نکالنا اور اس کے ساتھ انصاف کرنا نہایت دشوار کام ہے مگر ماہنامہ "تحریریں" کے ادارے نے ... کر دکھایا ہے۔ اگر اس نمبر کو معنوی لحاظ سے اور خوبصورت بنایا جا سکتا تو یہ نمبر ... اگرچہ اردو رسائل کے وسائل سے ہم سب بہت ... آگاہ ہیں اس لئے ادارہ ... تشکر کرنا ہے جو معلوم ہوتا ہے "تحریریں" نے زندہ اہل قلم کی قدر افزائی کی روایت کو ... آگے بڑھایا ہے جس کے لئے اس رسالے کے مرتبین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ش موہن (نئی دہلی)

"تحریریں" کا عبدالعزیز خالد نمبر ملا تھا۔ یاد آوری کے لئے شکریہ۔ بہت اچھا نمبر ہے۔ اکثر مضامین پڑھ چکا ہوں۔ خالد کی ... ت و ندرت کا تو میں رسیا ہوں ہی۔

سٹر قمر رئیس (دہلی)

خالد نمبر کے دو پرچے اور آپ کا نوازش نامہ ملا۔ اس نوازش کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ ابھی صرف چند مضامین پڑھ سکا ہوں۔ یہ پچھے تو جان بوجھ کر پڑھنے سے گریز کر رہا ہوں۔ اس اندیشہ سے کہ اگر یہ سرمایہ جلدی ختم ہو گیا تو پھر کیا کروں گا۔ عبدالعزیز خالد ... ے چند محبوب شعراء میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے موضوعات، لفظیات، ضمیات اور فکر و تخیل کے جیسے جرأت مندانہ تجربے کئے ... ڈہ کبھی اور سے نہ ہو سکا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا کلام کہیں کہیں الفاظ اور علوم سے بوجھل نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ان کی طویل ڈرامائی ... رں کو نکال دیجئے تو ہم جدید اردو شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے مقابل رکھتے ہوئے اگر شرمائیں گے نہیں تو جھجکیں گے ضرور۔

لٹر زرینہ ثانی (ناگپور)

"تحریریں" موصول ہوا۔ بے حد شکریہ، امتحانی مصروفیات اس قدر تھیں کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے بعد تھکن۔ بعدہٗ ... یریں کا بغور مطالعہ کیا۔ اور خالد صاحب کی شاعری کے لئے عقیدت بڑھتی گئی۔ میرا گمان تھا کہ الفاظ کی قادر الکلامی کے سلسلے میں جوش ... ی نہیں۔ لیکن اب مجھے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ اگر خالد صاحب کے دیار میں ہوتی تو ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عقیدت کا اظہار کرتی اور ان سے براہ راست مستفیض ہوتی۔

شفق خواجہ (کراچی)

خالد نمبر سے آپ کے سلیقے اور نفاست کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ "سیارہ" کے خالد نمبر کے بعد اس موضوع ... کام کرنے کی گنجائش نہ ہو گی۔ لیکن اس نمبر کو دیکھ کر آپ کی داد دینی پڑتی ہے کہ آپ نے تفہیم خالد کے بہت سے نئے پہلو پیش

کئے ہیں۔ خالد صاحب اچھے شاعر بھی ہیں اور اچھے انسان بھی۔ ایسے شخص کی خوبیوں کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔

ابوسلمان شاہجہان پوری (کراچی)

عبدالعزیز خالد نمبر ملا۔ طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ توقع کے عین مطابق اور ہر لحاظ سے قابلِ قدر و وقیع۔ موضوع کی اہمیت، جامعیت، مضامین کے ادبی و تنقیدی معیار، مواد کے حسنِ ترتیب و تہذیب۔ موضوع علیہ کے شاعرانہ مقام، ادبی اور شخصیت شان کے شایان اور مطالعے کی افادیت کا حامل ہے۔ مبارکباد قبول کیجئے۔

وفا راشدی (کراچی)

ماہنامہ "تحریریں" کا دلکش و دلنواز عبدالعزیز خالد نمبر ملا۔ اس نوازشِ بیکراں کے لئے میں آپ کا ممنونِ احسان ہوں۔ میں نے نہایت انہماک سے اس خصوصی شمارے کا مطالعہ کیا ہے۔ عصرِ حاضر کے ایک منفرد اور عظیم المرتبت شاعر کی خدمت میں جس اخلاص اور عقیدت و ارادت سے خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اس کی مثال اس خود شناس و خود سر زمانے میں بمشکل ملے گی۔ میں نے اپنے مضمون میں عبدالعزیز خالد کے فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے یہ پیش گوئی کی تھی کہ آج خالد کی شاعری پر مشکل پسندی اور عربی الفاظ و تراکیب کے استعمال سے شعریت کو مجروح کرنے کا الزام لگایا جا رہا ہے لیکن وہ وقت جلد آئے گا جب خالد کے کمالِ فن کا اعتراف کیا جائے گا۔ بقول مرزا غالب ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

"تحریریں" کا خالد نمبر دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ کل تک جو لوگ عظمتِ خالد کے منکر تھے آج وہ عظمتِ فنِ خالد کے معترف ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ خالد کے عروجِ فن، انسان دوستی، اخلاص اور شرافت کا کرشمہ ہے۔ شرافت کے بغیر کمال اور کمال کے بغیر شرافت ایسی ہی ہے جیسے خوشبو کے بغیر پھول۔ پھول کی رنگت و رعنائی نظروں کو کھینچتی ہے۔ لیکن اس کی خوشبو روح تک اُتر جاتی ہے۔

ہر مکتبۂ فکر اور مدرسۂ خیال کے دانشور، فنکار، مصنف، مفکر اور اربابِ علم و کمال عبدالعزیز خالد کی اس محفلِ رنگ و بو میں نہایت فراخدلی اور وسیع القلبی سے شریک ہیں۔ نئی اور پرانی نسل کے نمائندوں نے اعترافِ عظمت و کمال کے پھول نچھاور کئے ہیں۔ سچ ہے خلوص و محنت کی بنیاد پر عظمت کا جو مینار تعمیر ہوتا ہے اس کی روشنی دور دور تک آنکھوں کو چکا چوند کئے دیتی ہے۔

نگارشاتِ خالد کی شمولیت نے خود ان کے قلم سے ان کی شخصیت اور فن کے بعض پہلوؤں کو مؤثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔

پروفیسر حفیظ صدیقی اور زاہدہ صدیقی کی فکر انگیز کاوش ہے اس خصوصی اشاعت کو جو حسن ملا ہے وہ بھی بڑا دلآویز و نظر افروز ہے۔ بہر کیف اس نمبر نے ایک ادبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس خوبصورت اور فکر انگیز خصوصی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

راسخ عرفانی (گوجرانوالہ)

آپ نے جس تحقیق و تجسس سے یہ پرچہ مرتب کیا ہے۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اُمید ہے یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

رفیع اللہ شہاب (گوجرخان)

ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے میری پہلی نظر کسی تصنیف کی خامیوں پر پڑتی ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ

آپ کے اس سرمایہ میں کوئی خامی نظر نہ آئی۔

ایف۔ ایم۔ ساقی (رائچور)

اس شمارے جریدۂ گوہر بار کا عبدالعزیز خالد نمبر بھی ملا۔ ماشاء اللہ خوب ہے۔ ابھی جستہ جستہ دیکھا ہے اور محسوس ہوا کہ خالد صاحب کی تو ضیح کو مختلف فنکاروں کے خامہ گوہر نگار نے دلنشیں قسم کا گوشہ گنارسی لگا دیا ہے۔ بہر حال تمام تحریریں فکر انگیز اور معلومات افزا دکھتی ہیں۔

اے۔ کیو۔ فردوسی (حیدرآباد)

"عبدالعزیز خالد نمبر" ارسال فرمایا۔ بہت لطف آیا۔ یہ نمبر اپنے موضوع پر ایک مستقل اہمیت کی دستاویز ہے اور اس نے جس قدر بھی سراہا جائے کم ہے۔ مضامین نظم و نثر کا انتخاب بھی خوب ہے اور انہیں پیش کرنے کا انداز بھی ——— اس نمبر کا مرحلہ عبدالعزیز خالد جیسے اہم شاعر کے فکر و فن کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے ——— امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

زبیدہ زیب (واہ کینٹ)

ضخیم اور خوبصورت عبدالعزیز خالد نمبر زیر مطالعہ ہے۔ مضامین بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں اور انہیں نہایت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ مضامین اور نظموں کے سوا دبے شمار لکھنے والوں کے تاثرات عبدالعزیز خالد کی خود نوشت روداد اور ان کے انٹرویو شامل ہو جانے سے نمبر کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس خاص شمارے پر جس قدر محنت کی گئی ہے اسے ایک نظر دیکھنے ہی سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

نشمہ عالمتاب (کراچی)

"تحریریں" کا عبدالعزیز خالد نمبر موصول ہوا۔ یاد رکھنے کا شکریہ۔ خالد نمبر آپ کی جانفشانی، لگن اور ادب دوستی کی زندہ مثال ہے آپ کا یہ کارنامہ قابلِ تحسین ہے۔ امید ہے آپ اسی طرح زندہ ادیبوں کے نمبر نکال کر انہیں زندۂ جاوید بناتے رہیں گے خالد اس عہد کی اردو ادب میں ایک عہد ساز شخصیت ہیں اور انہوں نے اردو ادب کو جس طرح آراستہ کیا ہے وہ واقعی اس کے لئے ہر پذیرائی کے قابل ہیں ..... "تحریریں" خدا کرے روز افزوں ترقی کرے اور نشانِ منزل بن جائے ان لوگوں کے لئے جو راہ میں ہیں اور منزل کے لئے سرگرداں ہیں۔

سلطان سبحانی (مالیگاؤں)

"عبدالعزیز خالد نمبر" مل چکا ہے۔ یقیناً نہایت اہم اور مثالی ہے

خورشید احمد افروز (حیدرآباد)

عبدالعزیز خالد نمبر نظر سے گزرا۔ ماشاء اللہ خوب اور مرتب طور پر شائع ہوا ہے۔ آپ کی کوششوں کی داد دینا پڑتی ہے، مستحسن طریقے سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ اس قدر کم وقت میں ایسا شاندار نمبر نکال کر آپ نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میری جانب سے اس شاندار اور کامیاب نمبر کے لئے مبارکباد قبول فرمائیے خدا آپ کو توفیق دے کہ آپ اسی طرح ادب کی خدمت میں کوشاں رہیں اور "تحریریں" دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کے مراحل طے کرے۔ آمین! ثم آمین۔

بنامِ خالد

علامہ عبدالعزیز یمین
ڈاکٹر سید عبداللہ
ابن انشاء
حکیم محمد سعید دہلوی
آغا صادق
محمد طفیل
مولانا رازق الخیری
ناصر کاظمی
جمیل الدین عالی
جمیل جالبی
مولانا ماہر القادری
مرزا ظفر الحسن
اختر انصاری اکبرآبادی
مولانا اسد القادری
مولانا سعید احمد اکبرآبادی
نعیم صدیقی
ڈاکٹر ناظر حسین زیدی
ڈاکٹر ابوالخیر کشفی
کامل القادری
کبیر انور جعفری
منیر نیازی
قمر ہاشمی
حافظ لدھیانوی
خلیل الرحمٰن اعظمی
رضیہ فصیح احمد
ارشاد احمد حقانی

غلام جیلانی اصغر
محمد سلیم فاروقی
آفتاب احمد قرشی
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
محمد علی صدیقی
قمر جمیل
رحمت علی نازش
عبدالباقی
کالی داس گپتا رضا
عبدالعزیز کمال
سلمان الارشد
باقر مہدی
ابن فرید
شمس احسان قادر
ریاض حسین چوہدری
سلطان رشک
نعمت مولانی
راحت افزا بخاری
غلام غوث
عبدالسمیع
سلیم یزدانی
غلام حیدر مرزا
سید نور محمد قادری
منشی شیر محمد
مختار علی رحمانی

بنامِ خالد

ڈاکٹر سید عبداللہ

اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ
لاہور
یکم مارچ ۱۹۷۴ء

مکرم و محترم خالد صاحب
السلام علیکم

ہماری خواہش ہے کہ آپ کسی روز ہمارے ادارہ اردو معارف اسلامیہ میں تشریف لاکر اس منصوبے کے حالات سے براہ راست آگاہی بھی حاصل کریں اور ہماری بعض مشکلات ہیں ان میں بھی مشورہ دیں۔ ہم اس کیلئے آپ کے ممنون ہونگے ہمیں آپ کی گوناگوں مصروفیات کا احساس ہے لیکن اگر آپ اپنی قریبی فرصت میں ادارہ ہذا میں تشریف لاسکیں تو تو آپ کا بے حد کرم ہوگا۔ اس طرح میں اپنی گذارش زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرسکوں گا۔ میں آپ کی تشریف آوری کیلئے چشم براہ رہوں گا۔ ازراہِ کرم جس دن آپ تشریف لائیں پہلے مجھے بذریعہ فون مطلع فرمادیں تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔

نیازمند
سید عبداللہ

ابنِ انشا

کراچی
۵ر نومبر ۱۹۷۶ء

خالد میاں! تھوڑی دیر پہلے میں آزردہ بیٹھا تھا کہ تمہاری کتابوں کا پیکٹ ملا۔ تمہاری سے متعلق تمہارے باب میں۔ بصد اشتیاق ان کو دیکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تو آدمی قدرتاً اپنا نام تلاش کرتا ہے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ ایک محبِ صادق سمجھا لیکن یہاں دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ تم خراجِ عقیدت پیش کرتے وقت ہمیں تو بھول جاتے ہو۔ ایسے ایسوں کے نام لکھے ہو جو لوگ فوت ہو جانے کے نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ —————— ساؤ دالقروح وغیرہ کون سکتے۔ کچھ ہمیں بھی پتہ چلے۔ کیا ہم سے بہت دکھ سکتے تھے۔ ہم سے زیادہ تمہارا خیال رکھتے تھے۔ ہم سے زیادہ مکرم اور ملہم وغیرہ تھے۔ برجیاں کلاں کے رہنے والے تھے کہ گرائیں جان کر اتنا خیال کرو۔ آدمی کو ایسا بقم بھی نہ ہو جانا چاہیے۔

سائل القادری کے مضمون سے کئی نئی نئی باتوں کا پتہ چلا۔ افسوس ہوا کہ تم نے اچھا خاصا عام فہم نام دلوگرا چھوڑ کر خالد تخلص کیا۔ خود منصفی کرو جو بات لوگڑ میں ہے وہ خالد یا صہبائی یا یزید وغیرہ میں کہاں۔ کتاب میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ اب اسی لفظ کو دیکھو کاتب نے بابزید لکھ دیا ہے۔ تمہیں پروف پڑھنے چاہئیں تھے۔ مضمون نگار نے علامہ اقبال کے انتقال کا ذکر اس پیرائے میں کیا ہے جیسے بہ خدانخواستہ تمہارے منگل انبیاء کے اسکول میں داخل ہونیکی وجہ سے ہوا ہو۔ میں جانتا ہوں، مضمون نگار نے نادانستگی میں ایسا لکھا ہے لیکن لوگ یہ سمجھیں گے کہ چونکہ ان کے مرنے کیوجہ سے اسکول میں چھٹی ہو گئی تھی لہذا تم ان کو بہت پسند کرنے لگے۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۲ پر لکھا ہے کہ خالد اپنے بچپن میں بڑا شریف النفس اور حیادار اور نیک سیرت مشہور تھا۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا آدمی کیسے اتنی بے حیائی پر اتر آیا کہ گوٹے گریبان وغیرہ سے کھیلنے لگے۔ حیا کا تقاضا تو یہ ہے کہ آدمی غیر عورت کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ نہ یہ کہ ایسے مخرّب اخلاق اشعار رکھے جن کی مثالیں اس کتاب کے باب پنجم اور باب ششم میں دی گئی ہیں۔ رینٹے کے کساؤ اور سینے کے تناؤ کا ذکر کرتے ہوئے تمہیں یہ خیال نہ آیا کہ ہم اہلِ مشرق کی کچھ اقدار ہیں۔ اور ص۹۱ کی آخری سطر پڑھکر تو میرا اپنا اخلاق خراب ہونیکی طرف مائل ہے۔ اللہ تعالٰی تمہاری نعتوں اور حمدوں کے چکر میں نہیں آنے کے وہ تمہیں ان اشعار کیوجہ سے جنکی مثالیں ص۹۲، ۹۳ وغیرہ پر دی گئی ہیں، تمہیں ضرور اس احاطے میں دھکیلیں گے جہاں ہم لوگ پہلے سے موجود ہوں گے۔ فرشتے کوڑے مار مار

کر پوچھیں گے کہ اندامِ نوبہار کیا چیز ہوتی ہے۔ تم نے کہاں دیکھا؟ اور یہ انارِ پستاں دنیا میں کس بھاؤ بکتے ہیں۔ اتنی ہوشیاری یا احتیاط تو خیر تم نے کی ہے کہ زیادہ تر قابلِ اعتراض باتیں ایسی زبان میں لکھی ہیں، جو فرشتے نہیں سمجھ پائیں گے۔ پستاں کو پستان یا عروقِ پستاں وغیرہ کہہ کر نکلنے کی کوشش کروگے لیکن عربی تو فرشتے سمجھتے ہوں گے۔ پس اگر اپنی نجات مطلوب ہے اور شاعرِ اسلام وغیرہ بننا ہے تو ان حیاسوز باتوں سے اجتناب برتو۔ پنڈے کے کساؤ وغیرہ کے مضمون ہم دنیاداروں اور گنہگاروں کے لئے رہنے دو۔

دوسری کتاب شخص اور شاعر ابھی نہیں دیکھی۔ ابھی مہمات بھی کہاں پوری دیکھی ہے۔ یہ اندازہ کر سکتے ہو کہ اسے

پڑھ کر میں خوش ہوا۔ خوش نہ ہوتا تو یہ خط لکھنے کی تحریک کیوں ہوتی۔

تمہیں ہم نے اپنا مجموعہ "اس بستی کے اک کوچے میں" بھیجا تھا۔ چھوٹے منہ ہی سہی، تمہیں چاہئے تھا کہ اس کی تعریف کرتے۔ آخر ہم تمہارے مجموعوں کی تعریف کرتے ہی ہیں۔ کچھ تقاضے اخلاق اور وضعداری کے بھی ہوتے ہیں۔ تم ہمارے انکسار پر نہ جاؤ کہ تم سے بڑے شاعر ہیں لیکن ایسا کہتے نہیں ہیں۔ ایسا دعویٰ نہیں کرتے۔ تم کو البتہ اپنی تعریف کرنے سے نہیں روکتے۔ ضرور کرو، شوق سے کرو۔

تمہارا
ابنِ انشاء

حکیم محمد سعید دہلوی

کراچی

۱۵ر جون ۱۷۱ء

جناب محترم عبدالعزیز خالد صاحب

السلام علیکم و رحمتہ و برکاتہ'

مجھے اس خبر سے دلی رنج ہوا کہ آپ کے والد معظم انتقال کر گئے ہیں۔ اچھے لوگ ہمارے درمیان سے اس قدر تیزی سے اٹھے جا رہے ہیں کہ میں سوچتا ہوں کہ آنے والا وقت اپنے جلو میں کیا مسائل لائے گا اور ایسے بزرگوں کی رہنمائی سے محرومی کیا رنگ لائے گی جن کی بدولت خالد جیسے انسان پیدا ہوئے۔ اللہ تعالےٰ ان کی روح کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ایک باپ کی دعاؤں سے محرومی یقیناً بڑی محرومی ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کا حامی و ناصر ہو اور آپ کو توفیق صبر جمیل عطا فرمائے۔

آپ کا شریک غم

حکیم محمد سعید

آغا صادق

گلگشت ملتان

٦-٢-٧٥

محب عزیزم!

دعائے صحت و سلامتی

آپ کا نامۂ مودت انتہا ملا

حدیث خواب سے ایک بار لطف اندوز ہو چکا ہوں - دوبارہ تنقیدی نظر سے پھر مطالعہ کروں گا اور اظہار رائے کی جسارت بھی! کہ

خطائے منشا ہمیں ہم یک خطا است

تحریریں کا خصوصی شمارہ ضرور بھجوا دیجئے گا ممنون ہوں گا - میں ان دنوں ادبیات پر کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کر رہا اور پہلے بھی کونسا اضافہ کیا ہے - اب یہ آپ ہی کا حصہ ہے لیے بھی اپنا ہی حصہ سمجھتا ہوں

مخلص

آغا صادق حسین

ماہنامہ "تحریریں" لاہور

آغا صادق حسین

مستونگ (قلات)

۲۰-۶-۶۱

عبدالعزیز خالد صاحب زاد اللہ مجدکم
آپ کا تازہ مجموعہ کلام ملا

آپ کا تازہ مطبوعہ کلام ملا۔ تحفۂ لطیف کے لئے شکریہ۔ بعد از مطالعہ اپنے تاثرات قلمبند کروں گا۔ ہفتہ وار نصرت لاہور میں آپ کے حق میں اور خلاف خط وکتابت شائع ہو رہی ہے اور یہ آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔ ماشاء اللہ آپ نے تھوڑی مدت میں خوب نام پیدا کر لیا ہے۔ اور آپکی ذہانت دلی خلوص طباعی اور زرق ریزی نے آپ کو اس کا مستحق بھی بنا دیا ہے۔

اللّٰہم زد فزد
والسلام
آغا صادق

ماہنامہ تحریریں لاہور

محمد طفیل

نقوش، انارکلی لاہور

برادرم، سلام مسنون

آپ آئے - میں نہ ملا خلش رہی - بات یہ ہے آپ نے کہا تھا دو چار روز کے بعد آؤں گا - اس وعدے کے بعد آپ اگر آئے ہوں گے تو آٹھ دس دن کے بعد آئے ہوں گے - اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب آپ وعدے کے مطابق نہ آئے تو میں اپنا دل بہلانے کے لئے لاہور سے باہر چلا گیا -

مندرجہ بالا بات ممکن ہے شاعری کے زمرے میں آجاتی مگر یہ بات شاعری نہیں کہ میں نے آپ کا انتظار کیا تھا - آپ مجھے اچھے لگے تھے یہ کیا حادثہ ہوا ؟ میں انسانوں میں فنکار کو ڈھونڈھتا ہوں یہ میرا مشغلہ ہے -

محمد طفیل

۱۹/۱۰/۶۳

چودھری رحمت علی ازہر ٥

پیپلز کالونی لائل پور
۱۲-۷۹

پیارے خالد! ضاعف اجلالک
السلام علیکم!

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے پر لائلپور آیا تو مسلم ہائی سکول والے میرے لئے چشم براہ تھے۔ سنہ ۱۹۶۲ء تک اس سکول میں اُردو - فارسی تعلیمات سے نوجوانوں کے دل و دماغ پر اپنے نقوش مرتسم کئے - وہاں سے اسلامیہ کالج لائلپور بلایا گیا۔ وہاں چند روز ڈگری کلاسز میں فارسی ادبیات کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا۔

انھی ایام میں لائلپور میں لاسال ہائی سکول کے نام سے ایک انگلش میڈیم سکول بڑے طمطراق سے جاری ہوا - وہاں قوم کے امرا کے بچے کھچے چلے آ رہے تھے - حضرت اکبر الہ آبادی یاد آئے - ابھی ابھی آزاد ہونے والی اپنی قوم کی اس نئی پود کے اخلاق کی فکر ہوئی - اسلامیات کے استاد کی حیثیت سے وہاں اپنا مقام پیدا کر کے پورے بارہ سال قوم کے اس سرمایہ کو اسلامی اقدار کے سایہ میں سنبھالا۔

جب اکثر بر کلاس سے نکلا تو اتنا تھکا ہوا تھا کہ ذرا سستا کر ہی گھر پہنچ سکا - اب آئندہ کیلئے کام کی سکت نظر نہ آئی - گھنٹی بجنے کی آواز آ رہی تھی۔

؎ وہ کہتے کہتے چھوڑ گئے داستاں، گئے

میں پورے ساٹھ سال کی علمی سروس سے ریٹائر ہوا آپ یاد آئے - سارا حال آپ سے کہکر مطمئن ہو رہا ہوں - محولہ بالا مصرع پر یار لوگوں نے مشاعروں میں میری زندگی کی تصویریں دکھائی ہیں - ملک کے چوٹی کے شاعروں میں آپ کا نام سرِ فہرست ہے - اور احباب جانتے ہیں کہ آپ کے قلب و ذہن کی جلا میں میری حقیر مساعی کا بھی دخل ہے - میری شخصیت اگرچہ غیر معروف ہے مگر آپ کی نسبت سے میرا جو مقام ہے اس کا اظہار آپ کی زبان سے علمی حلقوں میں میرا تعارف کرا دیگا اور یہی آپ کا مزید تعارف ہوگا۔

اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو
آپ کا دعاگو
رحمت علی ازہر

٥ جناب عبدالعزیز خالد کے سکول کے زمانے کے استاد

مولانا رازق الخیری

کراچی

حضرت والا! وعلیکم السلام

حضرت والا نظم مل گئی، بڑا کرم فرمایا۔ یقین ہے جب کراچی تشریف لائیں گے تو یہ نہ بھولیں گے کہ آپ کے لاکھوں بہ سامعوں میں آپ کے اخلاق کا گرویدہ یہ بندہ ناچیز بھی ہے جسے آپ سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ اور خوش کرنا تو ثواب ہے نا۔

خاکسار
رازق الخیری

عبدالعزیز خالد

نوائے شوق

روحِ سرود و سخن - خواب و خیال و فغاں
سینۂ صد چاک سے فیض کے سوتے رواں
اشکِ جگر تاب سے لوح و قلم کا فروغ
خونِ رگِ تاک سے روشنیٔ گلستاں
فکر و نظر ضو فشاں حدّتِ احساس سے
جوشِ مئے ناب سے گردشِ رطلِ گراں
شہپرِ ادراک کو کرتی ہے افلاک رس
جو دلِ مضطر میں ہے کاہشِ سوزِ نہاں
جوہرِ تخلیق ہے بادۂ مینا گداز
ہر نظر اِک ابتلا، ہر نظر اِک امتحاں
اِک ازلی التہاب، اِک ابدی اضطراب
مبدأ فیّاض سے قسمتِ آزادگاں

سختیٔ دشت و دیار، صدقِ طلب کا عیار
راہِ تمنا میں ہے ہر قدم اِک ہفت خواں
ریشۂ خاشاک و خس، دوشِ صبا پہ سوار
پنجۂ گرداب میں کامِ صدف خونچکاں
پائے خضر کے لئے راحتِ منزل نہیں
بالِ ہما کے لیے شاخِ نشیمن کہاں
نجدِ تخیل میں یوں زمزمے آوارہ ہیں!
دشت میں بھٹکا ہوا جیسے کوئی کارواں
سینۂ بیتاب میں ولولوں کا اہتزاز
ولولے جن کا غبار، گردِ رہ کہکشاں
حیرتی بن کر تکے موجِ سموم و سراب
رخشِ عناں تاب کا کوئی نہیں ہم عناں
فکرِ صبا تگ پہ ہے عرصۂ آفاق تنگ

کیسے مقیّد رہے جذبۂ دلِ بیکراں؟
محبسِ الفاظ میں شاہدِ معنی مقیم
غالیہ مُو، شعلہ رُو، عربدہ جُو، بے قرار
پردۂ قرطاس میں زمزموں کا ارتعاش
منظرِ مُو قلم خال و خط و پود و تار
چشمکِ برق و سحاب، جلوۂ ماہ و نجوم
شعلہ لبِ جوئبار، چشمۂ کوہسار
دردِ شکست و طلب، سوزِ طلوع و غروب
شکر و سرور و خمار، زہرِ غمِ انتظار
ایسے کئی راز ہیں مضطرب و پُر فشاں
ایسے کئی ساز ہیں مرتعش و نغمہ بار
مہلتِ یک دو نفس کم ہے مگر مغتنم
فکر کی اقلیم میں چھوڑوں کوئی یادگار
کالبدِ شعر میں شورشِ جاں پھونک دوں
پیکرِ الفاظ میں بھر دوں طلسمِ بہار
صفحۂ تخلیق پر ثبت ہوں میرے نقوش
جذبِ دروں کو کروں اس طرح آئینہ کار
چشمِ جہاں خیرہ ہو جس کی چمک چوند سے
ڈوب کے پیدا کروں ایسا دُرِ شاہوار
رشکِ مہتابِ شب، غیرتِ خورشیدِ صبح
بادِ فروشِ چمن جس کی پھبن پر نثار
دور ہو جس سے میری ظلمتِ شامِ الم
نالۂ شب گیر ہو جس سے مرا کامگار
لذتِ دل روز و شب، نازشِ عمرِ رواں
خالدِ آشفتہ کا، نادرہ فن شاہکار!

ماہنامہ تحریریں لاہور

مولانا ماہر القادری

فاران کراچی

۲۵ اپریل ۷۴ء

صاحب المجد والکرم زید مجدکم

السلام علیکم وعلی من لدیکم

میرے لئے انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ آپ فاران میں میری تحریریں شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں - آپ نے بجا گرفت فرمائی وہ شعر لبید بن ربیعہ کا ہے، امراؤ القیس کا نہیں ہے - میری یاد داشت کی بھول تھی - مئی کے شمارے میں اسکی تصحیح آ رہی ہے

مخلص

ماہر القادری

جمیل جالبی

کراچی

۸ر ستمبر ۲۱ء

برادرِ محترم خالد صاحب: السلام علیکم

میں خیریت سے کراچی پہنچ گیا ہوں۔ ابھی بے سروسامانی کا عالم ہے۔ یہاں پہنچکر آپ کی یاد ستا رہی ہے اور آپ کی
کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ کامل القادری سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی۔ انھیں بھی خط لکھا ہے۔ آپ کراچی کب آ
رہے ہیں، مطلع کیجئے گا۔

احقر
جمیل جالبی

مسز اظفر الحسن

غالب یونیورسٹی کراچی
۱۱ر دسمبر ۱۹۷۱ء
مکرمی تسلیم

ادارۂ یادگار غالب کے پاس مختلف جرائد اور رسائل کے اندازاً آٹھ ہزار شمارے محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ جو ایک ہزار شمارے عطایا کی صورت میں جمع ہوئے تھے وہ سب ہماری بہادر افواج پاکستان کو روانہ کر دیئے گئے ہیں۔ جیسا کہ آج کے روزنامہ حریت میں شائع ہوا ہے۔ یہ ادبی تحفہ نہ صرف ادارے کی جانب سے بلکہ آپ کی طرف سے بھی۔ کیونکہ ان ایک ہزار شماروں میں آپ کے عطا کردہ رسائل بھی شامل ہیں جو آپ نے از راہ مہربانی غالب لائبریری کو دیئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے عطایا کو بہادر افواج پاکستان کی خدمت میں بطور نذرانۂ عقیدت و محبت پیش کرنے کے اس اقدام سے آپ کو بھی اتفاق ہوگا۔

مخلص
اظفر الحسن

اختر انصاری اکبر آبادی

دفتر نئی قدریں نغزاری ہوٹل
حیدر آباد
۷؍ نومبر

حبیب گرامی قدر! تسلیمات

"سلوٰی" کے دوسرے ایڈیشن کے علاوہ آپ کی تین چار نئی تصانیف سنا ہے بہت ہی خوبصورت طور پر شائع ہوئی ہیں آپ کے اکلمات کے مستحق صرف تعبیر اردو کے لیکچرار ہی نہیں ہیں بلکہ یہ خاکسار بھی ہے۔ ذاتی ناراضگی سے قطع نظر ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے میں آپ کی تصانیف کا حق دار ہوں، ناراضگی ہمیشہ قائم نہ رہ سکے گی۔ فی الوقت اپنے دیرینہ دوست کو نہ سہی ایک ایڈیٹر کو ہی سہی جملہ نئی تصانیف بواپسی ڈاک بھیجئے۔

خادم دیرینہ
اختر انصاری اکبر آبادی

مولانا اسد القادری

شاعر اعظم!
سلاماً و تحیۃً
اسد القادری
کان اللہ لہٗ

آپ کے والد محترم کے ارتحال کی خبر سن کر مجھ پر بھی وہی اثر ہوا جو ایک مسلمان پر ہوا کرتا ہے - اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے عزیزوں کو صبر جمیل ر

ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چلے ساغر چلے

اسد القادری

اسد القادری

۲۲ نومبر ۶۷ء
افتخار ملت
سلاماً و تحیۃً

آپ کی روانگی کے دوسرے دن ہی ڈھاکہ میں شاعر اعظم کی شخصیت اور ان کے فن پر تنقید کے لئے میری صدارت میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا۔ آج میمن سنگھ میں بھی ایک عظیم الشان جلسہ بعد مغرب ہونے والا ہے۔ تقریر کا عنوان ہے "شاعر اعظم اور ان کی فکر"۔ کل ہی پار بتی پور چلا جاؤں گا۔ ۲۴ گھنٹوں کا سفر ہے۔

اسد القادری
میمن سنگھ

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوری

حیدر آباد

۸-۱۱-۶۷

ہدیۂ خلوص!

امید ہے کہ جناب کے مزاجِ گرامی

بخیر ہوں گے۔

یہ نقل میں بہت پہلے روانہ کر دیتا۔ ریڈیو پاکستان والے آج اور کل کرتے رہے۔ اِدھر ڈاکٹر صاحب کے پاس اصل کاپی موجود نہیں تھی۔ اس تبصرے سے ڈاکٹر صاحب خود مطمئن نہیں ہیں کہہ رہے تھے یہ کتاب مجھے اس وقت دی گئی جبکہ میں پہلی دو کتابوں پر تفصیل سے لکھ چکا تھا چنانچہ اس کام کے لئے صرف آدھا صفحہ لکھا۔ آپ کو وہ اس دور کا عظیم شاعر مانتے ہیں۔ آپ کا ذکر جس محبت اور جس خلوص سے کیا اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ میں نے خود ایک طویل نظم (آزاد) آپ سے متعلق کہی ہے۔ آپ نے اتنے مختصر سے عرصہ میں اتنے شعر کہے ہیں اور اتنے اچھے کہے ہیں کہ اس پر پی ایچ ڈی کے معیار کا کام کیا جا سکتا ہے۔ انشاء اللہ کوئی نہ کوئی یہ کام جلد ہی شروع کرے گا۔

آپ کا اپنا

حسرت کاسگنجوری

---

۵ ڈاکٹر مخدوم مصطفیٰ خاں

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

علیگڑھ

۲۸-۲-۶۸

○ محب مکرم و محترم، السلام علیکم
ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا والا نامہ جس پر تاریخ کوئی نہیں تھی مع مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی کے مقالے کے بہت دن ہوئے ملا تھا مگر میں کاموں کے ہجوم میں آپ کا خط اور وہ مضمون کہیں رکھ کر بھول گیا اور آپ کو جواب دینا بالکل یاد نہ رہا۔ جس کے لئے صدقِ دل سے معذرت خواہ ہوں۔ آج پرانے کاغذات کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے آپ کا والا نامہ سامنے آیا تو سخت شرمندگی ہوئی اور اب میں یہ عریضہ تحریر کر رہا ہوں۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھ کو عبدالعزیز خالد اور ان کے کلام سے حد درجہ دلچسپی اور عقیدت ہے اور اس لئے جب کبھی ان کا کلام مجھے ملتا ہے میں اسے بڑے شوق اور ولولے سے بار بار پڑھتا ہوں اور لطف لیتا ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خالد اردو شاعری میں اس عہد کے غالب ہیں۔ اور وقت جتنا آگے بڑھتا جائے گا خالد کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اتنا ہی زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا۔ میں خود بہت دنوں سے ان کے کلام پر لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں لیکن ابھی تک اپنے خیالات کو الفاظ کا پیکر دینے کے قابل نہیں ہو سکا ہوں۔

حسن مثنیٰ صاحب کا جو مضمون آپ نے بھیجا ہے وہ زبان اور انداز بیان کے اعتبار سے چٹکیلا اور لطف انگیز ضرور ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے خالد کا حق ادا نہیں ہوتا۔ خالد کے کلام پر نقادانہ نظر ڈالنے کے لئے ضرورت ہے کہ جذباتیت سے الگ رہ کر خالص فنی نقطۂ نظر سے اس پر سیر حاصل گفتگو کی جاتے اور حسن مثنیٰ صاحب کے مقالہ میں مجھے اس چیز کی کمی نظر آتی ہے۔ اسی بناء پر برہان میں اسکی اشاعت سے معذور ہوں۔

مخلص
سعید احمد اکبر آبادی

○ غالباً یہ خط مولانا اسد القادری کے نام ہے

نعیم صدیقی

سیارہ، لاہور

برادرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے خطوط، آپ کے شعر، آپکی کتابیں، ان سے برابر استفادہ کیا۔ آپ کے دلچسپ، متنوع اور رنگین و دلنشیں تحریری تجربوں سے دل بہت متاثر ہے پھر آپ لکھتے بھی بہت ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اندر اظہار کی پیاس بہت شدید ہے جو کسی طرح بجھتی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اسے بار بار کہنے کے بعد آپ محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ کہنا تھا ابھی تک ادا نہیں ہو سکا۔ گویا یہ ایک سفر دوام ہے جس میں منزل کبھی نہیں آنے کی۔ فارقلیط میں آپ کے روزنامہ [illegible] دیوار، دیکھی تھی، اب اسے دوبارہ زیر مطالعہ لے رہا ہوں۔ ہو سکا تو کچھ اظہار رائے کروں گا۔

والسلام

نعیم صدیقی

۲۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء

ابنِ انشا

کراچی
۲، اکتوبر ۱۹۷۵ء

برادرم
پیشگی عید مبارک!

آپ کے کوئی کرمفرما ہیں جو مجھے دارا دبیانہ اخبار میں لکھا ہوا دو صفحے کا مضمون سائیکلو اسٹائل کرکر لوگوں کو بھیج رہے ہیں مجھے ملا ہے تو اوروں کو بھی ملا ہوگا اور ان میں سے کسی نے آپ کو دکھایا بھی ہوگا۔ عنوان ہے "قصہ میدان شاعری کے بولین اور انکم ٹیکس کے دخل المعظم کا"۔ جو کچھ لکھا ہے اسکی حقیقت تو ظاہر ہے۔ اعتنا کرنے کی ضرورت نہیں تاہم ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ جلن اور حسد بھی کیا گل کھلاتی ہے۔ یہ لازماً کوئی ادیب بھائی ہیں۔ خیر پنجابی میں کہتے ہیں "لوگوں کے کہنے سے ڈھگے نہیں مرا کرتے"۔ پشاور آئے تو مجھے فون کرنا۔

تمہارا
ابن انشا

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

کراچی یونیورسٹی کیمپس
۶ر اکتوبر ۱۹۷۶ء

برادر محترم، سلام مسنون

کل مجھے خیال آیا کہ آپ کا ایک انتخاب ایک مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا جائے — ایسا انتخاب میری رائے میں اب ضروری ہے تاکہ عام پڑھنے والوں کے سامنے آپ کے فکر اور فن کی ایک مجموعی تصویر کم سے کم وقت میں آسکے۔ یہ انتخاب ایسا ہو جس میں آپ کے کلام کو یا تو موضوعات کے تحت پیش کیا جائے، یا تاریخی ترتیب سے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں صورتوں کو برتا جاسکے۔ اگر شیخ غلام علی 'روشن کتابیں' کے سلسلہ میں چھاپنے پر آمادہ ہوں تو مناسب ہوگا کہ کم سے کم قیمت میں لوگوں کو یہ مجموعہ مل سکے۔ معاشی جبر سے کون انکار کرے گا۔ میں یہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن مجموعوں پر نشان لگانے سے کام نہیں چلے گا بلکہ نئی ترتیب کیوجہ سے کلام کو نقل کرانا پڑے گا۔ مجھے شیخ غلام علی کی شرائط بھی معلوم ہو جائیں تو مناسب ہوگا۔ جاپانی نظموں کا کام کہاں تک پہنچا؟

امید ہے میرا کتابچہ آپ نے مرزا صاحب کو بھجوا دیا ہوگا۔ میں نے ۱۹۷۶ء میں اردو کی نعتیہ شاعری کا ایک مختصر کتابچہ "نقشِ سعادت" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس دن آپکی خدمت میں پیش کرنا بھول گیا۔ ایک دو دن میں ڈاک کے ذریعہ بھیج دوں گا۔ اس میں آپ کا ذکر بطورِ خاص کیا گیا ہے۔

آپ کا
کشفی

کامل القادری

خالد صاحب!
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

گرامی نامے کا جواب لکھ چکا ہوں۔ عید آئی، لیکن آنکھیں اشک بار رہیں۔ مولانا مہر ہم سے چپکے سے وداع ہو گئے۔ کیا کہیے۔ اب میری زندگی سینہ کوبی کے لئے رہ گئی ہے۔ اتنا پیارا دوست، ایسا مزاج آشنا اور شفیق استاد کسے نصیب ہوتا ہے۔ میری تمنا تھی کہ ان کے قریب ہی رہوں، دل لاہور کی جانب کھینچ رہا تھا۔ لیکن حالات نے مجھے اجازت نہ دی۔ اور وہ محبوب ہزار شیوہ چپکے سے اس بزم سے اُٹھ گیا۔

آخری ملاقات اور آخری مصافحہ کی یاد کتنی فرحت بخش ہے۔ وہ منظر آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔

ایک دور ختم ہوا، اب کون اُس عہد کا افسانہ سنائے گا۔

آپ خورشید السلام اور فاروق سے میرے اور میری طرف سے تعزیت کیجئے۔ نیاز صاحب (کتاب منزل والے) سے تعزیت کیجئے کہ مولانا کے وداع کا انہیں کم غم نہ ہوا ہوگا۔ میں تعزیت نامہ لکھنے کا ہوش نہیں رکھتا۔ یہ غم بڑا غم ہے۔ مجھے سینہ کوبی کرنے دیجئے

کامل القادری

ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی

اورینٹل کالج لاہور
۲۱ر نومبر ۱۹۷۴ء

بندہ نواز

آپ کی دوسری کتابوں کی طرح حدیثِ خواب نے بھی مجھے کئی شب بے خواب رکھا۔ اسے پڑھتا رہا اور وہ تمام داستانیں ادب پارے، قصص، امثال و حکم اور دیومالائیں حافظے میں گھومتی رہیں۔ جن کی آغوش میں میرا تخیل آسودہ ہوتا رہا ہے۔ اگرچہ احباب کی تعریف میں مبالغہ کرنا کارِ ثواب ہے۔ لیکن بے مبالغہ عرض کرتا ہوں۔ کہ آپ کے ایک ایک حوالے سے پوری کتاب ذہن پر طلوع ہوجاتی ہے۔ جو کبھی پڑھی تھی اور جسے پڑھنے کی فرصت اب میسر نہیں ہے۔ داستانیں، مثنویاں، صحائف و صحاح تفاسیر، علم الخزافات (اگرچہ "حدیثُ خرافۃٌ یا امّ عمرو" سے ہرگز متفق نہیں ہوں) کے دفتر نظر میں پھر جاتے ہیں۔ چند حوالے برمحل یاد آگئے۔

ش گماں ہے میری نوا پر حکایتِ نے کا	(مثنوی)
ع گو بجا ہے میرے تغزل میں تفا نبک کی	(قصیدۂ لامیہ)
ع ہاتھ بولیں گے پکاریں گے قدم	(تکلمنا ایدیہم و تشہد ارجلہم)
ع جو میری ودیعت میں تھا یہ رہا	(واخرجت الارض اثقالہا خوب منظر ہوگا!)
ع وہی مارے پتھر جو ہے بے خطا	(انجیل مقدس)
ع ملائیں ساغرِ مے میں سفوفِ بیہوشی	(طلسم ہوشربا۔ بوستانِ خیال)
ع یادِ یارِ مہربان	(رودکی)
ع گراں ہے فرزدق پہ ہجو نوار!	(اصمعی)

استقصا محال ہے۔ اگر کبھی فرصت ملی تو پچاس صفحے میں اس کتاب کا تجزیہ کروں گا۔ کل شب میں "سرِ رہگذر" کے معرکے پڑھتا رہا۔ اس کے رچے ہوئے سوز و گداز میں آپ کی سیرت اتنی نمایاں ہے۔ کہ میں نے آپ کو نہ دیکھا ہوتا تب بھی آپ کے مزاج بلکہ حلیہ و صورت کی تصویر اپنے ذہن میں بنا سکتا تھا۔

ؔع یہاں بھی مرے شرمیلے پن نے مجھے مارا

اس مصرعے نے مجھے میر تقی میرؔ کی یاد دلائی کہ وہ غریب بھی آپ کا ہم مشرب تھا۔

؎ دستِ کہ تاہ تا سبو نہ گیا دست برسر ہی میرؔ ہم تو رہے

پروردگار آپ کو زندہ و قائم رکھے کہ میرے ہم مشرب بہت کم ہیں لہٰذا میں اُن کا پرستار ہوں۔ یہ مصرع

ع کشتۂ زیرِ زبانِ افرنگ

آپ نے لکھا ہے یا الحاقی ہے؟ بہت عمدہ پیاری اور ذی ثروت زبان ہے جو تین ہزار سال کی روایتوں اور ہزار سال کے ادبی سرمائے کو سنبھالے بیٹھی ہے۔ اس کے خلاف جہاد کرنا ہمارا کام نہیں۔ اس کا دبیر کے لئے ڈاکٹر عبداللہ صاحب موجود ہیں۔

ناظر حسین

ڈاکٹر ناظر حسین زیدی

نیو یارک

۲ر مئی ۷۵ء

مکرمی، تسلیم

اس رنگین کارڈ پر اختصار کے ساتھ اپنی خیریت اور ذاتی تاثرات لکھے تھے اور آپ جیسے مشغول و مشتغل شخص کو اس سے زیادہ زحمت دینی مناسب نہ تھی۔ لیکن اس مختصر تحریر سے میری تسکین نہ ہوئی اور وہ کارڈ ڈاک میں ڈالنے کا ارادہ ترک کر کے باقاعدہ مکتوب ملفوف کرتا ہوں۔ بندہ نواز آپ کو شاید میرے خصائل پسند نہ آئیں۔ میں غالب کے "رنج گراں نشیں" کی طرح اپنے ہم نشینوں اور ہم زبانوں سے دیر تک باتیں کرنے اور طولانی تحریریں لکھنے کا عادی ہوں۔ دو منٹ کے لئے کسی سے مل آنا اور مختصر مکتوب لکھنا جو تہذیب کا عین نشانہ ہے، اس سے میری طبیعت نفور ہے۔ تحریر میں طول عمل اور گفتگو میں طول امل کا مجرم ہوں۔ اسی لئے جب کبھی آپ سے ملتا ہوں تو مروت کے بغیر دیر تک بیٹھا اور باتیں کرتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میری اصل ملتان سے ہے۔ جہاں دوستوں عزیزوں سے "تفناسک" کی فرمائش بے تکلف کی جاتی تھی۔ غالباً اب وہاں بھی تہذیب کی برکت سے یہ بات باقی نہ رہی ہوگی۔ ؎

کأن لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیس ولم یسمر بمکۃ سامر

میں یہاں اپنے بیٹے کے پاس نہایت آرام سے ہوں۔ تاہم ان بند کمروں، تمد اور قالین کے فرشوں اور سامان کی کثرت اور مزاحم کی فضاؤں سے نفور ہوں۔ آپ تو یورپ کے اکثر شہروں میں دورے کئے ہیں اور غالباً یہاں بھی آئے ہوں گے۔ میرا تجربہ پہلا ہے۔ جس کا تصور تو تھا لیکن صحیح احساس نہ تھا۔ یعنی علم الیقین حق الیقین کی حد تک نہ پہنچا تھا۔ اب گھبراتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جلد اس زندانِ شاہی سے نکل بھاگوں۔ لاہور کے یارانِ باصفا یاد آتے ہیں ؎

اے خوش آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوئے شہر خود، از این منزل ویراں بروم

اس آباد ویرانے نے مجھے بہت دہشت زدہ کر دیا۔ اب مجھے وادی کا کنارہ یاد آتا ہے جہاں میں ہر دوسرے تیسرے دن کوئی کتاب لے کر مطالعہ کرتا اور پڑا رہتا۔ اور جہاں بقول بائرن ؎

There is society where none intrudes!

عرفی خلوت گزیں نے یہی بات شوخی و دردمندی کے ساتھ کہی تھی ؎

چو تنہا می نشینم از غمت صد ہم نشیں دارم
میانِ مردماں تنہائیم دیوانہ می سازد

غرض اس فکر میں ہوں کہ کسی طرح یہاں سے نکلوں۔ بیٹے کا اصرار ہے کہ چھ مہینے کی رخصت یہیں بسر کر کے اور ملازمت کر لو۔ چونکہ یونیورسٹی سے ایک بہتر سی پیش کش ملازمت کی مجھے آئی ہے لیکن تنخواہ کم ہے۔ بڑا مانع یہ ہے کہ میں کھانے کے معاملے میں مشرقی ہوں۔ ویسے بھی آنکھ دُکھی ہوں۔ وہاں مجھے وہ گوشت کسی مسلمان کے ہاتھ سے یا کسی نصرانی سے جو نجاست سے پاک ہو۔ کیسے میں گے یہاں کی یونیورسٹیوں میں نہ کوشش کی، نہ کوئی پیشکش اب تک ملی۔ مجھے بھی تو ان بند کمروں میں جہاں بلاک کی ڈیوڑھی تک تین تالے پڑے ہیں۔ جیسے وقت گزاروں۔ کھڑکی دروازہ اور کھلے کمروں، کھلے صحن کا عادی ہوں۔ آخر تو آلِ عمران ہوں۔ اب احساس ہوا کہ میسون بنت بحدل کلبی نے اپنے شوہر امیر معاویہ سے خطاب کرتے ہوئے جو کہا تھا کہ دمشق کے قصر سے مجھے وہ خیمہ عزیز تر ہے جس کے پردے ہوائے صحرا سے پھڑپھڑاتے تھے" وہ بیچاری نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اور ان اشعار میں درج عرب کا درد بیان تھی۔ المختصر ممکن ہوا تو بیٹے اور کم گشتہ پوتی کو بہکا پھسلا کر جلد یہاں سے نکلوں گا۔

یہاں بہاری فروری کا موسم ہے۔ آڑو اور پھوری" کے شگوفے کھل رہے ہیں۔ میں یہاں کے باغِ نبات (Botanical garden) (شاخِ نبات سے مجھے واسطہ نہیں) ایکویریم (سماکیہ؟) اور میوزیم آف نیچرل ہسٹری کی سیر میں محو ہوں۔ جہاں بیس لاکھ سال پہلے کے عفریت اپنے ڈھانچوں سے ہیبت زدہ کرتے ہیں۔ بقول سپنسر ؎

Tremendous still in death.

والسلام
ناظر حسین زیدی

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی

مکرمی ،

تسلیم ــــــ

اَلْھٰکُمُ التکاثُر اور کاسیاتٌ عاریات کے معنی یہاں آکر معلوم ہوئے۔ یہاں کی کم آمیزی اور بیگانہ وشی " یفرّ المرءُ من اخیہ " کی یاد دلاتی ہے ۔ اور لاہور کے بازار یا مقامات جلد جا ملنے کی ترغیب دیتی ہے کہ اب ہمارا وطن لاہور ہی ہے ۔ خدا جلد اس صنم خانے سے نکالے ۔

زیادہ نیاز ۔ یقین ہے کہ آپ بعافیت ہوں گے ۔ میرا وقت لائبریری میں گزرتا ہے ۔ اور کبھی ساحل پر آتا ہوں ۔ جس کی تعریف بائرن نے اپنی نظموں میں کی ہے ۔ لیکن یہاں کا ساحل کہیں سپاٹ اور کہیں سنگلاخ ہے ۔ جہاں کلکِ مورخ اس کا احوال پریشانی کے ساتھ لکھتا ہے ۔ غرض دلکش نہیں ۔ جب دھوپ ہوتی ہے یہاں کے اصنام خیالی ع

کنارِ بحر پہ جب غسل آفتابی کریں

فقط

والسلام

ناظر حسن زیدی

علامہ عبدالعزیز میمن

۳۰ مئی ۵۵ء

عزیز العزیز!

السلام علیکم

جوش صاحب کے مؤرخہ ۱۲ر کے ساتھ آپ کا کلام بھی ملا تھا۔ بدحواسی اور سر دتی کہیے کہ رکھ کر بھول گیا۔ تا آنکہ آپ کو کل تقاضا کرنا پڑا۔

آپ اور آپ کا کرم ہمیشہ یاد رہے گا۔ بڑی مسرت ہوئی کہ آپ نے ۷ ماہ میں اتنی حیرت انگیز ترقی کر لی۔

اللھم زد فزد

میری شعر و سخن کی قابلیت ہمیشہ کالعدم تھی اور اب تو ان باتوں کا جو چاہیے نہ میری بے بضاعتی نے کہیں کا رکھا۔ اگر یہ کہوں کہ آپ سے جدا ہو کر تا ایں دم کھڑے پاؤں رہا ہوں   تو کسی طرح بے جا نہ ہوگا۔

فعفوا یا صدیقی و غضّا

آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اللہ میسر کرے۔

مفردات تو بحمد اللہ آپ نے کافی یاد کر لئے ہیں مگر ضرورت اس کی معلوم ہوتی ہے کہ ان کو بار بار استعمال کیا جائے۔ کچھ عروضی خامیاں بھی ہیں اور کچھ نحوی بھی۔ ترکیب جملہ اور عربی نظم بہت کچھ مہارت چاہتی ہے۔ ورنہ مضمون کی شوخی،

یہ جذبات کی فراوانی   اور زبان کی روانی میں
اس نغز گو کا ہوگا، مشکل سے کوئی ثانی

یا یوں کہیے:

معدوم ہے جہاں میں اس نغز گو کا ثانی

افسوس آپ سامنے نہیں ہیں ورنہ عربی الفاظ کے استعمال کے متعلق کچھ مشورے پیش کرتا اور لکھنے میں بہت سست ہوں۔ البتہ وقت لائے کہ آپ سامنے ہوں۔ مگر چند اعرابی کے بہت سے یہ تعبیروں کو بھی اتنے مفردات یاد نہ ہوں گے۔ کچھ نثر کی طرف بھی توجہ دیجیے۔

مخلص

عبدالعزیز میمن

ڈاکٹر وزیر آغا

سرگودہا
۴ر فروری ۷۱ء

برادرم خالد صاحب
سلام مسنون!

آپ کا خط مل گیا تھا۔ مگر میں زکام میں مبتلا تھا۔ اس لئے جواب تحریر کرنے میں تاخیر ہو گئی۔ اوراق کے سلسلے میں آپ نے جو خبر سنی وہ آدھی سچ ہے۔ یعنی اوراق کا سلسلۂ اشاعت تو کچھ عرصہ کیلئے واقعتاً منقطع کر دیا گیا ہے لیکن پرچہ بند نہیں ہوا۔ اور انشاء اللہ ادبی فضا کے لوٹ آنے پر دوبارہ جاری ہو جائے گا۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ہمارے مدیران میں سے بیشتر سیاسی فضا سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ادیب کے مسلک کو فراموش کر کے بازاری سطح پر اتر آئے۔ چنانچہ دشنام طرازی کی جو روش انھوں نے اختیار کی اس کے جواب میں بجز اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ خاموشی اختیار کر لی جائے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ہر ادیب ایک عام شہری سے زیادہ سلجھا ہوا انسان ہوتا ہے اور ہنگامی حالات سے متاثر ہونے کے باوجود وہ زود یا بدیر اپنے ادبی لہجے میں بات کرنے کی طرف ضرور مائل ہو جاتا ہے۔ بس میں اسی نیک ساعت کے انتظار میں ہوں۔ مارچ کے آغاز میں بچوں کے امتحان ہو جائیں تو چند روز کے لئے کراچی آؤں اور آپ سے مفصل باتیں ہوں خدا وہ وقت لائے۔

آپ کا
وزیر آغا

ناصر کاظمی

ہمایوں لاہور
۵۵-۱۰-۱۰

برادرم خالد صاحب!
السلام علیکم

ہمایوں کی روش ذرا بدل گئی ہے۔ اسلئے اس سلسلے میں ذرا خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن اب پھر ارادہ ہے کہ اس میں خالص ادبی تحریروں کو بھی برابر کی نمائندگی ملے۔ نیا دور میں آپکی نظم دیکھی اور بغور پڑھی مجھے تو پسند آئی۔ اگر جی چاہے تو کوئی معقول سی چیز ہمایوں کے لئے بھیج دیجئے۔

آپ کا مخلص
ناصر کاظمی

ابنِ انشاء

الکم ٹیکس میں بھی عبد العزیز خالد کے ہوتے کسی اور شاعر کی ضرورت یا گنجائش نہیں ــــ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ ایسا قادر الکلام شاعر ہم نے تو نہیں دیکھا۔ یہ اگر اپنے علم سے مجبور نہ ہوتے اور کہیں اردو میں لکھا کرتے۔ تو آج ان کا نام پاکستان میں بھی اسی طرح بچے بچے کی زبان پر ہوتا۔ جس طرح عالم عرب میں ہم دیکھ آئے ہیں۔

ابنِ انشاء

جعفر طاہر

جھنگ
۱۱ جولائی ۱۹۷۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ھوالباقی

اے فخرِ ما، فخرِ وطن، فخرِ ہنر، یکتائے فن،
مخدومی و آقائے من!

مخدومی و معظمی قبلہ و کعبہ جناب آقائے پروفیسر سید عبدالباقی صاحب مدظلہ، پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ آپ کے ساتھ ایک شام منانے کے آرزومند ہیں۔ ہم نے آج جھنگ میں آپ کی تشریف آوری کا ذکر کیا تو وہ فارقلیط اور رشحنا اور زرد داغِ دل کے اشعار سنانے اور ہمیں رلانے بیٹھ گئے۔ آپ اگر ہفتہ عشرہ تک ایک اتوار ہمیں دے سکیں تو آپ کا ہم سودائیانِ صحرا پر ساون کی طرح احسان ہوگا۔ یہ تقریب بزمِ محبانِ خالد کے زیرِ اہتمام شبستانِ باقی میں منعقد ہوگی۔ آپ اپنے پروگرام سے جناب باقی صاحب کو براہِ راست مطلع فرمائیں۔ اس وقت ساڑھے بارہ بجے دن کا عمل ہے۔ بھائی صاحب قبلہ حضرت شیر افضل جعفری مدظلہ، برادرِ عزیز حضرت رام ریاض اور یہ روسیاہ سب آپ کو سلام عرض کرتے ہیں۔ باقی صاحب خالد نمبر کی تینوں جلدوں کو دیکھ دیکھ کر چاٹ رہے ہیں۔

خاکِ قدم
جعفر طاہر

منیر نیازی

المثال
گارڈی ٹرسٹ بلڈنگ
لاہور

خالد صاحب!

میں کچھ عرصہ سے بیمار ہوں اور دفتر بھی نہیں جا سکا۔ اگر آپ گھر آجائیں تو میں آپ کا مشکور ہوں گا۔ آپ سے کچھ دل کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کا
منیر نیازی

ڈاکٹر داؤد رہبر

ہارٹ فورڈ
۲۳ مارچ ۱۹۶۴ء

محبی: السلام علیکم

کرم نامہ آیا۔ مجھ کو ضرور ندامت ہے کہ جو سطور لکھنے کا ارادہ تھا اب تک انکی تشکیل نہ ہوئی۔ اس سال یہاں کے پروفیسر عربی چھٹی لے کر تشریف لے گئے۔ ان کے طلبہ کی دیکھ بھال کا کچھ کام میری تحویل میں آیا۔ اسکے علاوہ کچھ مکروہات بھی ہیں ۹ اپریل کو امریکن اورنٹیل سوسائٹی کا سالانہ اجلاس نیویارک میں ہے۔ اس کے لئے ایک مقالہ لکھ رہا ہوں۔ اس کے فوراً بعد مراقبہ ہوگا۔ ہمارا مراقبہ رہبانیت سے پاک ہوتا ہے چنانچہ آپ کے فرمودات، کے قافلہ سجا کر بیٹھ جائیں گے کبھی گل نغمہ کا شہد چوس لیا، کبھی برگ خزاں کو پان سمجھ کر اسکی گلوری کھائی۔ کبھی دکان شیشہ گر پر انتساب میخانہ کے لحاظ سے جا بیٹھے، کبھی اپنے دل کی گہرائیوں میں سرود رفتہ کی گونج سن پائی، آہو کو خود اسکی اپنی چال کی زنجیر کا زندانی پایا، درِ ناخواندہ کو شجر ممنوعہ جان کر اسکی لالچ کو تیز کیا۔

خاکسار شرمسار
داؤد

قمر ہاشمی

ہمدرد دواخانہ، کراچی

یا اخی، یا حبیبی و یا سیدی محمد

لحمی و دمک دمی،

سلام و رحمت

تسلیم مع التکریم

کرم گستر! بغیر کسی معذرت نامے کے مطلوبہ کتب "پرواز عقاب" اور اس کے علاوہ "سلوی" اور "حدیث خواب" (مجموعہ شعری) موصول ہو کر باصرہ نواز ہوا جزاکم اللہ۔ میں ان دنوں اپنی دوسری طویل نظم "ریا" اور دو کی طویل ترین نعت، کو تکمیل کے آخری مرحلے تک پہنچانے میں مصروف ہوں۔ اور دلی خواہش یہ ہے کہ کتاب کے فلیپ پر آپ کی چند سطری تقریظ شامل کر سکوں لیکن باید و شاید انسان کی ہر آرزو تو پوری نہیں ہوتی، مرسل آخرا آپ کے سامنے بھی نہیں ہے۔ اس امر کی یقین دہانی کی جاسکتی ہے کہ ہزاروں سطور میں ایک سطر بھی FLAT یا شاعرانہ اعتبار سے کم وزن وغیرہ وقیع نہیں، آپ کی مرسلہ کتب کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ اور اس عنایت و اخلاق کریمانہ کے لئے سراپا شکر و سپاس گزار ہوں۔

آپ نے علم و ادب کے جواہر سے ہماری زبان کے خزانوں کو مالا مال کر دیا ہے۔ اور روایت و درایت کی روشنی سے اس کی راہ دانی کی ہے۔ میں بھی سب و شتم اور ملامتِ باہمی کی فضاء میں بیٹھ کر قرطاس و قلم کی اعانت سے طالع آزمائی میں مصروف ہوں۔ خدا میری محنتوں کو بھی قبول فرمائے ؎

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

مخلص و دعاگو
قمر ہاشمی

۲۲-۱۰-۷۳

حافظ لدھیانوی

سرگودھا

۷ - ۳ - ۷۲

برادرِ مکرم جناب خالد صاحب

السلام علیکم!

حسب وعدہ نعتیہ مجموعہ "ثنائے خواجہ" پیش خدمت ہے، "اعترافِ عجز" میں اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کا اعتراف کر چکا ہوں۔ نعت گوئی سب سے مشکل فن ہے اس کے لئے علم سے زیادہ عشق کی ضرورت ہے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عقیدت اور محبت، نعت دل کی آواز اور روح کی پکار ہے۔ بہرکیف اس نظریے سے نعت کے شعر کہے ہیں کہ اگر میری نعت کا کوئی شعر کوئی مصرعہ بارگاہ رسالتؐ میں مقبول ہو گیا تو میری نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔

آپ کا

حافظ لدھیانوی

رضیہ فصیح احمد

۲۲ فلیگ سٹاف روڈ
رسالپور
۲ اکتوبر ۷۳ء

محترم خالد صاحب
تسلیمات

"پرزہ ہائے عقاب"، کا بہت بہت شکریہ! کئی رسالوں میں اس پر تبصرے نظر آئے۔ جو ظاہر ہے کہ سب اچھے ہی ہیں۔ کچھ دن ہوئے حفیظ صدیقی صاحب نے فرمائش کی تھی، آپ پر مضمون لکھنے کی۔ ان کو بھی ابھی تک جواب نہیں دیا۔ آپ پر مضمون لکھوں کم از کم اتنا تو سمجھ لوں، جتنا پکاسو کو سمجھی تھی۔ میرا خیال ہو رہا ہے ان کو لکھ دوں کہ آپ کے نمبر کے لئے میں آپ کو ایک دلچسپ انٹرویو مہیا کر دوں گی۔ اور جب آپ سے ملاقات ہو تو آپ سے چند ایک غیر رسمی سوالات کئے جائیں۔ کیا خیال ہے۔ اسی طرح میرا بچاؤ ہو سکتا ہے ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ سے آپ کی کتابیں پڑھنا شروع کر دوں۔ مگر یہ دقت طلب مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کند ذہن طالب علموں کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ یہ نہیں ہے کہ میں نے آپ کی کتابیں پڑھی نہیں ہیں۔ یہ جرأت کی ہے اور بعض کتابوں کے سلسلے میں شروع سے آخر تک کی ہے۔ مگر یہ ہے کہ میں آپ کی شاعری کے بارے میں آپ سے زبانی بات کرنا چاہتی ہوں۔

سیالکوٹ کی شامِ خالد میں جو مضامین پڑھے گئے تھے۔ ان میں سے ایک سے معلوم ہوا تھا کہ ہر ایک کی تعریف کرنا آپ کی عادت ہے۔ میں نے جمیلہ کو لکھا تھا کہ یہ جان کر دکھ ہوا۔ کیونکہ تعریف سے تو اسی کی خوشی ہوتی ہے۔ جو داد دینے میں کنجوس ہو۔

اردو ڈائجسٹ میں اتفاق سے ضمیر جعفری صاحب کا وہ مضمون نظر پڑ گیا۔ جو انہوں نے خوشحال خان خٹک کے مزار کی سیر کے سلسلے میں لکھا تھا۔ ایک جملے میں ہمارا ذکر بھی تھا۔ گو میرا نام غلط تھا یعنی رضیہ فصیح الدین۔ پچھلے دنوں اپنی ڈائری میں نارائن گنج کی سیر کا حال پڑھا، سارا منظر دوبارہ نظروں میں پھر گیا۔ ابھی تک چھپوایا نہیں ہے۔ اُسی زمانے کے سارے حالات قلم بند ہیں۔ تقسیم انعامات وغیرہ بھی، کبھی نظر ثانی کر کے چھپواؤں گی۔

ناچیز
رضیہ فصیح احمد

کبیر انور جعفری

احمد پور سیال جھنگ
۳؍ اگست ۱۹۷۳ء
عزیز خالد صاحب، طول عمرہ
السلام علیکم!
فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم

آج حفیظ صدیقی صاحب سے خط ملا ہے وہ فرماتے ہیں کہ تحریریں کا خالد نمبر نکل رہا ہے۔ اس لئے کوئی نظم جو خالد سے تعلق رکھتی ہو بھیج دیں۔ میں نے آپ کی کتابوں کے تبصرے بھیج رکھے ہیں۔ آپ انہیں یاد دہانی کرا دیں۔ ایک شعر کی تشریح بھی بھیج رہا ہوں یہ بھی انہیں اپنے دستِ مبارک سے بخش دیں۔

میری کتابوں کا تبصرہ بھی لکھ کر دے دیں۔ چھپ جائے گا اور میری روح کو تسکین حاصل ہو گی۔ یہ آپ کا عین فرض ہے۔

کبیر انور جعفری

خلیل الرحمٰن اعظمی

شعبۂ اردو علیگڑھ
۱۰ر نومبر ۱۹۶۱ء

محبِ مکرم
تسلیمات

آپ کی تصانیف "سرودِ رفتہ" اور "سلومی" بہت پہلے موصول ہوئی تھیں۔ ان کی رسید میں نے ناظرین کی معرفت آپ کو دیدی تھی۔ البتہ "دکانِ شیشہ گر" جو چند ماہ پہلے موصول ہوئی اس کے بارے میں آپ کو نہ لکھ سکا۔ "زنجیر رم آہو" کا ایک نسخہ آپ کا بھیجا ہوا ملا تھا اور ایک انجمن ترقی اردو کی طرف سے تبصرے کے لئے آیا۔ تبصرہ میں نے لکھ دیا ہے جو غالباً ۱۵ر نومبر کے "ہماری زبان" میں شائع ہوا۔ اس تبصرے کی ایک کاپی آپ کو بھیجدوں گا۔ "غزل الغزلات" مجھے نہیں ملی اس کے پڑھنے کا اشتیاق ہے۔

آپ اپنے فن کے لئے جو ریاضت کر رہے ہیں وہ ہر طرح قابلِ داد ہے۔ ہمارے شاعروں اور شعر کے قارئین میں سہل انگاری کی روایت عام رہی ہے۔ اس لئے آپ کے شعری اکتسابات اگر فوری مقبولیت نہ حاصل کرسکیں تو آپ پرواہ نہ کیجئے۔ اس طرح کے کارناموں کی قدر و قیمت کے پرکھنے میں عموماً دیر لگتی ہے۔

آپ کا
خلیل الرحمٰن اعظمی

غلام جیلانی اصغر

سرگودھا اکادمی
۲ر جولائی ۲ء

برادرِ مکرم جناب خالد صاحب!

کچھ لوگ پہلی ملاقات میں ہی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ آپ انسانوں کی اس خوش نصیب نوع سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ اب تو Generic ناموں کا دور ہے اس لئے آپ کا اصلی نام خوب چلے گا۔ آپ سے پہلی ملاقات لاہور آپ سے دفتر میں ہوئی۔ اور جب وہاں سے اٹھا تو یوں محسوس ہوا جیسے جنم جنم کے پرانے ساتھی سے مل کر آیا ہوں۔ شاعروں سے عام طور پر مل کر کوفت ہوتی ہے۔ لیکن خدا جانے آپ کے خمیر میں (یہ ضمیر نہیں ہے) کتنی ملائمتیں اور شرافتیں بھر دی گئی ہیں کہ آپ سے ہر دفعہ ملنے کے بعد دوبارہ ملنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ تعریف نہیں کیونکہ میں طبعاً طنز نگار ہوں۔ آپکی تعریف سے بھی طبعی طور پر گریز کرتا ہوں۔

سلام خلوص
نیاز مند
غلام جیلانی اصغر

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

گورنمنٹ کالج لائلپور
۱۲؍فروری ۱۹۷۴ء

خالد صاحب قبلہ
تسلیم

میں حال ہی میں لاہور سے نئی ذمہ داری پر یہاں آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا کہ چند روز ہوئے آپ لائلپور تشریف لائے تھے۔ میں اہلیہ کی علالت کے باعث اس روز لاہور گیا ہوا تھا، نیاز سے محروم رہا۔

آج اخبار سے 'پرواز عقاب' پر ادبی انعام کی خبر نظر سے گذری، بے حد مسرت ہوئی۔ آپ کی علمی اور نثری خدمات، اس نوع کے اعزازات سے کہیں بلند تر ہیں۔ اس سے یہ ضرور ہوا کہ بجائے خود انعام کی توقیر بڑھ گئی۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

نیاز مند
معین الرحمٰن

حکیم آفتاب احمد قرشی

لاہور
۲۸-۳-۷۴

محب گرامی، السلام علیکم۔

استاذ مکرم پروفیسر حمید احمد خاں کے تعزیتی جلسے میں آپ نے جو دلفگار نظم پڑھی اس کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا کیا پُردرد مرثیہ تھا جس میں استاد مرحوم کے اوصاف حمیدہ اور کمالاتِ انسانی کی تصویر آپ نے کھینچی تھی۔ آپ سے یہ درخواست ہے کہ اس نظم کی ایک نقل ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو بھجوا دیں۔ کئی بار آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے مگر آپ کی سرکاری مصروفیات کے پیشِ نظر رک جاتا ہوں۔

خیر طلب
آفتاب احمد قرشی

ارشاد احمد حقانی

فرانس
۱۴ ستمبر ۱۹۷۳ء
برادرِ عزیز و محترم!

چھ ستمبر کو لاہور کے ہوائی اڈہ پر آپ سے الوداعی ملاقات کی حسرت دل میں لئے دیارِ فرنگ کو روانہ ہوا۔ سات کو کراچی سے سحر پرواز ہوا اور قاہرہ اور روم ہوتا ہوا پیرس کے اورلی ائرپورٹ پر پاکستان کے وقت کے مطابق ۷/۲۰ پر اور پیرس کے وقت کے مطابق ۳/۲۰ پر اتر گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ اس عروس البلاد میں گزارا۔ یوں تو پوری دنیائے مغرب کی بہاریں دیدنی ہیں گفتنی یا شنیدنی نہیں لیکن پیرس خاص طور پر دیکھنے کے لائق شہر ہے۔ مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ یہ شہر اس قدر حسین، دلکش اور نظرنواز ہے۔ ہر قدم پر تاریخی آثار ہیں۔ ہر موڑ پر فرانسیسی قوم کی عظمت، ذوقِ جمال، ہنرمندی اور ہوشمندی کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ ادب، فنِ تعمیر، فنونِ لطیفہ، تاریخ، سائنس کے خزانے جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ اتنے میوزیم ہیں کہ ان سب کو دیکھنا تو درکنار، شمار کرنا بھی آسان نہیں۔ دنیا کا کوئی علم نہیں جس کے بارے میں کوئی نہایت بلند پایہ مرکزِ علم و تحقیق یہاں موجود نہیں۔ زندگی میں نفاست، نظم و ضبط، حسنِ اخلاق، پابندیٔ اوقات، خوش معاشگی کی کارفرمائی اسقدر نمایاں ہے کہ اسے دیکھنے اور سمجھنے کے لئے غیر معمولی ذہانت یا فراست کی ضرورت نہیں۔ اپنی مصروفیات اور وقت کی کمی کے باعث میں بہت کم چیزیں دیکھ سکا ہوں۔ اس کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے

خاکسار
ارشاد

ڈاکٹر سلیم فاروقی

لاہور
۲۳ - ۳ -
مکرمی، السلام علیکم

آپ نے جس طور اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے۔ اُس سے بہت متاثر ہوا ہوں ——— دنیا میں بہت سے شخص بے مقصد آتے زندہ رہتے اور مر جاتے ہیں۔ بعض کے لئے وقتی خواہشات کی تسکین ہی زندگی کا مدعا ہوتی ہے ——— ایسے لوگ بھی ہیں جو ان سے اعلیٰ مقاصد کا تعین کر کے اُن کے حصول کے لئے تگ و دو کرتے ہیں —— ہم اپنی زندگی میں اپنے رجحانات اور بہی خواہوں کے کہنے ایک راہ پر ہو لیتے ہیں۔ اگر متعین منزل کو پالیا تو کامیاب کہلائے لیکن اگر کسی اور جانب چل دیئے تو پھر اپنی ناکامی پر آنسو بہایا کیے۔ اور اپنے "مقاصد میں ہزیمت" پر اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر انسان اپنے اعمال پر مطمئن ہے تو پھر اسے اپنے تعین کردہ مقاصد میں ناکامی سے ملول نہیں ہونا چاہیئے ——— بحیثیت انسان کے ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ ہم کس کام کے لئے موزوں ترین ہیں۔ کون ہے جو وثوق سے کہہ سکے کہ وہ معاشرہ میں فلاں مقام پر ضرور جا متمکن ہو گا ——— کتنے ہیں جنہوں نے جو چاہا پالیا۔

اِن حالات میں "مقاصد" سے مراد مخصوص مراتب کا حصول نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ چند اصولوں کو حرزِ جاں بنالیا جائے۔ اور جس انسانیت بھی حیات کی تشکیل کا سامان کرنا پڑے ان اصولوں کے تحت زندگی گزار دی جائے۔ قدرت ایک انسان سے یہی توقع کرتی ہے ——— ہم مذاہب کی نوعیت کے بارے مسئول نہیں ہیں مگر ہر مذہب سے متعلقہ فرائض کی انجام دہی ہمارے ذمہ ہے ———

— تو پھر آپ کا یوں سوگوار ہونا عبث نہیں تو اور کیا ہے ——— آپ کو میرے خلوص میں شبہ ہے۔ "آپ بے حجابانہ مراسم کے باوجود بیگانگی کے قائل ہیں" "آپ کو مجھ سے گلہ کا حق نہیں پہنچتا" ———

مجھے اپنے کردار پر زعم نہیں مگر اپنے خلوص پر یقین ضرور ہے — یہ دل کی اقلیم کی شے ہے۔ اگر الفاظ کی مرہونِ منت ہوتی تو کچھ کہتا بھی۔ زندگی جوں توں بیتے جائے ہے۔ وہی ہم ہیں شب و روز کا تسلسل۔ اگرچہ میرا ماحول شعر نواز نہیں مگر پھر بھی کبھی کبھی دو ایک ٹیڑھی لکیریں کھینچ لیتا ہوں۔ آپ کے تفننِ طبع کیلئے یہ اشعار درج ذیل ہیں۔

مسکراتا ہوں غم گساروں پہ
غم کی کیا کیا ہنسی اڑاتے ہیں
میرے زخموں کو یوں نہ سہلاؤ
آپ ناحق مجھے رلاتے ہیں
چشمِ پرنم کو کوسنے والو
کیا خزاں میں بھی چہچہاتے ہیں
رہنماؤ ذرا سنبھل جانا
پھر مرے پاؤں ڈگمگاتے ہیں
لو تمناؤ الوداعی سلام
اب ستارے بھی ٹمٹماتے ہیں
کس کی آمد سے کلیاں چٹکی ہیں
کیف زا نغمے سرسراتے ہیں
اے متاعِ دل و جگر ہشیار
دیکھنا وہ قریب آتے ہیں
جذبۂ عشق آبرو رکھنا
آج وہ ہم کو آزماتے ہیں

میں ہفتہ عشرہ کے لئے گھر گیا ہوا تھا۔ واپس لوٹا تو آپ کا مکتوب گرامی ملا۔ محمود صاحب کو آپ کا سلام شوق پہنچا دیا۔ بھلا ہمیں کب ہے کو ناگوار گذرنے لگا۔ ہاں یہ غنیمت ہے کہ اس توسل سے آپ ہمیں یاد کر لینے کا گناہ کر بیٹھے۔ محمد صاحب جواباً ہدیۂ نیاز پیش کرتے ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ مختلف ماحول سے پیدا شدہ تاثرات، تجربات، اور فطری میلانات کے باعث ہمارا ذہن مختلف سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ اور اگر پرانے رفقاء سے گاہے بگاہے تعلقات کی تجدید اور تبادلۂ افکار نہ کیا جا سکے تو یہ

بے ربطی غلط فہمی سی پیدا کر دیتی ہے ۔ شاید یہی خارجی اثرات ہمارے مابین اس حجاب اور بُعد کا باعث بنے ہیں ــــــ لیکن اس کے قطع نظر میرا جذبۂ ارادت جیسا پہلے تھا اب بھی ہے ۔ واقعتاً زندگی کا جو دور آپ ایسے احباب کے ساتھ اکٹھے گزارا اس کے نقوش وقت کی گرد سے اٹ سکتے ہیں، مٹ نہیں سکتے ۔

زندگی برسے ہوئے ابر کی مانند اُداس
آج بھی گذرے ہوئے وقت کی راہ تکتی ہے

والسلام
محمد سلیم فاروقی
ایم بی بی ایس (سٹوڈنٹ)

ڈاکٹر سلیم فاروقی

بہت دنوں میں محبت کو ہو سکا معلوم
یہی کہ تجھ کو ضرورت نہیں محبت کی

تمہیں گمان جفا ہے مری خطاؤں پہ
مرے خلوص کی تذلیل اور کیا ہوگی

محمد سلیم فاروقی

قمر جمیل

دریافت کراچی

محترمی عبدالعزیز خالد صاحب! تسلیم

جب میں آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں تو میرے سامنے ہی اشد نامی ایک طالب علم فارقلیط کا ذکر کر رہا ہے ۔ بڑی خوشی ہے کہ نئی نسل فارقلیط سے اس درجہ دلچسپی رکھتی ہے ۔ احمد ہمیش میرے ساتھ اس ادارہ کے اعزازی لوگوں میں ہیں تسلیم یزدانی بھی ۔ ان سے بھی آپ کا ذکر بہت رہتا ہے ۔

احمد ہمیش آپ سے دریافت کے سلسلے میں ملیں گے ۔ مجھے امید ہے آپ دریافت کو اپنی تازہ نظم ضرور بھیجیں گے ۔ پہلا شمارہ مئی میں آئے گا ہاں مگر آپ کا تعاون بھی ضروری ہے ۔ یعنی احمد ہمیش کو نظم عنایت کر دیجئے گا ۔ فرصت نہ ہو تو ادارہ کے پتہ پر بھیج دیجئے ۔

قمر جمیل

محمد علی صدیقی

کراچی

۱۵، مارچ ۷۵ء

برادرم!

عبدالعزیز خالد صاحب!

کراچی پر جنگ میں آپ کی ایک نظم بھی پڑھی۔ کیا خوبصورت نظم ہے۔ آپکی کراچی کے لئے محبت مسلّم امر ہے، لیکن اس نظم میں جس بے ساختگی کے ساتھ آپ کی محبت (چاہے یادِ رفتگاں کے حوالے سے ہے) نئے اخبار کے صفحات سے قارئین کے دلوں کی طرف سفر کیا ہے اور یہ شہر اب زیادہ اچھا لگنے لگا ہے۔

آپ کا اپنا
محمد علی صدیقی

عبدالباقی

اسلام آباد

۱۲ فروری ۷۵ء

محبی و مکرمی زاد لطفہٗ

سلامِ مسنون

اپنے اُستادِ محترم مولوی عبدالقیوم خان باقیؔ مرحوم کی ایک تمنا کا آپ سے ذکر کرتا ہوں۔ ان کی فرمائش تھی کہ میں فاوسٹ کا حصہ دوم نظم کروں۔ اس طرح یہ کام اردو میں پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ محترم استاذی نے فاوسٹ کا حصہ اول نظم کیا ہے۔ جو ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اردو میں ان کو معلوم تھا کہ عمران کے ساتھ وفا نہ کرے گی۔ اس لئے انہوں نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی۔ وہ میری کم استعدادی کے عذر کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سوائے آپ کے اس سنگِ گراں کو اور کوئی اٹھا نہیں سکتا۔ میں اگر اس سے ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان بھی دیدوں تو اسے ایک انچ اپنی جگہ سے ہلا نہ سکوں گا۔

فاوسٹ کا منظوم ترجمہ حصہ اول اگر آپ کے پاس نہ ہو تو میں ایک نسخہ ساتھ لیتا آؤں گا۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہونچا دیں۔ تاکہ اردو میں لٹریچر کا یہ انمول موتی اپنی جگہ پائے۔

مخلص،

عبدالباقی

عبدالعزیز کمال

عالم ہاؤس سرگودھا
۱۵-۷-۷۴

شاعرِ نعت رسالت مآب
السلام علیکم رحمۃ اللہ

میں آپ کا بھائی عبدالعزیز کمال آپ سے مخاطب ہوں ۔ بھائی اس لئے کہ آپ کی سرگزشت "دریا بہ خود" اپنی ہی سرگزشت معلوم ہوتی ہے ۔ بالکل ساو مجنوں ہم سبق بودیم والی بات ہے ۔ آپ نے جن چوہدری محمد اکبر صاحب کا ذکر کیا ہے وہ میرے بھی محسن، مربی اور استاد تھے ۔ ان کی "درسِ حیات" میرے لئے بھی درسِ حیات ثابت ہوئی ۔ اگر جانے بہ تن داری تیری کا سبق انہی کی صحبت میں پڑھا ۔ چوہدری صاحب کا انتقال سقوطِ ڈھاکہ کے کوئی ایک ماہ بعد ہوا ۔ اور خاتمہ بالخیر تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمہ پر ۔ اپنی وصیت میں اس عاجز کو اپنا علمی وارث قرار دے گئے ہیں ۔ اللہ مدد کرے ۔

چوہدری صاحب مرحوم ننکل انبیاء میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے ہیں ۔ چوہدری رحمت علی صاحب کا ذکر خیر کئی بار ان کی زبان سے سُنا ۔ ننکل انبیاء کے ان کے چار سال کئی لحاظ سے اہم اور یادگار تھے ۔ وہاں کے اساتذہ کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے ۔ میں مرے کالج سیالکوٹ سے بی اے کرنے کے بعد ٹریننگ کالج میں داخل ہوا تو بر باد پندرہ روز کے بعد اپنے ہم جماعت دوستوں اصغر سودائی اور بشیر احمد ارشد سے ملنے اسلامیہ کالج آتا تھا ۔ یہ لوگ ان دنوں زیرِ تعمیر ہوسٹل کی وجہ خیموں میں رہتے تھے ۔ مبارک مسجد میں مولانا حنیف ندوی کا درس میں نے بھی سُنا ہے ۔

ادبی دنیا میں مولانا حامد علی (الحمراء) جناب رفیق خاور (ماہِ نو) اور ناصر کاظمی (ہمایوں) کی معرفت روشناس ہوا ۔ الحمراء میں میرے مضامین اقبال ۔ سلیمان ندوی گرامی ۔ کے متعلق چھپے ۔ ماہِ نو میں رپورتاژ اور ہمایوں میں تدریس ریاضی کے علاوہ میتھو آرنلڈ کے ترجمے ۔

کے ۔ ایل گابا کی ... OF THE DESERT ایف اے کے زمانہ میں خریدی ۔ لاہور آیا تو علامہ اقبال کا مزار زیرِ تعمیر تھا وہاں حاضری دی ۔ اساتذہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ سے ملا ۔ اور ان کی وساطت سے یونیورسٹی بزمِ ادب کی محفلوں میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، پروفیسر ... ، عبادت بریلوی، عابد علی عابد سے شناسائی ہوئی ۔ ایک روز ڈاکٹر سید عبداللہ پوچھنے لگے کوئی گیم بھی کھیلتے ہو، عرض کیا بالکل پھسڈی ہوں ۔ بعد ازاں ایم اے (انگلش) اور پھر ایم اے (فلسفہ) کا

امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ آجکل پی اے ایف سرگودھا میں انگریزی کا استاد ہوں۔ شاہین بچوں کی نور و پرداخت پر توجہ صرف ہوتی ہے۔ کوشش ہوتی ہے کہ یہ بچے مسلمان کا جذبہ لیکر اور دین و ملت کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر یہاں سے نکلیں اور خاکبازی کی بجائے آسمان و زمین کو شعار بنائیں۔

آپ نے حضور رسالت مآبؐ کی نعت گوئی میں جو کمال کیا ہے اسی کی بدولت عزیز جہاں ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کی دین ہے اس میں آپ کے خلوص اور محنت کے علاوہ اللہ پاک کے فضل و کرم کا بڑا دخل ہے اور حقیقت ہے بھی یہی۔ آں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است۔ اپنے چھوٹے بھائی اسلم کمال کے ساتھ آپ سے ملاقات کا پروگرام بھی بنایا مگر سرگودھا جلد واپس جانا پڑا۔ سال میں ایک آدھ دفعہ لاہور آتا ہوں دیکھیں کب ملاقات ہوتی ہے۔

خیر اندیش
عبدالعزیز کمال

کالیداس گپتا

نیروبی
۲۶-۷-۶۸

جناب عبدالعزیز خالد صاحب!
تسلیم

آپ یہ خط پڑھ کر متعجب نہ ہوں۔ میں قبلہ جوشؔ ملسیانی صاحب کا ایک ادنیٰ شاگرد ہوں اور اپنی چالیس سالہ زندگی کے پچھلے بیس سال لگاتار نیروبی۔ کینیا۔ مشرقی افریقہ میں گذار چکا ہوں۔ آج اتفاقاً میرے ایک دوست نے مجھے "شاعر" بمبئی کے پرچے برائے مطالعہ دئے۔ شمارہ نمبر ۱۲۔ ۱۹۶۷ء میں آپ کی کتاب "لحنِ صریر" پر ایک تبصرہ دیکھ۔ یقین نہ آیا کہ "شاعر" نے آپ کی رُباعیوں کے چھ مختلف مصرعوں کو خارج از وزن گردانا ہے۔ حالانکہ وہ سب درست اور بجا ہیں۔ بہرحال میں نے آج رسالہ "شاعر" کو بھی اس غلطی پر بالتفصیل خط لکھ دیا ہے۔ جس میں ملا جامی کی مثالوں اور متعلقہ اوزان سے (جن پر مصرعوں کو جانچنا اور تولنا چاہئے) واضح کر دیا گیا ہے کہ سب مصرعے عین رُباعی کے اوزان اور قیود میں رہ کر فکر کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے وہ میرا خط شائع کر دیں۔ آپ منتظر رہیں۔

میرا تعلق ایک عرصے سے ہندوستان اور پاکستان کی اردو دان پبلک سے نہیں ہے اور یہاں افریقہ میں تو کوئی رسالہ بھی شاذ و نادر ہی ملتا ہے جس سے تشنگیٔ ادب کو بجھایا جا سکے۔ گذشتہ بیس سال سے افریقہ میں رہ کر جو کچھ بھی میں نے فکر کیا ہے وہ جلد ہی "شعلۂ خاموش" کے نام سے مارکیٹ میں آ رہا ہے۔ اس وقت بمبئی میں کسی دوست کے ذریعے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ ویسے میں نے رسالوں اور اخباروں کے ذریعے جو کچھ لکھا ہے وہ محض نہ کے برابر ہے۔ اس لئے اگر میں شاعر ہوں تو "گمنامِ محض" ہوں۔ مگر فنِ شعر کو میں نے سیکھنے کی طرح سیکھا ہے۔

خادمِ اردو
کالیداس گپتا — رضا

ماہنامہ تحریریں، لاہور

سلمان الارشد

الشجاع کراچی

۶، دسمبر ۱۹۶۲ء

برادرِ مکرم، سلام مسنون

اس ملک میں ایک وصیت ... کی ... سے محروم ہے۔ میری ذات سے تو کوئی ... ہیں۔ پھر آپ نے مجھے کیوں ... آپ کی ... کا مجھے اندازہ ہے اس کے باوجود گلہ ہے تو الشجاع کو لوٹا دیں۔

مخلص

سلمان الارشد

سلمان الارشد

الشجاع کراچی
۱۳ اپریل ۶۲ء
برادر مکرم سلام مسنون

آپکی شرافتِ نفس، پاکیزہ روشی، بلند خیالی اور اخلاص نے مجھے بے انتہا متاثر کیا ہے اور یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اس دن پہلی بار ملے تھے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے برسوں کی رفاقت ہے۔ پہلی ملاقات کے بعد تشنگی کا شدید احساس تھا۔ آپ تشریف بھی لائے اور میں نہیں ملا مجھے اس بات سے تکلیف پہنچی۔ بہرنوع اگر زندہ رہا تو اخلاص و محبت کی چھٹکی ہوئی چاندنی میں پھر کچھ وقت گذارنے کا موقع ملے گا۔

نیاز آگیں
سلمان الارشد

شمس احسان قادر

لاہور
۱۵؍مئی ۷۳ء

گرامی قدر

ایک مردِ مومن، ایک عظیم شخصیت اور ایک بہت نامور ادیب کے لئے نیازمند کے پاس نہ تو الفاظ ہیں اور نہ ہی قلم میں جرأت ہے کہ انکی تشریف آوری اور انکی تصانیف گہرہائے گراں مایہ کا تحفہ کا اظہارِ تشکر اور اظہارِ مسرت بیان کر سکوں۔ آپ کا تحفہ ایک ایسا قیمتی جوہر ہے اور ایک ایسی شمع ہے جو صراطِ مستقیم بنکر زندگی کی تاریک راہوں کو ہمیشہ منور کرتی رہیگی شکریہ ادا کرنا تو ایک رسما سی بات ہے۔ اسکی جزا تو سوائے پروردگار کے اور کوئی نہیں دے سکتا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نیازمند
شمس احسان قادر

ابن فرید

علی گڑھ

۱۷ر فروری ۷۶ء

گرامی قدر، السلام علیکم!

کئی برس ہوئے جب میں نے آپ کو کراچی کے پتہ پر ایک خط لکھا تھا۔ لیکن جواب نہ آیا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ آپ لاہور آ چکے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ "تحریریں" نے بھی خالد نمبر شائع کیا ہے۔ مبارکبا د قبول فرمائیے۔ میں تو سیارہ کا خالد نمبر بھی نہ دیکھ پایا تھا۔ اس کا مطالعہ بھی شاید نہ کر سکوں گا۔ بہرحال آپ سے جو ربط رہا ہے۔ اُس کی بنیاد پر اظہارِ مسرت تو کر ہی سکتا ہوں۔

والسلام

ابن فرید

باقر مہدی

بمبئی
۲۸ - ۹ - ۶۳

خالد صاحب تسلیم و نیاز

آپ کا خط ملا تھا اور جب میں نے جواب کیلئے تلاش کرنا چاہا تو نہ جانے کہاں کاغذات میں گم ہو گیا کہ بہت تلاش کرنے کے بعد بھی نہیں ملا۔ اس لئے میں انتظار کرتا رہا کہ آپ کراچی پہنچیں تو خط لکھوں۔ میرا خیال ہے کہ میرا خط پہنچنے تک آپ آ چکے ہوں گے۔

بیدی کی سالگرہ پر ایک شاندار دعوت ہوئی تھی وہ بقول بیدی کے خالد کی نذر ہو گئی۔ یعنی مجروح سے آپ کی شاعری پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ وہ اب میرا مضمون لے گئے ہیں کہ اپنی رائے پر نظر ثانی کر سکیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کلکِ موج انھیں بھیج دیں۔ وہ غزل کے آدمی ہیں اسے پسند کریں گے۔ میں نے آپ کی چند کتابیں محور اور تلاش کو تبصرے کے لئے دیدی تھیں۔ محور نے آپ کو خط بھی لکھا تھا شاید ملا ہوگا۔

آج شب یگانہ منائی جا رہی ہے۔ میں ان کی شاعری پر ایک مختصر مضمون پڑھوں گا۔ سردار جعفری تقریر کریں گے مجروح صدارت۔ کچھ فلمی میوزک ڈائریکٹر غزلیں گائیں گے۔ ممکن ہے میرے مضمون کی وجہ سے چھوٹا سا ہنگامہ بھی ہو جائے کیونکہ میرا خیال ہے کہ سرسید اور ترقی پسند دونوں تحریکوں نے یگانہ کے پائے کا غزل گو شاعر پیدا نہیں کیا بلکہ میر اور غالب کے بعد تیسرا غزل گو شاعر یگانہ ہی ہے۔ ظاہر ہے اس رائے سے سب کو اختلاف ہوگا۔

آپ کا
باقر مہدی

باقر مہدی

بمبئی

۶۴-۸-۱۱

خالد صاحب تسلیم و نیاز

ایک زمانہ گذر گیا لمحے اتنی تیزی سے روز و شب میں تبدیل ہوتے گئے کہ یقین نہیں آتا اور آج بھی وہی عالم ہے، سوچا تھا کہ اگر رجائیت نہ سہی تو امید کی کرن ہی زندگی میں آجائے تو آپ کو تفصیلی خط لکھوں - میں یہ بھی مانتا تھا کہ ادب رجائیت کا سرچشمہ ہے مگر اب میری رائے کچھ مختلف ہے - ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ غم سے نجات ممکن نہیں ہے - کسی سے شکایت کیا کروں کہ خود ہی یہ درد مول لیا ہے اور اس کی 'سزا' مل رہی ہے - تنگدستی میں شغل ادب اور بھی مہلک ہو جاتا ہے - ہر رات کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے سوتا ہوں اور صبح اٹھ کر سوچتا ہوں کہ باہر کی دنیا سے میرا کیا تعلق ہے تو یہ تعلق پیدا کرنے کے لئے بھی کتابوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس طرح کتابیں کمزوری بن جاتی ہیں - ہمارا دور بھی انتہائی موذی ہے جو سرکشی اور احساس جرم کو ایک ساتھ رگِ جاں سے پیوست کر دیتا ہے اور ممکن ہے مجھے یہ محسوس ہوتا رہا ہے - غرضیکہ اب تو یہ معمول بن گیا ہے کہ صبح و شام کا فرق گیا بس ایک نیم دیوانگی ہر جگہ لئے پھرتی ہے جیسا کہ کبھی کہا تھا -

مفلسی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا   ایک دیوانگی ہی ساتھ رہی

بمبئی سے تابش سلیم اور گرلش چندر ایک رسالہ 'اظہار' نکال رہے ہیں جس کے سلسلے میں جلد ہی آپ کو خط لکھا جائے گا - اس کا پہلا شمارہ "جدید شعری ذہن نمبر" ہوگا - میں اس کے حصہ نثر کی ترتیب کر دوں گا - اس کے لئے چند نظمیں لکھوں گا - اطالوی شاعر جیکو سے ۵۹ء میں نوبل پرائز ملا تھا اس کی چند نظموں کا ترجمہ کر رہا ہوں - ادھر زیادہ تر نثر پڑھتا رہا - کئی اچھی کتابیں پڑھیں - HOW IT IS BY SAMUEL BECKETT کا نیا ناول ایک بہت اہم تجربہ ہے اس کے علاوہ شیکسپیئر کی کتاب دیکھیں -

اس بات کو ایک مدت گذر گئی مگر مجھے ندامت ہے کہ آپ کے انتخاب کلام کو مکمل کر کے نہ بھیج سکا - بات یہ ہے کہ میں اپنے معیار کے مطابق انتخاب کروں تو وہ ناشر کو پسند نہ آئے گا اور اگر صرف آسان انداز بیان کا خیال رکھوں تو مجھے کھلے گا - پھر بھی آپ لکھیں تو جیسا بھی ہو سکا فوراً بھیج دوں گا -

آپ کا

باقر مہدی

باقر مہدی

بمبئی
۱۰-۶-۶۷

خالد صاحب

ایسا بھی کیا آپ خفا ہو گئے کہ کتابوں کی رسید تک نہیں بھیجی۔ اگر میری کتاب پسند نہیں آئی تو بیدی کی کتاب کی رسید بھیج دیجئے! بمبئی میں کل سے برسات کا موسم شروع ہو گیا ہے آخر کار گرمی سے نجات ملی ہے مگر یہاں اتنی طوفانی بارش ہوتی ہے کہ کہیں آنا جانا مشکل ہے۔ میں تو یوں بھی درق بے حد ضروری کام سے ہی "کھولی" کے باہر نکلتا ہوں ورنہ کتابوں میں غرق رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لئے کہ آخر کتابیں بھی تو دوستوں کی طرح بے رخی برتتی ہیں۔ پھر بھی وہ کم از کم ذہنی تکلیف کا باعث نہیں ہوتیں۔

آپ کے خط کا شدید انتظار رہے۔ یوں بھی تو آپ صرف چند جملے لکھتے تھے۔ اور کیا اب میں ان سے بھی محروم رہوں گا اور مرزا غالب کا یہ شعر پڑھتا رہوں گا ؎

اب تغافل سے بھی محروم ہیں اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

آپ کا خیر اندیش
باقر مہدی

باقر مہدی

بمبئی (انڈیا)

۲۶-۱۰

خالد صاحب!

تسلیم و نیاز

آپ کا گرامی نامہ ملا۔

اس سے پہلے کوئی خط نہیں ملا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ جواب نہ دیتا۔ میں نے خط اس لئے نہیں لکھا کہ ایک بے معنی جمودی دور سے گذر رہا ہوں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے اب پڑھتا بھی نہیں ہوں اور فلسفہ (خاصکر اخلاقیات) عمرانیات اور سیاسیات کی دنیا میں چکر لگا رہا ہوں — خیر

اردو میں لکھنا آج کے دور میں تقریباً ناممکن سا نظر آتا ہے۔ یہی نہیں کہ یہاں زبان کا کوئی مستقبل نہیں ہے بلکہ جو چند رسائل ہیں ان میں اشاعت ادبی گروہ بندی کی وجہ سے ہوتی ہے اور میں اتنا بھی گیا گذرا نہیں ہوں کہ ان حرکتوں پر اُتر آؤں جو جمیل جالبی، وزیر آغا یا شمس الرحمٰن فاروقی کرتے رہے ہیں۔ بہرحال کچھ حالات ناگفتہ بہ ہیں اور کچھ مزاج خوشامدانہ نہیں ہے ایسی صورت میں اردو میں کیا اور کیوں لکھوں؟

آپ کا خیر طلب

باقر مہدی

باقر مہدی

بمبئی
۱-۴-۷۰

برادرم تسلیم و نیاز

آپ کا گرامی نامہ ملا اور اس سے پہلے کتابیں اور سیارہ ملا تھا۔ ان عنایات کے لئے بے حد شکر گذار ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے سیارہ میں شرکت کیوں نہ کی آپکی شخصیت پر دلچسپ مضمون لکھا جا سکتا تھا مگر شاید سیارہ اسے شائع نہ کرتا۔ اس لئے کہ اپنی ساری شدید مذہبیت کے باوجود میں آپ کو خاصا آزاد خیال شاعر سمجھتا ہوں اور اسی لئے آپ سے تعلق خاطر ہے۔ آپکی نئی کتاب 'مزمورِ میر مغنی' تو نہایت عربی زدہ ہے اور میری سمجھ سے بالا تر اسلئے کیا رائے دوں

آپ کا خیر اندیش
باقر مہدی

اظہر جاوید

تخلیق لاہور

مکرمی خالد صاحب۔

"تحریریں کے خالد نمبر پر میری طرف سے مبارک قبول فرمائیں۔ رب العزت آپ کی محنتوں کو مزید ثمر بار کرے اور دوستوں کی محبتوں کو استوار۔

آپ کا
اظہر جاوید   ۵-۳-۰۵

ریاض حسین چودھری

شہرِ سوگوار
۲۳ دسمبر ۱۹۷۱ء
جناب عبدالعزیز خالد صاحب!
السلام علیکم

آج "مشرق" میں آپ کی نظم "یا رحمۃ للعالمین" دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ع بکھری پڑی ہیں آبروئے رفتگاں کی دھجیاں

خالد صاحب یہ کیا ہوا، قیامت گذر گئی اور ہم زندہ ہیں ؂

اس کا ٹھکانہ اب تیرے در کے سوا کوئی نہیں
اس ارضِ بے برگ و نوا کا ہمنوا کوئی نہیں

یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آج بھی ہم رہنمائی کے لئے درِ مصطفٰے پر دستک نہیں دے رہے۔ اور غیروں کی امداد کے آسرے ڈھونڈ رہے ہیں۔ خون رگِ جاں کی ایک نظم، استغاثہ اور جواب استغاثہ میں دربارِ رسالت سے ارشاد ہوتا ہے ؂

غیر کی امداد کے طالب نہ تم ہوتے کبھی
کچھ بھی ناموسِ پیمبر کا اگر ہوتا خیال

کیا ہم ناموسِ پیمبر سے یونہی کھیلتے رہیں گے؟

ریاض حسین چودھری

شکیل عادل زادہ

سب رنگ، کراچی
۶-۱۱-۷۲
شاعرِ اعظم! آداب

آج آپ بہت یاد آئے۔
بس یونہی میں نے سوچا آپ کو سلام لکھوں۔
سو میرے سلام، سو میری تمنائیں!

شکیل عادل زادہ

سلطان رشک

نیرنگ خیال راولپنڈی
۲۱-۱۱-۷۲

محترم و مکرم خالد صاحب
سلام مسنون

بعض اوقات بڑے دلچسپ اتفاقات ہوتے ہیں۔ مثلاً میں آپ سے ملنے کی خواہش لئے لاہور گیا۔ پتہ چلا کہ آپ عازم اسلام آباد ہو گئے ہیں۔ اور یہ بات بھی پنڈی آکر پتہ چلی ضمیر جعفری صاحب کی زبانی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ آپ نے دو تازہ اور زور دار غزلیں بھی کہی ہیں۔ براہِ کرم وہ بلا تاخیر مجھے بھجوا دیجئے۔ تاکہ میں خود بھی لطف اندوز ہو سکوں اور قارئین "نیرنگِ خیال" کی بھی نذر کر سکوں۔

یقین جانیئے مجھے آپ کے فن اور شخصیت سے عقیدت ہے۔ اگرچہ ملاقاتیں کم ہیں تاہم تاثر گہرا۔ آپ کے دونوں خط ملے، بیحد شکریہ۔ اب آپ جب بھی پنڈی آئیں مجھے لاہور ہی سے یا تو خط لکھ دیجئے یا پھر فون کر دیجئے۔ میں غریب خانے پر (جو واقعی غریب خانہ ہے) چند احباب کو بھی آپ کے ہمراہ مدعو کرنا چاہتا ہوں۔ نیرنگ خیال کے لئے تخلیقات بھجوانا نہ بھولئے۔

نیاز مند
سلطان رشک

غلام غوث ٥

ساہیوال
۲۹-۱۳-

عزیزم عزیز صاحب !
السلام علیکم

آپ کی فرستادہ کتب موصول ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ۔ اکثر اُن کے مطالعہ میں وقت گذرتا ہے کم لیاقت ہونے کی وجہ سے دوسروں کی امداد کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرے سکول میں ایک صاحب مولوی فاضل اور حافظ قرآن ہیں۔ اکثر اشکال ان کی مدد سے حل ہو جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ گھر میں بچے بھی ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کتب اُن کے ہاتھوں میں دیکھ کر مجھے دلی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ان میں اسلامی جذبہ بیدار ہوگا۔

سکول کے اساتذہ بھی بڑے شوق سے چیدہ چیدہ حصے پڑھتے ہیں کیونکہ بعض حصوں کے پڑھنے میں فی الحال انہیں دقت محسوس ہوتی ہے۔ انشاء اللہ تعالےٰ ایک دوسرے کی مدد سے ان حصوں پر بھی عبور حاصل ہو جائے گا۔ سب آپ کی بلند پایہ شخصیت، وسیع مطالعہ، مافوق العادہ ذہانت اور مختلف زبانوں میں اعلےٰ درجے کی مہارت اور قابلیت کی داد دیتے ہیں آپ نے فی الحقیقت اسلام کی ایک گرانقدر خدمت سرانجام دی ہے۔ اپنی صلاحیتیں، اپنے وسائل اور اپنی زندگی دین کیلئے وقف کر دی ہے۔ اور دین و دنیا کی سب سے بڑی سعادت حاصل کر لی ہے۔ آپ نے سلوک و طریقت کی کئی منزلیں طے کر لی ہیں۔ واقعی آپ عالم باعمل ہیں۔ آپ میرے عزیز ہیں۔ اس بے عمل کے لئے دُعا فرما دیا کریں۔ شاید آپ کا وسیلہ ہی نجات کی صورت پیدا کر دے۔

آپ کا خیر اندیش
غلام غوث

٥ جناب عبدالعزیز خالد کے سکول کے زمانے کے استاد

ماہنامہ تحریریں لاہور

عبدالسمیع بوبیرے

صبح امید۔ بمبئی
۱۸ر مئی ۷۶ء
مکرمی خالد صاحب!
تسلیم

آپ کا کلام اکثر پاکستانی رسائل میں نظر آتا ہے۔ حال ہی میں آپ کا کلام کسی رسالہ میں نظر سے گذرا۔ بہت ہی مرصع کلام ہے۔ خصوصاً یہ ذکر ہے

اجرِ احساں رائیگاں جاتا نہیں
مزرعِ نورِ سحر ہے دشتِ شام
پھر نئے کوہِ مہر سے صُبحِ اُمید
[illegible] ہو [illegible] مُدغم ہوتا

پسند آیا۔ اجازت ہو تو آپ کا یہ کلام صبح امید [illegible] کیا جائے۔

صبح امید بمبئی سے مسلسل ۲۰ سال سے باقاعدگی سے جاری ہے اور اردو ادب کی بے لوث خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اردو میں تعمیری ادب پیش کرنے کے ضمن میں اس نے افریقہ نمبر، مہاراشٹر نمبر حصہ اوّل و دوم، تجارت نمبر حصہ اول و دوم جیسے عظیم الشان نمبر شائع کیے۔

ساتھ ہی ساتھ ادب میں سلور جوبلی نمبر، اقبال نمبر، جگر نمبر کا بھی اضافہ کیا۔ اس مختصر سے تعارف کے بعد گذارش ہے کہ صبح امید کے لئے اپنی گرانقدر تحلیقات وقتاً فوقتاً ارسال فرمائیے۔ تصنیف لطیف، نار غلیط شائع ہوئی ہے۔ اگر آپ اسے صبح امید کے لئے بغرضِ تبصرہ ارسال فرمائیں تو بڑی خوشی ہوگی۔ براہ کرم نار قلیط ذریعہ رجسٹری ارسال فرمائیں تاکہ بحفاظت پہنچ سکے۔

آپ کا مخلص
عبدالسمیع بوبیرے

راحت افزا بخاری

لاہور
۱۲ر اکتوبر ۶۷ء
قابل صد احترام، عبدالعزیز خالد صاحب تسلیم

بہاولپور سے لاہور آئی تو گھر میں آپکی عظیم تخلیقات کو دیکھ کر جہاں دل سرشار ہوا وہاں کچھ یہ احساس بھی ہے کہ آپ کو بڑی تکلیف دی۔ اتنی اچھی اچھی کتابیں اور مجھے ایک ساتھ مل جائیں مجھے اپنی قسمت پہ رشک آنے لگا۔ اب تک پورے طور سے 'ورق ناخواندہ' پڑھی ہے۔ دراصل یہ دلآویز شاعری جتنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھی جائے اتنا ہی اس کا حسن اجاگر ہوتا ہے۔ میں تو یہ سوچ سوچکر حیران ہوتی ہوں کہ آپ نے یہ اشعار کہے کیسے۔ موجودہ دور کی مصروفیات میں شاید آپ کو پُرسکون پُراطمینان فضا میسر ہو جس میں آپ دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو کر ایسی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں فرشتوں کے پروں کی آواز اور خدا اور اس کے عظیم انسان اپنی کہانیاں آپ کو سناتے ہیں۔ اور آپ اس پیغام کو ایک حسین ایک انوکھا روپ دیکر ہم تک لاتے ہیں۔ تو ہمیں بھی وہی نوائے سروش وہی الہامی کہانیاں انھیں فضاؤں میں لیجاتی ہیں۔

موجودہ دور کی شاعری نے مجھے بہت مایوس کیا تھا۔ زندگی کا صرف ایک رخ ایک پہلو چاہے آفاق و کائنات کی وسعتوں کو اپنے اندر سمولے لیکن رہتا تو ایک ہی پہلو ہے۔ میر۔ غالب اور اقبال کے بعد ہمیں یعنی اردو ادب کو وہ شاعر ملا جس پر ہم پھر اپنا سر فخر سے بلند کر سکتے ہیں۔

فقط تابعدار
آپ کی بہن
راحت

عفت موہانی

حیدرآباد (۲)
اے۔پی۔انڈیا

خالد بھائی تسلیم و تکریم

گذشتہ جمعہ ہی کو آپ کا خط مجھے مل گیا تھا۔ مگر اپنے بخار اور درد سر کی وجہ سے میں آپ کو اتنے دن خط نہ لکھ سکی۔ خالد بھائی دیکھئے میرا دماغ اس قدر ناکارہ ہوگیا ہے۔ کہ اب اس کے بعد سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا لکھوں۔ حالانکہ جب تک آپ کا خط نہیں ملا تھا۔ میں سوچتی رہتی ہوں کہ یہ لکھوں گی وہ لکھوں گی۔ مگر سب بھول بھال گئی۔ دس بارہ دن پیشتر مظہر بھائی کا خط بھی ملا تھا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ میرے ریسرچ ختم کر دینے سے آپ نے نہایت تاسف کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے بھی بہت افسوس ظاہر کیا تھا۔ میں بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کا موقع آئے۔ مگر کیا کرتی۔ دوران سر کبھی تو کبھی اختلاج قلب۔ سوچنے لگی کہ اگر آخر تک کام نہ کر سکی، تو کیا ہوگا۔ پھر اس عرصہ میں کام بہت پھیل گیا اور ادھر میری پریشانیاں بھی بڑھتی گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں بوکھلا گئی۔ سپروائزر صاحب نے کہا ہے کہ میں نے چونکہ بی اے آنرز اور ایم اے سارے حیدرآباد میں ٹاپ کیا تھا۔ لہٰذا مجھے یہ رعایت دی جائے گی کہ اگر مجھے پھر اس کا آغاز کرنا چاہوں تو مجھے اپنا نامکمل تھیسس واپس مل جائے گا۔ آپ کی اور مظہر بھائی کی رائے بھی ہے تو یہی سہی۔ اب کی جولائی سے پھر شروع کر دوں گی! سالِ آغاز دو ہی ہیں، دسمبر یا پھر جولائی!۔

اور پھر ایک بات اور بھی ہے۔ جس نے مجھے دنیا اور دنیا کی ساری دلچسپیوں سے بیزار کر دیا ہے۔ وہی جس کا اظہار آپ نے کیا ہے کہ گوتم بدھ ساری عمر کسی کو مسرور دیکھنے کی آرزو میں سلگتا رہا۔ مجھ میں بھی یہی قنوطیت رچ گئی ہے۔ جب بھی کوئی آرزو دل میں جاگتی ہے۔ فوراً ہی شوپن ہائر میر وفانی کی روحیں مرثیہ پڑھتی نظر آتی ہیں کہ یہ سب کیا ہے کیوں ہے؟ بیکار کی دلچسپیاں، بیکار کا گورکھ دھندہ، لاکھ کچھ کیجئے۔ یہاں سے جانا تو برحق ہے۔ پھر سے

جب کارِ یہ دہر سے میں کوچ کروں گی
تب ذکر بھی میرا کسی محفل میں نہ ہوگا

نجانے کون کون سے خیالات ہیں، جو مجھے ستاتے ہیں خالد بھیا۔ اب غم نہیں غم روح کا اک نغمہ خاموش ہے۔ غم اس دنیا کی بنیاد ہے۔ سالِ نو محرم سے شروع ہوتا ہے۔ اور بے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی۔ یہ بات آپ نے بھی

سوچی ہے۔ ہم مرے سے جذبۂ تخلیق بھی مرجاتے گا۔ (خاکم بدہن۔ سات قرآن درمیان) اس احساس سے مفر نہیں ہے۔ اور یہ ہر جذبہ مجھ پر بڑی شدت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اعلیٰحضرت سرکار نظام کو دیکھئے۔ اُن کی پوری زندگی ایک کتاب ہے۔ مگر ویسے ہی مرگئے جیسے ایک مفلس اور بے دست و پا مرجاتا ہے۔ نہ تاج رہا، نہ تاجدار رہا۔ انکل شہزادوں کے اتالیق ہیں۔ اکثر وہ انکل سے ملنے غریب خانے پر بھی آجاتے ہیں۔ اس دن بھی پرنس نواز شن جاہ بہادر اور پرنس ذوالفقار جاہ اس طرح چنگھاڑیں مار مار کر روئے ہیں کہ زمین و آسمان ہل گئے۔ خالد بھیا۔ وہ تو بڑی اہم ہستی تھی پھر ــــ

مری رائیگاں زندگی کا بہاؤ
نہ مقصد نہ مصرف نہ منشاء کوئی

میری مجال نہیں کہ خدانخواستہ آپ کے سامنے فنا لبقاء کے مسئلہ پر گلفشانی کروں۔ مگر دل میں جو کچھ آیا۔ دہ لکھ دیا۔ شاید یونہی دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ ورنہ میری کھوپڑی ایسے ہی باطل خیالات کی آماجگاہ بن کر رہ گئی ہے!

آپ ہمارے یہاں کے پرچوں میں نہیں لکھتے خالد بھائی۔ عرصہ ہوا صبح امید اور کتاب میں آپ کی نظمیں دیکھی تھیں۔ اچھے پرچے یہاں سے بھی نکلتے ہیں! کراچی کے رسائل میں آپ کی چیزیں چھپتی ہوں گی۔ مجھ تک کراچی کے پرچے بہت ! [illegible] پہنچتے ہیں۔ وہ لوگ بھیجتے ضرور ہیں۔ مگر راستے میں کھو جاتے ہیں۔ اس طرح میں بہتیرے رسائل میں آپ کو پڑھنے سے محروم رہ جاتی ہوں ــــ

لکھتا ہے خون دل سے حسنت نے اپنے نامہ
بھیا! اِلٰی فؤادی من صحبک القیامہ

آپ کی بہن
عفت
۲۷ فروری ۷۶ء

طلعت سلطان

حیدرآباد
اے' پی' انڈیا
۵-۶-۶۷

خالد بھائی تسلیم

آپ کا نہایت حسین ،شفیق اور بے حد قیمتی خط ملا۔ پہلے ہی جواب دیتی مگر شاہد صاحب کی خبر نے مجھے بیحد افسردہ کر دیا پھر کسی کام میں میرا دل نہیں لگا۔ افسوس بہت اچھے انسان تھے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ گذر گئے۔ ابھی انتقال سے ایک ہفتہ پہلے ہی ان کا خط آیا تھا۔ ہم سب کی مزاج پرسی کا انھوں نے شکریہ ادا کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ دعا کیجئے خدا صحت دے۔ مگر موت کب دعاؤں سے ٹلی ہے۔ اب مجھے بے حد پشیمانی اور افسوس ہو رہا ہے۔ میں نے ان کے بارے میں وہ سب کچھ کیوں لکھ دیا تھا مجھے بہت صدمہ ہے خدا مجھے مُعاف کرے۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ نہ جانے اب ان کے پسماندگان کا کیا حال ہوگا۔ ساقی تو اب غالباً بند ہی ہو جائے گا۔

جی ہاں خالد برابر اسکول جا رہے ہیں اور میں نے بھی دو ایک چیزیں لکھی ہیں۔ یہ آپ کے اور مظہر بھائی کے حسب الحکم جولائی سے یونیورسٹی کا چکر شروع ہو جائے گا۔ تو موقعہ نہیں ملے گا۔ ایک کہانی "محبت کی راہیں پُراسرار ہیں" جام نو میں بھیجوں گی لیکن عنوان کے لئے آپکی اجازت چاہیئے۔ اگر آپ اجازت دے دیجئے تو بھیجدوں' دوسرا ایک تعارفی مضمون ہے۔ دیکھئے خالد بھیا! آپ پر اور آپ کی شاعری پر بہت کچھ کہا گیا ہے' لکھا گیا ہے۔ سب نے اپنی اپنی کہی جس میں آپکی مرضی کا بالکل دخل نہیں دکھا گیا۔ میرا بھی جی چاہ رہا تھا بہت دنوں سے' کچھ میں بھی لکھوں۔ مگر آپ کی شاعری کے شایان شان الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ پھر میں نے سوچا کہ آپ کا ایک انٹرویو لینا چاہئے (اگر ناگوار نہ گذرے) میری دیرینہ ادبی آرزو بھی پوری ہو جائے گی اور یہ مضمون جسے آپ اپنے طور پر مکمل کریں گے دوسروں کے زاویوں اور نظریوں سے بالکل الگ اور مختلف چیز ہو گی۔ میں نے بہت سوچ سمجھکر سوالات مرتب کئے ہیں اگر آپ کو فقروں کی نشست مناسب نہ معلوم ہو تو آپ درست کر دیجئے گا۔ سوالات طویل ہوں تو انھیں بھی ٹھیک کر دیجئے۔ لیکن ہر سوال کا جواب دیجئے ضرور ــــ! آپ اپنی معروفیات میں سے تھوڑا سا وقت' دیں گے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ جلد ہی مظہر بھائی کو بھیجدونگی۔ مجھے یقین ہے کہ انھیں بھی یہ تعارف بے حد پسند آئے گا۔ ـ ـ ـ ـ میری ہی طرح وہ بھی آپ کو بہت چاہتے ہیں ..... بہت خوشی سے یہ تعارف شائع کر دیں گے۔ ـ ـ ـ لیکن اگر ــــ یہ بات آپ کو اچھی نہ لگے نہ ــ تو پھر......

آپ جیسا کہیئے —!!

اب اجازت دیجئے - بہت سا لکھ لیا تو آپ کا پڑھنے میں وقت خراب ہوگا - ویسے بھی رات کے گیارہ بج چکے ہیں موسم کچھ ہولناک ہوگیا ہے - آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں - تیز ہوائیں درختوں میں گونج رہی ہیں اور مینہ رم جھم برس رہی ہے گھنگھور گھٹا ——— مگر میرا جی نڈھال نہیں ہے - بے حد خوش ہوں! آپ کے ہاتھوں میں میرا خط ہے نا اس لئے —!!

آپ کی بہن

عفت

عفت موہانی

حیدرآباد (۲)

اے پی، انڈیا

۷۰-۳-۱۷

خالد بھائی تسلیم

عرصہ دراز کے بعد آپ کا خط ملا۔ اتنے دنوں بعد آپ حال احوال دریافت کرتے ہیں۔ اگر یہاں میں مرجاؤں تو شاید پہلی یا دوسری برسی پر آپ کا خط مجھ تک (۹) پہنچے۔ آپ کو تو پتہ ہی نہیں کہ اس عرصہ میں کیا کیا انقلابات میری بربادزندگی میں وارد ہوئے۔ انکل آج کل سخت بیمار ہیں۔ بایاں پہلو قطعی بیکار ہوگیا ہے۔ زبان بند ہے۔ اور اتنے بڑے بڑے دماغ پلنگ کے پڑے ہیں کہ دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ عبرت ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان اتنے بڑے بڑے دعوے کرنے کے باوجود موت، بیماری کے سامنے اس قدر مجبور کیوں ہے۔

دوسرا حادثہ مجھ پر مکان کی تبدیلی کا ہے۔ آپ خوش ہیں۔ ایک احساس جو مجھے رائی کے برابر معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک پہاڑ بن سکتا ہے۔ ہزاروں یادیں۔ اچھی اور بُری ہنسانے والی اور رُلانے والی، اس گھر کے چپے چپے سے وابستہ تھیں۔ جب میں نے اس مکان کی چوکھٹ کو ہمیشہ کے لئے عبور کرکے اس مکان کی دہلیز پر ہمیشہ کے لئے قدم رکھا۔ تو دل کی عجیب کیفیت تھی رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ ہر لمحہ یہی خیال آتا رہا کہ یہاں تو مہمانداری ہے۔ صبح ہو تو گھر جانا ہے لیکن یہ تو خواب تھا۔ کہرا مٹا تو حقیقت سامنے آئی کہ اب ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ بڑے بے کیف دن میرے گذر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

اوّل تو میں لکھنے والی ہی ایسی کون سی نامی گرامی اور اہم ہوں۔ مگر یہ نفسیاتی نحوست میرے ساتھ ہے۔ اگر مجھے اپنی جگہ، اپنا کمرہ، قلم کاغذ سب کچھ اپنا نہ ملے تو پھر دماغ پر قفل پڑ جاتے۔ میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔ اگر دماغ بھی داغ مفارقت دے گیا تو پھر مجھ میں اور ردّی کے بنڈل میں فرق کیا رہ جائے گا ——— خیر ہٹایئے یہ تو فضول کی باتیں میں نے آپ سے چھیڑ دیں۔ آپ کے وقت کی اہمیت کا خیال نہیں کیا ——— اُدھر کا کوئی پرچہ ابھی تک نہیں ملا! پتہ نہیں کب ملے گا۔ مظہر بھائی نے ایک صاحب کے ہاتھ آٹھ دس پرچے بھجوائے تھے۔ لیکن الشجاع، زیب النساء اور سیارہ وغیرہ تو ہماری تقدیر سے کب کے اڑ گئے۔ ایسا جی چاہتا ہے خالد بھیا کہ اُدھر کے رسالے پڑھنے کو ملیں۔ مجھے یقین ہے کہ اُدھر کے ... سے بہت

اچھے ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس جدیدیت کے بہانے جو گھورہ پچر چھاپا جا رہا ہے وہ اس قابل بھی نہیں کہ صحیح ادبی ذوق رکھنے والے لوگ نظر بھی ڈال سکیں۔ میں تو بڑی بیزار ہوں، پڑھے بغیر چارہ بھی نہیں۔ نیشنل لائبریری سے کتابیں منگوانی پڑتی ہیں۔ وہ لوگ حیران ہیں کہ اتنی جلدی اچھی کتابیں کہاں سے فراہم کریں۔

آپ کی کون سی نئی کتاب چھپی ہے؟ پچھلے مکان میں لکھا ہوا ایک ناول بندار کے نام سے میں نے چھپوایا تھا لیکن کاتب صاحب نے میری تحریر پر ایسی مشق ستم کی ہے کہ مجھے خون کے آنسو رلوا دیئے۔ پندار کو ایک جگہ پندرہ کر دیا۔ فیصل کو فصل سے بدل کر رکھ دیا۔ بہرحال کتاب ایسی چھپی ہے کہ اس پر اپنا نام دیکھ کر شرم آتی ہے۔

مظہر بھائی کو میں نے خط لکھا تھا مگر جواب سے ہنوز محروم ہوں۔ وہ اچھے تو ہوں گے؟ خالد بھیا! کیا آپ سب کراچی ہی کے ہو کر رہ گئے؟ ایک بار ہمارے ہاں آئیے نا۔ آپ پر تو اتنی پابندیاں نہ ہوں گی جتنی مجھ پر ہیں۔ اچو مقدمہ پچھلے برسوں چلا تھا اس میں اسی شرط پر فیصلہ ہوا کہ میں حیدرآباد چھوڑ کر کہیں باہر نہیں جا سکتی۔ آپ ایک مرتبہ ارادہ کر کے آئیے۔ بے اندازہ مسرت اس طرح مجھے ہوگی۔ ضرور آئیے گا۔

آپ کی بہن
عفت

عفت موہانی

حیدرآباد (۲)
اے، پی، انڈیا

۱۷-۲-۱۹۶۳ء

خالد بھائی تسلیم

آپ کا خط ملا! ویسے تو آپ چند ہی سطریں لکھتے ہیں۔ مگر میں معلوم نہیں کہ کتنی مرتبہ آپ کی سطروں پر نظریں دوڑاتی ہوں۔ مجھے آپ کا خط حفظ ہو جاتا ہے۔ اور پھر یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہت کچھ اور بھی تھا۔ جو میرے پڑھنے سے رہ گیا . . . . . . آپ کی علمیت، قابلیت، شرافت اور عظمت نے مجھے ایسا متاثر کیا ہے خالد بھیا کہ آج کل کے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے بد ٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں آپ مجھے روشنی کا مینار معلوم ہوتے ہیں . . . بہت کچھ میرا لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر میں اس ڈر کے مارے نہیں لکھ سکتی کہ آپ کو ضایع وقت کا مجھ سے گلہ ہو گا! . . . . . . یہ بھی ایسا ہوا کہ میں آپ سے بڑی دور ہوں۔ ورنہ کیا ہوتا؟ میری بکواس سے گھبرا کر آپ کراچی چھوڑ جاتے۔

میں ہمیشہ کی قنوطی ہوں خالد بھیا۔ اب تو ماحول اور حالات نے مجھے اس قدر بدہمت کر دیا ہے کہ مجھے اپنی زندگی اور "مستقبل" سے بھی دلچسپی نہیں رہ گئی۔ اب میں گھنٹوں اپنے کمرے میں بیٹھی سوچتی رہتی ہوں۔ اور کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم کیا سوچ رہی تھی تو میں ایک بات کا بھی اعادہ نہیں کر سکتی! . . . . . . کوئی دور عمر کا تھا کہ مجھے لکھنے پڑھنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اب نہیں ہے۔ نہ پڑھنے کی تڑپ نہ لکھنے کی بے چینی . . . . . آس پاس بکھرے ہوئے الیے مجھے روندتے ہوئے گزرتے ہیں۔ کتنی دیر تک احساس جگر کھرچتا ہے کہ میں آپ سے کیسے بتاؤں۔ دکھ کے عطیہ کے ساتھ ساتھ اگر انسان کو احساس کی نعمت بھی مل جائے خالد بھیا تو پھر کیا ہوتا ہے؟ . . . . . کوئی لمحہ نشاطِ غم سے خالی نہیں! ذہن میں جہنم سلگ رہا ہو۔ سینے میں بھٹی دہک رہی ہو اور میں آپ کی خاطر مسکراؤں۔ کیا ایسے انسان کو مظلوم نہیں کہتے؟ . . . اپنے آپ سے گھبرا جانے کی وہ کونسی منزل ہے۔ جہاں عبادت میں بھی لطف نہ آتے۔ اس گھر سے اس کے مکینوں سے مجھے ایسی الجھن ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ بس اب مر رہوں . . . . . . مجھے اپنے پچھلے دن یاد آتے ہیں۔ اور وہ سب جاننے والے، جن سے حشر میں بھی ملنے کی امید نہیں! میں نے ہزار بار سوچا ہے کہ مجھ سا احمق اور اپنا آپ بدخواہ دنیا میں اور کوئی نہ ہوگا۔ کیوں بیکار خیالوں میں سر کھپاتی ہوں۔ مگر پھر ایک کہرا سا میرے ذہن پر چھا جاتا ہے کہ یہ کیسا

ہے دنیا ؟ اس کا گورکھ دھندہ یہ شور وغل یہ چیخ پکار، یہ گہما گہمی۔ یہ سب کیوں ہے ؟ ایک دن سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ پتہ نہیں کیسے کب اور کیونکر موت آتی ہے۔ یہ تو مرنے کے بعد ہی دوسروں کو پتہ چلتا ہے کہ مرنے والا ایسے گیا۔ انسان کی ساری زندگی کا سفر کتنا ہوں پر طے ہوتا ہے اور بالآخر یہ دوتاریک منزل تک پہونچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ زندوں ہی کو یاد نہیں رکھتے۔ مرنے کے بعد کون یاد رکھے گا؟ یہی خیالات میرا سکون درہم برہم کئے رہتے ہیں۔ خالد بھائی! ایسی قنوطیت مجھ پر اُمنڈ کر چھا جاتی ہے کہ اگر آج کے دن میں زندہ ہوتے تو وہ بھی میرے سامنے بجھ کر رہ جاتے! آپ میری خرافات کو پڑھ کر گھبرا تو نہیں گئے۔ معاف کر دیجئے۔ اگلے خط میں نہیں لکھوں گی۔ خالد بھیا! کوئی تو ہو، جس سے آدمی کچھ کہہ سن سکے۔ اور یقین کرے کہ اپنا دُکھ بیان کر کے دُکھ کی توہین نہیں کی ہے؟!۔

آپ نے اور کیا کیا لکھ لیا ہے۔ خدا جانے کب آپ کی چیزیں دیکھنے کو ملیں۔

آپ کی بہن
عفت

عفت موہانی

خدا کا شکر اور احسان ہے کہ ایک مدت بعد آپ کا خط ملا اور مجھے احساس ہوا کہ ابھی اوروں کی طرح آپ سے میرا انسانی اخوت کا رشتہ ٹوٹا نہیں ہے۔ ورنہ یہ دنیا اور زمانہ اور حالات انھوں نے کس کو کسی کا نہ رکھا۔ کس کس کی شکایت کیجیے۔

کیا عجیب انقلاب ہے خالد بھیا کہ سیاست محبت پر اثر ڈالے۔ حکومت خلوص کی آہنی زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دے۔ خدا بہتر گواہ ہے، ایک آپ ہیں جنھوں نے اب تک مجھے یاد رکھا ہے۔ زمانے کی کوئی گردش آپ کے خلوص پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ سچ مچ آپ زمین کا فرشتہ ہیں۔ میرے دل کی گہرائیوں سے آپ کے لئے بہت ساری دعائیں نکل رہی ہیں۔ آپ کا معصوم و حسین چہرہ میری نظروں میں مسکرا رہا ہے۔ آپ کے پیارے پیارے محبت بھرے دل کو میری پُرنم آنکھیں دیکھ رہی ہیں ۔۔ رات کے اس خاموش سناٹے میں میرے خیالات نے قرب و بعد کی تمام منزلیں طے کر لی ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں آنکھیں بند کر کے یہ سب کچھ لکھ رہی ہوں۔ آپ میں مجھ میں اب کوئی فاصلہ نہیں۔ جو کچھ میں بک رہی ہوں آپ اس تمام بکواس کا جواب صرف اپنی مسکراہٹ سے دے رہے ہیں ۔۔۔ پھر مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے بہ چوں، مبصروں اور نقادوں نے آپ کے مداحوں نے اور بہتیرے پرستاروں نے آپ کی مدح وستائش میں جو کچھ لکھا تھا وہ سب گڈمڈ ہو کر صرف ایک سطر بن گیا ہے۔ آپکی خاطر خواہ اور نمایاں شان تعریف کوئی بھی نہ کر سکا میں بھی نہ کر سکی۔ آپ اتنے اچھے ہیں، اتنے اچھے ہیں کہ جس کسی کو بھی رتی بھر آپ سے وابستگی کا تصور آتا ہے وہ بھی اچھا بن جاتا ہے۔ اب مجھے پتہ چلا، سعدی نے یونہی چار مصرعے نہیں کہہ دیئے تھے۔ ایسا ہی کچھ سا وجدان اُن پر بھی طاری ہوا تھا۔ ورنہ خالد بھیا میں بھی نہ کہتی کہ من ہماں خاکم کہ ہستم

معلوم نہیں کہ میرا یہ خط دن کی پُرشور روشنی میں آپ کو کس وقت ملے؟ آپ میری بکواس پر ہنسنے لگیں گے۔ لیکن اس وقت میرے کمرے میں یادوں سے معمور سناٹا چھایا ہوا ہے۔ بہت کچھ مجھے یاد آ رہا ہے۔ اپنی پچھلی ادبی زندگی۔ جب

میں زندہ تھی۔ اب تو کچھ بھی نہیں اور اس وقت مجھے آپ کے گرد و پیش ہونے والے ہنگامے کا خیال آ جاتے تو الجھن ہو رہی ہے۔ خالد بھیا! سچ سچ کیا کبھی ایسا ہو بھی سکے گا کہ میں ان سینکڑوں میل کے ہولناک فاصلوں کو طے کر کے آپ تک پہونچ سکوں گی؟ یا اور دوسری آرزوؤں کی طرح یہ آرزو بھی حسرتِ ناتمام تلے دب کر رہ جائے گی، خدا ہی جانے۔

مظہر بھائی کے دل سے میرا نام حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا۔ معلوم نہیں اور کتنے ایسے ہیں جنھوں نے فراموش کیا۔ نام لینا تو کم ظرفی ہے۔ مگر جب اُن "پرخلوص" خواتین کا خیال آتا ہے جو میری محبت کا دم بھرا کرتی تھیں۔ اور جنھیں دنیا والوں کے ہاتھوں نے خواہ مخواہ کوئی درجہ دیا تو وہ کبھی کچھ اعلیٰ و برتر ثابت ہوتیں۔ افسوس، افسوس ——

خالد بھائی! اپنے آپ کو فریب دہی سے بچانا بڑا مشکل ہے وہ فریب جو انسان اپنے آپ کو دے۔ مجھے ہنسی بھی آتی ہے۔۔۔ کیسا عجیب جانور ہے انسان؟

عفت موہانی

غلام حیدر مرزا

نشانہ صاحب

۱۱-۶-۷۴

فصیح العصر بلیغ الاثر جناب خالد صاحب
دامت فیض کلامہ السلام علیکم

کچھ دن ہوئے ریڈیو پاکستان سے نئی تخلیقات پر انعامات کی تقریب کا حال سُنا "پرواز عقاب" کا نام سنکر شوق تازہ ہوا۔ منگوا کر بنظر غائر مطالعہ کیا بڑا لطف اٹھایا۔ وارفتگی کے عالم میں بے اختیار چند اشعار زبان پر جاری ہو گئے ہوچی منہ کے تاثرات جو قید خانہ کی پرصعوبت زندگی میں اشعار کی صورت میں ڈھل گئے اور جن کا اردو [illegible] آپ نے [illegible] نے سمط الدرر کی صورت مرتب کر دیا ہے بجائے خود ایک تخلیقی اور حرکیاتی کارنامہ ہے، جس سے محکوم و مظلوم [illegible] و [illegible] آزادی کے بام بلند تک پہنچنے کے لئے مضبوط اور محکم زینے مل سکیں گے۔ ہو کے افکار نے ویٹ نامی قوم کو حیات تازہ سے [illegible] ہے۔ امید کہ پرواز عقاب سے پاکستانی عوام کو بھی حرکت ہوگی۔ مولانائے روم کی حکایت یاد آگئی کہ "گر گذارش [illegible] با ہمیان چغدان ویران" فرماتے ہیں

غلغل افتاد در چغدان کہ ہا — باز آمد تا بگیرد جائے ما

چغدوں نے باز کا محاصرہ کرلیا۔ اس کے سر پر ٹھونگیں مارنے لگے، اس کے پروں کو نوچنے لگے۔ باز نے کہا بے وقوفو!

درمن آویزید تا نازاں شوید — گرچہ چغدانید شہبازاں شوید
بازم و حیران شود در من ہما — چغد کہ بود تا بداند سر ما
یک دمم با چغد ہا دمساز کرد — از دم من چغد ہا را باز کرد

الحق کہ جناب کے سامنے کچھ لکھنا جسارت ہے گویا آفتاب کے پاس چراغ لے جانا ہے۔ یا بحر بیکراں کو مٹکا دکھانا ہے۔

ذرۂ گر نیک و گر بس بد بود — گرچہ عمرے تگ زند در خود بود

نیازمند
غلام حیدر

منشی شبیر محمد

حیدرآباد

۲۴ مارچ ۶۶ء

علامۃ العصر، تسلیماً کثیرا

راقم الحروف ایک ناچیز تابلو نویس ہے۔ پاکستان کی طرح سادی ذت ڈاکخانہ مارکیٹ کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ان پڑھ لوگوں کے خطوط وغیرہ لکھتے گزر چکی ہے۔ مجھ ناچیز کی غریبی و مفلوک الحالی کا حال یہ ہے کہ ؎

افلاس و فلاکت کو فقط مجھ سے لگا ہے

محتاج ہیں اتنا ہوں غنی جتنا خدا ہے

مجھ ہیچمدان نے آپ کی تصنیف مایۂ ناز و شہرہ آفاق کتاب "فارقلیط" کے متعلق ریڈیو لکھے ہوئے کافی عرصہ پیشتر پڑھے تھے۔ جب سے اسے خریدنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ آرزو پوری ہوئی ہے۔ یہ کتاب کیا ہے ایک غیر فانی۔ غیر معمولی اور لاثانی دستاویز ہے۔ جس میں خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دینے کی بے پناہ قوت، دل میں گھر کر لینے والی تاثر مندانہ اور سوز و گداز ہے۔ مجھ سالخوردہ ضعیف العمر کی دیرینہ اور کہنہ بری عادتیں اور علتیں اس لافانی کلام کے اثر سے اکثر جاتی رہی ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ اس کے متواتر مطالعہ کے طفیل جاتی رہیں گی۔ تمام افعال قبیحہ و شنیعہ کردارِ نیک میں بدل جائیں گے۔ آمین ثم آمین۔

میرے محسن! آپ نے نہ صرف مجھ گنہگار پر بلکہ تمام بنی نوعِ انسان پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ اور پیارے محمدؐ سے پوری وفاداری کا بین ثبوت پیش کیا ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

میرے محترم! آج ابھی میرے محلے کا ایک نیک مرد حرکتِ قلب بند ہونے کے سبب اچانک فوت ہو گیا ہے۔ جس کی تجہیز و تکفین میں جانا ضروری ہے۔ لہٰذا اس خط کو کمال محبت و عقیدت سے بند کرتا ہوں۔ زندگی رہی تو پھر کبھی عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کے لئے حاضر ہوں گا۔

منشی شبیر محمد

سلیم یزدانی

محترم المقام خالد صاحب،
السلام علیکم،

آپ کا دم کراچی میں بڑا غنیمت تھا۔ ایک تو آدمی ایسا تھا جس سے بات کر کے ذہنی آسودگی نصیب ہو سکتی تھی۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ آپ سے ملاقاتوں کے دوران میں نے ایک انقلاب محسوس کیا جس نے مجھے ذہنی بیداری کی طرف بڑھایا۔ آپ کا اندازِ فکر بڑا مثبت اور صداقت پر مبنی ہے۔

کراچی میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو دانشور کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ لیکن یہ دانشور انتہائی ذہنی انتشار اور گروہ بندیوں کا شکار ہیں۔ شہرت کے تعاقب میں بھاگ رہے ہیں اور شہرت ان سے بھاگ رہی ہے۔ تعجب ہے یہ کیسی وبا ہے کہ جس نے ہر انسان کو اپنے دامِ فریب میں پھنسا رکھا ہے۔ ہمارے ہاں کے پڑھے لکھے شاعر اور ادیب مغربی ادب سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بعض شاعروں نے تبدیلیِ دماغ کا اپریشن کرا لیا ہے۔ ان کے اپنے دماغوں کو شہرت کی بلی نے کھا لیا ہے اور ان کے دماغوں میں مارسے، ہنڈرسن اور بادلیئر کے دماغ لگا دیئے گئے ہیں۔ خدا ان کی حالتوں پر رحم کرے۔ جائزہ پڑھ کر آپ کو اس سے اندازہ ہوا ہوگا۔ ہمارے ادیب اور دانشور ماسکو اور پیرس کے غلام ہیں اور قوم کو اغیار کا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ میں اگر اپنے مشن میں کامیاب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی خدمت کے قابل سمجھا تو میں سب سے پہلے اپنے دانشوروں کے دماغوں کی تبدیلی کے لئے اپریشن کراؤں گا کہ یہ قوم کی رگوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ کراچی کے کتب فروشوں سے پتہ چلا ہے کہ کہانی بند ہو گیا ہے۔ کراچی میں کہیں نہیں ملا۔ آپ چھاپ رہے اور کہانی مجھے بھجوا دیں، میں منتظر رہوں گا۔ جسارت میں میرے مضامین آپ پڑھ رہے ہوں گے۔ اس ضمن میں آپ کے گراں قدر مشوروں اور رائے کو میں اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھوں گا۔ قرطاس ابیض پڑھ کر ذہن ایک مستقل بوجھ محسوس کر رہا ہے۔ جو کچھ وہاں ہوا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم انسانیت سے کتنی دور جا چکے ہیں۔ لاکھ ذہن کو ہٹاتا ہوں۔ لیکن ایک لاکھ کا غم ہے۔ یہ غم بھی کیسا کہ اُٹھائے نہ بنے۔

درحقیقت ایک مجاہدے سے گزر کر ہی انسان اپنے آپ کو پہچانتا ہے لیکن ہمارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش تو کرتے ہیں اپنی تلاش میں نہیں نکلتے یہی وجہ ہے کہ ہم جرأت اظہار یقین اور مقصد سے پیدا ہونے سے مرنے تک ناواقف رہتے ہیں ۔

والسلام

سلیم یزدانی

افتخار زیدی

مراد آباد (انڈیا)

۲۵ مارچ

محترم و مکرم حضرت عبدالعزیز
خالد صاحب سلمہٗ السلام علیکم و رحمۃ اللہ
و برکاتہٗ

عرصہ ہوا "فارقلیط" اور "منحمنا" کے پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اشعار سمجھ میں تو کم آئے لیکن قلب پر ان کا اثر پڑا۔ کبھی کبھار کر ان کو پڑھتا رہا۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کو خط لکھوں بلکہ ملاقات کر سکوں۔ مگر بیتے سرحدوں، خط و کتابت کی بھی دعوت نہیں پھر آپ کا پتہ بھی نہیں معلوم۔ سیارہ ڈائجسٹ کے خاص نمبروں کی تلاش کرتا رہا تاکہ آپ کے کلام کو کچھ سمجھ سکوں۔ سیارہ کا مطالعہ کر کے یہ عریضہ پیش کر رہا ہوں۔ انسانی مزاج پر شعر اثر کرتا ہے۔ اس لئے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام عالموں و زمانوں پر اثر انداز ہے۔ حضورؐ کے لائے ہوئے پیام کو تمام انسانوں تک پہنچانے کے لئے ان کی زبانوں کی ضرورت ہے۔ اسی لئے غالباً آپ کو بہت سی زبانوں کا علم عطا ہوا ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ اپنے اشعار کے ذریعہ کی زندگی پر بس تر دکھ سکیں لکھنے کی کوشش فرمائیں۔

حضورؐ کی نبوت کا شباب ابھی غالباً نہیں آیا ہے۔ کیا عجب حق تعالےٰ شانہٗ آپ کے اشعار میں مختلف زبانوں کے ذریعہ امت کی کوئی راہ پیدا فرمائیں۔

آپ کے کلام کے تراجم: ان الفاظ کو جو آپ نے جن زبانوں کے استعمال فرماتے ہیں۔ رنگ لائیں گے انشاء اللہ!

اس وقت اسلام کی دعوت مسلمانوں کی زندگی سے نہیں بلکہ کچھ دوسرے واقعات کے ذریعہ سے ہی وجود میں آئے گی۔ علوم خصوصاً سائنسی تحقیق و تلاش اور اشعار قرآن و حدیث سے۔ الفاظ کا اشعار میں آنا بھی اس کی نشان دہی کر رہا ہے کہ بات اپنے اصلی روپ میں پہنچ سکے۔ شق قمر۔ معراج۔ خلا کے مسائل، خاصے وقت، وزن جس قدر اشعار کے ذریعہ ظاہر کئے جائیں دعوت کے مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کریں گے۔

آپ کے اشعار مع بھری ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں اشعار انشاء اللہ ہدایت کی راہ کھولیں گے۔

نوٹ: شمیم الحبیب سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمہ ہے جو مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نے عربی میں لکھا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ وہ آپ اشعار میں کریں اور دلائل الخیرات میں وہ سب اسمائے رسول آئے ہیں ان کو بھی ہر نام کی صفت کے اظہار ساتھ شعروں میں لایا جائے۔

والسلام
خادم
افتخار زیدی

مختار علی رحمانی

ماڈل کالونی حیدرآباد
۱۳ر جولائی ۱۹۶۸ء
صدیق مکرم، حبی فی العلم
سلام برسانید!

اتفاقاً جولائی ۱۹۶۸ء کا "سیارہ ڈائجسٹ" ہاتھ آگیا۔ صفحہ ۳ پر "واردات و تاثرات" کے زیرِ عنوان ایک اقتباس نے بے ساختہ توجہ و نظر کو کھینچ لیا۔ معلوم ہوا عبدالعزیز خالد صاحب ایک دوست کے نام خط میں رقم طراز ہیں کہ:

"زندگی ہے بہر حال، بہر طور کٹتی جاتی ہے

سوچتا ہوں معرفتِ زیست کیا۔ مآلِ حیات کیا۔ غایتِ کائنات کیا۔ بے مرفہ ایام گزرتے جاتے ہیں۔ اپنے عجز و کوتاہ دستی اور بے مقصد ہونے کا تلخ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک عجیب ناآسودگی و تشنگی کی حالت ہے۔ عمر کا بیشتر حصہ گزر چکا۔ اس میں کیا کیا؟ وہی ترسیدہ صبح و شام، وہی آلامِ دہر، وہی نفس کا زیر و بم —— الم و الم ع

کیوں بکھرتی نہیں خورشیدِ سحر کی کرنیں
کب سے اس گنبدِ ظلمات میں محصور ہوں میں

یا اللہ! اگر عبدالعزیز خالد صاحب کی زندگی بے مرفہ ایام کی نذر ہے۔ اگر خالد صاحب کا تاثرِ حیات اور تصورِ زندگی یہ ہے کہ —— ایک عجیب ناآسودگی و تشنگی ——" گویا عمر گزاری نہیں گزار دی ہے!! تو پھر —— ! تو پھر —— ہم کیا —— !! ہم نے کیا کیا!! ہماری زندگی کیا؟ ہیہات۔ ہیہات۔ ع

سحر ہونے نہ دے شبِ نقش گرِ حادثات

—— اگر خالد صاحب کے نزدیک زندگی کی بے کیفی کا یہ عالم ہے —— تو پھر —— !

—— اپنی زندگی تو محض و عبث ۔ تارِ عنکبوت ۔ دن رات کا تانا بانا ۔ بے معنی و بیکار —— زندگی نہیں بلکہ دارِ دستِ رفتہ ۔ نغمۂ حیات نہیں ۔ بلکہ نوحۂ مرگ ؎

ہم اپنا جنازہ اٹھائے پھرتے ہیں

مآلِ حیات کیا ؟ وبالِ کائنات —— !!

اِنا للہ و انا الیہ راجعون

سوچتا ہوں ۔ تیس سال کا طویل عرصہ ۔ عمر ۔ بے حاصل و بے مراد ۔ دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے رائیگاں گیا ۔ نہ معاشی زندگی کامیاب ہوئی ۔ نہ علمی زندگی بار آور ہوئی ۔ نہ سیاست نے دُرِ مقصود بخشا ۔ نہ دامن نے کنٹرول کیا ۔ نہ ادب نے سہارا دیا ۔ نہ بر لگائے ۔ نہ شعر نے آب حیات ٹپکایا نہ خطابت نے کوثر و تسنیم بہے ۔ آج بے روزگار ہوں ۔ اس پر مستزاد اپنوں کی بیگانگی ۔ فریب دوستی اور فریب زندگی کھا رہا ۔ زخم پہ زخم ۔ چوٹ پہ چوٹ ۔ الغیاث ! الغیاث !! رخصت ! رخصت !! آرزوؤں کا قبرستان ۔ تمناؤں کا مزارِ شکستہ ۔ زندگی بے بال و پر ۔ فانی ۔ آہ فانی —— !!

اُو از جہاں گذشت کہ آخر خدا نبود
او آنچنیں بزیست کہ گوئی خدا نداشت
طغیانِ ناز بیں کہ بلوحِ مزار او ہست
ثبت است سالِ رحلتِ فانی خدا نداشت

غزلیہ ؎ فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن

آپ کی تحریریں پڑھی ۔ معلوم ہوا نزع میں سورۂ یٰسین سن لی ۔ دل ڈوبنے لگا ۔ نبضیں چھوٹنے لگیں ۔ آنکھیں پتھرانے لگیں ۔ رگ رگ میں بیٹھ کر کچھ کہنے لگا ۔ کہ یکایک ایک دوسرا ادا ایجنٹ سرہانے تیر کے آہستہ بولا ۔

The Reader's Digest, volume 66, March 1955.

As a man thinketh, so is he" Dont be Sorry for yourself!

By A. J. Cronin.

صاحب من ۔ یہ صدائے آہستہ تو ندائے ۔ قم باذن اللہ ۔ ثابت ہوئی ۔ مردہ جی اٹھا ۔ آخر تیس سال کی زندگی میں کیا کچھ حاصل نہ کیا ۔ زندگی ہی زندگی ۔ ماں کی گود سے لے کر اپنے قدموں پہ کھڑے ہونے تک ۔ پھر ان قدموں چل کر "شاعرِ اعظم" کی خدمت میں باریاب ہونے تک ۔

مجھ کو میرے کریم نے کیا کیا نہیں دیا۔ آہ ہے کیا کیا نہیں دیا ـــ!

(قوالی کی طرز میں)

جناب محترم مہر کا "ساغرِ غزل الغزلات"۔ نادر تخلیط۔ سادہ۔ شگفتہ۔ سحر در دامنہ۔ لحن مدہر۔ اور ایک درجن سے زیادہ تخلیقی تصنیف۔ اور تحقیقی تخلیقات کے شارح و خالق۔ مصنّف و محقق کی تحریر۔ مدّاحِ رسالتمآبؐ۔ شاعرِ اعظم کا تشکر ہم جیسے تھڑ دلوں کے لیے تو نہ تھا"۔ وہ تو "منزلِ ترک" اور "فنا فی الذات" کے مرتبہ "عین الیقین" و خود شناسی و خدا شناسی" کے بعد۔ حق الیقین۔ انکشافاتِ حجابات اور مشاہدۂ مقصودِ جمالِ ذات کا اظہار واقعی اور واردات وجدان سب مومن کا مظہر معنوی داستانِ بیانی تھا۔ ہاں! یہ ضرور ہوا کہ "سیارہ ڈائجسٹ" نے اسے شائع کر کے ہم جیسے تہی نگاہ و مردہ ذوقوں کو خلائے عدم میں "اسپتنک" بنا دیا۔ سو غلطی یہ "کاروانِ گزراں" ترتیب دینے والوں کی تھی۔ یا خالد صاحب کے ان دوست کا کرم تھا کہ اپنا۔ خالد صاحب کا ذوقِ نظر عام کرنے پر آئے تو ہم جیسوں کے قتلِ عام کا سامان کر گئے۔ ورنہ خالد صاحب کا یہ پیغام ہم غریبوں کے لیے تو نہ تھا۔

آخر کیوں کر مدّاحِ رسالتمآبؐ۔ خود کو محصورِ گنبدِ ظلمات محسوس کرے؟ "لولاک لما خلقت الافلاک" مرکزِ عطا کے مخاطبؐ کا مخاطب و نعت گو کا وجود۔ دستِ تہ سنگ آمدہ تو نہیں"۔ اس کے شبستانِ وجود کی سحر تو خورشیدِ ازل کی کرنوں سے منور ہے۔ وہاں غروب کہاں۔ حجاب کہاں؟ جو بطنِ گیتی کے ظلمات سے خورشیدِ تازہ کی تمنا ہو۔ جو بذاتِ خود۔ صورتِ خورشید جیسے ہوں۔ ؎

"ان پہ جو لمحہ گزرتا ہے خدا ہوتا ہے"

"شاعرِ اعظم" کے مدّاحِ اعظم حضرت علامہ الدہر اسعد العالم مولانا محمد رضا اسعد القادری صاحب کی خدمت بابرکت میں [illegible]۔

میرے محبِ مہربان! آپ کے مداح
و ثناخواں صاحبزادہ رشید خان صاحب
آپ کی خدمت میں آداب مؤدبانہ عرض
کرتے ہیں

تا نگردد کہ از ساغرِ وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

والسلام
فقط
مختار علی رحمانی

شبّیر احمد ساجد قادری

چک ۵۵ شمالی گجرات،

حبیب لبیب۔

برادرِ مکرم جناب عبدالعزیز خالد صاحب

السلام علیکم!

۱۔ پہلے پہل جب کسی رسالے میں مندرجہ ذیل اشعار ~

تمہیں جو یہ بھی پتہ اس کی خوبیوں کا اگر
ستارے ٹوٹ پڑیں تھک تھک کے نیل گنبد پہ
مطلع ج... مہ و مہر تا بہ نوح و قلم
قسم ادائے محبوبِ کبریا سے
فضائے حسن پہ اس طرح سے جھکے
کہ جیسے پھولوں نے پہنا ہو ہار شبنم

تو جی چاہا کہ میں اپنے تاثرات اس عظیم عاشقِ رسول تک پہنچا سکوں۔ لیکن پتہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ پچھلے دنوں ایک دوست کی معرفت ساوہ کا خاص نمبر نظر سے گزرا (میری اپنی مادی حالت اتنی کمزور ہے کہ میں اپنا پسندیدہ رسالہ منگوا سکوں۔ دوسری پسندیدہ کتابیں خریدنے سے معذور ہوں) اور آپ کا پتہ معلوم ہوا تو آپ کو یہ خط لکھا۔ اس طرح دل کی مراد بر آئی۔

۲۔ مذکورہ نمبر کے صفحہ ۱۲۹ پر مندرجہ ذیل شعر ~

تو حاشر بھی، عاقب بھی، شاہِ زمن بھی
تو اصل اور کون و مکاں فرع تیری

ترے گرد سارا جہاں گھومتا ہے
تو مرکز ہے دنیا سب دائرہ ہے

یہ شعر درج کرنے کے بعد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب تحریر فرماتے ہیں: "اگر حضرت محسن کاکوروی اور مولانا احمد رضا خان اس دور میں زندہ ہوتے تو خالد کی نعت کو صحیح داد دے سکتے تھے۔ خالد صاحب ڈاکٹر صاحب نے کتنا صحیح فرمایا ہے کہ جس نفاست و لطافت سے حضرت محسن اور حضرت رضا قرآن پاک کی آیات اور احادیث پاک کو نظم فرماتے تھے اسی انداز سے بلکہ ان سے بھی بڑھ کر اس سلسلہ میں خالد کامیاب ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر اقبال آپ کے زمانہ میں زندہ ہوتے تو ان کی زبان سے یہ فقرہ نکلتا "درگہ داماں دراز آمد"

۳۔ جوش زندہ ہے تو نظم کی وجہ سے فراق زندہ ہے تو غزل کی وجہ سے اور خالد زندہ ہے تو نعت خوانِ رسول ہونے کی وجہ سے۔ جہاں تک میری محدود سی علمی کائنات کا تعلق ہے اس برصغیر میں تین ایسے شاعر ہیں جو کہ محض نعت حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے:

(۱) محسن کاکوروی
(۲) رضا بریلوی
(۳) عبدالعزیز خالد

والسلام

محمود ایاز

بنگلور
۷ را پریل ۱۹۶۳ء
برادرم!
تسلیم

شادی کا کارڈ انگریزی میں تھا تو اس کی وجوہات بھی تھیں۔ یہاں جو لوگ مدعو تھے ان کا نوّے فیصد حصہ اردو پڑھ نہیں سکتا۔ آپ کی اس بات سے مجھے 'اصولی' اختلاف ہے کہ اصول کو انسانی تعلقات پر ترجیح دی جائے۔ ایسی شدت تو ظواہر پرست علمائے شریعت کا خاصا ہوتی تھی۔ آپ اہلِ حال اور اہلِ دل ہوتے ہوئے ایسا رویہ اختیار کریں، تعجب ہے۔ شادی پر خوش ہونے کیلئے جس ذہنی اور عقلی دور کی ضرورت ہوتی ہے مجھے اس سے گذرے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا۔ لیکن آپ کا خط یا مبارکباد آتی تو ضرور خوشی ہوتی۔ یہ خوشی شادی کی خوشی سے مختلف ہوتی ہے۔ بہرحال آپ کا عذرِ گناہ گناہ سے زیادہ دلشکن نکلا۔ جس طرح وہ عبادت اور ریاضت رائیگاں ہوتی ہے جو انسان کے قلب کو گداز نہ کرے اور اس میں خشوع و خضوع کی کیفیت پیدا نہ کرے۔ اسی طرح وہ اصول اور نظریات بھی 'پائے چوبیں' ثابت ہوتے ہیں جو انسانی تعلقات اور دلبری و دلداری کے رشتوں کو نظرانداز کردیتے ہیں۔

اور بتایئے کیا مشاغل ہیں؟ پچھلے دنوں ایک اچھی کتاب نظر سے گذری۔ ولیم بیرٹ کی IRRATIONAL MAN اس میں اس نے PROTESTANTISE مذہب و آرٹ پر اثرات سے جہاں بحث کی ہے وہاں میرا ذہن اسلام میں IMAGES اور SYMBOLS کے فقدان کی طرف مبذول ہوا۔ انڈو مسلم تہذیب، عجمی تہذیب ان سب پر اسلام کے اثرات تسلیم لیکن یہ اثرات اپنی تکمیلی شکل میں کس حد تک اسلامی ہیں؟ اسلام کا کلچر کیا ہے؟ کیا تہذیبی زندگی صرف مذہبی معنوں میں روحانی ہوگی یا اس کا کوئی غیر دینی (SECULAR) روحانیت بھی ہوسکتی ہے۔ موخرالذکر صورت میں شریعت سے کیسے بچیں گے۔ اور اگر اول الذکر صورت پر اصرار ہو تو پھر آپ کی شاعری بلکہ پورا شعر و ادب کہاں جائے گا۔ آج کل پاکستان میں جو نیک اور خوش عقیدہ لوگ اس نوزائیدہ مملکت کے باسیوں کے لئے جڑیں مہیا کرنے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں ان کے بارے میں اس سے قطع نظر کہ اس مہم میں ذاتی مفاد کا کتنا عنصر شامل ہے، آپ کے کیا خیالات ہیں۔ ٹائن بی سے پاکستان کے اہلِ فکر اسکی THEORY OF CREATIVITY کے سبب بہت خوش ہیں لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے ٹائن بی کو اس کے ملخص ایڈیشن میں بھی نہیں پڑھا۔ آپ کو دلچسپی ہو تو کچھ اقتباسات بھجواؤں، جن سے ان کی قدردانیِ اسلام کا حال معلوم ہو۔

اب بتایئے ہم کہاں جائیں۔ مولانا عبدالماجد وحدتِ ادیان کے نام پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ ابن العربی شریعت کو دروغ مصلحت

آمیب کہتے ہیں - دونوں باتوں کی صحت یا عدم صحت سے بحث بعد میں ہوگی پہلے عملی شکل دیکھ لیجئے ۔ مولنا کی بات مان لیں تو ہم ہند کے مسلمان کہاں رہیں؟ شیخ اکبر کی بات مان بیٹھئے تو پھر کبیر کے گرو کے توسط سے شنکراچاریہ اور رامانج کو مسلم (جی ان معنوں اسلامی نہیں) تصوف میں SMUGGLE کرکے جو دینی اور روحانی زمین ابن پاکستان کو مہیا کی جائے گی اس میں اورنگ زیب پیدا ہوگا یا دارا شکوہ؟ ذہن میں اتنا مواد بھرا ہوا ہے کہ جی چاہتا ہے دو ایک سال کیلئے تیاگ لے لوں - اور صرف پڑھتا جوں اور لکھتا رہوں - لیکن صنوبر پابگل ہے (اس کے آزاد ہونے کی بات اقبال کا تصرف شعری ہے) پریس سات ماہ سے ایسے ہی پڑا ہوا ہے POWER نہیں مل رہا ہے - سارا جمع جتھا اس میں ڈال دیا اب بیٹھا ہوا اقبال سے توکل و قناعت کا سبق سیکھ رہا ہوں - ہر ماہ پریس کا کرایہ ۱۲۵/-، شادی کے بڑھے ہوئے اخراجات پر مزید اضافہ ہے - والد کی علالت اور میری بیماری اس پر مستزاد ______ - ایسے ہی حالات میں ہر صاحب فہم تصوف کی طرف راجع ہوتا ہے -

اگر نشہ کی کتابیں، انگریزی میں پڑھنے سے آپ ابھی تائب نہیں ہوئے ہیں تو یہ کتابیں اللہ کا نام لے کر پڑھ ڈالیے :

EXPERIMENTS IN DEPTH BY W MARTIN

THE IRRATIONAL MAN BY WILLIAM BARRET

THE TRAGIC SENSE OF LIFE BY MIGNAL DE UMAMNNO

دیگر سب خیریت ہے اور آپکی خیریت نیک درگاہ خداوندی میں مطلوب ہے -

پس نوشت: مجھے خط لکھئے تو ازراہ کرم دل پر جبر کرکے پتہ انگریزی میں لکھئے بصورت دیگر خط D.L.O کی سیر کرکے آتا ہے -

آپ کا مخلص
محمود ایاز

عبدالعزیز خالد

○

ہویدا ہے نظر سے کیفِ مستی
شبِ خمر و خمارِ صبح گاہی
ترا سج بن کے راتوں کو نکلنا
حصارِ عافیت کی ہے تباہی
مجھے رکھتا ہے مثلِ نو رمیدہ
کسی شمشاد قد کا رنگ کاہی

ہے دل دریا سمندر سے بھی گہرا
کوئی سمجھا نہ راز اس کا کماہی[ل]
چلا جاتا ہوں تنہا پا پیادہ
نہیں کوئی مری منزل کا راہی
پکاریں مجھ کو بے لولو ہے لولو!
الٰہی! میں تو ہوں تیرا سپاہی

وہ بے پروا ہے شاہانِ جہاں سے
جسے مل جائے دل کی بادشاہی
حکومت فضلِ ربّی کا نشاں ہے
غرور و تمکنت دل کی تباہی
سراپا غرقِ دریائے جواہر
نگاہوں میں کنایاتِ ملاہی
فروغِ صبحِ صادق خال و خد میں
شبِ یلدا کی زلفوں میں سیاہی
نہیں دل ساز یہ خوبانِ دلخواہ
مگر دل لے اڑیں خواہی نخواہی

○

عمر محدود، شوق لامحدود
کیا کریں زندگی میں کیا نہ کریں!
تو ہے نا دردمندِ عشق و جنوں
تجھ سے رازِ حبیب کیسے کہیں؟
چہرہ جیسے نوید یومِ وصال،
زلفیں جیسے فراق کی راتیں
ایسی چاہت سے ہم تو درگزرے
کون سمجھے یہ رمز کی باتیں!
کون چادر میں باندھے پانی کو
کون پکڑے ہوا کو مٹھی میں!

ہوشیاروں کو وہ پھنساتا ہے!
ان کی چالاکیوں کے پھندے میں
آئیں جائیں طرح طرح کے خیال
تیرے گیسو ہوا میں لہرائیں!
ہجر کی رات بانجھ ہو جائے
اور دیکھے نہ صبح کی پلکیں!

ل اللھم ارنا الاشیاء کما ھی
—————— رسولؐ

حرفِ تبریک

ہم اپنے صاحبِ اقبال مہمانوں کو
سلام کرتے ہیں، خوش آمدید کہتے ہیں
تمام ارضِ زمیں پہ جتنے مسلماں ہیں
ہمارے دوست، ہمارے دلوں میں بستے ہیں
خوشی کہ ہے ان کیلئے ارضِ پاک چشم براہ
دل ان کے لئے جذبات سے بھرے ہیں
ہے جو یہاں یہی جذبات دید کے قابل
سفینے شوق کے حسرت کی رو میں بہتے ہیں
شریکِ راحت بھی ہیں وہ شریکِ درد بھی ہیں
ہم ان کے ناز اٹھائیں، ہم ان کی چاہ کریں
زباں سے ان کی جو نکلے سخن سر آنکھوں پر
وہ حکم دیں تو دل و دیدہ فرشِ راہ کریں
ہم ان کی رہ میں ہیں، ہمارے لیے یہ فخر کیا کم ہے
کہ کم نگاہ ہماری طرف نگاہ کریں
ہے بسکہ ان کا ہمارا عقیدہ واحد
یہی ہے شرطِ رفاقت کہ اب نباہ کریں
تجھے پکارتے ہیں تیرا نام لیتے ہیں
تَبَارَكَ اسْمُكَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ
يُجَاهِدُونَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ
عطا ہو ان کو فلاح و صلاح و استحکام
ہیں بے اثر مگر امت ترے حبیب کی ہیں
ہوا ہے حسبِ مراد ان کے گردشِ ایام
ہے تو غنی تری درگاہ میں کمی کیا ہے

بہم ہو دل پذیر سے نم و آتش و رم و آرام
یہی دعا ہے یہی التجا، یہی خواہش
کہ تیرا فضل ہمیشہ شریکِ حال رہے
کریں تزئین و زباں سے ثنا مرتب ہیں
شکست و فتح میں ناموس کا خیال رہے
تو جس کے ہاتھ پہ شفقت سے رکھ دے ہاتھ اپنا
نہ بیمِ جاں نہ اسے خوفِ ماہ و سال رہے
ہے دہر میں جو ہمارا مقدمہ درپیش
دیارِ پاک میں آج اس کی روبکاری ہے
کچھ اضطراب ہمارا نہیں ہے دنیا
غزا کا شوق شہادت کی بیقراری ہے
ہم اپنے خون سے کشتِ حیات کو سینچیں
ہمارے ذمہ یہاں کارِ لالہ کاری ہے
وہ ایک گھڑی جو تری یاد میں کٹے اس میں
طراوتِ نفسِ یادِ نو بہاری ہے
ہوا ہے حوصلہ تکمیلِ کار کا کس کو؟
فضول ہے گلۂ بے وفائیِ دنیا!
ملے کسی سے نہ تجھ بن تشفی و تسکین
ترے سراغ میں ہیں شوریدگانِ دشتِ وفا
وفا پرستوں کا دیدار بھی عبادت ہے
زہے نصیب یہ اعزاز بھی نصیب ہوا
مبارک ان کو جو اس مؤتمر میں شامل ہیں
وہ شخص منتخبِ روزگار ہیں گویا

تبصرے

امروز — لاہور
مشرق — لاہور
مساوات — لاہور
نوائے وقت — لاہور
پاکستان ٹائمز — لاہور
سیارہ ڈائجسٹ لاہور
آنگن — لاہور
استقلال لاہور
حکایت لاہور
آہنگ — گیا
نشانات — مالیگاؤں
افکار — کراچی
جنگ — کراچی

عبدالعزیز خالد نمبر

امروز ——— لاہور

ماہنامہ "تحریریں" خالص علمی و ادبی رسالہ ہے جو ہر قسم کی گروہ بندی سے بالا ہو کر گذشتہ چند برسوں سے علمی و ادبی خدمت میں مصروف ہے۔ زیر نظر شمارہ اس کا "عبدالعزیز خالد نمبر" ہے جس میں مشہور شاعر اور فلسفی عبدالعزیز خالد کی شخصیت اور فکر و فن کا نہایت کامیابی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ "پہلی تحریر" کے تحت اداریے میں ان مشکلات کا بین السطور ذکر کیا گیا ہے جو پاکستان میں علمی و ادبی جرائد کو درپیش ہیں اور ان سے "تحریریں" بھی دو چار ہے۔ ان تمام مشکلات کی موجودگی میں "تحریریں" نے موجودہ ضخیم نمبر شائع کر کے ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

حمد اور نعت کے بعد پرچے کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ۲۵ نظموں پر مشتمل ہے جن میں شعراء نے اپنی نظموں کے ذریعے عبدالعزیز خالد کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان شعراء میں عبدالحمید عدم، شورش کاشمیری، غلام رسول ازہر، کبیر انور جعفری، ذوقی مظفر نگری، خیال امروہوی، قمر صدیقی، رؤف شیخ، تاج سعید کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

"پہچان" کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا، عارف عبدالمتین، سیف زلفی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جبکہ آغا صادق، مرزا ادیب، عارف عبدالمتین، مرزا ظفر الحسن، کانڈا انور، حفیظ صدیقی، کامل القادری، ارشاد احمد حقانی، مقبول جہانگیر، ضیاء الرحمٰن ضیاء وغیرہ نے "عکسِ شخص" کے تحت عبدالعزیز خالد کی شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسی حصے میں خالد کا ایک خود نوشت خاکہ بھی شامل ہے جو بڑا اہم ہے۔

"مطالعۂ فکر و فن" کے تحت چالیس تنقیدی مضامین ہیں جن میں سید وقار عظیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، سید ضمیر جعفری، عارف عبدالمتین، عبدالصمد صارم، ابن انشاء، رفیق خاور، عبداللہ قریشی، رشید نثار، عذرا مسعود کے مضامین بڑے اہم ہیں۔ "مطالعہ کتب" کے تحت عبدالعزیز خالد کی تصانیف کے الگ الگ تجزیے پیش کیے گئے ہیں۔ ان تجزیہ نگاروں میں احسان دانش، رئیس احمد جعفری، مالک رام، رفیق خاور، محمود سعیدی، اعجاز فاروقی، انور سدید، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر وزیر آغا، ضیاء جالندھری، جمیل جالبی، جعفر طاہر، وقار انبالوی، صہبا لکھنوی، وحید قریشی، احسن فاروقی، ظہیر کاشمیری، غالب احمد

عبدالسلام خورشید جیسے اہم نقاد بھی شامل ہیں۔

• ملاقاتیں" کے تحت ذوالفقار تابش، حفیظ صدیقی، کامل القادری، ضیاء شاہد، اکرام رانا، سلطان شاہد، ہارون الرشید، نذیر ناجی کے عبدالعزیز خالد کے ساتھ انٹرویوز شامل ہیں جو قابلِ مطالعہ ہیں۔ "خیالات" اور "تاثرات" کے تحت پاکستان اور ہندوستان کے سو کے قریب معروف لکھنے والوں کے تاثرات دئیے گئے ہیں۔

مختلف قد آور شخصیتوں پر خصوصی نمبروں کا سلسلہ اس اعتبار سے لائقِ قدر ہے کہ ان کے مطالعہ سے پڑھنے والوں کو کسی بھی اہم شخصیت کو کما حقہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ "تحریریں" نے "عبدالعزیز خالد نمبر" کے ساتھ اس سلسلے کا آغاز کیا" پہلی تحریر" کے تحت اس امر کا اظہار کہ اس نمبر کے تین سو سے زائد کتابت شدہ مضامین روکنے پڑے، غالباً اس امر کا بالواسطہ اعلان ہے کہ اس نمبر کی دوسری جلد بھی متوقع ہے۔ اگر "تحریریں" نے تفصیلی مطالعے کے اس سلسلے کو جاری رکھا تو بہت بڑی خدمت ہوگی۔ عبدالعزیز خالد نمبر سوا چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ خوبصورت سرورق اور تصاویر سے آراستہ یہ خاص نمبر آفسٹ پر اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ظاہری حسن اور معیار کے اعتبار سے قیمت بہت کم ہے۔

مشرق ——— لاہور

عبدالعزیز خالد آج کی شعری دنیا میں سب سے الگ پہچانے جاتے ہیں اور سب سے زیادہ انہوں نے اپنے عہد سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی مختلف ادبی رسالے اپنے خاص شمارے اس شاعر کے لئے وقف کر چکے ہیں اور اگر ان ہی خاص شماروں کو سامنے رکھیں اور ان نقادوں اور دوسرے اہلِ قلم کے اسمائے گرامی پر نظر ڈالیں جنہوں نے اس شاعر کے بارے میں لکھا ہے تو احساس ہوگا کہ آج کے پورے ادبی عہد نے اس شاعر کے جوہر کا لوہا مانا ہے اور خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ عبدالعزیز خالد اپنی فکر اور اپنے زبان و بیان دونوں کے اعتبار سے منفرد مقام رکھتے ہیں، پھر وہ بہت پرگو شاعر ہیں۔ وہ مشکل پسند شاعر ہیں، جو اسلوب انہوں نے اپنے لئے وضع کیا ہے اس میں اظہار کرنا آسان نہیں، جان جوکھوں کا معاملہ ہے۔ مگر عبدالعزیز خالد اس مشکل اسلوب میں اتنے رواں ہیں کہ متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور شاعر کے یہاں کوئی آورد یا تکلف کا احساس نہیں ہوتا۔

موجودہ خاص شمارے میں شاعر کو جانچنے پرکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ منفرد شاعر کس قسم کی شخصیت ہے۔ یہ جاننے سمجھنے کی بھی کوشش نظر آتی ہے۔ جن اصحاب نے شخصیت پر قلم اٹھایا ہے ان میں ڈاکٹر وزیر آغا، عارف عبدالمتین اور مرزا ظفر الحسن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جن نقادوں نے ان کی شاعری کو جانچا پرکھا ہے ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر وقار عظیم جیسے نقاد بھی شامل ہیں۔ ان دونوں حضرات نے خالد کو نعت گو کی حیثیت سے پرکھا ہے۔

عبدالعزیز خالد کے مختلف مجموعوں کا الگ الگ بھی جائزہ لیا گیا ہے اس طرح سے ان کے ہر مجموعہ کی قدر و قیمت الگ متعین کی گئی ہے۔ مختلف شاعروں نے اپنے ہمعصر شاعر کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ پھر کچھ انٹرویو بھی اس میں شامل ہیں۔ ان انٹرویوز کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کا اپنا نقطۂ نظر شاعری کے بارے میں کیا ہے اور کس مقام

سے وہ بولتا ہے۔

مساوات، لاہور

"تحریریں" کا یہ خاص نمبر مارچ اور اپریل ۷۵ء کے لئے مشترک ہے۔ اس شمارہ میں تقریباً سواد و سوزندہ اہل قلم نے اپنے ایک ہمعصر زندہ شاعر کو نثر میں خراج تحسین سے نوازا ہے۔ ہمارے نزدیک محترم عبدالعزیز خالد بڑے خوش نصیب شاعر ہیں۔ اس لئے کہ اس خاص شمارے میں جن ۲۰۰ زندہ شعراء نے اپنے منظوم فن پاروں میں خالد صاحب سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار کیا ہے ان میں جناب عبدالحمید عدم اور جناب شورش کاشمیری جیسے بے لوث اور مخلص لوگ بھی شامل ہیں۔

عبدالعزیز خالد کی شخصیت کے دو پہلو بہت واضح ہیں۔ ایک طرف وہ بہت بڑے سرکاری افسر ہیں اور دوسری طرف وہ قد آور اور منجھے ہوئے معروف شعرا کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں اور یہ دونوں باتیں لکھنے والوں نے اپنے سامنے رکھی ہیں لیکن انہوں نے برملا کہا ہے کہ ہمارا مخاطب سرکاری افسر نہیں، بلکہ عظیم انسان اور بلند خیال شاعر عبدالعزیز خالد ہے۔

زاہدہ صدیقی نے "پہلا سریر" میں باعث تحریر کے طور پر لکھا ہے۔ "ہم نے عبدالعزیز خالد نمبر کا اعلان کرتے ہوئے اسے قد آور لکھنے والوں کے خصوصی مطالعہ کے سلسلے کی پہلی کڑی قرار دیا تھا ——— پہلی کڑی شائع کرنے تک ہم جن کٹھن مراحل سے گذرے ہیں ان کے باوجود ہمارے ارادوں میں وہی پختگی ہے جو ابتدا میں تھی ——— عبدالعزیز خالد نمبر آپ کے سامنے ہے۔ ہم نے حد درجہ نامساعد حالات کے باوجود ایک معقول نمبر پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس میں ہم کمال تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا تعین تو پڑھنے والے ہی کریں گے۔

"پہچان" کے عنوان سے وزیر آغا لکھتے ہیں:

"وہ جب با ادب با ملاحظہ مقام کی دور دراز فضاؤں میں سے گذر کر اپنے باوقار اور سنجیدہ دفتر میں قدم رکھتا ہے تو چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے ———

تاہم اس سارے سنجیدہ انہماک، بھاری بھرکم شخصیت اور دفتری عمامے کے باوجود یہ شخص اندر سے ایک قلندر ہے جو جاہ و حشمت کو نوکِ پا سے ٹھکرا کر محض سورج کی روشنی کی تمنا کرتا ہے کہ روشنی ہی ازل ہے اور روشنی ہی ابد ———"

عارف عبدالمتین لکھتے ہیں:

"وہ (عبدالعزیز خالد) ہمارے عہد کے ان لاتعداد فنکاروں میں سے نہیں ہیں جن کی شخصیت اور فن میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ برصغیر پاکستان و ہند کے حق کے ان فنکاروں کی اس مختصر سی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو شخصیت اور فن کے عدم تفاوت کی وجہ سے ممتاز ہے، جس کے ہاں فن شخصیت کی رفعتوں کا امین ہے۔"

عبدالعزیز خالد کے ایک سوانح نگار کے مطابق وہ جنوری ۱۹۲۷ء میں بمقام جالندھر پیدا ہوئے۔ ان کی پہلی نظم "راہ و رسم منزلہا" ۱۹۵۲ء میں "ساقی" کے سالنامہ میں شائع ہوئی۔ لیکن میرزا ادیب کو فخر ہے کہ انہوں نے خالد کی پہلی نظم "ادبِ لطیف" میں اس وقت

شائع ہوئی جب خالد ابھی تک طالب علم تھے۔ خالد کا پہلا منظوم ڈرامہ "حریرِ رگِ گل" کے عنوان سے "ماہِ نو" میں شائع ہوا
آٹھ نو برس کے مختصر سے عرصہ میں انہوں نے غیر معمولی شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ ان کی شہرت کا سب سے بڑا سبب ان کے منظوم ڈرامے ہیں۔ وہ تنہا شاعر ہیں جنہوں نے اردو شعر میں نہایت سلیقے سے ڈرامہ سمویا۔ ان کی ڈرامائی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف کلاسیکی ادب کے تراجم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بیشتر ان موضوعات پر اپنی تخلیقات کی بنیادیں استوار کیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ عبدالعزیز خالد مشکل پسند شاعر ہیں۔ یہ خیال اس لئے پیدا ہوا ہے کہ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر ایک مخصوص و منفرد رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے ان کے الفاظ انتخاب موضوع کی گہرائی اور گیرائی سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ان کا ادبی نقطۂ نظر بڑا صحت مندانہ ہے۔ وہ انسان کو رجائیت اور عمل کا پیغام دیتے ہیں اور ان کی شاعری میں انسان کی عظمت اور شکوہ کا عکس ہے۔ عبدالسلام خورشید کے نزدیک ——— عبدالعزیز خالد ایک طرف یونانی دیومالا اور دنیا کے بہترین کلاسیکی ادب سے روشنی اخذ کرتے ہیں تو دوسری طرف آسمانی صحیفوں کی ضیاباری سے بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔ السنۂ شرقیہ میں انہیں گہرا درک حاصل ہے، بالخصوص عربی زبان میں۔ اپنے کلام میں عربی زبان کو اس چابکدستی سے سموتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ لیکن احسن کلیم جناب عبدالعزیز خالد کے اس لئے معتقد ہیں کہ انہوں نے اردو کو ایک نیا اور منفرد اسلوب دیا ہے۔ انہیں عربی، فارسی، لاطینی اور عبرانی پر بھی پورا عبور حاصل ہے اور اپنے اس علم سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اردو شاعری کے دامن کو نئے اور انوکھے موتیوں سے مالا مال کیا ہے۔

ناصر زیدی کو جناب جوش ملیح آبادی کی رائے سے اتفاق ہے کہ بڑے افسر ہونے کے باوجود وہ (عبدالعزیز خالد) ایک اچھے انسان ہیں۔ ایسے اچھے انسان کہ ان سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہی چیز ان کی غیر معمولی شرافت کی سب سے قوی برہان ہے۔

دوسری تحریروں کے علاوہ خود عبدالعزیز خالد کی خود نوشت اس ادبی صحیفہ کی زینت ہے۔ مختلف تحریریں مل کر جو تصویر بناتی ہیں ان سے ہم خالد صاحب کی علمی فنی اور شخصی شرافت کے مجملاً نقوش نہایت آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس خاص شمارہ میں اور تو سب کچھ ہے لیکن عبدالعزیز خالد کا کوئی منظوم ڈرامہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ نظر نواز نہیں ہوتا۔ البتہ ان کے معروف ڈراموں پر تنقیدی مضامین پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تنقید پڑھنے سے اصل تخلیق کو پڑھنے کی پیاس اور بڑھ جاتی ہے۔

نوائے وقت۔ لاہور

——— لگ بھگ ڈھائی سو لکھنے والوں نے عبدالعزیز خالد کے فکر و فن کا احاطہ کیا ہے۔
پرچہ ترتیب و تدوین کا اعلیٰ معیار پیش کرتا ہے۔

ستارہ ڈائجسٹ: لاہور

"تحریریں" میں وہ حصہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جس میں عبدالعزیز خالد کی تصانیف پر اردو کے مستند اور صاحب الرائے ادیبوں اور نقادوں نے اپنی تنقیدی اور تاثراتی آراء کا اظہار کیا ہے۔

"تحریریں" کا خالد نمبر ایک بڑے شاعر کو سمجھنے سمجھانے کی ایک پُرخلوص اور قابلِ قدر کوشش ہے۔

۴۔ آہنگ۔ لاہور

عبدالعزیز خالد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں کہ اُنہوں نے شاعری کو نیا اسلوب عطا کیا ہے۔ اُنہوں نے طویل ترین نظمیں لکھیں۔۔۔ نعتِ رسولؐ کو نیا رنگ دیا ـــ شاعری میں ان کا سب سے الگ رنگ ہے۔ وہ سرود رفتہ ہو یا فارقلیط۔ اردو شاعری میں نعتیں تو بہت لکھی گئیں مگر وہ زیادہ تر ـــ میرے مولا بلا لو مدینے مجھے ـــ یعنی معاشرہ، ماحول اور حالات سے گھبرا کر فرار۔

علامہ اقبال نے قوم کو نیند کی گولی نہیں دی بلکہ قوم کو عہدِ ماضی کی داستان یاد دلا دلا کر بیدار کیا ـــ اور عبدالعزیز خالد نے ایک "مسلم بیدار" کے خیالات طویل نظموں میں ڈھالے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کی کتابوں اور شاعری پر تبصرے تو اخبارات و رسالوں میں ہوتے آئے ہیں مگر ماہنامہ "تحریریں" نے اپنے اشاعتی دور کا عظیم کام یہ کیا ہے کہ خالد کے بارے میں لکھی گئی ہر تحریر کو یکجا کیا ہے۔ آج تک ان کی کتابوں پر کئے گئے سب تبصروں کو اکٹھا کیا ہے۔ ان کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں بڑے جاندار مقالے لکھوائے ہیں۔ اور لکھنے والوں نے "تحریریں" کی آواز پر اس طرح لبیک کہا کہ انہیں اپنا دامن تنگ نظر آیا۔ حالانکہ خالد نمبر چار سو سولہ صفحات پر بکھرا ہوا ہے۔ اس میں خالد کی اپنی حمد و نعت بھی ہے اور خالد پر لکھی گئی ۲۴ نظمیں ہیں۔ کچھ سات ملاقاتیں ہیں۔ کم و بیش ستر تاثرات ہیں۔ دس، عکسِ شخص، باقی ان کی کتابوں پر تبصرے۔

بلاشبہ یہ بہت بڑا کام ہے۔ اور اس عظیم منفرد شاعر پر ایسا ہی منفرد نمبر نکلنا چاہیے تھا ـــ زاہدہ صدیقی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ اُنہوں نے ادب میں فحاشی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے دور میں، پاکیزہ نفس شاعر کی شخصیت اور فن پر اتنا ضخیم نمبر نکالنے کی جرأت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کیا ـــ کہ

یہ نمبر ۔۔ صفحات کا تھا مگر اس میں سے بہت سے مضامین کم کرنے پڑے ـــ ہماری خواہش ہے کہ وقفے وقفے سے اسی نوع کے نمبر نکالے جائیں۔

ہفت روزہ استقلال ـــ لاہور

"تحریریں" کا ۴۱۶ صفحات پر مشتمل عبدالعزیز خالد نمبر پیش نظر ہے جس کی ترتیب و تزئین میں زاہدہ صدیقی نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ عبدالعزیز خالد کی ہلویاہ اور حمطایا کے بعد خالد کی شان میں ۲۴ نظمیں شاملِ اشاعت ہے۔ جن میں عدم، شورش، غلام رسول ازہر، خیال امروہوی وغیرہ بہت سے شعراء نے خالد کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے اور افصح الفصحا، اشعر الشعراء، شاعرِ معجز بیاں جیسے خطابات سے نوازا ہے۔ رؤف شیخ نے پنجابی زبان میں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

ہتھ بنھ غلام نیں لفظ تیرے تیری باندی اے ازلوں زبان خالدؔ

حصہ نثر میں "پہچان" کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا، عارف عبدالمتین اور سیف زلفی نے خالد کے سراپا سادگی اور علمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ ایک بڑا افسر ہے لیکن نہایت منکسر المزاج، وہ کم آمیز ہے مگر مردم آزار نہیں ـ وہ مجموعۂ اضداد ہیں سماجی سطح پر اور فن کی سطح پر۔ وہ انکم ٹیکس کمشنر ہیں حساب کتاب کے آدمی لیکن صاحبِ دیوان شاعر ہیں، بہت سی زبانوں کے ماہر اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، نازک خیال فنکار ہیں وغیرہ وغیرہ

اس سے اگلے صفحات پر آغا صادق، مرزا ادیب، عارف عبدالمتین اور مرزا ظفرالحسن الور، کامل القادری اور راشد احمد حقانی، اور ضیاءالرحمٰن ضیاء نے اس کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ خود عبدالعزیز خالد نے اپنی شخصیت کے بارے میں مختصراً "مدبیان اپنا" دیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ اور سید وقار عظیم نے خالد کے فنِ نعت گوئی کو ایک فنکار اور نقاد کی حیثیت سے پرکھا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے خالد کو مخترع نعت نگار کہتے ہوئے اعلان کیا کہ اس نے نعت نگاری کا ایک خاص انداز ایجاد کیا ہے۔ جس طرح وہ خاص اسلوب کا موجد ہے اسی طرح وہ نعت نگاری میں بھی مخترع و مجتہد ہے۔ انہوں نے مزید بتایا ہے کہ خالد کی نعت کا دامن جذبات سے واقعات تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا میدان وصفِ رسولؐ سے آگے بڑھ کر تاریخِ اسلام سے آگے کی منزلوں تک جا پہنچا ہے۔ اس کی نعت میں خلافتِ راشدہ کے متعلق افکار بھی ہیں اور بعد کے اسلامی عروج و زوال کے تاثرات بھی۔ تذکرۂ مدوجزر قومی بن کر اس کی نعت ایک نیا تصور پیش کرتی ہے۔

سید وقار عظیم بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عبدالعزیز خالد کی نعتوں کی تشکیل تین اجزا سے ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کے وہ اوصافِ حمیدہ جن کی شہادت قرآن نے دی، حیاتِ طیبہ کے وہ اقوال و اعمال جنہیں ثقہ راویوں نے مرتب اور محفوظ کیا اور رسول اللہؐ کی محبت و عقیدت کا سرمایہ جو ہمارے ایمان کا جزو لازم ہے۔ شاعر نے ان تینوں اجزاء کے میل سے جو مرقع بنایا ہے اس میں ذاتِ رسولؐ کے ان سب پہلوؤں کا عکس موجود ہے جن کی پیروی میں انسانیت کی فلاح کا راز مضمر ہے اور یہ کہ ہر شعر میں ایک مہتم بالشان حقیقت بیان ہوئی ہے اور ہر شعر کو اس کے اظہار کا مہتم بالشان پیرایہ ملا ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے یہ حقیقت قلمبند کی ہے کہ خالد کے سترہ مجموعہائے کلام میں، گیارہ ان کے دستخطوں کے ساتھ برق کے پاس بطور بیش بہا سرمایہ موجود ہیں۔ ان کے تاثرات کچھ اس طرح ہیں کہ جس طرح علامہ اقبال کے دس مجموعہائے شعر کا اساسی نکتہ خودی و صفاتِ خودی ہے اسی طرح خالد کا بنیادی موضوع ہے عشقِ رسولؐ۔ منہامیں تقریباً ساڑھے چار سو اشعار ہیں اور فارقلیط ۱۲۹۴ اشعار نعتیہ کلام پر مشتمل ہیں۔ خالد کو عظیم شاعر کے علاوہ تاریخ کا بہت بڑا عالم مانتے ہوئے برق کہتے ہیں "یوں معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونان، اہلِ مصر، روما اور ہند کے واقعات اس کے سامنے بکھرے پڑے ہیں اور وہ جس واقعہ کو چاہتا ہے قیدِ بحر و وزن میں لے آتا ہے۔" برق نے جہاں خالد کے کمالِ فن اور سلامتِ زبان و پرگوئی کی داد دی ہے وہاں ماہر القادری کے حوالے سے ان کی ہیبتناک تلمیحات کو جنگل اور دھونس جمانے کی سعی نامشکور کہنے سے نہیں چوکے۔

سید ضمیر جعفری نے خالد کو اردو شاعری کے عقابِ اعظم کا خطاب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں جب بھی یہ عقاب اردو کی طرف آتا ہے عربی فارسی کے بہت سے کارآمد الفاظ بھی دور دور سے مار لاتا ہے۔ مزید یہ کہ ان کی شاعری بلند آہنگ بھی ہے، بلند پرواز بھی اور تیز رو بھی۔ تہذیب و فن، فلسفہ و فکر، بصیرت و حکمت، تاریخ و تمدن، الغرض کائنات اور انسان کا کون سا عنوان ہے جو اس کے بال و پر کے نیچے نہ آیا؟"

عارف عبدالمتین نے خالد کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "خالد اصلاً غزل گو ہیں۔ ان کی نظموں میں لہجے کی غنائیت بات کرنے کا ایمائی اور رمزیہ انداز اور فکر و ادراک کے بجائے جذبہ و احساس کی سطح سے ابلاغ کا مستحکم میلان اس امر کا آئینہ دار ہے کہ ان کی تخلیق غزل کی اساسی خصوصیات کی مرہونِ منت ہے۔ عبدالعزیز خالد کی غزل، فن اور شخصیت کا ایک دلآویز نقطۂ اتصال پیش کرتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے یہاں فن کا فروغ اور شخصیت کا ارتقا ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلتے ہیں"۔

عبدالصمد صارم اعتراف کرتے ہیں کہ خالد کو پڑھنے کے لئے اعلیٰ درجے کا عربی داں ہونا ہی کافی نہیں۔ یہاں صرف عربی، فارسی ہندی، سنسکرت سے ہی کام نہیں چلے گا۔ فرانسیسی انگریزی، عبرانی، سریانی اور نہ جانے کتنی زبانوں کی ضرورت پڑے گی۔ پھر یہ کہ خالد کے قاری کو علامہ ہونا چاہئے۔ اسے تاریخِ اسلام، حدیث، فقہ، تفسیر، تصوف، نئے اور پرانے علوم نیز تلمیحات کا بھی ماہر ہونا چاہئے۔ عبدالصمد کو اندیشہ ہے کہ اگر خالد کچھ اور طویل عرصہ زندہ رہے تو وہ ساری حدیثیں نہیں تو پورے قرآن کو شعر کے قالب میں ڈھال دیں گے۔ ریاض حسین اکرام، ابن انشاء، رفیق خاور، جمیلہ ہاشمی، محمد عبداللہ قریشی، انور رومان سلیم بیتاب اور کامل القادری، خالد بزمی، عذرا مسعود، عفت موہانی، رشید نثار، سعید وارثی، اکمل گیلانی، وزیری پانی پتی اور اکبر کاظمی وغیرہ نے خالد کے فن کے بحرِ ذخار کی غواصی کی ہے اور جو جو موتی وہ چن سکے لا کر صفحۂ قرطاس پر سجا دیئے ہیں۔

خواجہ اعجاز احمد بٹ نے طویل نظموں سے قطع نظر صرف مختصر ترین نظموں پر قلم اٹھا کر خالد کی مشکل پسندی سے قاری کی نظر ہٹا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خالد کے اسلوب میں سادگی کا اظہار ناقابلِ بیان حد تک رشک آمیز ہے

اس انتظار میں
کہ خواب میں
تم آؤ گی
میں ساری رات جاگتا رہا

اس سے اگلے صفحات خالد کی تصانیف پر تبصرے کے لئے مختص ہیں۔ "فارقلیط" پر احسان دانش، رئیس احمد جعفری ملک اکرام، حکیم محمد سعید، یونس احمر حسن مثنیٰ ندوی۔ ڈاکٹر خان رشید، قاسم محمود، سجاد رضوی۔ ذوالفقار تابش، محمود سرحدی نے خالد کی فن نعت گوئی کو اس کی معراج قرار دیا ہے۔ برگِ خزاں پر اظہار رائے کرتے ہوئے ڈاکٹر خان رشید کہتے ہیں "اس کتاب میں تین طویل نظمیں شامل ہیں۔ قابیل، تلک ناز اور آشور بنی پال جن سے قدیم تہذیبوں کے بیشمار گوشے سامنے آتے ہیں۔ شروع میں قرآن پاک اور توریت کے اقتباسات ہیں پھر منظومات کا آغاز ہوتا ہے اشعار میں روانی اور متانت و وقار نمایاں ہے۔ صوت و آہنگ کے خصوصی شعور سے کام لے کر خالد نے واقعات اور مواقع کی مناسبت سے فضا اور تاثر قائم کرنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے مکالموں میں ندرت ہے، ڈرامائی کیفیات اور محاکات نگاری کے اعتبار سے یہ مجموعہ یقیناً بے مثل ہے"!

ابنِ فرید، امریک انند، نسیم گل نے بھی اسے بہترین المیہ اغنیۂ بہار کہہ کر آئندہ نسلوں کے لئے خراجِ عقیدت کے

لئے لازمی قرار دیا ہے۔ اسی طرح گل نغمہ پر رفیق خاور، وفا راشدی، محمود سعیدی، تاج سعید، انیس خورشید اور ضیاء الدین برنی نے قلم اٹھایا ہے اور پورا پورا انصاف کیا ہے۔

"لحن صریر" پر غلام مصطفیٰ خان، عباس فاروقی، انور سدید، فرمان فتح پوری اور گوپال متل نے اس کی ۳۱۳ رباعیوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ کہیں اس کے جمالیاتی رنگ کو سراہا گیا ہے، کہیں اسے ندرت کے نقیب سے زیادہ روایات کا امین کہا گیا ہے، کہیں اس کی قلندرانہ نفی کو امتیازی وصف قرار دیا گیا ہے اور کہیں اس کا دم غنیمت جانا گیا کہ وہ روش زمانہ کے مطابق محرومیت کا شکار نہیں ہوا، کہیں اس کی رباعیات کو پاکیزہ اور خیال افروز ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل رباعی کی مثال پیش کی گئی اور لحن صریر کو رباعی کے سرمایہ میں ایک وقیع اضافہ تسلیم کیا گیا۔

جب تک نہ ہو آزادیٔ اظہار و بیاں
ممکن ہے نشو و نمائے انساں
جو کہ میں نہ تاب و تب ادراک و شعور
ہے ہر دو جہاں میں رائیگاں وہ انساں

"زنجیر رم آہو" کو انسانی فکر و نظر کی میزان پر رکھ کر اسے خالد کا بہترین مجموعہ گردانا ہے اور اس امر کا واضح کیا ہے کہ مشکل گوئی کا الزام خالد پر جب یار کر دیا گیا ہے ورنہ وہ اتنا مشکل گو اور اتنا ہی بالکل سہل ممتنع کہنے والوں میں۔ ان کے سنجیدہ فکر کے ڈانڈے غالب اور اقبال سے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری سونگھنے کی چیز نہیں پڑھنے اور لذت اندوز ہونے کی شے ہے۔ تنویر بخاری نے اس مجموعے کو خالد کے تازہ ترین رنگ طبیعت اور رنگ سخن کا نمائندہ کہا اور لفظیات پر قدرت، شوکت بیان کا بہترین مظہر۔

غلام محمد پرویز صاحب نے اسے عربی و فارسی نادر و پرشکوہ الفاظ کا ایک سیلاب کہا ہے۔ محمود احمد، عبیداللہ علیم، انجم اعظمی، وفا راشدی، شفیع معین، محمد اکبر الدین احمد، جوہر میر، رخشندہ برلاس وغیرہم نے مختلف انداز میں مجموعہ کو امتیاز خاص کا حامل قرار دیا ہے اور خالد کے فن غزل گوئی کو سراہا ہے۔

"کف دریا" کو وزیر آغا اور ابن انشاء نے نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے اسے اردو شاعری میں اہم اضافہ اور حامل بصیرت کہا ہے۔ سید عابد علی عابد کو "کلک موج" میں خالد کے تخیل کی رسائی اور گہرائی اور تنوع کا جوہر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ جمیل جالبی کو اس میں زندگی کی ابدی حقیقتیں زیادہ واضح اور انداز ناصحانہ محسوس ہوا۔ وزیری پانی پتی کے خیال میں یہ مجموعہ اردو غزل میں ایک نئے موڑ اور سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اسے ایک ایسا ذہنی عنصر قرار دیا ہے جس سے فنکار کا تخلیقی عمل زندگی و پائندگی حاصل کرتا ہے۔

"دشت شام" پر تبصرہ کرتے ہوئے افسر آذر کہتے ہیں کہ یہ خالد کی غزلوں و نظموں کا طویل مجموعہ ہے اور خالد کی قائم کردہ روایات پر پورا اترتا ہے۔ خالد کی شاعری میں جذبات و احساسات موجود ہیں۔ البتہ ان کو مستعمل پیمانوں اور سانچوں سے نہیں ناپا جا سکتا اس کے لئے تنقید کو آگے بڑھ کر وہ صورت اختیار کرنی ہے جس سے قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل نظر

آتے " مزمورِ میرمغنی" کے بارے میں انور سدید کی رائے ہے کہ اس کے اظہار میں زیرِ لب گفتگو کی سی کیفیت ہے اگرچہ یہ خطابیہ نظم نہیں لیکن مخاطب ایک ایسی قوم ہے جو بنیادی لذتوں میں اپنا روحانی منصب کھو چکی ہے" فرمان فتح پوری کی نظر میں یہ طویل مثنوی اردو شاعری کی بالکل نئی چیز ہے جس کا مقصد انسانیت اور اسکی اعلیٰ اقدار کی ترویج ہے۔ مشتاق مفتی نے اس قحط الرجال کے دور میں ایسی تصانیف بسا غنیمت جانی ہیں۔ خالد کا شعری مجموعہ "سرود رفتہ" یونان کی حسین شاعر کے حسین کلام کا خوبصورت ترجمہ ہے جیسے جعفر طاہر، جمیل جالبی، اختر انصاری اکبر آبادی، محمود سعیدی، جون ایلیا نے مترجم کے تخلیقی کرب، احساس حسن کاری، اجتہادِ نظر اور ریاض کو عجب انداز میں کار فرما پایا ہے۔ "سلومی" کے بارے میں مرزا ادیب کی رائے ہے کہ خالد صاحب اس میں اپنے فن کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتے ہیں اور ایک منظوم ڈرامہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے اردو ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

" ورقِ ناخواندہ" کے متعلق رفیق خاور، ڈاکٹر شوکت سبزواری، نارش حیدری، سجاد نقوی کی آراء پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے "پروازِ عقاب" میں ہوچی منہ اور خالد کی جذباتی وعقلی مناسبتیں تلاش کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ شاعر کے احساسات اور مترجم کے داخلی کوائف میں کیا رشتہ ہے۔ خالد نے ان نظموں کو خارجی سطح پر بھارت میں مقید پاکستانی نوجوانوں سے منسلک کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں :

> " ہوچی منہ کا تصورِ حیات اسے عزم و ہمت پر اکساتا ہے۔ یہ عزم اور حوصلہ خالد کے مزاج سے ہم آہنگ بھی ہے۔ شاعر کی میں انا دیت کے متلاشیوں کو اس میں کئی سبق ملیں گے۔ خالد کے حوالے سے دیکھا جاتے تو ان نظموں کا عزم و ہمت والا پہلو ملک کی موجودہ صورت حال میں بہت غنیمت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں خالد اس شعری مجموعہ میں روحانی نقطہ نظر سے مناظر کو دیکھتے ہیں اور احساسات کو ٹھوس مادی حقائق سے ہموار کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں "

ڈاکٹر احسن فاروقی نے خالد کے شعری رعب و دبدبہ کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ہوچی منہ کے دل کی دھڑکن کو اردو زبان میں منتقل کرنے میں کمال کے ساتھ کامیاب نظر آتے ہیں۔ ظہیر کاشمیری، غالب احمد، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، فتح محمد ملک اور اطہر جاوید نے بھی ہوچی منہ اور خالد کی قدرِ مشترک دردِ ملی اور حب الوطنی قرار دیتے ہوئے ترجمہ کے اسلوب، سلاست، روانی، شدتِ احساس، شعری عظمت و آہنگ کا اعتراف کیا ہے۔ خصوصیت سے اس کے منظوم انتساب کی جدت وندرت کو سراہا ہے۔

ان نظر بندوں کی آبادی کے نام
ان ظفر مندوں کی بربادی کے نام
وہ جری جرار پاکستان کے
جو لڑے بڑھ چڑھ کے سینہ تان کے

پر بیگانوں نے جنہیں دھوکہ دیا
مے سے خونِ ناب کا سودا کیا

اگلے چند صفحات میں " ملاقاتیں " ہیں جن میں ذوالفقار تابش، اکرام رانا، نذیر ناجی، کامل القادری، ضیا شاہد، حفیظ

صدیقی، سلطان شاہد وغیرہ نے عبدالعزیز خالد کی شخصیت کو اجاگر کیا ہے اور نقاب کشائی کی ہے۔
خالد کے ۱۹ شعری مجموعے بلحاظ تصنیف سن و نام ایک ورق پر درج کرنے کے بعد اگلے چند صفحات "خیالات" کے عنوان کے تحت چیدہ مختلف ادباء و شعراء کے اظہار خیال پر مبنی ہیں جن میں مختلف انداز سے خالد کے "تبحرِ علمی، وسعتِ تخیل، قدرتِ بیان، تنظیم و تہذیب، فکر و سلیقہ، ترتیب طباعت کی ستائش کی گئی ہے۔ کچھ خطوط کے اقتباسات ہیں جن میں مدح و ستائش کے علاوہ عربی دانی پر دبا دبا احتجاج اور نصائح بھی ہیں۔ مختصر مختصر متعدد آراء کے بعد پھر ایک نظم اور دو مضامین شاملِ اشاعت ہیں جس کے بعد "تاثرات" کے عنوان سے خالد کو سراہنے والے قطار در قطار کھڑے نظر آتے ہیں۔
"تحریریں" کا یہ خالد نمبر چوک اردو بازار اور اپنے ذیلی دفتر نمبر ۲/۱۷ سلطان پورہ لاہور سے شائع ہوا ہے جس کی قیمت ۱۲ روپے ہے۔ بارہ روپے میں ایک اہم شخصیت کے متعلق اتنی تفاصیل معلوم ہو جانا اس دور میں بسا غنیمت ہے۔

حکایت - لاہور

"تحریریں"، ایک ماہنامہ ادبی رسالہ ہے۔ ادبی حلقوں کے جانے پہچانے اس جریدے نے عبدالعزیز خالد کی شاعری سے متاثر ہو کر یہ ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔ اس میں بے شمار معروف شاعروں، ادیبوں اور مفکروں نے علم و دانش کے ہر شعبے کی نمائندہ شخصیتوں نے عبدالعزیز خالد کی شاعری اور شخصیت کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سے نہ صرف شاعرِ موصوف کے علمی، فنی اور نفسیاتی پہلو سامنے آتے ہیں بلکہ شاعری بحیثیت فن پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ اس خاص نمبر کا ایک حصہ منظوم ہے جس میں عبدالعزیز خالد کے منتخب کلام کے علاوہ اچھے اچھے شاعروں کا کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔
"تحریریں" کی یہ کاوش قابلِ داد ہے۔ کسی شاعر یا ادیب کو خراجِ تحسین پیش کرنے اور اسے متعارف کرانے کا یہ انداز ہر لحاظ سے تعریف کے قابل ہے۔ اس خاص نمبر میں بعض مفکروں اور ادیبوں نے نہایت اچھی تنقید پیش کی ہے اور بعض کے تجزیے قابلِ غور ہیں۔ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے "تحریریں" کا یہ خاص نمبر مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آہنگ ——— گیا (انڈیا)

کسی شخصیت پر نمبر نکالنا بجا اہم ہے تو حد درجہ دشوار گذار بھی۔ اگر محض خامہ فرسائی مقصد ہو تو کوئی بات نہیں ورنہ فن اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر صحت مندانہ اندازِ فکر اور خلاقانہ صلاحیتوں کا اظہار جتنا فعال کام ہے اتنا ہی مشکل اور صبر آزما۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے کسی شخصیت پر نمبر نکالنے کا مقصد خامہ فرسائی کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا لیکن پیشِ نظر خالد نمبر اس سطحیت اور حوصلہ شکن رجحان سے مبرا ہے۔ اس کے مشتملات میں تنوع اور زندگی ہے جو دیانتداری اور لگن کی رہینِ منت ہے۔ ایک مضمون کا عنوان ہی ہے "خالد کی سب سے بڑی کمزوری"
عبدالعزیز خالد قادر الکلام شاعر ہیں لیکن ان کی فطرت میں مشکل پسندی اس طرح رچی بسی ہے کہ ان کی شاعری میں

جگہ جگہ اجنبی اور غیر مانوس الفاظ، مشکل تراکیب اور اساطیری اور تاریخی تلمیحات نظم ہوئے ہیں جس کے سبب خالد کی شاعری کو سمجھنا اور ان کے فن کا تنقیدی جائزہ لینا خالد کی شاعری ہی کی طرح مشکل ہے۔ لیکن تحریریں کے مشتملات میں عبدالعزیز خالد کے فن کے مختلف گوشوں کو جس ہنرمندی اور حسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ بڑی عرق ریزی اور لگن سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔

خالد کی شاعری، خالد کے تراجم، یونانی شاعرہ سیفو کے خالد پر اثرات، کلاسیک اور عصری آگہی سے لگاؤ کے علاوہ خالد کی ذاتی زندگی کا کوئی پہلو بھی شاید ہی چھوٹا ہو۔

ناہید صدیقی، عبدالحمید عدم، وزیر آغا، عارف عبدالمتین، مرزا ادیب، انور، کامل القادری اور وقار عظیم کے مضامین ان کے عالمانہ اندازِ فکر کی غمازی کرتے ہیں۔ "عبدالعزیز خالد نمبر" اردو ادب و صحافت میں شخصیتوں پر نکالے گئے نمبروں میں نمایاں اور ممتاز مقام کا حامل ہے جو ادبی دستاویز کی حیثیت کا متحمل ہے۔ سرورق میں سادگی و پرکاری اور مضامین کی ترتیب و تدوین میں ہنرمندی خوش سلیقگی کو بڑا دخل ہے۔ (عشرت ظہیر)

نشانات ——— مالیگاؤں (انڈیا)

تقسیم ملک کے بعد ہند و پاک دونوں ملکوں میں علمی و ادبی اعتبار سے جو کچھ کام ہوا ہے وہ قابل قدر اور اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے حالانکہ یہ دور دونوں ملکوں کے لئے ایک عبوری حالات کا دور ہے۔ تجربات شاہد ہیں کہ ادبی تخلیقی کاموں کے لئے یہی زمانہ ہمیشہ موثر و محرک ثابت ہوا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں غالب کے بعد اردو شاعری میں عصری تبدیلی کا جو گہرا عکس نمایاں ہوا ہے اسی عکس کی مدد سے علامہ اقبال جیسے دانائے راز فنکار اردو ادب میں اپنی انفرادیت کے ساتھ ابھر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے عالمی ادب میں اس کے تخلیقی کارناموں کی دھوم مچ گئی۔ بے پناہ تخلیقی صلاحیت اور وسیع علوم کے سمندر میں غرقابی کے بعد یہ مفکر، مدبر شاعر اردو فارسی شاعری میں اپنے افکار عالیہ کے خزانے لٹا گیا۔ یہ خزانہ اب ادب میں مستقل و منفرد دوامی قدر سے روشن و تابندہ ہے۔

علامہ اقبال کے بعد اردو ادب میں عبدالکریم ثمر، ڈاکٹر حق، انسر سیمابی، نعیم صدیقی، محمد نیاز نے اسی انداز میں فکر کی تخلیق کی کوششیں کی ہیں۔ کوششیں قابل قدر ضرور ہوتی ہیں لیکن کوششوں سے کوئی اقبال پیدا نہیں ہوتا البتہ کچھ فنکاروں کے حصے میں اقبال مندی ضرور آتی ہے۔ اسے تقلیدی رجحان کہئے یا رہگذاری۔ اس قسم کے راستوں سے گذرنے سے انفرادیت کو زبردست دھکا لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کے بعد اردو ادب میں کوئی ایسا منفرد شاعر دکھائی نہیں دیتا جسے ہم اقبال کا ہمسر یا اس کے مرتبہ کا شاعر کہہ سکیں۔ کسی فنکار میں جب گہری نظریاتی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنی متفکرانہ زندگی سے کائنات کے اندر اترنے لگتا ہے تو اس کی فطری استعداد کے جوہر کھلنے لگتے ہیں پھر جوہروں کے مسلسل اکساؤ سے تخلیقی سوتوں کو پھوٹنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ اور مقام ہے جہاں عظیم فنکار آ کر رک جاتا ہے اور اپنے فکری و تخلیقی

خزانوں کو بحرِ ظلمات سے نکالنے میں ہر طرح کامراں و شادکام رہتا ہے۔
بحرِ ظلمات کی ان گہرائیوں تک جہاں شعوری تہمتی تجزیاتی خزانے پرورش پاتے ہیں فقط عظیم فنکار ہی ان کو اپنے تخلیقی
فرس سے قرطاس تک پہنچاتا ہے۔ صدیوں میں ایسا کوئی فنکار پیدا ہوتا ہے جس کی صلاحیتوں میں یہ خوبو دکھائی دیتی ہے۔
علامہ اقبال کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ دور تک ایسے فنکار کی کوئی گونج سنائی نہیں دیتی جسے ہم عظیم کہہ سکیں۔ سورج کے سامنے
ستاروں کے اجالوں کا ذکر جگنوؤں کی حیثیت سے بھی کم تر ہے کیونکہ دونوں ظلمتوں کے محتاج ہیں۔ رات کی گہری تاریکیاں
ان کی جگمگاہٹ کو محسوس کراتی ہے۔ پاکستان میں عبدالعزیز خالد کے شاعرانہ مرتبہ پر جو بحثیں چل رہی ہیں انہی بحثوں کا
ایک بیش بہا تحفہ ماہنامہ "قربیب" لاہور کا خالد نمبر بھی ہے جس میں ۴۱۶ صفحات پر عبدالعزیز خالد کی شاعرانہ صلاحیتوں پر
مضامین، نظمیں، تنقیدی تبصرے اور خطوط شامل ہیں۔ ہند و پاک کے مشاہیر اہلِ قلم نے عبدالعزیز خالد کی شاعرانہ
صلاحیتوں اور فنکارانہ قوتوں کا اعتراف کیا ہے۔
بیشتر مضامین اور نظمیں، سرسری توصیفی جذبات اور تعارفی انداز کی ہیں۔ ان میں چند اہم ترین مضامین
بھی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا، میرزا ادیب، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، سید وقار عظیم نے عبدالعزیز
خالد پر بھرپور تنقیدی انداز میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے اپنے مضمون " عبدالعزیز
خالد میری نظر میں " میں وسیع تر جائزہ لیا ہے اور خالد کے فکر و فن کے ہر گوشے کو کھنگالنے کی کوشش فرمائی ہے۔
آپ نے خالد کی شاعری کے بڑے حصے کو ناقابلِ فہم، نامانوس اور ثقیل قرار دیا ہے۔ انہوں نے حضرت ماہر القادری
کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے جو ماہنامہ "سیارہ" کے عبدالعزیز خالد نمبر میں دی گئی ہے۔
مولانا ماہر القادری کی رائے یہ ہے کہ

"بعض مقامات پر ان کی شاعرانہ بلندیوں کو دیکھ کر وجدان لطف و آسودگی محسوس کرتا ہے لیکن اس کے
ساتھ ہی کلام کی پستیوں، کمزوریوں، بے ربطیوں اور سپاٹ اندازِ بیان سے ذوق و وجدان تلملا کر رہ
جاتے ہیں اور طبیعت خاصی بدمزہ ہو جاتی ہے۔ . . . . خالد کی شاعری میں تلمیحات کی اتنی فراوانی
اور کثرت ہے کہ ان کی کتابیں تلمیحات کا ایک جنگل نظر آتی ہے . . . . . آدمی انہیں پڑھتے ہوئے
یہ محسوس کرتا ہے کہ شاعری کی کسی کتاب کی بجائے نثر کی کتاب کی انڈیکس " INDEX " کو پڑھ رہا ہے
مگر یہ شاعری کیا ہوئی۔ یہ تو لوگوں پر اپنی معلومات کی دھونس جمانے کی سعیٔ نامشکور ہے"

(سیارہ، عبدالعزیز خالد نمبر، حصہ اول ص۵۳)

اس میں شک نہیں ہے کہ عبدالعزیز خالد ایک قد آور شاعر ہیں جن کی زبردست علمی و فکری استعداد سے کوئی انکار
نہیں کر سکتا جو مختلف زبانوں پر عبور حاصل ہے اور ان زبانوں کے علمی خزانوں سے سیرابی کر چکا ہے جس کو زبان و بیان
پر زبردست عبور حاصل ہو اور ایک قادر الکلام فنکار کی حیثیت سے ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہو اس کی
بے پناہ صلاحیتوں کا اعتراف ضروری ہے اور اس کی شاعری کا بڑا حصہ تنقیدی توجہ کا مستحق بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

پاکستان میں اس قدآور شاعر پر بحثیں ہو رہی ہیں اور ادبی رسائل کے نمبر اس کی عظمتوں کے اعتراف میں نکل رہے ہیں۔

ماہنامہ "تحریریں" لاہور نے اس نمبر کو ترتیب دے کر عبدالعزیز خالد کے تخلیقی کارناموں کو خصوصی مطالعہ کی طرف متوجہ کیا ہے۔ یہ کام ہر طرح اہمیت کا حامل ہے۔ ۴۱۶ صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین کا احاطہ اور ان پر تنقیدی نظر ڈالنا بہت مشکل کام ہے۔ سرسری مطالعہ اور تنقیدی نظر جہاں تک پہنچ سکتی ہے اس نمبر کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ ماہنامہ "تحریریں" کا عبدالعزیز خالد نمبر ادب میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جو اردو کے قاری کے لئے پرکشش ہے اس کے مطالعے سے اردو شاعری کے ہر گوشے تک رسائی ہوتی ہے اور معلومات میں زبردست اضافہ ہوتا ہے۔ یہ نمبر ہندوپاک کی ہر لائبریری میں اپنی افادیت اور اہمیت کی وجہ سے رکھنے کے قابل ہے۔

(احمد نسیم میناچری)

THE PAKISTAN TIMES
Published from Lahore and Rawalpindi

Road to Medina

MONTHLY 'TEHREEREN' LAHORE ABDUL AZIZ KHALID NUMBER. Compiled by Zahida Siddique Pages 416 Price Rs 12 Available from Chowk Urdu Bazar, Lahore.

ABDUL AZIZ KHALID is one of the greatest living poets of our country. Various magazines have already published special issues to pay homage to his poetic genius and the magazine under review "TEHREEREN" is another such attempt.

Quite a large number of well-known Urdu writers have contributed their articles to this issue. Almost all of them agree on two points regarding Khalid's poetry. Firstly it is based on the Islamic Ideology and secondly the poet's deep knowledge of the famous cultures of the world especially the Islamic culture. That is why that his poetry has rightly been characterised by some writers as a ROAD TO MEDINA. These observations are a great tribute to any living poet.

However as the compiler desired to present the balanced

personality of the poet it has included such articles which point to the short-comings of the poet as well. The main objection levelled against him is the use of difficult and unfamiliar words of other languages especially Arabic which makes his poetry difficult to understand. Actually it was Mr Khalid's mission to [illegible] the Urdu language to such an extent that at least our writers and scholars must study the Arabic language which is the main source of our culture. But as the general standard of knowledge in our country is very low hence the objections. These objections have already compelled Mr Khalid to revert to easy language.

From the observations of various writers it appears that Mr Khalid has also composed Arabic verses although not included in the compilation under review. Arabic magazines of International repute such as 'Dawat al Haq' of Rabat (Morocco) and Al-Alam al Islami of Mecca will readily publish such Arabic poems and this will not only be an honour for the poet but enhance our national prestige in Arab World as well.

—RAFIULLAH SHEHAB

تقریبات

تقریبات

عبدالعزیز خالد کے ساتھ ایک شام ——— انتظار حسین

کل پھر عبدالعزیز خالد تھے اور ایک پُر رونق شام تھی۔ عبدالعزیز خالد وہ شاعر ہیں جنہوں نے اپنے عہد میں سب سے بڑھ کر خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ رسالوں نے عبدالعزیز خالد نمبر بھی بہت نکالے اور انجمنوں اور اداروں نے ان کے ساتھ شامیں بھی بہت منائیں اور آپ جانتے ہیں کہ شاعروں میں جذبۂ رقابت بہت ہوتا ہے۔ اردو غزل میں رقیب کا اتنا ذکر آیا ہے کہ جذبۂ رقابت شعروں سے نکل کر شاعروں میں سرایت کر گیا ہے۔ سو دوسرے شاعروں نے بھی اپنی شان میں خصوصی نمبر نکلوائے اور شامیں منوائیں ؏

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

حق یہ ہے کہ جو آن بان عبدالعزیز خالد نمبروں کی ہوتی ہے اور جو شان عبدالعزیز خالد کے ساتھ شام کی ہوتی ہے وہ ابھی تک اور کسی شاعر کی شاموں اور خصوصی نمبروں میں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔

عبدالعزیز خالد کے ساتھ یہ شام پاکستان سنٹر میں منائی گئی۔ پاکستان سنٹر کی ایک شام بہت دنوں سے ان کے آس پاس منڈلا رہی تھی بلکہ اٹھلا رہی تھی۔ قریب آتی تھی اور سرک جاتی تھی۔ کئی بار شام کا اعلان ہوا مگر شام آتے آتے کسی اور طرف نکل گئی۔ کبھی ایک واقعہ ہوا کبھی دوسرا، کبھی ہڑتال ہو گئی، کبھی کوئی وفات حسرت آیات۔ یاروں کو کوئی شگفہ چاہیئے انہوں نے اڑا دی کہ نیشنل سنٹر عبدالعزیز خالد سے پہلو تہی کر رہا ہے۔

خیر ہم آپ یاروں کی باتوں پہ کیوں جائیں۔ ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے نہ کہ پیڑ گننے سے۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ نیشنل سنٹر میں بالآخر عبدالعزیز خالد کے ساتھ شام ہوئی اور ایسی شام ہوئی کہ بہت سے شاعروں کی یادگار شامیں پس منظر میں چلی گئیں۔

یہ شام اسلامیہ کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے منائی گئی تھی۔ واضح ہو کہ عبدالعزیز خالد اسلامیہ کالج کے سپوت ہیں۔ اسلامیہ کالج کے موجودہ پرنسپل خواجہ اسلم اپنے کالج کے اس فرزندِ دلبند کو خراجِ تحسین پیش کرنے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک عرصہ تک وہ عبدالعزیز خالد کی شاعری بہ جانے بغیر پڑھتے رہے کہ یہ ستارہ اسلامیہ کالج کے آسمان سے ٹوٹا ہے۔ ان کی شاعری کو پڑھنے میں دقت ضرور پیش آتی تھی کیونکہ خالد ایک زبان کے شاعر تھوڑا ہی ہیں، ہفت زبان شاعر ہیں اور جب تک لغت پاس نہ ہو ان کی شاعری سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے جب بھی کسی شاعر سے خالد کا ذکر کیا وہ طرح دے گیا۔ رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ یہ تو اسلامیہ کالج ہی سے نکلا ہوا شاعر ہے۔

اس تقریب میں شاعر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اور معزز شخصیتیں بھی آئی ہوئی تھیں جسٹس ایس. اے رحمان. نے خراج تحسین پیش کیا۔ احسان دانش خود نہ آ سکے تو انہوں نے اپنا منظوم نذرانہ بھجوا دیا۔ شاور ڈوگر نے مضمون پڑھا۔ پنجاب اسمبلی کے سپیکر شیخ رفیق اس تقریب کی صدارت کر رہے تھے۔ اس پروگرام کی ایک شق تھی کلام شاعر بزبانِ شاعر۔ شاعر نے اپنا کلام سنایا اور داد پائی۔

ایک منفرد تقریب

اختر امان

عبدالعزیز خالد کے بارے میں کسی نے انتہائی خوبصورت فقرہ لکھا ہے کہ ابھی ہماری اتنی غزلیں بھی شائع نہیں ہوئیں جتنی عبدالعزیز خالد کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ عبدالعزیز خالد اگرچہ عام گفتگو کے دوران کم گو ہونے کی ریپوٹیشن حاصل کر چکے ہیں تو تحریری طور پر معاملہ کچھ اس سے الٹ ہے۔ وہ پاکستان کے دوسرے شعراء سے اس لئے بھی مختلف ہیں کہ اگر فیض احمد فیض کے بارے میں کراچی کے ایک رسالہ نے ایک نمبر نکالا تو عبدالعزیز خالد کے بارے میں اب تک دو رسالے اچھے خاصے ضخیم مستند نمبر نکال چکے ہیں اور حال ہی میں "تحریریں" عبدالعزیز خالد نمبر نکلا ہے جس کے بارے میں نیشنل سنٹر لاہور میں تواتر سے تقاریب ملتوی ہونے کے بعد دیال سنگھ کالج لاہور میں حلقہ دام خیال نے تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ مضمون نگاروں کی طویل فہرست میں جناب ڈاکٹر وزیر آغا، عطاء الحق قاسمی، پروفیسر منظور الٰہی، محترمہ شاور ڈوگر، وارث میر شامل تھے، جبکہ رشید انور اور چند دوسرے شعراء نے عبدالعزیز خالد کے بارے میں نظمیں پڑھیں۔ صدارت کے فرائض جناب ظہیر کاشمیری نے انجام دیئے اور یہاں پر عبدالعزیز خالد کی تقریب اس لحاظ سے لاہور کی تقاریب میں ایک منفرد تقریب تھی کہ یہاں مضامین لکھنے والے بھی لاہور کے معروف ترین اہلِ قلم تھے۔ سامعین میں پڑھے لکھے طبقہ کے لوگ تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس تقریب میں سامعین پورے تین گھنٹے تک جمے بیٹھے رہے اور تقریب میں ان کی دلچسپی آخر دم تک برقرار رہی اور بقول شخصے یہاں لوگ پورے ذوق و شوق سے آئے تھے جبکہ نیشنل سنٹر لاہور کی تقاریب میں بالعموم وہ لوگ بھی آ جاتے ہیں جن کو الفلاح سینما سے ٹکٹ لینا نہیں آتا۔ اس تقریب کو "ہاؤس فل" تقریب کہا جا سکتا ہے۔

اس تقریب کے آخر میں ظہیر کاشمیری نے عبدالعزیز خالد کی شاعری کے بارے میں کہا کہ عبدالعزیز خالد ایک "بولڈ" شاعر ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے قارئین کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ اپنے لسانی تجربات اور فکری توانائی سے ان کی راہنمائی کی۔ ظہیر کاشمیری نے یونانی تنقیدی معیار کے حوالہ سے کہا کہ عبدالعزیز خالد کی شاعری تناسب اور جمال کی شاعری ہے اور ان کی شاعری میں قدیم اور جدید احساسِ فکر کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان سے قبل ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک خوبصورت مضمون پڑھا اور عبدالعزیز خالد کے بارے میں کہا کہ ان کی مثال ایک ریلوے جنکشن کی ہے کیونکہ ریلوے جنکشن میں گاڑیاں آتی اور جاتی رہتی ہیں۔

عبدالعزیز خالد کی شاعری ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے جس میں بتدریج تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور ان کی شاعری کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔

اس تقریب کے دو دلچسپ مضامین عطاء الحق قاسمی اور محترمہ شاور ڈوگر نے پیش کئے۔ عطاء الحق قاسمی کا مضمون ان کے اہلِ قلم کے بارے میں خاکوں کے سلسلہ کی ایک خوبصورت کڑی تھا۔ انہوں نے کہا "میں عبدالعزیز خالد کو شاعر نہیں مانتا کیونکہ آج کل شاعر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف اس کے حلیہ اور عادتوں سے محلہ کے بچے خوفزدہ ہو جائیں اور دوسری طرف بچوں کی ماں کے دل میں وسوسے

بنیادی تاثر دیں۔ عطاء الحق قاسمی نے کہا کہ میں عبدالعزیز خالد کو اس لئے بھی شاعر نہیں مانتا کہ آج کل شاعر ہونے کے لئے کسی کا [illegible] ہونا ضروری ہے
نہیں جبکہ عبدالعزیز خالد شاعری کے ساتھ ساتھ کام کاج بھی کرتے ہیں۔ بہر اس طرح علماء نے عبدالعزیز خالد کو دوسرے شاعروں سے الگ
مختلف شاعر ثابت کیا جو اسلامی روایات کا علمبردار ہے اور زبان و بیان پر یکسر قادر ہے۔

عطاء الحق قاسمی سے قبل محترمہ شاہدہ ڈوگر نے اپنا ایک خوبصورت مضمون پڑھا۔ اس مضمون میں انہوں نے عبدالعزیز خالد پر بڑے ہلکے پھلکے انداز میں طنز کی۔ اور بڑے عمدہ انداز میں ان کی شاعری کا جائزہ لیا۔ انہوں نے اپنے مضمون کی ابتدا میں کہا کہ عبدالعزیز خالد ایک ایسا فقیر ہے جو بوریا نشین نہیں بلکہ قالین پر اپنی زندگی گزارنے کا عادی ہے۔ وہ بے تکلف ضرور ہے مگر ان کی دوستی کے معیار الگ الگ ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں عربی کا استعمال بے تحاشا کرتے ہیں لیکن شاعری میں عربی کے استعمال سے پڑھ کر دل تو مستنا نہیں ہو جاتا۔ انہوں نے عبدالعزیز خالد کو ایک بڑا شاعر اور بڑا انسان ثابت کیا۔ وارث میر نے کچھ باتیں عبدالعزیز خالد اور فہمیدہ ریاض کے بارے میں کیں نظم نگاروں میں حفیظ تائب، اقبال ساجد اور رشید انور کی نظمیں پسند کی گئیں۔ مجموعی طور پر حلقہ دام خیال کی یہ تقریب انتہائی کامیاب تقریب تھی۔

○

عبدالعزیز خالد نمبر کی تعارفی تقریب ——— اظہر جاوید

عبدالعزیز خالد کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہر کہ ومہ اور ہر کس وناکس نے انکی شاعری کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے بلکہ ایک نیم مذہبی اور سیاسی جماعت کے حد اعلیٰ نے تو انہیں حسان بن ثابت سے تعبیر کیا ہے۔ کوئی سات آٹھ برس ادھر بھی ان کی شخصیت و فن پر ایک رسالے نے نمبر نکالا تھا۔ اب "تحریریں" نے پھر یہ خوشگوار فریضہ نبھایا ہے اور اس شاعر کے لئے ایک جامع نمبر پیش کیا ہے۔ خالد ان ہستیوں میں سے ہیں جن پر جیتے جی کچھ نہ کچھ کام ہوتا ہی رہے گا۔ مگر ایک عجیب لطیفہ ہوا ہے کہ اس نمبر کی تعارفی تقریب مسلسل چھ بار ملتوی ہو چکی ہے۔ ہر دفعہ کارڈ چھپے، تاریخ کا اعلان ہوا مگر کوئی ناگہانی افتاد آپڑی اور تقریب دھری کی دھری رہ گئی بلکہ یوں بھی ہوا کہ ہر بار ایک ہی صدر کے نام کا اعلان ہوتا رہا تو چھٹی بار اس صدر نے حاضری سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ فوری طور پر ایک اور صاحب کو صدارت کے لئے تیار کیا لیکن تقریب پھر بھی ملتوی ہو گئی۔ اسی دوران سرگودھا میں ایسی ہی ایک تقریب ہو گئی یقیناً اب منتظمین بھی سوچتے ہوں گے کہ کس ڈھب سے کیا تبدیلی کی جائے کہ ساتویں دفعہ تو تقریب ہو ہی جائے۔ ویسے کہتے ہیں سات کا ہندسہ بڑا مبارک ہوتا ہے۔ اس طرح ہم نے بھی آخر عبدالعزیز خالد کی تقریب ہو جانے پر شکر کا کلمہ پڑھا۔ یہ تقریب اب ایک حکایت بن گئی تھی اور اس سے شکایت کے کئی در کھل چکے تھے۔ گلزار وفا چودھری صاحب کو تو اس تقریب پر فخر ہونا ہی چاہیئے کہ آخر ساتویں بار اس نے اسے نہایت خوبصورتی سے بھگتایا ہے۔ مگر خالد احمد نہ جانے کیوں بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ بنا پھرتا ہے۔ عبدالعزیز خالد کسی تعارف اور تعریف کے محتاج نہیں لیکن اس تقریب میں تنقید اور تعریف کے یہ دو پہلو بھی دیکھے۔ وزیر آغا نے کہا کہ خالد کے اتنے مجموعہ ہائے کلام آنے اور ان پر دو نمبر چھپنے کے باوجود میں ابھی تک ان کی شاعری کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکا حفیظ تائب کہ جو نعت کے شاعر ہیں اور لفظوں کے استعمال میں نہایت محتاط اور شریف واقع ہوئے ہیں انہوں نے ممدوح کو نوٹ اور حسان تک کہہ دیا۔ اب اس کے بعد باقی تقریب کا احوال کیا کہیں!! (امروز — لاہور)

روزنِ دیوار سے ——— عطاء الحق قاسمی

نیشنل سنٹر لاہور میں مقامی ادیب کبھی کبھار اس لئے جمع ہو جاتے ہیں کہ انہیں وہاں بہرصورت جمع ہونا پڑتا ہے۔ شہر میں ایک سے زیادہ جوا خانے ہیں، شراب خانے ہیں۔ افیم اور بھنگ کے ٹھیکے ہیں لیکن اگر کچھ نہیں ہے تو وہ کوئی ایسا "اڈہ" ہے جہاں ادیب، شاعر اور دانشور اکٹھے بھی ہوں مگر کوئی ان کا ٹھیکیدار بن کر محکمہ اطلاعات "برعکس" نہ ڈالے اور نہ ٹی وی ریڈیو کے ادبی و غیر ادبی پروگراموں کی صورت میں اس کا معاوضہ وصول کرے۔ یہ "تنگیٔ داماں" ہی کا کرشمہ ہے کہ ایک طرف حکومت بلیک میل ہو رہی ہے اور دوسری طرف ادیبوں کو یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ ان کا سارا ادبی بھرم فردِ واحد کی خوشنودی ہی سے قائم رہ سکتا ہے۔ عالم یہ ہے کہ ممتاز شاعر عبدالعزیز خالد کے فن اور شخصیت پر "تحریریں" کا ایک خصوصی نمبر شائع ہوئے ایک عرصہ دراز گزر چکا ہے مگر اس کی تقریبِ رونمائی کا معاملہ ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہے۔ اس تقریب کے لئے سات بار تاریخ مقرر کی جا چکی ہے۔ ان میں سے تین بار دعوتی کارڈ بھی چھپ کر تقسیم ہو گئے مگر ہر بار یہ تعارفی جلسہ عین موقع پر ملتوی کر دیا گیا۔ آخری تین بار اس تقریب کے التوا کی وجہ واقعی ٹھوس تھی مگر اس سے پہلے چار دفعہ التوا کے لئے وجوہات "تلاش" کی گئیں۔ شاید اس لئے کہ عبدالعزیز خالد فہمیدہ ریاض کے قبیلے سے تعلق نہیں رکھتے۔ فہمیدہ ریاض کا حوالہ یہاں یوں ضروری ہے کہ اس خاتون کے لاہور آنے پر صرف ایک روز میں نیشنل سنٹر نے تقریب کا اہتمام کر دیا تھا اور اس جنسی شاعرہ نے جو سیاسی نظم یہاں سنائی وہ کھلے لفظوں میں "سندھو دیش" کی حمایت میں تھی۔ نیشنل سنٹر کا سٹیج اس سے پہلے اور بعد میں بھی ایسے عناصر کی پروجیکشن کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے جن کا "سسرال" روس میں ہے یا جو روس کے لئے "سسرال" کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ پالیسی ناقابلِ فہم ہے کیونکہ سنٹر کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی بتایا جاتا رہا ہے کہ اس کے ذریعے قومی یکجہتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی مگر لاہور نیشنل سنٹر کی حد تک ادیبوں اور دانشوروں کے حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ پلیٹ فارم مقامی ڈائریکٹر کی ذاتی پروجیکشن اور پبلک ریلیشننگ کے لئے بری طرح استعمال ہو رہا ہے۔ دوسرے وہ لوگ بھی یہاں سے تشہیر پا رہے ہیں جن کا ناطہ اس سرزمین سے اتنا بھی نہیں جتنا حرامی بچے کا حلالی خاندان سے ہوتا ہے اور تیسرے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ شہر بھر کے ادیب، شاعر اور صحافی فردِ واحد کی جیب میں ہیں اور انہیں جس طرح چاہے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ تاثر دور ہو سکے تو "نیشنل سنٹر پرنسپل" کا اعتماد بحال ہو سکتا ہے ورنہ ایسے کئی ادارے ماضی میں بنتے اور ٹوٹتے رہے ہیں۔

(نوائے وقت - لاہور)

عبدالعزیز خالد نمبر کی تقریبِ رونمائی ——— ناصر گجراتی

حلقۂ دامِ خیال دیال سنگھ کالج نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے تعاون سے گزشتہ دنوں عبدالعزیز خالد کے ساتھ ایک شام کا انعقاد کیا۔ صدرِ مجلس ظہیر کاشمیری تھے۔ یہ تقریب ماہنامہ "تحریریں" کے عبدالعزیز خالد نمبر کی تقریبِ رونمائی کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔ ماہنامہ "تحریریں" کی ایڈیٹر زاہدہ صدیقی نے بھی تقریب میں شرکت کی۔ حلقۂ دامِ خیال کے نگران پروفیسر گلزار وفا چوہدری نے بات شروع کرتے ہوئے جناب خالد کا مختصر تعارف کرایا۔

پروفیسر منظور الٰہی نے خالد کے فن پر مقالہ پڑھا اور خالد کی مشکل پسندی کے بارے میں اپنے احساسات کا بڑی خوبصورتی سے تجزیہ کیا انہوں نے شروع میں خالد کو نہ پڑھنے اور اب بڑے ذوق و شوق سے پڑھنے کا واقعہ بڑے خوبصورت پیرائے میں سنایا اور کہا کہ اگر قاری یکسوئی سے پڑھے تو جناب عبدالعزیز خالد میدانِ فن میں ایک بحرِ بیکراں ہیں۔ تحسین فراقی نے منظوم نذرانہ پیش کیا۔

شناور ڈوگر اگرچہ کوئی معروف ادیب تو نہیں مگر خالد کے فن پر آپ کا مقالہ بڑا خوبصورت تھا۔ آپ نے خوبصورت الفاظ میں اپنے احساسات مرقوم کئے۔ انہوں نے خالد صاحب کے نوجوان نو واردوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے جذبے کو سراہا اور خالد کو اس لحاظ سے دوسرے شعراء سے منفرد قرار دیا کہ دوسرے تو چھوٹوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں اور خالد حوصلہ افزائی کرتے ہیں

عطاء الحق قاسمی نے بات شروع کی تو خالد کو شاعر تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا لیکن بعد میں اس انکار کی جو توضیح کی وہ بھی انوکھی تھی کہ خالد کا حلیہ شاعروں جیسا نہیں، وہ شاعروں کی طرح بیکار نہیں رہتے، وہ شاعروں کی طرح مطالعہ سے دور نہیں بھاگتے اور انہیں دیکھ کر مائیں اپنے بچوں کو نہیں ڈراتیں۔ اس طرح آپ شاعر نہیں ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے کہا کہ خالد کی گفتگو میں علم کی چاشنی ہوتی ہے اور ہلکی پھلکی گفتگو میں بھی علم کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔

بشیر رحمانی نے منظوم نذرانہ پیش کیا اور پھر ڈاکٹر رشید انور نے بھی پنجابی غزل کی صورت میں یہی نذرانہ پیش کیا۔

ان کے بعد وارث میر صدر شعبۂ صحافت پنجاب یونیورسٹی نے خالد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا انہوں نے سندھ کی شاعرہ فہمیدہ ریاض کو خالد کی مناسبت سے یاد کیا اور ان دونوں کے کلام کا فلسفیانہ تجزیہ بھی کیا اور یہ بات واضح بات کر دی کہ خالد روح کا شاعر ہے اور روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے، وہ فہمیدہ ریاض کی مانند جسم اور جسمی جذبات کا شاعر نہیں۔

اقبال ساجد نے خالد کے حق کی داد کچھ اس پیرائے میں دی ؂

اہلِ نظر کے واسطے علم کا باب ہو گیا — تو نے لکھا جو ایک حرف ایک کتاب ہو گیا
منہ سے نکل گئی جو بات اک حدیث ہو گئی — جس کو ادب کے ضمن میں پڑھنا ثواب ہو گیا

حفیظ تائب عصرِ حاضر کے نعت گو شاعروں میں شمار ہوتے ہیں اور جہاں نعت کا ذکر ہو وہاں حفیظ تائب کا ذکر ضرور آتا ہے۔ آپ نے خالد کو اس کے نعتیہ کلام کی نسبت سے نذرانہ پیش کیا ؏

وہ بدرتوں کا پیامی وہ بدلتوں کا امیں — وہ زندگی کا تبسم وہ آگہی کا علم

وزیر آغا نے بھی اس نشست میں شرکت کی اور خالد کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا انہوں نے زندہ شخصیتوں پر خصوصی نمبروں کی اشاعت کی پرزور مذمت کی کیونکہ اس طرح ادب محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ خالد عام شاعروں کی طرح کسی حادثے سے تعلق رکھنے والے حادثاتی شاعر نہیں بلکہ آپ کا فن مسلسل محنت کا نتیجہ ہے اور آپ کا فن مسلسل ارتقاء کی طرف رواں ہے انہوں نے کہا کہ جناب خالد نے اردو شاعری کو نئے اسلوب اور نئے رستے دیئے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کو بھی شامِ خالد میں شرکت کرنا تھی لیکن آپ کسی مجبوری کی بنا پر تشریف نہیں لا سکے اس لئے آپ کا مقالہ جواں جذبوں کے جواں ادیب جناب خالد احمد نے پڑھا۔ مقالے میں دوسری زبانوں کے الفاظ کے حسین استعمال کی تعریف

کی گئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ عبدالعزیز خالد کو فن کے ساتھ بے پناہ لگن ہے اور بے شک اس لحاظ سے اور بھی زیادہ ہے کہ وہ اپنے سرکاری فرائض بھی انتہائی احسن طریقے سے انجام دیتے رہتے ہیں۔

خالد احمد کے بعد عبدالعزیز خالد کو دعوتِ سخن دی گئی۔ آپ نے ایک تازہ غزل پیش کی اور حاضرین کے پیہم اصرار پر ایک نظم زلزلہ بھی پیش کی اور خوب خوب داد وصول کی۔

جناب خالد

رائیگاں جاتی نہیں عشاق کی قربانیاں
اشک و خوں کا قرض دنیا کو ادا کرنا پڑے
ہے یہی اک صورت علاج رنج تنہائی کی؟
درد دل کا آدمی آخر مداوا کیا کرے

زلزلہ سے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

یلغار بے گناہوں پہ باران سنگ کی
کس جرم کی سزا ہیں یہ آتش فشانیاں
یہ سرزمین دکھ اور مصیبت کی سرزمیں
ناگفتنی ہے جس کی المناک داستاں
اس سرزمیں کی عزت و حرمت ہے تیرے ہاتھ
تو اس کا ملجا اس کی سپر اس کا پاسباں
سب حمد ہے تیرے لئے اے رب بے نیاز

جناب خالد کے بعد صاحب صدر جناب ظہیر کاشمیری کو خالد کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی دعوت دی گئی۔ آپ نے ہونے والی ساری بحث کو انتہائی حسین پیرائے میں سمیٹا۔ آپ نے بات کچھ اس انداز سے شروع کی "لفظ جب لغت میں ہوتا ہے تو اس کی حیثیت ایک بیکار بندے کی طرح ہوتی ہے لیکن جب فنکار اسے اپنے فن میں استعمال کرتا ہے تو وہ لفظ معنی پا لیتا ہے اور خالد کو لفظ استعمال کرنا خوب آتا ہے"۔

انہوں نے کہا کہ عبدالعزیز خالد ایک عام فنکار نہیں بلکہ یہ اس عہد کا بہادر ترین فنکار ہے کیونکہ اس نے بڑی جرأت اور جوانمردی سے نئے نئے الفاظ استعمال کئے ہیں اور اردو شاعروں کو وسعت بیان بخشی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی شاعری میں جلوہ بھی ہے اور نقش گر بھی اور اس لحاظ سے آپ کا فن مسلسل ارتقاء کی طرف رواں دواں ہے۔ انہوں نے خالد کے فن کے بارے میں اپنی ضمنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

"خالد اپنے خیالات کے اظہار میں روایت کے قائل نہیں ہیں"!

(مغربی پاکستان ـ لاہور)

ایک نیا ادبی محاذ ــــــــــــ خالد احمد

ایک سولہ سالہ نوجوان ایک نئی ایجاد پر کام کر رہا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں سے مکمل انہماک سے جٹا تھا۔ والد بزرگوار نوجوان کی دلچسپی، دلجمعی اور لگن کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے نئی ایجاد کی خصوصیات، فوائد اور عنوانات کی وضاحت چاہی

"دیکھیں! یہ دائیں دروازے کے اوپر سے ایک باریک تار گزر رہا ہے" نوجوان موجد نے وضاحت کا آغاز کیا۔

"تو! میں نے اس تار کے دوسرے سرے پر ایک مصنوعی چھپکلی باندھ رکھی ہے۔ جب کوئی لڑکی میری کار میں بیٹھے گی تو میں تار کو ڈھیلا چھوڑ دوں گا۔ یہ دیکھیے چھپکلی نیچے آئی۔ ادھر لڑکی کی نگاہ چھپکلی پر پڑی، ادھر وہ اچھل کر میرے بازوؤں میں آ گئی"

سولہ سالہ نوجوان نے اپنے باپ کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا:

"میں نے اس ایجاد کا نام "خودکار آلہ محبت" رکھا ہے"

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ گلزار وفا چودھری نے بھی ایک ایسا ہی آلہ ایجاد کیا ہے مگر اس کا نام حلقہ دام خیال رکھا ہے۔ ادھر حلقہ دام خیال میں وہ کسی تقریب کا اعلان کرتا ہے اور ادھر ٹیلیفونوں کی بارش ہو جاتی ہے، ادیبوں کے گھر پیغامات پہنچنے لگتے ہیں

"دیال سنگھ کالج میں نہ جائیے گا، وہاں کیا رکھا ہے؟ وہاں تو کوئی آتا ہی نہیں۔ وہاں کی تقریبات بھی تقریبات ہوتی ہیں۔ ادھر تشریف لائیے، یہاں مال روڈ پر، جی ہاں مال روڈ پر، ہم دل و جان فرشِ راہ کئے بیٹھے ہیں۔ آئیے آئیے کہ ہم سینہ کشادہ رکھتے ہیں"

عبدالعزیز خالد کی شخصیت اور فن پر ماہنامہ "تحریریں" لاہور کا خاص نمبر شائع ہوا۔ مگر تین ماہ میں تقریباً چھ بار افتتاحی تقریب کے انعقاد کا اعلان کیا گیا اور سات بار "بوجوہ" تقریب کی منسوخی کا اعلان ہوا لیکن وہ جو کہہ گئے ہیں نا خدا جن کا نہ ہو ان کا خدا ہوتا ہے۔ مذکورہ نمبر کی افتتاحی تقریب بھی منعقد ہوئی اور بڑے ٹھاٹھ سے منعقد ہوئی لاہور میں موجود تمام ادیب، شاعر اور متشاعر اس تقریب میں موجود تھے۔ البتہ وہ تمام ادیب جن کے ناموں کے ساتھ ادیب یا شاعر کا لفظ موجود رہے، "بوجوہ" تشریف نہ لا سکے۔ مال روڈ پر چلنے کے عادی نسبت روڈ پر چلتے ہوئے شرما سے جاتے ہیں حالانکہ الفلاح کے سائے میں پلنے والے خوبصورت ترین نوجوان شاعر یوسف کامران تک نسبت روڈ کی سطح پر اتر آئے تھے۔

عبدالعزیز خالد کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ عبدالعزیز خالد نے ہوچی منہ کی نظموں کا اردو ترجمہ پیش کر کے اردو ادب کی وزارت خارجہ کا شعبہ ہند چینی سنبھال لیا ہے۔ جب کہ سید محمد کاظم مشرقِ وسطیٰ کے شعبے پر متعین ہیں۔ ان کی مدد کے لئے امجد اسلام امجد مقرر کئے گئے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی امریکہ اور یورپ میں سفارت انجام دے رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ برطانیہ عظمیٰ میں، مسعود اشعر اور حمید جہلمی چین۔ اور فیض احمد فیض سوویت یونین میں ان فرائض سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔

عظیم روسی شاعر پشکن اپنے آپ کو روسی ادب کا وزیر خارجہ کہتا تھا اور وہ عالمی ادب کو روسی زبان میں منتقل کرتا رہتا تھا۔

عبدالعزیز خالد کی شام میں خامے کی جیب سے ترجمہ شناور ٹوگر کا تاثر تھا۔ اس خوبصورت تحریر میں ہمیں وہ تمام خوبیاں نظر

آئیں جو کسی بھی شہ پارے میں ہونا چاہئیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہم نے بہت کم ایسے خوبصورت نثر پارے سنے ہیں، متناسب اور متوازن۔

اس تقریب میں ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی شرکت فرمائی اور ایک انتہائی دیانت دارانہ محاکمہ پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنا انداز نظر رکھنے والے نقاد ہیں جو کچھ وہ سچ سمجھتے ہیں اسے صاف صاف بیان کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے عبدالعزیز خالد کو ریلوے جنکشن سے تعبیر کیا جہاں سے بہت سی لائنیں نکلتی ہیں اور گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں انہوں نے کہا کہ عبدالعزیز خالد کا فن ہمہ جہت ہے۔

مولانا عطاء الحق قاسمی نے بھی عبدالعزیز خالد کا خاکہ پڑھا۔ ان کے گذشتہ خاکوں والی بات تو نہ تھی مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ زیادہ شریف لوگوں کا خاکہ بھی ذرا شریف سا ہی ہوتا ہے۔ قصور عطاء کا نہیں عبدالعزیز خالد کا لگتا تھا۔

حفیظ تائب جو اس عہد کے نامور ترین نعت گو ہیں عبدالعزیز خالد کے حضور ان کی نعت گوئی کے حوالے سے ہدیہ عقیدت پیش کرنے آئے۔ عبدالعزیز خالد بلاشبہ ہمارے عہد کے نامور ترین نعت گوؤں میں سے ایک ہیں۔ ثنا خوانِ رسولؐ کی جتنی بھی عزت کی جائے کم ہے۔ خدا ہر دو حضرات کو بفیضِ شاہِ انبیاء ہمیشہ خوش رکھے اور ہمارے سروں پر ان کا سایہ ہمیشہ قائم رکھے۔ احمد ندیم قاسمی کا بھیجا ہوا پیغام تقریب میں پڑھ کر سنایا گیا جس میں انہوں نے "تحریریں" کی مدیرہ کو خالد صاحب پر ایک اور نمبر کے جواز کو عملاً ثابت کرنے پر مبارکباد دی تھی۔

تقریب کے صدر ظہیر کاشمیری تھے انہوں نے جس خوبصورتی سے عبدالعزیز خالد کے فن کا تجزیہ کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ کاش آپ بھی وہاں ہوتے تو انہیں دیکھتے۔

اسرار زیدی، عطاء الحق قاسمی، گلزار وفا چوہدری اور منظور الٰہی کی کوششیں ثمر بار ثابت ہو کر ثابت کر رہی ہیں کہ تقریبات کا حسن ان کے شرکاء پر مدار ہے نہ کہ ہال یا ہال والوں پر۔ خدا ہم سب کو صوفوں کی جگہ کرسیوں پر بیٹھنے کی توفیق دے۔

ایک تیز طرار نوجوان کی شادی ایک مذہبی گھرانے میں طے پا گئی۔ شوخ نوجوان کسی نہ کسی طرح اپنی منگیتر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کی منگیتر نے اسے کچھ اتنی خوبصورتی سے تلقین کی کہ وہ واپس آ گیا۔

لڑکی کی ماں کو نوجوان کی آمد اور واپسی کا حال معلوم ہوا تو وہ اپنی بیٹی پر برسنے کے لئے اس کے کمرے کی طرف بڑھیں مگر اسے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"کیا ہوا بیٹی ——"

"وہ آیا تھا ——!"

"تمہیں اسے تلقین کرنا چاہئے تھی ——"

"اسی لئے تو میں رو رہی ہوں! میں نے تلقین کچھ زیادہ کر دی ہے ——" لڑکی نے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا "وہ دنیا کی بے ثباتی پر یقین لے آیا ہے اور یہاں سے سیدھا تبلیغی جماعت کے ساتھ جانے کے لئے روانہ ہوا ہے۔"

ہمیں ڈر ہے کہ لوگ صوفوں سے اتر کر کرسیوں تک آ گئے ہیں۔ اگر مال روڈ پر موجودہ صورتِ حال ٹریفک کی طرح

بچتی رہی تو یہ نہ ہو کہ لوگ فرش پر بیٹھنا قبول کر لیں مگر مال روڈ کے ایئرکنڈیشنڈ ہال کا رخ نہ کریں۔
مال روڈ سے ہمارا تعلق "گو واں نہیں پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں" قسم کا تھا۔ چوہوں کی دوڑ میں سب سے پیچھے رہ جانے والے، کتوں کی دوڑ کے بارے میں پوچھنے والے ۔۔ ان پر سواری کون کرے گا؟" (امروز ۔ لاہور)

عبدالعزیز خالد نمبر کی افتتاحی تقریب ——— امروز لاہور

حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے زیر اہتمام پاکستان سنٹر اسلام آباد میں کرم حیدری کی صدارت میں ماہنامہ "تحریریں" کے عبدالعزیز خالد نمبر کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ آغاز میں تحریریں کی ایڈیٹر زاہدہ صدیقی نے اس نمبر کی اشاعت کے جواز میں تقریر کی اور بتایا کہ بے شمار دوسرے پہلوؤں میں سے محض یہی ایک پہلو بھی خاص نمبر کا جواز پیش کرتا ہے کہ عبدالعزیز خالد نے اپنے ہر ہمعصر سے زیادہ لکھا ہے اور اس پر اس کے ہر ہمعصر سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ پرتو روہیلہ نے عبدالعزیز خالد کی شاعری کے انسانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اسے اس عہد کا منفرد اور اہم شاعر قرار دیا۔ نظیر صدیقی نے خالد کو اس دور کا سب سے اہم اور نزاعی شاعر قرار دیا جس کے بارے میں مستقبل میں بھی بحثیں جاری رہیں گی۔ کرم حیدری نے عبدالعزیز خالد کو اہم اور منفرد شاعر قرار دیا اور کہا کہ اسے میر، غالب اور اقبال کی صف میں بھی کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ آگے نکل جاتا ہے اور اپنے آپ کو نمایاں تر ثابت کر دیتا ہے۔ اس خاص تقریب میں پنڈی اور اسلام آباد کے علم دوست خواتین و حضرات اور شعراء و ادباء کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

عبدالعزیز خالد نمبر کی افتتاحی تقریب ——— مشرق لاہور

ماہنامہ تحریریں کے عبدالعزیز خالد نمبر کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے عبدالعزیز خالد کو ان کی شاعری پر خراج تحسین ادا کیا اور خیال ظاہر کیا کہ اگر انہیں میر، غالب، اقبال یا کسی دوسرے بڑے شاعر کی صف میں کھڑا کیا جائے تو وہ انفرادیت کے بل پر اپنے آپ کو نمایاں ثابت کر دیں گے۔ یہ تقریب حلقۂ ذوق اسلام آباد کے زیر اہتمام ہوئی۔ تقریب کے مہمان خصوصی عبدالعزیز خالد تھے جبکہ صدارت کے فرائض کرم حیدری نے ادا کئے اور "تحریریں" کی ایڈیٹر زاہدہ صدیقی، پرتو روہیلہ، نظیر صدیقی نے عبدالعزیز خالد کی شاعری پر اظہار خیال کیا۔

شامِ خالد ——— جلیل صدیقی

یہ خصوصی تقریب "عبدالعزیز خالد کے ساتھ ایک شام" تھی جس کا انعقاد جامع اسلامیہ کالج کے لائبریری ہال میں ہوا۔ صدارت کے فرائض جمیلہ ہاشمی نے انجام دیئے۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک اور خالد کے نعتیہ کلام سے ہوا۔ تلاوت جمیل نظامی نے کی اور نعتیہ کلام محمد اجمل نے پڑھا ۔۔۔ تاثم میرزا نے منظوم صورت میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ۔۔۔ عارف عبدالمتین، پروفیسر محمد عثمان، جمیلہ ہاشمی، زاہدہ صدیقی،

عذرا مسعود، حافظ لدھیانوی، ارشاد احمد حقانی، حنیظ صدیقی، اکرام سانبوی اور ریاض حسین چوہدری نے عظیم شاعر اور مفکر عبدالعزیز خالد کی شخصیت اور فن کے بارے میں مقالات پڑھے جن کے اختتام پر کلام خالد بزبان خالد سنا گیا۔

ریاض حسین چوہدری نے "خالد اپنے آقا و مولا کے حضور میں" کے عنوان سے ایک تنقیدی مضمون پڑھا جس میں خالد کی نعتوں کا فنی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس عقیدت اور محبت کا بھی ذکر کیا جو خالد کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کے ساتھ ہے۔



گوش بہ آواز سامعین

پروفیسر اکرام سانبوی کے نہایت پر مغز مقالے کا عنوان تھا "خالد سخن — خالد" اس میں عبدالعزیز خالد کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا بڑی جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا گیا تھا اور ان کی شاعری پر ہونے والے بعض اعتراضات کو بے معنی ثابت کیا گیا تھا۔

پروفیسر حنیظ صدیقی نے اپنے دلپذیر پیرایے میں عبدالعزیز خالد کی دلپذیر شخصیت کے بے شمار پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کیا۔ یہ شخصی خاکہ بہت پسند کیا گیا۔

پروفیسر ارشاد احمد حقانی نے بھی خالد کی شخصیت کے کچھ گوشے کامیابی کے ساتھ نمایاں کیے۔ مضمون اپنے دلچسپ انداز کے سبب بڑا پسند کیا گیا۔

حافظ لدھیانوی نے کلام خالد کے نعتیہ پہلو کو اپنے مخصوص رنگ میں نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

عذرا مسعود نے اپنے خوبصورت پیرائے میں عبدالعزیز خالد کے فن اور شخصیت کے بارے میں ایک شگفتہ مضمون پیش کیا جسے اس کے مندرجات اور انداز کے اعتبار سے پسند کیا گیا۔

[illegible] صدیقی نے اپنے مضمون بعنوان "فارقلیط —— ایک اہم شعری دستاویز" میں عبدالعزیز خالد کی نہایت اہم تخلیق "فارقلیط" کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ اس عمیق زبانی مطالعے کو بہت سراہا گیا۔

عارف عبدالمتین نے "خالد کی غزل گوئی" کے موضوع پر ایک جامع مضمون پیش کیا اور ثابت کیا کہ خالد بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں رومانی عناصر بھی موجود ہیں جن کی طرف عموماً توجہ نہیں دی جا رہی۔

پروفیسر محمد عثمان نے کلام خالد کے جملہ محاسن بیان کرنے کے بعد بعض مشورے بھی دیئے۔ محاسن کلام کا یہ تجزیہ بہت عالمانہ رنگ میں تھا۔

آخر میں صدر مجلس جمیلہ ہاشمی نے اپنے فاضلانہ مقالے میں عبدالعزیز خالد کی شاعری پر بھرپور تنقید کی۔ شاعری کے تجزیے کے بعد آپ

نے بعض مشورے بھی دیئے اور تجویز پیش کی کہ اب وقت آگیا ہے کہ عبدالعزیز خالد اپنی فکر کی روشنی کو پھیلائیں، اخلاقی انحطاط کے اس دور میں اقبال ہی کی طرح نئی نسل کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں اور شاعروں اور ادیبوں کے قافلے کی میرِ کارواں بن کر رہنمائی کریں ــــ حاضرینِ مجلس نے صدرِ مجلس کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور اس کی مکمل تائید کی ــــ اختتام پر عبدالعزیز خالد نے سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر اپنی طویل نظم پڑھی جسے بہت سراہا گیا ــــ

پانچ گھنٹے کی اس خوبصورت اور کامیاب تقریب کی یاد اہلِ سیالکوٹ کے دلوں میں موجود رہے گی۔ اس کامیاب تقریب اور باقاعدہ مجالس کی کامیابی کے ضمن میں حفیظ صدیقی سیکرٹری، حلقۂ اربابِ ذوق، اکرام سانبوی جائنٹ سیکرٹری، پروفیسر نعیم مسترشد، پروفیسر شاہد زبیر، ریاض حسین چوہدری اور پروفیسر رشید احمد چوہدری پرنسپل جناح اسلامیہ کالج کے نام خاص طور سے لائقِ ذکر ہیں جن کی کوششوں سے شہر میں مخصوص ادبی فضا پیدا ہو گئی ہے اور بہت تھوڑے وقت میں "حلقۂ اربابِ ذوق"، شہر کی فعال ترین بلکہ فی الحقیقت واحد فعال ادبی تنظیم بن گیا ہے۔ (ماہنامہ تحریریں لاہور)

"حمطایا" کی تعارفی تقریب — حسین سحر

"حریم فن" ملتان کی خواتین کا واحد ادبی ادارہ ہے جس کے زیرِ اہتمام گاہے گاہے علمی، ادبی اور ثقافتی تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں اردو کے نامور شاعر جناب عبدالعزیز خالد کے تازہ نعتیہ مجموعے "حمطایا" کی تعارفی تقریب اسی ادارے کے تحت علی گڑھ ماڈل اسکول گلگشت میں منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر سید صفدر امام ڈپٹی ڈائرکٹر کالجز ملتان نے فرمائی جب کہ مہمانِ خصوصی صاحبِ کتاب جناب عبدالعزیز خالد تھے۔ اجلاس کی کارروائی ٹھیک ۸ بجے شب تلاوتِ کلامِ پاک سے شروع ہوئی۔ اسٹیج سیکرٹری "حریم فن" کی معتمد محترمہ بشریٰ بانو تھیں۔ انہوں نے ادارے کی گزشتہ روداد پڑھ کر سنائی۔ ان کے بعد نوجوان ریڈیو آرٹسٹ مشتاق احمد قریشی نے خالد صاحب کی ایک نعت ترنم سے پیش کی۔ اب "حمطایا" پر تعارفی مضامین کا آغاز ہوا۔ محترمہ تنویرہ زہرہ جعفری نے "حمطایا" کو خالد کی ایک لائقِ تحسین عظیم دینی خدمت قرار دیا۔ ان کے بعد پروفیسر حسین سحر نے ایک مضمون پڑھا "فارقلیط سے حمطایا تک" جس میں انہوں نے خالد کے اس شعری سفر کا نہایت فاضلانہ انداز میں جائزہ لیا جو شاعر نے فارقلیط سے لے کر اپنی موجودہ تصنیف حمطایا تک طے کیا ہے۔ انہوں نے خالد کو اس کے اسلوب اور مواد کے اعتبار سے دورِ حاضر کا بہت بڑا نعت گو شاعر قرار دیا۔ پروفیسر شمیم ترمذی نے "حمطایا" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب خالد کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں نسبتاً سادہ اور آسان زبان میں ہے۔ چنانچہ خواص کے علاوہ عوام بھی یقیناً اس سے مستفیض ہوں گے۔ ان کے بعد پروفیسر عاصی کرنالی نے خالد کی شخصیت اور فن کے پس منظر میں چند دلچسپ خاکے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں پیش کئے۔ جنہیں سامعین نے جو خاصی تعداد میں تھے بہت پسند کیا۔ ان کے بعد ملتان کی معروف سماجی کارکن اور "حریم فن" کی صدر بیگم فیضان نے خالد کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ خالد دورِ حاضر کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے ہماری اسلامی اقدار اور درخشاں ماضی کو زندہ کر دیا ہے۔ اور یوں انہیں

ایک نئی معنویت سے آشنا کیا ہے۔ ان مضامین کے دوران میں جناب وزیری پانی پتی اور اصغر علی شاہ نے خالد کے حضور منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ریڈیو آرٹسٹ جناب حفیظ کیفی نے "حمطایا" کی ایک نعت اپنی سحر آفریں آواز میں پیش کی اور دیر تک سامعین کو مسحور کیے رکھا۔ اس کے علاوہ شہلا اور ان کی چند ہم نوا چند بچیوں نے خالد کی ایک نعت قوالی کے رنگ میں پیش کی۔ ان معصوم آوازوں نے جب اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو سماں بندھ گیا۔ اب صاحب تصنیف جناب عبدالعزیز خالد سے تبرک کے طور پر ان کا کلام سنا گیا۔ انہوں نے اپنی چند تازہ تخلیقات سامعین کے دلوں پر نقش کیں۔ آخر میں صدر تقریب پروفیسر سید صفدر امام نے "حمطایا" کو ہمارے نعتیہ ادب میں ایک گراں بہا اضافہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ خالد نے نعت جیسی مقدس اور نازک صنفِ سخن میں بھی اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوایا ہے۔ اور یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ ان کے خطاب کے بعد تقریباً گیارہ بجے شب یہ ادبی تقریب اختتام کو پہنچی۔

دریچہ زندگی کا

سید ضمیر جعفری

پاکستان کے ممتاز شاعر جناب عبدالعزیز خالد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ جہاں کسی قلمکار اور فلمسٹار کے درمیان "ٹائی" پڑ جائے تو خالد صاحب قلمکار کو فلم اسٹار پر ترجیح دیتے ہیں، یہ انکشاف ۱۲ جون کو مری کی ایک تقریب میں سلطان رشک (مدیر نیرنگِ خیال) نے کیا، تقریب کا عنوان تھا "عبدالعزیز خالد کے ساتھ ایک شام" اور اس کا اہتمام افسانہ نگار لطیف کاشمیری کی مری لٹریری سوسائٹی نے میونسپل لائبریری کے ہال میں کیا تھا۔ خالد صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ خوب صورت اور عمدہ کتابوں کی اتنی وسیع ذاتی لائبریری کم لوگوں کے پاس ہوگی۔ کتابوں کی الماریاں اب ان کے باورچی خانے تک چلی گئی ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ اب اگر کوئی نئی کتاب ان کے گھر داخل ہوتی ہے تو گھر کا کوئی برتن ۔ ۔ ۔ ۔ دیگچی، لوٹا، گلاس وغیرہ گھر سے باہر نکل جاتا ہوگا۔ بہر حال میونسپل لائبریری میں کتابوں کے محاصرے میں خالد صاحب ایسے ہی بیٹھے ہوتے تھے جیسے اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ مقالات میں ہمارے دوست شاعر کیا پروفیسر کرم حیدری صاحب نے خالد کی شاعری کے کوئی ڈیڑھ درجن مختلف پہلوؤں پر باری باری اتنی روشنی ڈالی کہ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

سلطان رشک نے اپنے شخصی خاکے میں اس واقعہ کا ذکر کیا کہ ایک دفعہ وہ خالد صاحب کے دفتر میں ان سے ملنے گئے۔ تو ایک مشہور و مقبول فلم اسٹار بھی، کہ جس کو دیکھ کر قیامت کا نقشہ نظر آتا تھا ملاقاتیوں کی لائن میں لگی تھی مگر خالد صاحب نے اسے نظر انداز کر کے سب سے پہلے مجھے اندر بلوایا۔ اسلامیہ کالج قصور کے پروفیسر ارشاد حقانی تو خالد صاحب کے ہم دم دیرینہ ہیں۔ انہوں نے خالد صاحب کی بائیس کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے جو منظر عام پر آ چکی ہیں، علم و ادب کی پیاس کے سلسلے میں ان کی ریاضت اور مجاہدے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ آپ ہر روز رات کو اپنے کمرے میں، جہاں کتابوں کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا ڈیڑھ دو بجے تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ نے بتایا کہ جس روز خالد صاحب کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی، آپ اس دن بھی، کوئی چار سو مہمانوں اور شامیانوں کی دیکھ بھال، انتظامات کی نگرانی اور پھر بیٹی کو رخصت

کرنے کے بعد رات کو وہی ڈیڑھ دو بجے تک "خروش خم" کا مسودہ صاف کرتے رہے۔ سامعین میں حافظ عبدالرشید بھی موجود تھے جن کے مضامین ایک زمانہ میں مہر و سالک کے روزنامہ "انقلاب" میں چھپا کرتے تھے۔

مری سے اترنے کے بعد خالد صاحب ایک روز اسلام آباد میں بھی ٹھہرے۔ سہ پہر کو سیدھے میرے ہاں پہنچے۔ فرمایا انٹھو مسعود مفتی، اعجاز فاروقی اور محب عارفی سے مل آئیں" عرض کیا "یہ مسلمان افسروں کے قیلولے کا وقت ہے۔" مگر جب ہم لوگوں نے ان کے گھروں پر دستک دی تو سب کو نہ صرف جاگتے، بلکہ کچھ لکھتے پایا۔ محب عارفی تو حقہ پی رہے تھے۔

راولپنڈی والوں کو خالد صاحب کی آمد کا علم ہوا تو ادیب، نقاد، مورخ، اور شاعر جمیل یوسف نے ۱۵ جون کو راولپنڈی کلب کے "خس خانے" میں ایک محفل جمیل ان کے اعزاز میں آراستہ کی۔ جعفر طاہر نے جن کی داڑھی پہلے سے زیادہ نظر آتی اپنے مخصوص گھن گرج والے قلندرانہ لہجے میں، خالد کے فن و فکر کا ایک فاضلانہ جائزہ پیش کیا۔ "سول اینڈ ملٹری" سامعین میں لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) عبدالعلی ملک، میجر جنرل (ریٹائرڈ) ریاض شمیم، کرنل محمد خان (بجنگ آمد فیم)، میجر صدیق سالک (ہمہ یاراں دوزخ فیم) بہ تو رحیہ، راجہ اکرام اعظم، اور مولوی سعید صاحب (پاکستان ٹائم فیم) موجود تھے۔ مولوی سعید صاحب کا پہلے چہرہ ہی سفید ہوا کرتا تھا۔ اب داڑھی بھی مکمل سفید ہو گئی ہے۔ جنرل عبدالعلی ملک اور جنرل ریاض شمیم نے اگرچہ جوانی میں قلم چھوڑ کر تلوار سنبھال لی تھی مگر شعر و ادب کی طرف کنکھیوں دیکھنا نہیں چھوڑا۔ ریاض شمیم جو مولانا چراغ حسن حسرت کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے کالج کے زمانے میں نہایت چلبلے ڈرامے لکھا کرتے تھے اور عبدالعلی ملک تیمر تخلص کرتے تھے۔ نشست کا اختتام عبدالعزیز خالد کی نعتوں پر ہوا اور میں خیال کرتا ہوں کہ راولپنڈی کلب کے در و دیوار نے اس سے پہلے کسی ایک نشست میں اتنی نعتیں نہیں سنی ہوں گی۔

(نوائے وقت لاہور)

عبدالعزیز خالد کے ساتھ ایک شام وفاق لاہور

پنجاب اسمبلی کے سپیکر شیخ رفیق احمد نے کہا ہے کہ انسانیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے محسن انسانیت کا تذکرہ ناگزیر ہے کیونکہ انسانیت کو ان سے معراج نصیب ہوئی ہے۔ وہ آج یہاں پاکستان نیشنل سنٹر میں ممتاز شاعر جناب عبدالعزیز خالد کے ساتھ ایک شام" کی تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ جس کا اہتمام اسلامیہ کالج کے طلبائے قدیم نے کیا تھا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں عبدالعزیز خالد کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری کی بنیاد انسانیت سے والہانہ محبت پر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اپنی شاعری میں وہ عشق محمدی میں سرشار نظر آتے ہیں۔ کیونکہ انسانیت کو پیش کیا جانے والا خراج تذکرۂ رسول کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا کہ عبدالعزیز خالد کی شاعری ایک سمندر ہے۔ جس میں طوفانی لہریں بھی ہیں ہلکی ہلکی موجیں بھی۔ انہوں نے کہا کہ اُن کے کلام میں انتہائی برجستگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ وجدان کی کیفیت میں اپنے افکار کو موزوں کر رہے ہوں۔

اس تقریب سے ریٹائرڈ جسٹس ایس اے رحمان، ارشاد احمد حقانی، محترمہ شتا در ڈوگر، کلیم اختر اور سید نذیر نیازی

نے بھی خطاب کیا۔ جناب ارشاد حقانی نے اپنے مقالہ میں کہا کہ عبدالعزیز خالد آج تک کبھی کسی سے ذہنی طور پر مرعوب نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ اپنے غیر معمولی علمی تفضیلت کا ادراک ہے۔ جو اسے منفرد رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ذہنی اور طالب علمانہ جستجو بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسے سیاست کے ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ وہ سیاست دانوں کے طور طریقوں سے نالاں ہے۔ بتاتے ہے۔ اور وہ ادب کی خدمت میں اس قدر مصروف ہے کہ اسے کسی دوسرے مشغلہ سے دلچسپی نہیں۔ بظاہر عبدالعزیز خالد مذہب کے معاملہ میں غیر معمولی دلچسپی کا حامل نظر نہیں آتا۔ لیکن درحقیقت دین کی محبت اس کی روح میں رچی بسی ہے۔ محترمہ شاہد ڈوگر نے اپنی تقریر میں کہا کہ عبدالعزیز خالد میں ملٹن کے کلام کی سی سنجیدگی متانت اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے موازنہ کرتے ہوئے دونوں شعراء میں مماثلت کے بہت سے پہلو حاضرین کو بتائے اور کہا کہ عبدالعزیز خالد کی شاعری سے سادگی اور حقیقت پسندی جھلکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ شاعر قوموں کی تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔ اور عبدالعزیز خالد یہ فرض نہایت خوبصورتی اور کامیابی سے ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا مستقبل میں عبدالعزیز خالد کو شاعری میں ان کا وہ مقام حاصل ہوگا۔ جس کے وہ مستحق ہیں۔

اسلامیہ کالج کے ریٹائرڈ پرنسپل خواجہ محمد اسلم نے اپنی تقریر میں کہا کہ عبدالعزیز خالد زمانہ طالب علمی ہی میں منفرد مزاج کے حامل تھے۔ اور ان میں حد سے زیادہ شرافت سادگی اور سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ اور ایک ایسی کشش ان میں تھی جو ان سے مخاطب ہونے کی رغبت پیدا کرتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ وہ ایک مشکل پسند شاعر ہیں۔ لیکن ان کا اسلوب منفرد ہے اور انہوں نے فن میں نئی روش کی ہے۔ اور وہ اپنا آفاقی پیغام لوگوں تک پہنچا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے۔ جو برائی اور رذیل سے پاک ہو۔

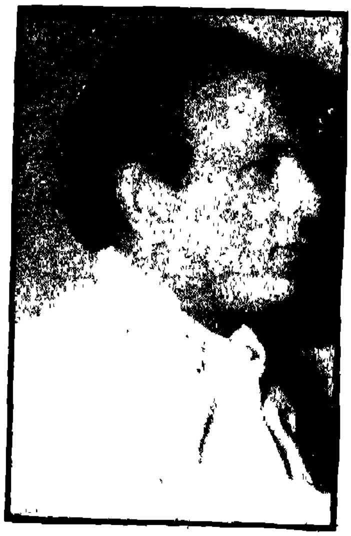
تقریب میں جناب دانش، اکبر کاظمی اور حفیظ تائب نے عبدالعزیز خالد کے فن کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ اور ملکہ ترنم نورجہاں کی گائی ہوئی عبدالعزیز خالد کی ایک نظم کا ریکارڈ بھی سنوایا گیا۔ جناب عبدالعزیز خالد نے اپنی تازہ ترین نظم پیش کی۔ جو سوئے خدا کی مدح میں تھی۔

شب کے سناٹے میں وہ دار دہوا
آنکھ میں مُسکان، بینا ہاتھ میں
اور گونجے میرے سینے مدھ بھری گونجارتے
کیوں اکارت جا رہی ہیں آہ یوں راتیں مری!
کیوں میں اسکی دید سے محروم ہوں
جس کی عطر آلود سانس
روز مس کرتی ہے میری نیند کو

پروفیسر جاوید اللہ

"فقر اور عشق" کا مجموعہ عبدالعزیز خالد

کالج کی انجمن اردو اور خالد کے اعزاز میں شاندار تقریب



عبدالعزیز خالد

خالد کا فن
مختلف رنگوں میں
بکھرا ہوا ہے

○

کالج کی انجمن اردو نے مورخہ ۱۱ر مارچ ۱۹۹۴
کو اردو کے منفرد اور صاحب طرز شاعر جناب
عبدالعزیز خالد کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا
وقت ساڑھے تین بجے بعد دوپہر کا تھا۔ مگر طلباء و
طالبات کی ایک بہت بڑی تعداد تین بجے ہی ہال میں
جمع ہوگئی تھی۔ سوسائٹی کے عہدہ داران سٹیج کی زینت

دلہا لکش کو چار چاند لگانے میں معروف تھے ۔ لاہور
سے جناب طفیل دارا جناب عاصم صہبائی اور مردان سے
جناب تاج سعید تشریف لا چکے تھے ۔ اتنے میں
مہمان خصوصی کی آمد کا وقت ہو گیا ۔ پرنسپل صاحب
اساتذہ کرام ، سٹوڈنٹس یونین اور انجمن اردو کے
عہدہ دار اور انتظامیہ کے اراکین پھولوں کے ہار
ہاتھوں میں لئے صدر دروازے کے پاس کھڑے
ہو گئے ۔ مہمان خصوصی وقت کے بڑے پابند ہیں
چنانچہ انہوں نے اپنی روایت کو قائم رکھا اور پانچ
منٹ پہلے تشریف لے آئے ۔ ان کا بڑی گرمجوشی
سے استقبال کیا گیا ۔ ہال میں پہنچے تو طلباء طالبات
اور دیگر معززین شہر نے کھڑے ہو کر انہیں
خوش آمدید کہا ۔ تالیوں کا اتنا شور تھا کہ کان پڑی
آواز سنائی نہیں دیتی تھی ۔ تقریب کا آغاز حسب
معمول قرآن پاک کی چند آیات کی تلاوت سے ہوا
نگران انجمن اردو پروفیسر احمد حسن حامد نے طلباء
کو مہمان خصوصی کا مختصر تعارف کرواتے ہوئے بتایا
کہ جناب عبدالعزیز خالد ۱۹۲۷ء میں جالندھر
کے مردم خیز ضلع میں پیدا ہوئے ۔ میٹرک تک
تعلیم وہیں حاصل کی ۔ مڈل میں صوبہ بھر میں پہلی اور
میٹرک میں مسلمانوں میں پہلی پوزیشن حاصل کی اسلامیہ
کالج لاہور سے ایم اے کیا ۔ شاعری کا آغاز سکول
میں ہی ہو گیا تھا ۔ کالج کے ادبی مجلہ "کریسنٹ"
مدیر رہے اور کالج کے بہترین طالب علم ہونے
کے باعث آپ کو "رول آف آنرز" دیا گیا ۔
۱۹۵۰ء سے محکمہ انکم ٹیکس سے متعلق رہیں اور اس
وقت کمشنر انکم ٹیکس لاہور زون کے عہدہ پر فائز ہیں



مہمان خصوصی کا تعارف

ن
"فارقلیط"
دنیا کی تاریخ میں
اتنی طویل نعت
آجتک کسی زبان
میں نہیں لکھی گئی
○

آپ کی بیس کے قریب کتابیں اب تک
شائع ہو چکی ہیں ۔ آپ کو اپنی کتاب "فارقلیط"
پر آدم جی ادبی انعام ملا ۔ اور "پرواز عقاب"
پر حبیب بنک کا ادبی انعام اس سال دیا گیا ۔ آپ کی
تصنیف "فارقلیط" اردو زبان و ادب
میں ایک گران مایہ اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔
اس میں چودہ سو کے قریب نعتیہ اشعار ہیں ۔
جو ایک ہی قافیہ اور ردیف میں لکھے گئے ہیں
دنیا کی تاریخ میں اتنی طویل نعت آج تک کسی
زبان میں نہیں لکھی گئی ۔ انہوں نے اپنے ہم عصر
شعراء کے سامنے تاثرات کا ایک نیا ذخیرہ
پیش کیا ہے اور اپنی شاعری کے ذریعے ہمیں
اپنی ثقافتی روایات سے قریب تر کرنے میں
ایک بھرپور کردار ادا کیا ہے ۔
اس مختصر سے تعارف کے بعد پرنسپل صاحب
ارشاد احمد حقانی نے جو خالد صاحب کے دیرینہ اور
گہرے دوست ہیں ۔ موصوف کی شخصیت کے بارے
میں مضمون پڑھا جو بلا مبالغہ خالد صاحب کی شخصیت
کے نمایاں پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا ۔ انہوں
نے کہا کہ "میرے نزدیک خالد کی شخصیت کے دو
نمایاں ترین اجزا اور غالب ترین عناصر "فقر" اور
عشق ہیں ۔ میں ان اصطلاحات کو ان کے اعلیٰ ترین
اور وسیع ترین معنوں میں استعمال کر رہا ہوں ۔ مجھے
اچھی طرح احساس ہے کہ میں نے ایک بہت بڑی
بات کہہ دی ہے لیکن میں اس "قول ثقیل" کی گرانباری
سے ہرگز بے خبر نہیں ہوں ۔ خالد نے مادہ پرست
ماحول میں آنکھیں کھولیں ۔ جدید مغربی تعلیم پائی ۔
معاشیات میں ایم اے کیا اور انکم ٹیکس کے محکمے میں
نوکری کی ۔ اس کی ملازمانہ زندگی تقریباً تمام کراچی جیسے
شہر میں بسر ہوئی جس کا مزاج ہی کاروباری اور
دنیا پرستانہ ہے ۔ جہاں دیکھتے ہی دیکھتے لوگ کروڑ



پرنسپل حقانی

یتی بن گئے ۔ جہاں علمی، تہذیبی اور دینی اقدار، اس قدر دبی ہوئی ہیں کہ ان کی موجودگی اور قدر شناسی کا احساس بھی نہیں ہوتا ایسے شہر میں خالد کا واسطہ رات دن براہ راست ان لوگوں سے رہا ۔ جنہوں نے دولت دونوں ہاتھوں سے سمیٹی ۔ حیران کن بات یہ نہیں ہے کہ خالد نے اس بہتی گنگا میں سے ایک چلو بھر پانی نہیں پیا بلکہ یہ کہ اس کے دل میں اس کی کوئی خواہش نہیں ہے ۔ بے صلاحیت اور مواقع سے محروم لوگوں کی بات تو دوسری ہے لیکن استعداد اور وسائل رکھنے والے لوگوں میں بڑے بڑے دینی راہنماؤں اور علمی شخصیتوں سمیت میں نے خالد سے بڑھ کر دنیا کی طلب نہ کرنے والا اور دنیاوی لذات اور عزت و شوکت کے دنیاوی معیارات کو نظر انداز کرنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا

خالد کی اس وقت حالت یہ ہے کہ وہ سالہا سال سے کھانا ایک وقت کھاتا ہے کھانے

کے بارے میں کئی کئی مہینے بلکہ کئی کئی سال وہ گھر میں اپنی کسی مضمون پسند کا اظہار نہیں کرتا ۔ خالد کے تقریبی کا اظہار یہ ہے کہ اپنی ملازمت کے دوران اس نے کبھی اپنے حکام بالا سے اختلاط بڑھانے کی کوشش نہیں کی ۔ وہ ایک نہایت منکسر المزاج شخص ہے وہ کسی ایسے آدمی سے بالا مادہ مل نہیں سکتا ۔ جس کی دلچسپیاں اس کی دلچسپیوں سے مختلف ہوں اور جس کے ساتھ اسے ایسے موضوعات پر بات کرنی پڑے جو اس کے موضوعات نہیں ہیں ۔

خالد کے کردار کا دوسرا نمایاں عنصر عشق ہے بلکہ یہ اس کے کردار کا اصل جوہر ہے ۔ عشق شدتِ محبت کا نام ہے یہ کسی مقصد اور کسی نصب العین کے ساتھ لگن اور وابستگی کا نام ہے اس کا خاصہ کامل انہماک، جذب کلی اور آرزوئے پیہم ہے ۔ خالد ایک سچا عاشق ہے ۔ اسے عشق ہے حقیقت اور صداقت سے اسے عشق ہے اسلام سے کہ یہ اس کائنات کی عظیم ترین اور ارفع ترین حقیقتوں کا مجموعہ اور مرقع ہے ۔ اسے عشق ہے شاعری سے فن سے صلاحیت سے تخلیق سے ۔ اسے عشق ہے اردو سے پاکستان سے ....“

خالد محض عظمت رفتہ کا شاعر نہیں، بلکہ وہ حال اور مستقبل کی صداقتوں کا نقیب بھی ہے

پرنسپل صاحب کے بعد جناب عاصم صحرائی نے اپنا پر مغز مقالہ پڑھا ۔ انہوں نے کہا، خالد نے شاعری کی کسی ایک صنف میں طبع آزمائی کی ہوتی تو شاید نقادوں کے لئے اتنی مشکل پیدا نہ ہوتی لیکن خالد نے خود کو کہیں محدود نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ اس کا فن مختلف رنگوں میں بکھرا ہوا ہے ۔ اور اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ خالد کے ہر رنگ میں قوس قزح سے زیادہ کشش اور جاذبیت موجود ہے ۔ میں خالد کی شاعری کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس میں سنجیدگی اور متانت کے علاوہ شگفتگی، جاذبیت دلآویزی اور علم کی گہرائی بدرجہ اتم موجود ہے خالد کے نظام فکر میں صرف اس کی ذات شخصیت یا تخلیقی جبلت ہی کارفرما نہیں بلکہ اس کے نظام فکر کی جڑیں اس کے اپنے ہم عصر علم و ادب کے علاوہ کلاسیکی ادب میں بھی دور دور تک پہنچی ہوئی ہیں ۔ اس کے ہاں شاعرانہ تضاد کی بجائے فلسفیانہ ارتباط ہے ۔

خالد محض عظمتِ رفتہ ہی کا شاعر نہیں



پروفیسر طفیل دارا



تقریب کے سامعین

بلکہ وہ حال اور مستقبل کی صداقتوں کا نقیب بھی ہے اس کے فن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے فن میں دوسرے شاعروں کی طرح شعوری اور لاشعوری کش مکش نہیں ملتی۔ بلکہ خالد کا کلام پڑھتے پہلے احساس ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ایک واضح نصب العین موجود ہے۔ وہ سعی و خطا کے ذریعے مسائل کی گتھیوں کو نہیں سلجھاتا بلکہ اپنے بے پناہ مشاہدات و تجربات کے علاوہ ادراک و بصیرت سے بھی بھرپور استفادہ کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خالد زلف و کاکل کے قصے چھیڑ کر قوم کو جنسی ماریا کے انگشن لگانے کی بجائے لوگوں میں عقل و خرد اور شعور و ادراک کی دولت بانٹتا ہے۔

جناب عاصم صہبائی کے مقالے کے بعد "م

ملتانی" نے کلام خالد ترنم سے پیش کیا اور ایک عجیب ہی سماں باندھ دیا۔ اب پروفیسر طفیل دارا (صدر شعبۂ اردو، ایم اے او کالج لاہور) مائیک پر تشریف لائے اور "شلوکی" کے کردار اور اس کی پیش کش کے بارے میں ایک نہایت ہی بلند پایہ مضمون پڑھا۔ ان کے بعد مردان سے تشریف لائے ہوئے ہمارے مہمان جناب تاج سعید کو زحمت دی گئی جنھوں نے عبدالعزیز خالد پر ایک بڑی خوبصورت نظم پڑھی۔ نظم کا آخری حصہ آپ بھی سنیے۔

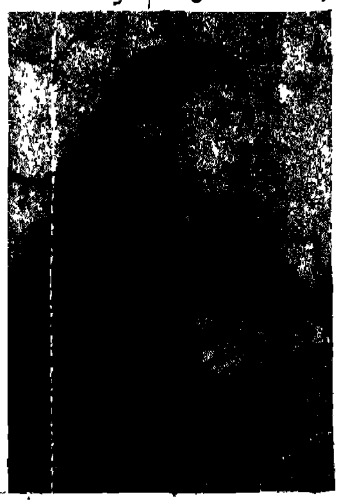
"لیکن اس گیانی نے اب تو بھید الوکھا پایا۔
کڑوے بول بھی۔ ہر ایک من میں زہر
کی گانٹھیں لوٹیں۔
من میں میٹھے بول پریم کا امرت یوں ٹپکاتے ہیں۔
جیسے میٹھا ٹھنڈا پانی من کی پیاس بجھاتا ہے۔



جناب تاج سعید۔

جیسے برکھا کی رم جھم میں دھرتی کا رنگ
دھلتا ہے۔
جیسے سات سروں کا جادو شہروں کو چمکاتا ہے"

تاج سعید صاحب کے بعد مہمان خصوصی جناب عبدالعزیز خالد سے ان کا کلام سنا گیا۔



کلام شاعر، بزبان شاعر

آپ نے بہت سی نظمیں سنائیں۔ سامعین کے اصرار پر غزلیں بھی پڑھیں۔ داد و تحسین کا ایک شور تھا۔ واہ واہ کے نعرے تھے اور تالیوں کی گونج تھی۔

کلامِ خالد

عبدالعزیز خالد

مصیبت امتحاں ہے حوصلے کا
تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ تَعَالٰے

دلِ درویش سیّاحِ جہاں ہے
فَکَانَ نَاتَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰے

قلم لکھتا ہے تیرے حسن کے گیت
بیاکل من مراکب شانت ہوگا
فَقَالَتْ : وَیْحَکَ اِنِّی مُغِیْبٌ
اکیلی جان کر اس کو جو چھیڑا
وہی ساعت ہے تیری جس میں تو ہے
ہے فردا غیب، ماضی آب رفتہ
مرا دامن پکڑ کر مجھ سے بولی
کہ اِنّی اَعْزِ عنُ نَفْسِی عَلَیْکَ
ترے قالب میں میری روح ہوتی
تو تجھ کو دردِ دل کا علم ہوتا
بنے ناسور نا آسودہ خواہش
کسی جذبے کو رہنے دے نہ تشنہ

عبدالعزیز خالد

موجودہ دور میں قلم کا بحران

"موجودہ" کی تخصیص کیوں ؟

ع : بہار ہو کہ خزاں رنگِ گلستاں یکساں

مجھے تو یہ "موجودہ" قرنِ اوّل کے بعد ملتِ بیضا کی کم و بیش پوری تاریخ کا احاطہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کب قلم کا بحران نہیں تھا ؟ کب اظہار پر قدغن نہیں تھی ؟ کب فکر پر پہرے نہیں تھے ؟ کب وہ لوگ جنہیں ان کی ماؤں نے آزاد پیدا کیا پابند سلاسل نہیں تھے ؟

اسلام کا سب سے بڑا فیضان — عدل و احسان کا، اخوتِ بنی نوعِ انسان کا، قانون کی بالادستی، بڑے چھوٹے ہر شہری کے برابر کے معاشرتی حقوق اور اربابِ حل و عقد کی کسی رُو رعایت اور خوف و خطر کے بغیر مسئولیت و احتساب کا بلند و بے مثال تصور ہے۔

وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے خواب دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے جہاں فرد، حسب نسب، طاقت اور دولت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ اپنے ذاتی جوھر کی بدولت آگے بڑھتا ہے جہاں آدمی کی بڑائی کا معیار اس کی "خلق" خدا کے لئے نفع رسانی ہے، اہلِ زمین پر اس کی مہربانی ہے جہاں قیادت فلاح و خیر کا سرچشمہ اور ایثار و استغنا کا نمونہ ہوتی ہے۔ جہاں انسان پھیلتا ہے، بڑھتا ہے، پنپتا ہے سکڑتا نہیں، گھٹتا نہیں، مرجھاتا نہیں اس کی تخلیقی صلاحیتیں جاگتی ہیں، جلا پاتی ہیں، زنگ آلود نہیں۔ عدمِ استعمال اور ماحول کی سیلن اور گھٹن سے ریختہ نہیں ہوتیں۔ کوٹ جل کی کائی کی طرح انہیں پھپھوندی نہیں لگتی ! ع

ہے کیا اسلام ؟ ہر چیز جمیل و خوب و زیبا !

لیکن افسوس مسلم معاشرے نے چند مسیحا نفس ادوار کو چھوڑ کر جن پر بھی النادر کالمعدوم کی مثل صادق آتی ہے۔ اس نصب العین کو من حیث المجموع، شرحِ صدر سے کبھی قبول نہیں کیا۔ مسلمانوں کی "تاریخ" مطلق العنان، مستبد بادشاہوں کی تاریخ ہے (الّا ماشاءَ اللہ) جس میں بے زبان عوام کالانعام کا کوئی "تذکرہ" نہیں ملتا۔ خدا کے بندے

پہلے بتوں کو پوجتے تھے پھر طوعاً و کرھاً ان ارضی خداؤں کے آگے سجدہ ریز ہو گئے جن کے ہاتھوں میں ان کا رزق، ان کی عزت، انکی زندگی اور موت تھی۔

ہماری پسماندگی، ذہنی جمود، فکری انتشار اور تہذیبی بےحسی، بے اثری اور بے سمتی کی یہی وجہ ہے کہ ہمیں کبھی "سوچنے اور بولنے والا جانور" نہیں سمجھا گیا۔

مسلمانوں کے قدوم میمنت لزوم جہاں بھی پہنچے۔ وہاں سب سے پہلے ان "پُر اسرار بندوں" نے ملوکیت کا طودل ڈالا اور قانون کو خواہشات کا تابع مہمل بنا کر اسے آختہ کیا کہ:

نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارند

ہم کہتے ہیں (اور صحیح کہتے ہیں) کہ سکندریہ کا کتب خانہ ہم نے نہیں جلایا لیکن ہمیں دیکھتے ہوئے کون ہمارے اس بیان کو باور کر سکتا ہے۔

ہم دعوے تو بہت کرتے ہیں احترام آدمیت کے، شرف انسانی کے لیکن عملاً ہم اس لاوارث جنس کی جسے طنزاً اشرف المخلوقات کا نام دیا جاتا ہے، اور جسے عرف عام میں عوام یا عامۃ الناس کہتے ہیں جو تذلیل و تضحیک کرتے ہیں۔ اسے دیکھ کر

"صنم بھی پکارے ہری ! ہری !"

ہم آدم کی اولاد کو شخص نہیں بلکہ محض شے سمجھتے ہیں۔ ایک بے حیثیت شے۔ نخاس کا مال، ایک آلۂ کار، ایک صدائے بازگشت ــ ہم سے مراد وہ سلاطین وملوک وہ الامرہ وجبابرہ ہیں جن کے آہنی ہاتھوں میں اس امت مرحومہ کی تقدیر ہے اور رہی ہے ــ نرگسیت کے مریض اپنی ذات کو "ہمہ اوست" سمجھنے والے نیرانی منتقم، متکبر ــ اور ان کی حاشیہ بردار مذہبی پیشوائیت۔

کیسی باز پرس ! کہاں کی جواب دہی ! ان کی بارگاہ میں جنبش مژگاں بھی گناہ ہے ۔۔

جس کو ہو زندگی عزیز، سربسجود ہو نہ کیوں ؟

ہمارے ہاں کاروبار حیات صرف لذت کام و دہن تک محدود ہے، آزادی ضمیر کا، آزادیٔ اختلاف کا، آزادیٔ رائے کا، آزادیٔ عمل و انتخاب کا، آزادیٔ اظہار خیال کا ہمارے نظام اقدار میں کوئی مقام نہیں۔ سرکار دربار سے وابستہ ہوئے بغیر، شہ کا مصاحب بنے بغیر آبرومندانہ زندگی گذارنے کی ہم اجازت نہیں دے سکتے، کیونکہ اس سے ہماری "ہمہ از اوست" جبریت میں خلل آتا ہے۔ ہماری کبریائی پہ زد پڑتی ہے۔

اے خاصۂ خاصان رسل ! وقت دعا ہے

یہ وقت دعا اس امت پہ آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے طاری ہے، اور (خدا نہ کرے) شاید ہمیشہ طاری رہے کیونکہ ہمارے ہاں مساوات و جمہوریت اور حرمت و حریت کا کوئی تصور نہیں۔ صدیوں کی غلامی نے ــ غیروں کی نہیں بلکہ اپنوں کی غلامی نے ــ سانس پی جانے والی، گلا گھونٹ دینے والی غلامی نے ــ ہماری روحوں کو مسخ کر دیا ہے۔ ہمارے

ذہنوں کو بانجھ بنا دیا ہے۔ یہ "جبری نس بندی" کا عمل ہے۔ ہم نے کب حقائق پر پردے نہیں ڈالے؟ کب خبر کے پر نہیں کھینچے؟ کب کاروانِ حرف و نور پر شبخون نہیں مارا؟ ہم نے انصاف و امانت کے تقدس کو پامال کیا ہے۔ گواہی کا مذاق اڑایا ہے اور گواہوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا ہے۔ ہم قحطِ خبر، سرابِ وعدہ اور قولِ کاذب کے مارے بھاگتے ہوئے لوگ ہیں۔ ؏

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

جو مذہب تسخیرِ فطرت، مشاہدۂ قدرت اور تحصیلِ علم پر اس قدر زور دیتا ہے جو عقل اور قلم کو انسان کو سب سے بڑی متاع اور خدا کی سب سے بڑی عطا کہتا ہے، اس کے پیرو بسم اللہ کے گنبد میں بند ہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں دیکھتے نہیں، کان ہیں سنتے نہیں، دل ہیں سمجھتے نہیں۔ نہیں! نہیں! وہ تو دیکھنا چاہتے ہیں، سننا چاہتے ہیں سمجھنا چاہتے ہیں، لیکن انہیں اس کی پروانگی نہیں۔ نتیجۃً ان میں کھڑے پانی اور بند مکان کی ساری عفونتیں اور بدبوئیں جمع ہو گئی ہیں وہ تازہ ہوا کو ترستے ہیں لیکن بادِ صبا کو ادھر آنے کا حکم نہیں!

ہمارے وہ علمی و فکری کارنامے جن پر ہم فخر کرتے نہیں تھکتے چند اربابِ عزیمت کی اپنی انفرادی اور بے سروسامان جانکاہ کاوشوں کا ثمر ہیں جو ایک متشدد، علم دشمن، مادہ پرست اور بے اجتہاد معاشرے سے اپنی جان و آبرو بچا کر وہ اولوالعزم سرانجام دینے میں کامیاب ہو گئے۔

ان پاک روحوں کو مجھ سے بے توفیق لوگوں کے شکر گزار دلوں اور اشکبار آنکھوں کا سلام پہنچے!

ہمارے لئے مثالی معاشرہ الف لیلہ کا ہے جس میں صرف جسم اور اس کی پرخمار لذتیں ہیں ۔ طوان ثروان اور کاسالووٗ کی جنت شداد، دلیلہ اور قلو پطرہ کے خوابوں کی سرزمین، ابن الوقتوں اور طالع آزماؤں کا دیارِ حرام پور۔ اہلِ بصارت و بصیرت کا طلسم حمام بادگرد!

انسانی ذہن خوف و دہشت کی خیال کُش تہلکہ خیز فضا میں کیسے کام کر سکتا ہے: ہم اپنی صلاحیتوں کے آپ قاتل ہیں ۔ بے پناہ، بے کراں، زرخیز، پُرجوش، بے لوث ذہنوں کی صلاحیتیں ۔ جو تخلیقی اظہار کی راہیں مسدود پا کر انتہائے یاس میں ضحاک کے سانپوں کی طرح اپنے مالکوں کو ڈسنا شروع کر دیتی ہیں اور یوں موجِ دریا، موجِ گرداب بن کر رہ جاتی ہے ؎

خونِ فرہاد بر سرِ فرہاد

اے باغبانِ قدرت!

غنچے یہ کھلے فقط بکنے کے لئے؟

اے دیارِ پاک

اے دیارِ پاک تیری سرزمیں
فخرِ عالم رشکِ خلدِ بریں
حسن کا گہوارہ، مہدِ صدق و حق
کشورِ عزم و ثبات، ارضِ یقیں
قطرہ قطرہ چشمۂ آبِ حیات
ذرہ ذرہ مطلعِ مہرِ مبیں
نافۂ آہو سے بڑھ کر مشکبو
تیرے میدانوں کی خاکِ عنبریں
تیرے ریگستان فرشِ پرنیاں
تیرے کوہستان کانِ گوہریں
تیری راہوں کے خس و خاشاک و خار
سنبل و ریحاں، گلاب و یاسمیں
تیرے سنگ و خشت اے ارضِ وطن
گوہرِ گنجینۂ دُرِّ ثمیں
تیرے باغ و راغ جولاں گاہِ ناز
کرتے ہیں گلگشت شوخانِ حسیں
دف بجیں لہروں کے ان میں رات دن
تیرے دریاؤں کی لے ہے دلنشیں

سرو کے بوٹے، سہی قد، سربلند
تیرے دلبر غیرتِ حورانِ عین
پیکرِ شرم و حیا، نقشِ وفا
تیری عذرائیں ملیح و مہ جبیں
تیری سلماؤں کو شاعر کا سلام
ان کی مریم دامنی پہ آفریں
جذبۂ حبِّ وطن کے فیض سے
بن گیا نغمہ نوائے آتشیں
تو جیالے جاں نثاروں کا وطن
تو سجیلے سرفروشوں کی زمیں
تیرے محبوب و مقدس بام و در
عظمتِ اسلام کے حصنِ حصین
تیرے غیرت مند فرزندوں کا نام
شاہبازِ کوہی و شیرِ عریں
جاں نثارانِ رسولِ ہاشمیؐ
نام و ناموسِ محمدؐ کے امیں
خالدؓ و طارقؒ کے پایندہ نشاں
خاتمِ حمزہؓ کے تابندہ نگیں
یہ محمد ابنِ قاسم کے رفیق
یہ حسینؓ ابنِ علیؓ کے جانشیں
جعفرِ طیارؓ کے حلقہ بگوش
حیدرِ کرارؓ کے یہ خوشہ چیں
یہ عمرؓ فاروقِ اعظمؓ کی سپاہ
سرخوش و زندہ دل و دلکش جبیں
یہ صلاح الدین ایوبی کا جیش
لرزیں جن کے نام سے اعدائے دیں

قرۃ العینِ نبی محترمہ
یہ جنودِ رحمت للعالمین
یہ سراج الدّولہ و ٹیپو کی فوج
فخرِ ملک و فخرِ قوم و فخرِ دین
سینۂ کہسار سے مضبوط تر
ہیں یہ ذوالقرنین کی دیوارِ چین ۔

سینے میں ناقابلِ تسخیر عزم
جسم کا قلعہ حصارِ آہنیں
لرزہ بر اندام ہیں زنّارِ پوش
کانپتا ہے رَن لرزتی ہے زمیں
اِن کی جرأت کا شمار ناں ہے جہاں
ان کی جانبازی کے قصے ہر کہیں
بادشہ اقلیم ابر و باد کے
یوں بظاہر خاکسار و کمترین
بحر و بر پر ان کا سکہ ہے رواں
خشک و تر کی سلطنت زیرِ نگیں
برق ہیں سیماب ہیں یا کہربا
کھولتے ہیں راز پر کھلتا نہیں
ششدر و حیراں حسن ابن صباح
اِن فدا کاروں کا ثانی ہے کہیں
پیروِ خضر و سلیمان و خلیل
ہیں یہ غازیٔ حامیٔ دین متیں
یہ خدا کے ماننے والے ہیں یہ
ماسوا کے سامنے جھکتے نہیں
حکم ہے اِنفاقِ نفس و مال کا
ذوقِ قربانی نہیں تو کچھ نہیں

وادیٔ کشمیر تو کیوں ہے اداس
چاہنے والے تجھے بھولے نہیں
ہے نگاہِ الفت و مستی میں تو
ہو بہو فردوس بر روئے زمیں
شہ پری دیوِ سیہ کی قید میں
سر بزانو، دل فگار، اندوہگیں
گرد چہرے پہ غم و آلام کی
پاؤں میں زنجیرِ استبداد کہیں
جان و دل بیتاب ہیں تیرے لئے

اے دیارِ آرزو، اے گل زمیں!
طاقتِ طاغوت زورِ کفر کو
مضمحل کر دے الٰہ العالمین
سامری کے سحر کو کر پاش پاش
اے شدید البطش و خیرالماکرین
اے خدائے جن و انس و عرش فرش
ربِ افواجِ سماوات و زمیں
کون پاکستان کا تیرے سوا
حامی و ناصر، مددگار و معیں
ہم تری تائید کے محتاج ہیں
ہم غلامانِ رسولِ آخریں

اقبال

۱

اے خودی کے شاعرِ والا صفات
تجھ پہ آئینہ تھے اسرارِ حیات
سوز و سازِ آرزومندی سے تھی
روشن و پُرمایہ تیری کائنات
محرمِ یکتائی و درِ یتیم
منکرِ دارائیِ لات و منات
تو نے درویشی کو [illegible]
تو نے ٹھکرائی [illegible] کی زکات
تو نے کھولا اس طلسم [illegible]
موت در پردہ ہے تجدیدِ حیات
مستی و دلسوزی و وارستگی
تیری ہستی تھی مجسم کیفیات
اشک و آہ و فکر و ذکر و زمزمہ
ہیں یہ تیری زندگی کے واقعات
سال و سن کی ہے عبث بحث و جدل
اصل شے ہیں ذہن و دل کی واردات
بے ہمہ ہو آدمی یا باہمہ
بیخودی ہو یا خودی اثباتِ ذات

بن گیا تھا جو سخن برگِ حشیش
ہے وہ تیرے لمس سے شاخِ نبات
تیرے شعری پیکروں کے سامنے
خم کشیدہ قد بتانِ سومنات
ہے محال و ممتنع تیرا کلام
تُو نے دکھلائے ہزاروں معجزات
تو نے ناممکن کو ممکن کر دیا
یعنی دی اہلِ زباں کو شہ و مات
زندۂ جاوید ہے تیرا سخن

ہے تغیّر کی طرح اس کو ثبات
شعر تیرا ہے زمانے کی زباں
ہیں جہان اندر جہاں اس کے نکات
تیری تمثیلیں سوادِ حرف میں
رات کے آنگن میں تاروں کی برات
تیرے اندازِ تکلّم کی قبیل
مختلف الاطراف و حیرانیٔ ناعمات
تیری تشبیہیں بہت اندر بہت
حاملات و والدات و مرضعات

تیری پروازِ تخیل دیکھ کر
محوِ حیرت فاعلاتن فاعلات
ہے صریرِ خامہ آوازِ سروش
یہ خدا کا ہاتھ ہے یا تیرا ہاتھ
ہے ورائے شاعری چیزے دگر
جس کے فہم و درک سے عاجز لغات
حیطۂ ادراک میں آتے نہیں
تیرے ابعاد و مقامات و جہات

فکر و فن کا یہ مرقع دیکھ کر
ہم کو آیا اعتبارِ معجزات
میں کہ واقف ہوں فنونِ شعر سے
اس کمالِ فن پہ ہوں حیران و مات
ہے بقولِ خود تو فن سے نابلد
اے ابوالآبائے فنِ شعریات
کیوں نہ ہوں اہلِ نوا تیرے مرید
اے نوا سنجِ مریدِ کائنات
خواب جو دیکھا تھا تو نے بن گیا
رفتہ رفتہ نقشۂ صبحِ نجات
بوئے عشق آتی ہے تیری قبر سے
ہے یہ کس کی تجھ پہ چشمِ التفات

لیتے رہنا خوابِ نوشیں کے مزے
سوتے رہنا حشر تک بعد از وفات
ساری امت گوش بر آواز ہے
یَا بِلَالُ! قُمْ[1] فَنَادِ بِالصَّلٰوۃ!

---

[1] اَرِحْنی ۔ اَرِحْنَا

شام

شام اے سانولی سلونی شام!
پرنیاں پوش، ارغواں اندام

سر پہ البیلی آن سے اوڑھے
بادلوں کا شہاب رنگ آنچل
نگہِ چشمِ سرمگیں جیسے
جھیل کے گہرے پانیوں میں کنول
آگ میں جیسے گھل رہا ہو دھواں
جا رہی ہے تو تیز تیز کہاں؟
اُدھ کھُلے مکھ پہ اُدھ کھُلی الکیں
نشے کے بوجھ سے جھُکی پلکیں
کریں خواب و خیال کی باتیں
آنکھیں آنکھوں کے راز پہچانیں

اے سبک گام لیلیٰ گلفام
شام اے سانولی سلونی شام
رنگ کتنے ہیں تیرے، کتنے نام؟

رقص کرتی، دِیے جلاتی شام!
آتی شب کا گجر بجاتی شام!
داشدِ دل کی میکدہ آشام!
ساعتوں کا سندیسہ لاتی شام!

شفق آلود، شعلہ رُو، چنچل
غازہ گالوں پہ آنکھ میں کاجل
آتشِ حُسن اس پہ آتشِ مے
کرے چھم چھم سرور سے چھاگل
ساحر آنکھوں کا میکدہ چھلکے
چال جیسے کہ جلترنگ بجے
اپنی چُنری پہ یوں ستارے جڑے
شبِ وعدہ میں جیسے وصل کا پل
سرِ قرطاس جیسے حرفِ غزل
چشمِ گلنارِ شوق میں جیسے
لمحۂ خود سپردگی کا کسل

کسی مردِ خدا کی فردِ عمل
اے حسین و عظیم و بے پایاں
جا رہی ہے تو تیز تیز کہاں
(کیوں نہ ہو کامنی کو روپ گماں!)

شب کے دامن میں مُنہ چھپاتی شام!

دلبروں کی طرح لجاتی شام
شرم و شوخی سے تمتماتی شام

تن تنہا اندھیری راہوں میں
یوں دیے کو ہوا سے اوٹ کیے
دیدہ و دل کو لوٹ پوٹ کیے
ایک بے نام خوف سے لرزاں
مات و مبہوت و خیرہ و حیراں
جا رہی ہے تو تیز تیز کہاں؟

اے پر اسرار جھلملاتی شام!
زینہ زینہ اُتر کے آتی شام!
اپسراؤں کے رنگ محلوں کے
گیت دروازے کھٹکھٹاتی شام!
موجِ سیماب کی طرح مضطر
در بدر بھور کو تلاش نہ کر

نارسائی پہ تلملاتی شام
گلہ مندِ کم التفاتی شام
کیوں تو پھرتی ہے اس طرح بیکل،
پاؤں زخمی ہیں پایلیں گھائل

پل دو پل اے خرابِ ذوقِ خرام
کسی چوکھٹ پہ جھک کے کر آرام
اے تھکن کی کتھا سناتی شام
بے قراری سے کسمساتی شام
سُن اگر بھاگ میں ہوا تیرے
تو تِرا آسماں کہیں نہ کہیں
ڈھونڈے گی کوئی سویر تجھے
اے صباحت سرشت نور افشاں
(کون دل سوز ہے کسی کا یہاں؟)
جا رہی ہے تو تیز تیز کہاں؟

کیا تجھے اس لیے قرار نہیں
اس لیے ہے یہ تری تیزیٔ گام
کہ مباداں ہو نہ جائے دیر تجھے!
کوئی اردواح سے نہ گھیر تجھے!
کہاں آتے ہیں ہیر پھیر تجھے!

کُنج در کُنج، سرسراتی شام
خوابوں لے میں گنگناتی شام
سایوں سپنوں کی شال میں لپٹی
جیسے جوگن ہو کوئی لٹ دھاری
یوں اُجالوں کی کھوج میں نکلی
کب تک اپنے تراشں بھٹکے گی؟

اے اندھیرے سے خوف کھاتی شام
رات کے سینے میں سماتی شام
اے طرحدار، رسمساتی شام!
شام اے سانولی سلونی شام
ریشیاں پوش ارغوانی اندام
رنگ کتنے ہیں تیرے کتنے نام۔

خاموشی

کمرِ یار نہ تھی بازوؤں کے حلقے میں
کوئی سانچے میں ڈھلا پیڑ تھا شاید جس سے
بیخودی میں، میں بغلگیر ہوا
پیڑ خاموش رہا

کوئی جنبش کی نہ اس نے کوئی بات
مصلحت تھی کہ وفورِ جذبات؟

خزاں کا چاند

خزاں کا چاند، گئے سال جسکو دیکھا تھا
اکٹھے دونوں نے، پھر آسمان پر اُبھرا
لیے زمیں نے قدم، چاندنی نے کھیت لیا
مگر وہ شخص کہ تھا جو حبیبِ جاں میرا
کبھی کا رسم و رہِ آشنائی بھول چکا
نہ عہدِ رفتہ اُسے یاد ہے نہ عہدِ وفا

○

مانگیں اہلِ قلم آزادیٔ فکر و اظہار
تاکریں ضبط بہ اوراق نقوشِ افکار !

کرشن و موسیٰ پہ تشدد کریں کنس و فرعون
طاقت انساں کو بنائے متکبر، جبّار

خیر و شر میں ہے وہی معرکہ برپا کہ جو تھا
ویشیا کہتی ہے اپنے کو پتی ورتا نار

حال ہم خاک نشینوں کا انہیں کیا معلوم
قصرِ دربند ہے اربابِ حشم کا دربار

ہم فتوحاتِ مدینہ کے ورق گرداں ہیں
رہے ابنِ عربی محوِ مزید و تکرار

ہم اسی علم کے طالب ہیں کہ جو نافع ہے
جو نہ سینے کو اجالے ہے وہ دانش بیکار

جب سے دل حکمت اَلنَّاسُ مَعَادِن سمجھا
اپنے دشمن کے بھلاوے پہ نہ بھولا زنہار

"بازناں حرف زدن" کیا ہے حماقت کے سوا
مسرفانہ نہ لٹا باغِ جوانی کی بہار

کام شکتی کا اہنکار تو دیکھا لیکن
رتی شکتی کی نہ دیکھی کسی جیوٹ میں سہار

مثلِ سقراط ہے نعمان کا مقتلِ زنداں
لائے پیغامِ حیات اس کے لئے سمِّ الفار

جون آف آرک کی مانند جلائیں زندہ
جرمِ اخلاص نہیں مستحقِ استغفار

مختصر نظمیں

ابرِ باراں کو پپیہا ترسے
عاشق نورِ سحر سے سُرخاب
چاند کے جلوے کا دیوانہ چکور
ایک دوجے کے لیے ہم بیتاب

تعمیر ہو رہا تھا محلِ معاویہ !
گزرے جو اس طرف سے ابوذر تو رُک گئے
کہنے لگے : کہ ہے اگر اس قصر کی بِنا
اللہ کے مال سے تو خیانت ہے برملا
ہے اپنے مال سے تو ہے اسرافِ ناروا

شام ہوگی تو میں دروازہ کھلا
چھوڑ کے راہ تکوں گا اُس کی
میرے خوابوں میں ملاقات کا جس
دشمنِ جاں نے کیا ہے وعدہ

صبح نے قافلۂ شب سے کہا وقتِ وداع
عیشِ منزل ہے باندازۂ اندوہِ سفر
کیفیت کوئی بھی ہو عارضی و آنی ہے
عمر ضائع نہ کر اے دل کہ جہاں فانی ہے
صبح کو پھول کھلے شام کو مُرجھا جائے
قربِ میخانہ و ہمسائگیٔ مرقد ہے
ایک پل روشنی پھر تیرگیٔ سرمد ہے
کُنہِ اشیا کو پرکھ ظاہری صورت پہ نہ جا
زہرِ احمر سے گراں تر حجرِ اسود ہے
وہی زندہ ہے جو بار آور و با مقصد ہے

تمام عمر

تمام عمر دلِ خود نگر کی نذر ہوئی

ادھورے خواب ہیں دامن میں ان کہی باتیں
گلو گرفتہ گلے نارسا مناجاتیں
جو لُٹ کے رہ گئیں سینے میں وہ ملاقاتیں
جو کروٹوں میں کٹیں وہ گناہ کی راتیں
بقدرِ شوق کہیں جن کی قدر ہو نہ سکی
وہ ارمغانِ نوا وہ سخن کی سوغاتیں
وہ چشمِ شوق کی چشمک جو ڈر کی نذر ہوئی
رقیب کی نگہِ کج نظر کی نذر ہوئی

تمام عمر دلِ پُر حذر کی نذر ہوئی —
بکار گزری ہے جانے کہ رائگاں گزری؟

نامہ نقش گر اک پیکرِ تصویر کے نام

عمر گزری ہے ، زمانہ بیتا
ایک ہی چھت کے تلے
ہمیں رہتے ہوئے لیکن پھر بھی
نہ مَیں تیرا نہ تو محرم میری
دل نہ آمیز ہوئے جسموں کی آمیزش سے
دِل کی فرہنگ جدا ، جسم کا آہنگ جدا

خضرِ لب تشنہ کنارِ دریا
نہ تو مجھ سے نہ میں تجھ سے گویا
دل کبھی حرفِ ریائی سے تسلّی نہ ہُوا

میرے واسوختہ دل ! مرے برافروختہ دل
ادب آموختہ دل ! آگہی اندوختہ دِل
پردہ تو نے وہ گرایا کہ اٹھائے نہ بنے !
گھونگھٹ آنکھوں نے وہ کاڑھا کہ ہٹائے نہ بنے
بات بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے
بال شیشے میں وہ آیا کہ چھپائے نہ بنے

یہ رفاقت بھی انوکھی یہ محبت بھی عجب!
جس محبت کی عداوت ہے شریک غالب
(دُوری اِک نام ہے شاید اسی نزدیکی کا)

دو لکیریں متوازی جیسے
دھرتی آکاش سے ملتی نظر آتی ہے جہاں
وہ افق کا خطِ موہوم نہیں جس کا نشاں
کہتے ہیں اہلِ نظر جس کو نظر کا دھوکا
کسی پاتر کی طرح، چلبلی چاتُر کے سماں
باہیں پھیلائے زمیں مدھ متی پسپائی میں
چور زخموں سے، مگن لذتِ پیدائی میں
کامنا سے رچے رس بھاؤ کی سرسائی میں
گلِ شبّو سے مہکتی ہوئی پُروائی میں
قوس کی طرح تنی، لوَچ کی تصویر بنی
صنعتِ آذری و شعبدۂ برہمنی
نیلگوں حسن کو آغوش میں بھرنے کے لیے
رُخ برنگِ شفق، آنکھوں میں گلابی ڈورے
من کی چھل بل ڈھلی اعضا شکن انگڑائی میں
کھُلے بندوں کہے: کیا شرم ہے رسوائی میں؛
گرچہ ملتا ہے سکوں عالمِ تنہائی میں!
زندگی شوق کی ہے انجمن آرائی میں
پرنیاں پوش، شب افروز، زلیخا مشرب
بت زرّیں تن و نغمہ گر و کافر مذہب

ارغواں چہرہ و جادو نظر و شیریں لب
کبھی نقشین کبھی ملگجی چادر اوڑھے
کبھی مٹی سے اٹی تو کبھی پھولوں میں بسی
ابھی گلنار ابھی چہرے پہ سرسوں پھولی
کبھی اٹکھیل کرے پریم سدھا سے بے سدھ
کبھی گر گر پڑے برہا سے بیاکل بے خود
جس طرح لوٹے مہاویر کوئی ہار کے یدھ
کبھی واجد علی شاہ اور کبھی گوتم بدھ
کبھی ممتاز محل اور کبھی پاربتی سے!
قرۃ العین کبھی اور کبھی بھاگ بھری
کبھی اک رام جنی کامنی ہردے رمنی
کبھی در پردہ و بے پردہ کبھی گلبدنی
تنگ پوشی کبھی غالب کبھی بے پیرہنی
اس کی طرّاری و تر دامنی —— اللہ غنی
بیٹھنے دے اسے نچلا نہ کبھی نفس دنی
رہے من مست کی دن رات عناصر سے ٹھنی
دھرتی ماتا بھی اسے کہتے ہیں کہنے والے
(پردے آنکھوں پہ پڑے ان کے دلوں پر تالے)
چرخ بھی اس کو ترنگ آئے تو کہتا ہے
(اتفاقی ہے مگر یہ ہر دم و ہارمنی)

عرضِ احوال سے مقصود نہیں دل شکنی
ہے وہی بعد وہی تفرقۂ ما و منی

حسن پہلو میں سما کے بھی گریزاں ہی رہا
شعلۂ عشق چراغِ ترِ داماں ہی رہا
خواب دیوانے کا شرمندۂ تعبیر ہوا؟
اشہبِ وقت کا کیا کوئی عناں گیر ہوا؟
شوق زنجیر ہوا، حوصلہ تسخیر ہوا؟
راستہ تا بہ درِ میکدہ تعمیر ہوا؟
داخلِ بابِ اثر، نالۂ شبگیر ہوا؟
شاملِ دامنِ وطن خطۂ کشمیر ہوا؟

داغِ دل دُھل نہ سکا، چاکِ جگر سِل نہ سکا
دست و بازو ہوئے شل، سنگِ گراں ہِل نہ سکا
واشدِ گُل ہو کہاں، غنچۂ جاں کھل نہ سکا
تجھ سے مل کے بھی ملاقات کا ارماں ہی رہا
دل بایں دولتِ مجموع، پریشاں ہی رہا
تجھ کو پا کے بھی نذر کردۂ حرماں ہی رہا
کر سکی دشت کو سیراب کبھی جوئے سراب؟

دو پڑوسی ہوں قریبی جیسے
خوش مدارات، ملنسار، مہذب لیکن
باہم داد و ستد اجنبی آپس میں رہیں
آمد و رفت برابر ہوں نہ مگر شیر و شکر
حدت و شدتِ احساس سے اعصاب تنے
اور یوں اپنے پرائے کو دکھانے کے لئے ۔

خلق و شائستگی و حلم کی تصویر بنے
(آشنائی میں بھی شعبے ہیں اداکاری کے
دوستی اک باب ہے شاید اسی یکجائی کا)
ایک ذوجے کی لیں کنسوئیاں آمن ہیں کھڑے
کبھی چیمن سے لگے
بالکونی میں، لبِ بام کبھی
کبھی کھڑکی، کبھی دروازے کی اوٹ
کبھی دیوار کے پیچھے چھپ کر
کسی روزن سے کریں جاسوسی
اور محسوس کریں
ایک ناقابلِ اظہار خوشی
لاگ کا جس میں حرارہ ہو تپک، کینے کی
رو برو ہو کے کھلے لفظوں کی
بات کرنے کے روادار نہ ہوں
(یہ لگاوٹ ہی بناوٹ تو کہاں کا اخلاص)
کش مکش چشم و نظر میں کہ مٹائے نہ بنے
راز سینے میں وہ کھٹکے کہ بتائے نہ بنے
وضع کا پاس، تکلف کی بساندی بُو باس
پاس آئے نہ بنے، ہاتھ چھڑائے نہ بنے

اب کھلا مجھ پہ فریب آغوش
انگ سے انگ ملے، تن کی فقط پیاس مجھے
اب کہیں جا کے ہوا علم مجھے
دہر میں نیک و بد و ظلمت و ضو، لحن و خروش

چلتے ہیں دست بدستِ دگرے ، دوش بدوش
منزلیں گردِ سفر میں رو پوش
پیش آہنگ ہے، رہزن کا رفیقِ خورد و نوش
(کرے دو آتشہ وحشت کو شرابِ سر جوش)

اس سے پہلے مجھے تسلیم نہ تھا
قلب و قالب میں بربِ کعبہ
یہ موحّد یہ پرستارِ خدائے واحد!
یعنی میں ——— قائلِ تقسیم نہ تھا

راز یہ دُوری و نزدیکی کا
آج تک قابلِ تفہیم نہ تھا
اُف وہ طوفانِ تمنّا کہ ہوئے جوش و خروش
کفِ افسوس ملیں ، حسرت حاصل کھینچیں
داغ دل نے وہ دیا ہے کہ مٹائے نہ بنے
حاصلِ مشقِ ورق گردانی ———
ایک مجموعۂ بے شیرازہ
نفعِ یک عمرِ گہر افشانی ———
ایک اعصاب شکن خمیازہ

دل یہ دیوانہ ، پُر افشار ، برانگیختہ دل
تپش آمادہ و آشفتہ و آمیختہ دل
ایک سر رشتۂ موہوم سے آویختہ دل
عاشقِ ریختہ دل
دم جو بھرتا ہے تلوّن میں بھی یکتائی کا
نہ ہوا دوست ستمگر کسی ہرجائی کا
دیکھ کر رنگ خود آرائی و خود رائی کا
نکتہ چیں گو نہ بنے چشمِ تماشائی کا
کلمہ اب نہ پڑھے گا تری رعنائی کا

سوال

بہار آئی
مشامِ جاں کو خوشبوئے نگار آئی
در و دیوار پر بیلوں نے تانی لہریا چلمن
بھرے پھولوں سے خوبانِ چمن کے شبنمی دامن
ہوائیں گنگناتی ہیں بجاتے ہیں درخت ارگن

کراں سے تا کراں شاداب فصلیں لہلہا اٹھیں
تشکّر سے نگاہیں ڈبڈبا کر مسکرا اٹھیں
لکیریں ملگجی پیشانیوں کی تمتما اٹھیں

سرِ صحرا سمن زاروں کا گلزاروں کا منظر ہے
زمیں کا چپّہ چپّہ رشکِ اوراقِ مصوّر ہے
کسانوں کی کٹھن کڑیل مشقّت بار آور ہے
(مشیّت روزِ اول سے اولوالعزموں کی یاور ہے)
بساطِ فرش پر سبزے کی سج دھج روح پرور ہے

زمیں سے نافہ نافہ پھوٹتی مہکار میں کھو کر
جواں جذبات کی ہلچل سے سرمست نوا ہو کر
فضاؤں میں تمہارا نغمہ لہرایا

گرسنہ چارپاؤں نے وہ سبزہ کھا لیا سارا
درانتی کے حسین و تیز دانتوں نے
زمرد فام فصلوں کو چبا ڈالا
بپا ہے غلغلہ ہیمنت رُت کی آمد آمد کا

خزاں آئی
اور آتے ہی لباس رنگ و بو کو نوچ کر اُس نے
چمن کے سبز پوشوں کو سر رہ کر دیا ننگا
(بھری محفل میں خوش قامت ہوئے رُسوا)

زمستاں کی اجاڑ، افسردہ، کہرلی فضاؤں میں
بدن کو چیرتی بے مہر، برفیلی ہواؤں میں
تمہارے آتشیں نغمہ کی مستانہ نوائیں اب بھی ابھریں گی!

متاعِ بُردہ

چنڈی داس کے بول ○

یہ خطا میری ہے

میرے محبوب سراسر یہ خطا میری ہے
دوں میں الزام گرفتاریٔ دل کا کس کو ؟
دوش میرا ہے، کسی اور پہ کیوں بوجھ دھروں ؟
جو ہُوا ہے میرا خود کردہ ہے
کتنی الھڑ ہوں میں، کتنی ناداں !
جس نے مسحور کیا مجھ کو وہ بحرِ نوشاب
جب پیا میں نے تو نکلا زہراب
ہوں دل آزردہ و غمگیں لیکن
کس طرح جانتی میں ؟
جانتی بھی تو اس اُفتاد سے کیوں کر بچتی ؟

گھر مرا، ذات مری
دونوں برباد ہوئے
تم کو اب مجھ سے وہ پہلی سی محبّت نہ رہی
تم سے ملنے کی مگر مجھ کو تمنا ہے وہی

شوقِ دیدار وہی، حسرتِ گلنار وہی
غمِ دُوری بھی وہی
ناصبوری بھی وہی!

کون عورت کو سمجھ سکتا ہے ؟
وہ صنم گر بھی کہ جس نے اسے تخلیق کیا
غالباً دے نہ سکے اس کا جوابِ شافی
زہر و نوشاب ہیں یکجا، گویا !

وہ دیا جو کہ ضیا پھیلائے
اک کرن دل میں ہے روشن اس کے
اور پروانہ جسے عشقِ مجسم کہیے
آتشیں موت سے ہوتا ہے ہم آغوش
لپک کر کہیے
آدمی غلبۂ شہوت میں سفر
منزلِ گورِ غریباں کا کرے

عاشقِ زار مگر
زہر کو چھان کے بکتا رہے
اور تا حشر جیے!

یہ خوفناک محبت! یہ بے بسی میری!
یہ نارسی مری قسمت کی، میرے طالع کو
ہر انتشار کی لیکن سہار ہے مجھ میں
میں ہر کڑے سے کڑا درد جھیل سکتی ہوں

لگاؤ شوق سے دل کو، مگر یہ یاد رہے
ہے پیار کرشن کا گویا پیامِ مرگِ سکوں
گلے میں طوقِ غلامی پڑے تو اُترے کہاں
سرورِ رفتۂ آزادی اب نہ حاصل ہو
رہائی اس سے ملے گی نہ موت سے پہلے
جیو گے جب تلک آسودگی کو ترسو گے

میں چھوڑ دوں اسے، چاہت مگر نہ چھوٹے گی
اُداسی بڑھتی ہے، غم میں اضافہ ہوتا ہے
ہے دل میں ماتمِ یک شہرِ آرزو برپا
محبت اس سے میں کرتی یہ کاش کے کم کم
نظر لگی ہے شکر خند کو زمانے کی
اب آنسوؤں سے عبارت ہے زندگی میری

کیوں کریں گفتگو اس زہر بھری بنسی کی
گھر کے آنگن سے بزورِ آواز
جو گرہستن کو بھگا لے آئے
کھینچ کر بالوں سے لے آئے اسے شیام کے پاس
نہ رہے سحر زدہ کو سرِ مُو
نام و ناموس کا پاس
کشش اس کی کرے اوسان خطا
اسے سنتے ہی وفا کی پتلی

استری اپنے پتی کو بھولے
کھینچے اس تان کی اور
کسی بھٹکے ہوئے لب خشک ہرن کی مانند
ہوش جاتے رہیں اک زاہدِ مرتاض کے بھی
پیڑ پودے بھی اُسے سن کے نہ آپے میں رہیں
تال دیں، ہاتھ ہلائیں، جھومیں
ساری دُنیا کا یہ عالم ہے تو پھر
ایک مجبور سی معصوم سی لڑکی
نہ ہو بے قابو کیوں؟ —

جمنا کنارے کون بجاتا ہے بانسری؟

گوکل جو گوپیوں کا دھنک رنگ شہر ہے
اس کی چراگہوں میں گوالوں کی طرح کون
لہرا کے رسا کے بجاتا ہے بانسری ؟

بھرتا ہے آگ موہ کی میرے شریر میں
رہ رہ کے چھینتا ہے مرے ذہن کا سکوں
کرتا ہے بے قرار اسے اپنی تان سے
اس نامراد نے تو بھلا دی مری سرت
جی گھر کے کام کاج سے میرا اچاٹ ہے
ہر چیز بے ٹھکانے ہے ہر شے الٹ پلٹ
یہ کون ہے ؟ یہ کون بجاتا ہے بانسری ؟

تلاش

میں رات بھر فلک نیلگوں کو تکتا ہوں
دلِ حزیں میں یہ امید و اشتیاق لئے
کہ وہ ستارہ[1] تم آنگن سے دیکھتی ہو جسے
کبھی تو سامنے آئے گا گھومتے پھرتے
کہیں صباح بخیر آسماں کے زینوں سے
اُتر کے جب شفق و شبنم سحر گاہی
تو خوابگہ کی بجھاتا ہوں بتیاں لیکن
کہیں بلانے پہ آتی ہے نیند کی دیوی؟

○

میں ہر دیار و ولایت کے زائر و سیاح
سے جا کے ملتا ہوں شاید کسی نے اچانک
تمہاری خوشبوئے دامن دراز سونگھی ہو
جوان جسموں میں ہوتا ہے مشک و مقناطیس
جو چاندنی کی طرح دل پہ سحر کرتا ہے!
مگر کسی نے بھرا دم نہ آشنائی کا!
جو ہوشیار ہو کیوں رازداں کرے پیدا

○

میں پوچھتا ہوں سحاب و صبا سے دلبر نے
مرے لیے کوئی پیغام تو نہیں بھیجا؟
کہ اگلے وقتوں کے شاعر مزاج عاشق لوگ
ہوا و ابر کو پیغامبر بناتے تھے!
ملن کے رس بھرے دوہے انہیں سناتے تھے
گل آشنا نہیں بادِ صبا ہے بیگانہ!
برہنہ پا پھرے دشتِ جنوں میں دیوانہ

---

[1] اُقَلِّبُ طَرْفِي فِي السَّمَاءِ لَعَلَّهُ   يُوَافِقُ طَرْفِي طَرْفَهَا حِينَ تَنْظُرُ   (جمیل بثینہ)

میں اس خیال سے سڑکوں پہ گشت کرتا ہوں
تمہارے ہونٹوں سے نکلا ہوا کوئی نغمہ
کسی گلی کسی کوچے کے موڑ پر شاید!
ہوا کے دوش پہ سرمستِ ناز مل جائے
مجھے فسردہ و دلگیر دیکھ کر بولے
سخن سرا ہو مگر زندگی سے ڈرتے ہو؟
خدا پرست ہو قسمت کا شکوہ کرتے ہو؟

○

بوقتِ شام ٹہلنے کو جب نکلتا ہوں
تو دیکھتا ہوں پری پیکروں ، گل اندا موں
سمن بروں کو ، مگر یونہی بے نیازانہ
مطالعے کی غرض سے بچشمِ صاحبِ فن
(ہوس کا رنگ ہو اس میں تو ضمناً و سہواً
اٹھائے نازِ جنوں ، دل غریب مجبوراً)
کہ کتنے رازوں کا مدفن ہے کتنی خوشیوں کا
نقاب پوش سلگتی ہوئی سیہ آنکھیں
کنک کنک سے اروج ، انگ ، اگن ، انوپ ابار
سمکھ سروپ سلوچن ، جگر مگر شکمار
لب و نگاہ میں رمز و رضائے بوس و کنار
کہ جیسے آتشِ پنہاں سے دہکے شاخِ چنار

دہانِ تشنہ پکار اُٹھے : اَسقنی خمرًا ![2]
جنوں کہے کہ حریفانہ کھینچ لے دامن
اگرچہ خلدِ نظر ہے بہارِ سرو و سمن
حصارِ دل ہے ہر اک ترکتاز سے ایمن
نگاہِ راز فقط یہ تلاش کرتی ہے
کسی کے خال و خدِ دل نواز میں شاید
تمہارے حسن کا ہلکا سا عکس شامل ہو

یہ آبِ خضر کہاں ، لمعۂ سراب کہاں!

لہ نقش - پستان زن

ٹہ سے پلا مجھ کو

○

محرمِ جزر و مدِ قلبِ عوام
باخدا ہیں ناخدایانِ کلام
پھوٹے کودِ صبر سے صبحِ اُمید
خاک ہو عنبر، معطّر ہو مشام
اجرِ احساں رایگاں جاتا نہیں
مزرعِ نورِ سحر ہے دشتِ شام
"میری اُمّت، اُمّتِ مرحومہ ہے
دوزخِ جاوید ہے اس پر حرام"
زندگی بہجت کی خاطر بیچ دیں
بندگانِ حرص، لذّت کے غلام
روز تا شب، شب ہمہ شب تا سحر
منتظر رندوں کا ہے کاسُ الکرام
گر ہوس ہے تجھ کو مانع کون ہے؟
وا ہے بابِ میکدہ، کر شغلِ جام
بندۂ فن مردِ مسلوب الحواس
لوگ فرزانے کو دیں مجنوں کا نام
آئے دُزدیدہ ملاقاتوں کی یاد
ہائے وہ رنگین و شیریں صبح و شام
جسکے دل میں شک کا گہرا زخم ہے
اس کو دینا اے صبا! میرا سلام

دوستی کا ہے وہ جویا جو خطا پوشی کرے
باز رکھے اپنے ہونٹوں کو دغا کی بات سے
دل کا اطمینان ہے گویا بدن کی زند گی!
روح سرخوش جسم کو شاداب و بالیدہ کرے
بھوگنا پڑتا ہے ہر انسان کو کرموں کا پھل
بے وفا کو بے وفائی کی سزا مل کر رہے
ہر حسینہ ہے دلیلہ وادیٔ سوریق کی!
موہ لے من کو سخنہائے فسوں آمیز سے
انقلابِ دہر دیکھو ہیں وہ خواہانِ وصال
جن کے تن سورج کی آنکھوں سے بھی پوشیدہ رہے
رہزنِ جمعیتِ دل کا سیاست عاریات
اس ہجومِ رنگ و بو میں پارسائی کیا کرے؟
ہر نگارِ آتشیں رُخ پر زلیخا کا گماں
سیکس کی باتیں کرے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے
مرد و زن دونوں قتیلِ احمرانؔ و اصفرانؔ
عشرتِ یک دو نفس کے بدلے انساں بک گئے
ہر کس و ناکس کے آگے جھینکنے کا فائدہ
بے خبر فریاد کر فریاد رس کے سامنے
پرورش خونِ جگر سے کر جبینِ فکر کی
نازِ مہمانِ گرامی کا اٹھانا چاہیئے

شبد سنچیپ[۳] ارتھ بالیا[۴] ہے اعجاز بیاں
صاحبِ فن عمر بھر اس کے لئے کوشاں رہے

شعر کے الفاظ سادہ ہوں معانی دور رس
میں بھی کہتا ہوں مگر ڈرتے جھجکتے جھینپتے

رُوح پیتی ہے مدام تقدیر کے تیروں کا زہر
ہے وہی محرم مرا جو میری تلخی کو سہے
درپئے ہر نابغہ ہے اک مُتخیّل لشکری
خیمۂ گُل موجِ آتشناک صرصر سے جلا
زندگی سے موت کم پیاری نہیں مجھ کو مگر !
زندگی بہتر ہے جب تک زندہ رکھ یارب مجھے

---

[۱] شراب ۔ گوشت [۲] سونا ۔ زعفران ــــ زیور خوشبو

○ سنکھیپ [۳] معانی کثیر (بہت) اور الفاظ کم

خیر الکلام ماقلّ ودلّ ولم یمل

اخراج المعانی الکثیرۃ بالالفاظ الیسیرۃ

ع مرے معانی کی حد نہیں ہے اگرچہ الفاظ مختصر ہیں ۔ (اکبر)

تقریر کا اس کی حال مت پوچھ معنی ہیں بہت و لفظ تھوڑے (غالب)

بیا و حالِ اہلِ درد بشنو ! بلفظ اندک و معنیٔ بسیار (حافظ)

خیر الکلام قلیل علیٰ کثیر دلیل

والعی معنی قصیر یحویہ لفظ طویل

فصاحت آنست کہ درگزارش زبان کج مج نشود و بلاغت آنست کہ معنی کثیر در الفاظ اندک گفتہ شود

کوئے لذت میں ہے آوازۂ شیئاً للہ

تن بہ تسلیم ہیں اربابِ محبت تنہا
کس سے سیکھی ہے فغاں بلبلِ خوش الحاں

محرمِ حیرتِ گل کون ہے شاعر کے سوا

ایسے اِترا کے نہ چل اے صنمِ حشر خرام

جسم پر ناز نہ کر خاک میں مل جائے گا

راہ چلتے کو جوانی تری آوازیں دے

پاسِ پیمانِ وفا ہے نہ خیالِ فردا
تو جسے قتل کرے اسکی دیت ہے نہ قصاص

تو جسے قید کرے ہو نہ وہ تا عمر رہا

بڑھے دزدیدہ نگاہی سے تو بے تابیٔ دل

سحر آنکھوں میں ہے ناگن کی نگاہوں جیسا

اے سہی سردِ خراماں تری منزل ہے کہاں

دوست دشمن ہیں خدا حافظ و ناصر تیرا

باندھ کر عہدِ وفا لوگ بچل جاتے ہیں

چشمۂ ریگِ رواں دیتا ہے اکثر دھوکا

وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں

آنکھ لگتی ہے تو لگنے دے مگر دل نہ لگا
تیری آنکھوں میں کئی بھید بھری باتیں ہیں

دیکھنا ہے اُڑے ان کو نہ ہوا کی چڑیا
جتنے اسرار کے خازن ہوں ضیاع اتنا ہی

بات کی بیچ میں کیسے رہتی ہے سچ کی پڑیا

ہم گنہگار ترے بندے ہیں یارب ہم کو
شرِ لقلق[1]، شرہِ[2] قبقب[3] و ذبذب[4] سے بچا

گونجتی ہے مرے کانوں میں گلوگیر آواز
مجھے دیتا جو تسلی کوئی ایسا نہ ملا

خالد اک مردِ یگانہ ہے رفیعِ حکمت

جس کا ثانی ہے نہ انباز و شریک و ہمتا

اس کی تعریف میں سب متفق اللفظ ہوئے

اس کے سر پر ہے خداوند خدا کا سایہ

اس کے اشعار کو تم مخزنِ اسرار کہو
ہم نے پایا اسے ہر صنفِ سخن میں یکتا

---

[1] زبان نطق [2] حرص بے جا [3] شکم، بطن [4] شرم گاہ، فرج

(

ہر کمینہ عشق کا بھرتا ہے دم
اِک ستم یعنی کہ بالائے ستم
علم کا سیلاب ہے حکمت کا قحط
لوگ کہتے ہیں بہت کرتے ہیں کم
ماورائے فہم ہیں اسرارِ دِل
دل کی سرحد میں خرد مارے نہ دم
ہمتِ فرزندِ آذر ، زندہ باد !
ہے وہی آذر ، وہی بیتُ الصَّنَم
مستی و بے خویشی و وارستگی
سرخوشی کیا —— غازۂ رُخسارِ غم
زندگی کیا —— سعی ہائے نارسا
منزلِ ذوقِ نفس —— دشتِ عدم
نفس کو کرتی تو ہے فربہ مگر
قائلِ دل سے خوشامد بیش و کم
عیب اپنے کس کو آتے ہیں نظر
کھائے دَدْ ، دامانِ مریم کی قسم
ظلم کے بے انت ، بے انداز روپ
پیشوائی جن کو دیتی ہے جنم
کس طرح حاصل ہو اطمینانِ قلب
اے زبوں نخچیرِ دینار و درم

کیوں نہ رہ رہ کے اٹھے طوفانِ درد
کیوں نہ بھڑکے آتشِ غم دمبدم
چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی
دولتِ بیدارِ اقوام و اُمم
کٹ نہ جائے رایگاں عمرِ عزیز
فرصت و صحت کو سمجھو مغتنم
رحم کر اے حسن ہم پر رحم کر
ملک و ملت کی امانت ہے قلم
سینہ ہائے کاغذِ نمناک پر
حرفِ آتشناک کرتے ہیں رقم
ہم درفشِ کاویانی کے امیں
عظمتِ آدم کا لہرائیں عَلَم
ہم تولّائی عوام الناس کے
حجتِ برحق کو رکھیں محترم
ہم نہیں خواہندۂ اسبابِ جاہ
ہم نہیں کارندۂ اہلِ حشم
عِلم و عرفاں کی طلسمی وادیاں
سلسلہ در سلسلہ نا مختتم
فکر و فن دریائے نا پیدا کنار
نرم ، نازک ، ناتواں ، ناوِ قلم

مشرق و مغرب پہ چھانے کیلئے
سمتِ بطحا سے اٹھا ابرِ کرم
سحرِ شب ٹوٹا سحر نے سانس لی
گر پڑے سجدے میں تارے ایکدم
ہو رہی ہے صبحِ آزادی طلوع
کھول اپنے پھاٹک اے یوروشلم
مجھ کو ازبر ہیں حکایاتِ عرب
قصہ ہائے ہند و یونان و عجم
ملہمِ الہامِ شیطانِ سخن
صاحبِ تمثیل و امثال و حکم
محرمِ اسرارِ قرآنِ حکیم
منحمنا کو فقط مانوس تکلم
ہے مری خو بو زمانے سے الگ
اِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ تَکُوْنَ لِیْ لَمَمُ

○

نہ غافل ہو مکافاتِ عمل سے
بدی بوتا ہے کاٹے گا مصیبت
حصولِ آرزو شیریں ہے لیکن
زوالِ سرخوشی مرگِ محبت

نشاطِ کار و کیفِ آرزو سے
دِل زندہ ہے چشمہ سار لذت
مدام آوارگی، صحرا نوردی
ملی عاشق کو مجنوں کی خلافت

مرے اندو نگیں نا مطمئن دل!
تجھے کیا چاہیئے بہرِ مسرت!
عجب عالم ہے افسردہ دل کا
نہ غصہ ہے نہ استہزا نہ نفرت
میں بجھتی آگ ہوں مقسوم میرا
شرنگِ انتظار و زہرِ حسرت

نکلتے ہیں مگر ہونٹوں سے نغمے
گِلہ مندی نہیں کیشِ محبت
کہے زندانیٔ ظلماتِ گیسو
سعادت ہے محبت کی اسارت
ترے چہرے کے دیوانے کو جاناں
نہ کیوں خوبانِ عالم سے ہو وحشت
کفِ داؤد میں فولاد و آہن
دلِ شاعر میں فرہنگ و عبارت
ثریا اور لسندرا خا کہاں ہیں؟
کہاں ہیں شعلہ بافانِ نزاکت؟

طروب و اعتماد و مرغریطہ
بدور و بدریہ، اسماء و عصمت
کہاں لوراکہ، ولادہ، لبا
بھری ہے جن کے ہونٹوں میں حلاوت
نگارِ نوشِ لب، ماہِ قصب پوش
بنفشہ جعد، گُل رُخ، لالہ طلعت
وہ عنبر پاش و گوہر پوش ہیکل
خداوندانِ خمر و خواب و خلوت
وہ مذمورِ زبور نوجوانی
وہ نیسانِ خیابانِ محبت
غزالانِ سمن اندام، گلفام
سیہ چشمانِ میگوں، ساج قامت
کہاں وہ قصر حمرا کی بہاریں
وہ عیش و لہو و ناز و جاہ و حشمت

کہاں غرناطہ و اشبیلیہ کے
نگار و نقش و آثار جلالت
عراق و مصر جس کا مہر ٹھہریں
دکھاؤ وہ فردوس خوبصورت
نسیم نجد چلتی ہے ہمیشہ
برستا ہے سدا بارانِ رحمت
جہاں لذریق نے دیکھا عرب کو
وہ جادو کا محل وہ بیتِ حکمت
زمانہ آج تک جس کا ثنا خواں
وہ الکاذر، رواق عیش و عشرت

پریزادیں کریں باغوں میں سیریں
نگاہوں میں فسون و انس و وحشت
سراپا دولتِ بیدار مستی
مجسّم رنگ و رامش، نور و نکہت
نواسنج جہاں گرد اندلس کے
وہ بے گھر تیرہ شامانِ محبت
جھروکوں میں کھڑے معشوق رعنا
شہابی، دودھیا، مرمر کی مُورت
سُنیں طنبور سے رومان و دستاں
کریں تمثیل میں اظہارِ اُلفت
مغنّی کی نوا میں گونجتی ہے
حدی خوانوں کے لہجے کی حلاوت
سلونا پن ملیحانِ عرب کا
وہی سنولائی سنولائی سی رنگت
سفینہ موجِ دریا کو بنا کر
جو چل نکلا پئے سیر و سیاحت
کھڑا اِک پیڑ سے کرتا ہے باتیں
ہے یہ بھی سوختہ جانوں کی عادت
کرے ابرِ بہاری تجھ کو سیراب
ہے تو بھی سرکشیدہ میری صورت
غریبِ شہر تو بھی اور میں بھی
خلش ماضی کی رنج و درد فرقت
یہیں اب تازہ نخلستاں اگیں گے
رگ و دل سے نکالیں خارِ حسرت
یہی کوہ و دمن دریا و گلشن
کریں گے تا قیامت اب ضیافت ۔

یہی وادی ہے جولانگہ ہماری
یہیں اب مستقل کر لی سکونت
بدارت ابتدا تھی جس سفر کی
اسی کی انتہا ہے یہ حضارت
کریں تازہ بتازہ نو بنو کے
ہمیشہ جستجو مردانِ ہمت
سفینوں کو یہیں طارق نے دی آگ
یہ خاکستر نہیں ہے خاکِ جنت
نکالو مطلب اپنا دخترِ رز سے
تمہیں کیا ہے اگر خطرے میں عزت
ہوئے معزول اربابِ معانی
سفاہت ہے سریر آرائے عظمت
ورق جمعیت دل کے پریشاں
چلی قشتالہ سے بادِ نحوست
جلی قندیل ترسا مسجدوں میں
بجھی ہسپانیہ میں شمعِ وحدت
بنے بیغولۂ جغداں وہ گوشے
جو تھے نزہت گہِ حورانِ جنت
ہوا نامِ مسلماں محو و منسی
کبھی ان کی نہ تھی جیسے حکومت
ہے قدرِ خیر و شر منجانب اللہ
مقدر کا نوشتہ ہے یہ نکبت
ہے گردش بخت کی ہوتا ہے یونہی
کبھی مسند کبھی فرشِ مذلت
مزاجِ بادشاہی ہے وفائی
یہ ہرجائی ہے طوعِ عزم و ہمت

ہزار حور لقا ہو ہزار مہ سیما !
اگر یہ حسن ہمارا نہیں تو ہم کو کیا

نہیں ہے میری محبت جواب کی طالب
کہ سوز و ساز تمنا ہے آپ اپنا صلہ

عروسِ فن سے اگر شوق ہمکناری ہے
اتار و جامۂ پرہیز و خرقۂ تقوےٰ

میں مثل تاروں کے شب بھر سفر میں رہتا ہوں
میں منتظر ہوں مگر انتظار ہے کس کا

زباں ستائشِ پروردگار کرتی ہے !
دلِ عزیز ہے مشغول شاہدِ رعنا

حیا سے عارضِ شاداب تمتمائے ہوئے
لبوں پہ موجِ تبسم شراب آلودہ

بدن کی جوت سے روشن تھی رات دن کی طرح
ہے نقش دل میں وہی صحبتِ شبینہ کا

عمل، خیال، محبت سے بڑھ کے کیا دولت
فقیر ہیں پہ نہیں بے نوا و بے مایہ

جھلک ہے شرک و تعلّی کی قم باذنی میں
جو با خدا ہیں وہ کہتے ہیں قم باذن اللہ

کنارِ بحرِ خودی ہے سرابِ فکر و نظر
جو دل میں غوطہ لگایا تو آشکار ہوا

اطاعتِ نبیؐ پاک ہے اطاعتِ حق
ثنائے احمدِ مختار ہے ثنائے خدا

ھم

ہم اَلْبیرونیؔ عصرِ رواں ہیں ! رہینِ خانہ و بے خانماں ہیں
اَیازؔ و غزنویؔ دونوں کے محرم سکوتِ گُل، عنادل کی زباں ہیں
عُبَیدُ الظّاہر ، اَحْرَارُ البَوَاطِن گدائے راہ ، میرِ کارواں ہیں
لگاوٹ باز، عاشق تن مگر پاک نہاں معنی میں، لفظوں سے عیاں ہیں
اگر دیکھو تو ہر محفل میں شامل اگر ڈھونڈو تو بے نام و نشاں ہیں
قتیلِ جلوۂ تشبیہ و تمثیل ہلاکِ غمزۂ حرف و بیاں ہیں
نہیں عرضِ ہنر کا ھم کو ہَوکا فقط سوزِ دروں سے نغمہ خواں ہیں
غنی بخشش و کم داد و ستد سے خزف چُنتے ہیں لیکن دُرفشاں ہیں
بڑی نعمت ہے بے برگ و نوائی سرو ساماں لُٹا کر شادماں ہیں
غمِ ذاتی سے ہیں آزاد ہر چند مگر زندانیٔ فکرِ جہاں ہیں
ہمارے ہم قدح بُوذرِ غفاری اَبُوبکرؓ و عُمَرؓ پیرِ مغاں ہیں
اُولُوالعَزمی میں تَخَیُّل کو کہیں فرد بقدرِ ہمت اس کے ہمعناں ہیں
کریں سلطانِ جابر کی نہ بیعت ہم ابلہ دُشمنِ ھر قہرماں ہیں
ہر اک جابر کے آگے سرکشیدہ ہر اک بے دست و پا کے پاسباں ہیں

جفا کو مژدۂ مرگِ مفاجات   وفا کو یادِ یارِ مہرباں ہیں!

(اُفق پر یہ اندھیرے کے پھریرے   چراغِ آخرِ شب کا دھواں ہیں)

تکبّر کے لئے سنگِ فلاخن!   خودی کے واسطے سنگِ فساں ہیں

ہے سنگِ پارس قبضے میں ہمارے   زرِ داغِ دلِ افسردگاں ہیں

ہنرمندوں کی لاچاری پہ نالاں!!   بظاہر گرچہ بے آہ و فغاں ہیں

خداوندانِ بحر و بر سے پوچھیں   (نگاہیں بے زبانوں کی زباں ہیں)

کٹی عمرِ عزیز اندوہ و غم میں   ہمارے حصّے کی خوشیاں کہاں ہیں؟

صِلہ فن کار کا اجرِ ستمگار   زوالِ فن کے نوحہ خواں کہاں ہیں؟

علی بابا سے پوچھو رازِ سم سم   ہم اُجڑے معبدوں کے سوزخواں ہیں

نوائے یرمیا کانوں میں گونجے   دل و جاں محوِ ذکرِ رفتگاں ہیں

کریں میران و مرجینا کی باتیں   حقیقت آشنائے داستاں ہیں

لبِ اظہار بخشیں وسوسوں کو   بلیس و سامری کے ترجماں ہیں

مثالِ ماہِ کنعاں نور افشاں   زلیخا کی طرح آتش بجاں ہیں

کبھی بزمِ یقیں میں میرِ مجلس   کبھی آوارۂ دشتِ گماں ہیں

کبھی حمد و درود و ذکر و تسبیح   کبھی لب پہ حکایاتِ مغاں ہیں

کریں سرگوشیاں کرّ و بیاں سے   شریکِ بزمِ نازِ حوریاں ہیں

اگرچہ رہنے والے ہیں زمیں کے   پہ رمّازِ رموزِ آسماں ہیں

اجل سے رات دن دست و گریباں

نظرگاہِ حیاتِ جاوداں ہیں!

ایک سوال

صرصرِ وقت سے جب مشعلِ دل بجھ جائے
کیا مرا فن بھی مرے ساتھ ہی کھو جائے گا
مرقدِ خاک میں سو جائے گا
یا جِلا بخشے گا ایام کے ایوانوں کو

لوگ آتے ہیں تڑپتے ہیں چلے جاتے ہیں
ان کے بعد آتے ہیں جو لوگ پرکھتے ہیں انہیں
یا انہیں قعرِ مذلت میں گرا دیتے ہیں
یا انہیں رفعتِ افلاک عطا کرتے ہیں

دیکھیں اس محنتِ خود سوز سے کیا حاصل ہو
بیٹھے بیٹھے کبھی دل میں یہ خیال آتا ہے
ہم مریں جذبۂ تخلیق بھی مر جائے گا
یہ مگر خام خیالی ہے دلِ ناداں کی

پھول مرجھاتا ہے اک، غنچے کئی کھلتے ہیں
کبھی رکتی نہیں امواجِ یمِ کون و مکاں
بوڑھے جاتے ہیں جواں آتے ہیں!
خاک اڑتی ہے، بہار آتی ہے

ہر گھڑی خاک میں ملتے ہیں کئی بطلِ عظیم
تپشِ کار وہی اور وہی رنگِ جہاں
کارواں رہتا ہے لمحاتِ گریزاں کا رواں
ایک طوفانِ بلاخیز ہے سیلابِ حیات

جس کے گرداب میں غلطاں پیچاں
خس و خاشاک کی صورت ہم تم
فردِ واحد کی اس آشوب میں قیمت کیا ہے!
نقشِ گل کی بیاباں میں حقیقت کیا ہے!

کریں تو کس سے کریں بخت نارسا کا گلہ؟
جو کچھ ربیع میں بویا خریف میں کاٹا
معاملات تو بنتے بگڑتے رہتے ہیں
جو ڈر کے موت سے بھاگا شکار مرگ ہوا
قتال گہ میں ہمیشہ ببول اگتے ہیں
حسد کی آگ میں جلتے ہیں سارے ہم پیشہ
جسے عطا ہو مقام سکوت و اطمینان
کرے نہ شور انا الحق سے عشق کو رسوا
کوئی گنہ نہیں تیرا بجز وفاداری
اے ارجوان![1] ہلاکت ہے مخبری کا صلہ
ہمیشہ دکھ کے دشنیت کو جھیلے الٹر
شکنتلا کے کف پا میں درب کا کانٹا
نگاہ سے سخن راز کہہ گئی مشاید
نہ دوسروں کی زمیں پر بنا تو گھر اپنا
گلوں کے میت نہیں بھونرے رس کے لوبھی ہیں
فغان بے خودی و آہ ناشنا نہ کیا!
شراب ناب پیو سرخ سرخ ہونٹوں سے
سنا ہے حسن بتاں دیرپا نہیں ہوتا

قناعت ہی حقیقت میں ہے میری
امارت دل کی ہوتی ہے نہ زر کی
کیے جا کام اپنا ہو نہ بد دل
فن استغنا و وارستہ مزاجی
چکوری چاند کو پکڑے تو کیسے!
أُلَاقِي فِي هَوَاكَ مَا أُلَاقِي
اچھوتے ہیں ابھی تک ہونٹ میرے
تَعَرَّى مَوْرِدٌ عَذْبٍ زُلَالِ
نگینے ہیں یا طلائی آبگینے؟
أَلَا بِاللّٰهِ قُولُوا. يَا رِجَالِ!
سراپا صاحب شرم و حیا ہے
چرا لیتی ہے آنکھیں وصل میں بھی
ہنسی ہونٹوں پہ آنکھوں میں اشارے
گلابوں کی پھبن کلیوں کی شوخی

---

[1] ہارون الرشید کا غلام جس نے عباسہ و جعفر کی جاسوسی کی۔

رباعیات

جس سینے میں قرآن نہیں ویرانہ ہے
آسیب کا گھر ہے شر کا کاشانہ ہے
جو دل کے نہیں، تار بدن کے چھیڑے
خالد وہ حقیقت نہیں افسانہ ہے

آزر سے رہے براہیم محو ستیز
فرہاد کو ناکام بناتے پرویز
ہر دور کا ہے سامری و گوسالہ
ہر دور میں ہے فتنۂ کجدار و حریز

حاصل کا ہے گاہے گاہے لاحاصل کا
موجوں کا تلاطم ہے سکوں ساحل کا
غم روح کا اندوہ ربانغمہ ہے
غم سرمدی آہنگ ہے ساز گل کا

پھرتا ہے زباں پہ لب پہ آتا نہیں نام
شاید کہ ہے جذبۂ محبت ابھی خام
ناداں ہے لکنت کی دلیلِ عرفاں
جب عقل تمام ہو تو گھٹ جاتے کلام

دنیا میں جہاں دیکھو وہاں غم غم غم
ہر شخص کے ہے وردِ زباں غم غم غم
اس زہر کو مشکل ہے پچانا ، لیکن
تخلیق کی ہے رُوحِ رواں غم غم غم

اک بار جو کہہ دو اس کے پابند رہو
سہنی پڑے تکلیف بھی اس میں تو سہو
کرتے ہیں جواں مرد وچن کا پالن
کذّاب و دروغ گو کو نامرد کہو

ہم حیلے بہانے دل کو بہلاتے ہیں
سائل کو سوالات میں اُلجھاتے ہیں
خواہش ہے مگر حرص نہیں آنکھوں میں
پانی پہ اُترتے نہیں منڈلاتے ہیں

عکسِ تحریر



عبدالعزیز خالد

اپنی لفظوں سے نہ تم

اپنی لفظوں سے نہ تم
جن سے تم نے مجھے مسحور کیا
مجھے دیوانہ بنایا، مجھے مجبور کیا
دے کے احساس مجھے اپنی زلیخائی کا
اپنی تقدیر رسا پر مجھے مغرور کیا
ساغرِ بادۂ سرجوش سے مخمور کیا

اپنی لفظوں سے نہ تم
اب کسی اور سے اظہارِ محبت کرنا
اپنی لفظوں سے نہ تم
اب کسی اور کو تلقینِ بغاوت کرنا
اپنی لفظوں سے نہ تم
اب کسی اور کو وقفِ غم و حسرت کرنا!

ماؤزے تنگ

باوجودیکہ دل و جاں سے مسلماں ہوں میں — ماؤزے تنگ کی عظمت کا ثنا خواں ہوں میں
اس کے افکار سے تو بحث نہیں ہے مجھ کو — اس کے کردار پہ انگشت بدنداں ہوں میں

پیکرِ حلم، پہاڑوں سے زیادہ محکم — اس کی عظمت کا سبب پوچھتے ہو کیا مجھ سے ؟
اس نے سیراب کیا دشت کو بادل کی طرح — پانی اپنوں کے لیے آگ تھا غیروں کے لیے

خیر ہر چیز میں ابنائے وطن کی مطلوب — جتنے منصوبے تھے اس کے، تھے طویل المیعاد
لگنِ شمع میں دیکھو پرِ پروانہ کے ڈھیر — کون کہتا ہے نہیں خانۂ احساں آباد ؟

کاٹ دی سوزِ نفس کے دمِ پُر صیقل سے — اس نے افیونیوں کے خوابِ گراں کی زنجیر
کچھ بھی کھٹکا نہ تھا اغیار کے کہنے کا اسے — کیا چُنے اونٹ کٹاروں سے کسی نے انجیر ؟

پہلے پت جھڑ کی ہواؤں کو کیا ملک بدر — پھر بہاروں سے کہا : آؤ قدم رنجہ کرو !
کارخانوں کی مشینوں کو نہ زنگانے دو — کھیتوں کو فصل سے کھلیانوں کو دانوں سے بھرو

سرحدیں چین کی لاچین پہ کیں اس نے بند
شہر کے ننگوں میں در آیا عجب احساس وقار
ایک انبوہ پراگندہ بنا قوم مساً
ہوں جو خود گروہ پہنچتے ہیں اترن برتن

سر پہ ہو خاک وطن آنکھ کا جب بات بنے
خشک ریگیں پر پرواز کو دریائی پرند
کھیل بچوں کا ہیں پرورش حبّ وطن
ان کے انداز کو کیا پائیں گے مرغانِ چمن !

بھوک میں صبر کرے شکر کرے سیری میں
کام سے کام تھا اس کو نہ ہوس اس میں نہ لو
"لانگ مارچ" اس کا سناتا ہے کہانی اس کی
اس کا سرمایہ یہی بے سروسامانی تھی

اس کو ایام و تواریخ نے بتلایا یہ :
جب تک اسوہ نہ ملے لوگ نہ سانچے میں ڈھلیں
قوتیں آنکھوں سے بنا کرتی ہیں کانوں سے نہیں
شاہد اس بات کے دونوں یہ زمانہ یہ زمیں

تلمی سب کھول کے دو رنگی کنفیوشس کی
ایک ہی سب کو سبق جہدِ مسلسل کا دیا
لینن و مارکس کے مذہب کو بڑھایا آگے
تاکہ انسانوں میں جو فرق و تفاوت ہے مٹے

جارحیت کو وہ توہین بشر کہتا تھا
عملاً اس نے کیا اہل جہاں پر ثابت
جرس قافلۂ امن تھا وہ زمزمہ گر
ہیں کوئی عمل، اخلاصِ عمل سے بڑھ کر

ہم نے اس پردۂ دنیا پہ بچشمِ نگراں
اک ترے لوگوں کے کتنے ہی پیرت دیکھے ہیں
ایک کر کے تو دکھائیں دُوئی ذات و صفات
مدعی ورنہ نبوت کے بہت دیکھے ہیں

ہاتھ ظالم کے کٹے، سائے ستم کے سمٹے
تھے جو اندھے وہ سوجاکھے ہوئے گونگے گویا
اس کی شکتی تھی مہان، آدمیوں میں انسان
ایسا انسان جو صدیوں میں کہیں ہو پیدا

کیا کہو اس کو کہو گر نہ قرانِ سعدین
دستِ آزر بھی ملا اس کو یدِ بیضا بھی
شان یہ آدمِ خاکی میں کہاں دیکھی تھی
چیز پیش بیں کی اس نے خداوندی کی

گرچہ انکار کیا اس نے کئی چیزوں کا
لیکن انکار میں اقرار چھپا رہتا ہے
ہے قوانینِ طبیعی سے بغاوت مشکل
کفر کے گھر میں بھی جھانکو تو خدا رہتا ہے

کر گیا سوئے فلک روئے زمیں سے پرواز
کیا ستاروں میں بھی ہوگی کوئی دنیا آباد ؟
میں دعا اس کے لیے کیا کروں؟ کس منہ سے کروں ؟
ایک اعجوبۂ عالم تھا وہ، پائندہ باد !

٥

اے بہار رنگ و رامش اے نگار شوخ و شنگ! — تیرے ہونٹوں کا نشہ ہے مے، ترے عارض کا رنگ

شامل آہنگِ صبا تیرے خرامِ ناز میں — نغمہ ریز آواز میں زیر و بمِ مردنگ و چنگ

جس طرح سورج کی کرنوں سے کھل اٹھتا ہے کنول — تیرے دیکھے سے یونہی بجتا ہے دل کا جلترنگ

مرگ نینی کامنی من موہنی گج گامنی — شعلہ رخ شمشاد قامت نوش لب شاداب رنگ

سوختہ ساماں ہے تیرا لالۂ خونیں قبا — اے بہ فوجِ فتنہ ہا غارت گرِ ناموس و ننگ

سانولا مکھڑا رسیلی لٹ بٹی البیلی چال — شعلہ ہائے زیرِ داماں سے دہکتا انگ انگ

کس سے سیکھی تو نے خوئے وحشت و بیگانگی؟ — کس نے شہد آلود ہونٹوں میں بھرا زہر و شرنگ؟

کربِ پیمانِ وفا کا ہو تجھے احساس کیا — تو نے دیکھی ہی نہیں تکلیفِ دستِ زیرِ سنگ

اے نکو محضر نہ کر خالدؔ سے یوں صرفِ نظر
قطب الاقطابِ ولایاتِ سخن ہے یہ ملنگ

بدم خرام وہ جیسے ہوا پہ چلتی ہے

o

سرو کو کرتی ہے شرمندہ نزاکت اس کی

o

موت کی مشعل ہوئیں تلواریں

o

وقت مغلوب کر سکے مجھ کو

نہ بڑھاپے کا زور مجھ پہ چلے

o

مردوں کو بے وقوف بناتی ہیں عورتیں

o

باپ کے خیالوں کا

اور ماں کے گیتوں کا

میں امین و وارث ہوں

یہ مرا تشخص ہے

o

اک شعلۂ لرزاں ہے مرا دل خالد !

مجھے درکار ہے گرمی ترے محبوب ہاتھوں کی

o

خامشی کی بھی زباں ہوتی ہے

o

اک حرفِ ناگفتہ نے کیا مجھ کو پریشاں

o

سر بعض کے قلم ہوں اور بعض کی زبانیں

o

کبھی سوار کو گھوڑا گرا بھی دیتا ہے

o

چلے زمانے کے نقشِ قدم پہ ہر بیٹا

o

روح کی پیاس کہاں کھوکھلی باتوں سے بجھے !

o

ریت کے محلوں کی مانند مرے خوابوں کو

تو نے مسمار کیا !

خالق نے مرے حسن پہ لکھے تھے کبھی شعر
تم شاید جوانی میں بہت یاد کرو گی!

○

دلوں میں فاصلے قرنوں کے لب سے لب پیوستہ

○

لوٹے گی کبھی رُت اسپِ رفتہ پھر آئے گی؟
بوسیدہ ہڈیوں میں دوبارہ پڑے گی جان؟

○

چٹکا تھا غنچہ بس کھلنے کے لیے

○

وقت کو باتوں میں برباد نہ کر

○

تمہارے نام سے منسوب ہیں مرے نغمے

○

کہاں ملتا ہے مرہم دردِ دل کا؟

دل مرا ملک و امانت ہے زمینِ پاک کی

○

تم مرا نا تمام نغمہ ہو

○

مرے بوسوں کی تیز و تند شراب
اچھلے اس کے پیالۂ دل سے

○

ننھے بچوں کے لیے
پھول مرجھائیں نہ سورج ڈوبے

○

تابِ اخفا ہے آوازِ محبت سے کسے؟

○

نگاہ دل میں اترتی نگہ ہلاک کرے

○

جو مہک ہے مشک میں سب اس کے پیراہن کی ہے

دل آنکھ کے پھندے میں الجھ جاتا ہے

٥

واکرے شرما کے جب وہ مرقعا بند قبا

رسنائیں ہاتھ سینے پر پھیلنے کے لیے

٥

ابھی جوان ہو سود و زیاں سے بے پروا

ابھی تجربہ نہیں تم کو بہت سی باتوں کا

٥

ہر شخص کو یہ زعم ہے میں راست باز ہوں

٥

برداشت محبت کو رقابت کی کہاں؟

سرِ قلم موسم گل کا ہے قلم خالد کا

٥

کرو کام اپنے، اپنے ہاتھوں سے

٥

اہل جہاں ہیں اک نئے نغمے کے منتظر

بے قلم تلوار اس تلوار کو صیقل کرو

٥

وقت دعا ہے اب تو، جو ہونا تھا ہو چکا

٥

حرف ناگفتہ کی لذت کو کروں کیونکر بیاں؟

٥

کہوں کیا کیفیت محبت کی

آب حیواں بھی زہر قاتل بھی

موج طوفاں بھی سنگ ساحل بھی

٥

کرو میرا محاسبہ لیکن

یہ نہ بھولو محاسبہ کہ میں ایک

خاکی انسان ہوں فرشتہ نہیں

٥

ہے جذبہ کوئی برتر، حب وطن سے بڑھ کر؟

٥

میں امر، ہر آنے والی نسل کا ہمعصر ہوں

نبی خضری

ہ

کہیں کوئی نہ کوئی نت ہماری راہ تکتا ہے
نجانے کس جگہ کوئی ہماری راہ تکتا ہے
کہیں پر کیا کوئی پھر سے ہماری راہ تکتا ہے ؟

بالآخر ختم ہو جاتے ہیں لمبے دن جدائی کے
لبوں سے گرم لب پیوست ہوں طغیانِ مستی میں
وفورِ سرخوشی میں پیش بچھڑے یار یاروں سے
کہیں پر راستے اک دوسرے کو قطع کرتے ہیں
کہیں پر ہاں کوئی پھر سے ہماری راہ تکتا ہے !

مایا کوفسکی

o

ٹکرا کے روزمرہ کی بے کیف زیست سے
کشتی ہوئی ہماری محبت کی پاش پاش
آپس کا بے حساب تھا بیباق ہو چکا
کیا فائدہ ہے اب غم باہم کے ذکر کا
جو ایک دوسرے کو لگائے وہ ضرب و زخم
ان کو شمار کرنے سے اب کیا حصول ہے؟

تم بھی سو چکی ہو گی
یا مری طرح بیکل
کروٹیں بدلتی ہو؟

o

ہستیٔ روح کی ہے ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ؟
مرورِ وقت سے کیا یہ بدن نہیں گھستا؟

o

جذب باہم کا سفینہ نذرِ طوفاں ہو چکا
رات ڈھل چکی ہے اب
ایک کا عمل ہو گا

o

مری نگاہ نے دیکھے ہیں گلبدن ایسے
کہ شاعروں سے جو دیوانہ وار عشق کریں

ایگزنڈر بلاک

o

پرانی داستانوں کی مہک اس میں سے پھوٹے
ابھرتا ہے مرے ہمدم کا چہرہ جام مے میں

o

مجھے سونپے گئے ہیں خفیہ اسرار

o

کہیں میخوار: سچ شراب میں ہے

o

مجھے تباہ کیا ہے شراب و شہوت نے

o

ہے کھیل ختم میری جوانی گزر چکی

o

بے اماں کرب کی گرفت میں ہوں

o

اے خدا اے خدا دیکھ یہ ہے تری مملکت
یہ ہے تخلیق تری !

رسول رضا

۵

میں آج رات بھی پہلے کی طرح سو نہ سکا
علیل بھی نہیں بستر بھی نرم ہے میرا
چھت سے فرش تک اک گہری خامشی طاری
کہ جیسے ایسے ہی سنگین سکوت میں شاید
مرا عزیز ترین دوست الوداع کہے
بغیر ہی سوئے منزل اکیلا چل دے گا
فضا [illegible] دو دم سے کٹے گا رشتۂ درد

یہ سوچ [illegible] زلزلے، تب بھی سر ہو گی
مری تمام حیا[illegible] کی طرح
یہ اور ایسے ہی اندیشہ ہائے دور و دراز
نہیں ہیں میرے اس آزار کا سبب لیکن

ہیں دین اور ہی غم کی یہ رتجگے میرے
جو بار بار مری نیند کو اچاٹ کریں
جو ایک پل مجھے آرام سے نہ لیٹنے دیں
وہ دکھ ہیں اہل زمانہ کے، درد لوگوں کے
وہ درد ہے کرۂ ارض جزو داں جن کا
وہ درد سینۂ گیتی ہے آشیاں جن کا
وہ درد جن کو کسی وقت بھی افاقہ نہیں
میں سوؤں، کیا مرا ان سے کوئی علاقہ نہیں ؟

کوئی ایسا بھی ہے شاعر کہ بخلوت گہِ ناز
اپنی محبوبہ کو جو شعر سنائے اپنے
پڑھ کے کیا اس سے صلہ عرضِ ہنر کا ہوگا ؟
اس سے نغز اس سے حسیں دادِ سخن کیا ہوگی
خود ہو موضوعِ سخن صیرفیِ نقدِ سخن ؟
خود سخن ناز کرے جس پہ یہ رتبہ وہ ہے
ہائے اس شاعرِ خوش بخت کا اقبال و عروج
جس کے دل کی ملکہ سرِ صفحہ مسحور بنی
اس کے اندازِ بیاں کی اثر انگیزی پر
فخر بھی عارضِ گلنار پہ محجوبی بھی
عشق بھی چشمِ جگر تاب میں محبوبی بھی !

O

کہاں ممکن ہے کفّارہ گناہِ بے وفائی کا
شکستِ شیشۂ دل کو رفو ہوتے نہیں دیکھا

دل اپنی سادہ لوحی کے سبب کھاتا رہا برسوں
فریبِ آشنائی اک بتِ بیگانہ پرور کا

تلافی کس طرح ہو اس کی ما ضیّعتُ من عُمری
ملامت خود کو کرتا ہوں اسے میں کچھ نہیں کہتا

گواہی دی کسی نے بھی نہ میری بے گناہی کی
محبت خطرہ بن سکتی ہے میں نے یہ نہ سوچا تھا

ملا ہے حل کہ جس نے یاد رکھا چہرۂ خوباں
دیا اس پیرِ ظاہر بیں کو موجِ رنگ نے دھوکا

میں علّامہ ہوں لیکن مکتبِ بے دانشی کا ہوں
وہی ہے آدمی جو ہو صراحت کی طرح سادہ

بتوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا بینائی گوتم ؟
دیا ذوقِ نظر جس نے دلِ بینا نہیں بخشا ؟

اگر ذوقِ تماشا ہے نگاہِ شوق پیدا کر
ہے دل آئینہ حق کا نَعلَمُ الجَہرَ وَما یَخفیٰ !

۵

دل لگا دلبرِ سیمیں بر سے
سینہ سوزِ مفارقت سے جلے

یوں جھلکتا ہے پیرہن میں بدن
نُور فانوس سے چَھنے جیسے

تحفہ جاتِ طلسم کی مالک
گات ابھری، بھرے بھرے کولہے

اس کے سینے میں دل نہیں اس کو
بُت بلنشا و رُخام کا کہیے

میں نے احرام درد باندھا ہے
بے قراری علی الدّوام رہے

(کام کے ساتھ ساتھ اے خوش کام!
غم بھی لازم ہے زندگی کے لیے)

رگیں تاریں بنیں، بدن طنبور
تار سارنگیوں کے ٹوٹ گئے

یاد کی جوت کلبۂ دل میں
جیسے ویرانے میں چراغ جلے

کون اپنا ہے کون بیگانہ ؟
آدمی شکوہ کس سے کس کا کرے ؟

عورتوں، بادشاہوں، دریاؤں
کو نگہ پھیرتے نہ دیر لگے

سیدھا اپنے ہدف پہ پہنچے جو تیر
دوستی کی کماں سے چھوٹے

دور ہے ضیق و ضمر و ظلمت کا
خیر نے پیٹھ پھیر لی ہم سے

دولت اک ڈھلتی چھاؤں ہے لیکن
گُن گُنی کے ہمیشہ ساتھ رہے

عارفوں کی زباں سے جاری ہوں
پھوٹ کر دل سے چشمے حکمت کے

ظرفِ سینہ کو علم سے جتنا
عمر میں اتنا ہی پھیلتا جائے

میرا رشتہ ترے ہاتھ میں ہے
اے خدا! میری التجا سُن لے

کیوں تہِ آسماں ہوں سرگرداں؟
کیوں ترے راستے نہیں ملتے؟

ہمنوائے لبید و اعشیٰ ہوں
راز دل میں ہیں دفن صدیوں کے

اگلے وقتوں کی بات ہے جب تھا
اٰمرءُ القیس اشعرُ الناس

شعر کا صاحب الزماں خالد
کون ہے خوش نصیب تر اس سے؟

کیبسن کولیسو

٥

ندی میں ایک عورت ننگی نہا رہی ہے
اپنی سنہری کرنوں کی انگلیوں سے سورج
اس کے حسیں بدن کو ہنس ہنس کے گدگدائے
شانوں کو چھُو کے دیکھے چھُو چھُو کے کسمسائے

کرتے ہیں بید مجنوں سایوں کو اپنے لمبا
اس نازنیں کے چہرے کو تاکہ چھُو کے دیکھیں
اور اس کے بازوؤں کی گولائیوں کو ناپیں
نَے خامشی سے دیکھے یہ زرنگار منظر
سب جلترنگ اپنا بھولے ہیں سنگریزے

موجوں میں بے کلی ہے اک آگ سی لگی ہے
نہ موت ہے نہ دکھ ہے نہ یاس ہے نہ شر ہے
نہ سیل ہے نہ طوفاں نہ خوف ہے نہ ڈر ہے
نہ جنگ ہے نہ غربت نہ جیل کی سلاخیں

اطراف میں سکوں ہے امن اور شانتی ہے
ندی میں ایک عورت ننگی نہا رہی ہے
نہ کچھ دکھا رہی ہے نہ کچھ چھپا رہی ہے

تم مرے خواب میں آئے جاناں

میں ڈری آنکھ نہ کھل جائے کہیں!

o

کھلتا ہے گلِ حیات بس ایک ہی بار

o

تعاقب میں ہو تم جس کے پھیلاوہ ہے پھیلاوہ

o

مری ساری گزشتہ زندگی کا ایک ہی

مقصد تھا، یعنی میں تمہیں دیکھوں

ملوں، تن من سے تم میں جذب

ہو جاؤں!

o

دیارِ عشق کی ہر رسم و راہ الٹی ہے

وہ آگ سینے کی، ناکامیِ محبت سے

کچھ اور بھی بھڑک اٹھی بجائے بجھنے کے!

جو تین ہزار سال سے
اپنی تعریف سن رہا ہے

o

کہاں شباب ہوا ہے جلا وطن؟ بولو!
کہاں گئی مرے خوابوں تمہاری شیرینی؟

o

مجھے کلیسا نے کو ہر دم نئے غم آتے ہیں

o

وہ رت خمار کی بوس و کنار کا موسم
وہ رات سحر کی مہتاب کی ترنم کی
جو یاد آتی ہے تو دل میں ہوک اٹھتی ہے

o

خوبان بے لحاظ وفادار تم کہاں!

o

کہاں کسی پہ حسینوں کو غمگساری کی؟

خیالات

خیالات

ممتاز حسین

ہمارے شعرا میں کوئی اور ایسا نظر نہیں آتا ہے جسے عربی، فارسی کے ساتھ یورپ کے قدیم و جدید ادب پر اس قدر عبور حاصل ہو جتنا عبدالعزیز خالد کو ہے۔

مجنوں گورکھپوری

میں اُن کی تخلیقی توانائی کا قائل ہوں جو اردو شاعری میں ایک نئی نوعیت کا اضافہ ہے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ وہ اپنی تمام منصبی اور نجی زندگی کی مختلف مصروفیتوں کی کثرت کے باوجود اس قدر جلد جلد تخلیق کرتے ہیں اور ان کی ہر تخلیق میں ایک ہموار انفرادیت قائم ہے، یعنی کہیں سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ عملی زندگی کی کثیف ذمہ داریوں نے ان کی تخلیقی قوت کو تھکایا ہے۔

رئیس امروہوی

ان کی شاعری اور انداز بیان کا وزن تولنے کے لیے دوسرے پیمانے ناکافی ہیں بلکہ سب سے بڑا پیمانہ خود ان کی شاعری اور ان کا اپنا انداز بیان ہے۔ لفظاً و معناً وہ اپنے عہد اور اپنے سے بیشتر عہد کے تمام شاعروں سے مختلف ہیں اور یہیں سے ان کی انفرادیت شروع ہو جاتی ہے۔ ان کی نظموں کا رنگ روپ اور الفاظ کے ساتھ ان کا برتاؤ بڑا حسین کارانہ اور خوبصورت ہوتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا شاعرانہ مستقبل کتنے عظیم تخلیقی کارناموں سے حاملہ ہوگا؟

میرزا ادیب

عبدالعزیز خالد کے بارے میں بالعموم کہا جاتا ہے کہ یہ شاعر تو اصل میں عربی کے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے عشرہ اشعار میں اردو الفاظ کی پیوندکاری سے بھی کام لے لیتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں اردو کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے کہا ہے کہ "عبدالعزیز خالد کی شاعری ان کے پڑھنے والوں کے لئے معلومات کا اور ہمارے لئے مشکلات کا ذریعہ ہوتی ہے۔" اس فقرے سے خالد کے شعری رویے کی خاص وضاحت ہو جاتی ہے۔ مگر حال ہی میں ان کی جو نظم "مسعود مفتی کی نذر" کے عنوان سے "اوراق" کے تازہ شمارے میں شائع ہوئی ہے، وہ مشتاق احمد یوسفی کے نظریے کی بہت حد تک تردید کر رہی ہے۔ میں نے بہت حد تک کہا ہے اور وہ اس بنا پر کہ خالد کو اس نظم میں بھی تلمیحات کی ایک دنیا آباد ہے۔ تلمیحات کے ساتھ ساتھ نظم ادق الفاظ کی بھی جلوہ آرائی سے محروم نہیں ہے۔ مگر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے عربی لغت سے ذرا ہٹ کر بھی شاعری کی ہے اور جہاں بھی آواز ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے براہ راست دلوں میں پہنچ گئی ہے۔

رفیق خاور

شاعری اس کی دلہن ہے اور وہ اس کا پجاری۔ اس لئے جو بھی متاع نظر و نیاز کوئی عقیدت مند پرستار اپنے معبود کو پیش کر سکتا ہے وہ پیش کرتا ہے۔ عربی، فارسی، ہندی کے بے پایاں الفاظ وسیع علمی تبحر، عالمی ادب کا وافر ذخیرہ، سیر حاصل ذاتی تجربہ اور منفرد ذہانت کے توتموں وسائل ــــ یہ ساز و سامان لے کر وہ شعر و فن کی مہم سر کرنے کو روانہ ہوتا ہے۔

غلبے کی بے پناہ کیفیت شاعر کی جباری و قہاری کی علامت ہے اور در حقیقت یہی استیلا، یہی قدآور اٹھان، یہی شان کبریائی ہے جو اسے ہمارے شعرا میں منفرد و خصوصی حیثیت عطا کرتی ہے۔ وہ کسی کے سامنے لچک نہیں سکتا وہ یہی چاہے گا کہ دوسرے اس کے سامنے لچک جائیں۔

ابن انشا

عبدالعزیز خالد نئی نسل کے شاعر نغز گو و خوش گفتار۔ وہ بہت ذہین اور صاحب مطالعہ آدمی ہیں بلکہ ان کا ایک معاصر کہتا ہے کہ اتنا علم لئے لئے پھرنا انسان ضعیف البنیان کے لئے بڑی ہمت اور خطرے کی بات ہے۔ ان کا یونانی، لاطینی، عربی، عبرانی کلاسکس کا گہرا مطالعہ ہے۔

خالد کا مطالعہ قدیم و جدید ادب کا اتنا وسیع ہے کہ کم لوگوں کا رہا ہوگا۔ ان کے ہاں عربی شاعری کی طنازی اور صلابت بھی ہے۔ یونانیوں کا آئیڈیلزم بھی۔ ڈرامائیت ان کے کلام کا خاص پہلو ہے جو نظم باقاعدہ ڈرامہ نہیں وہ بھی خودکلامی یا تنہا کلامی ضرور ہے ــ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات بھی پھیل رہے ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

خالد نے مناسبتِ مقام کا لحاظ رکھ کر اُردو لفظوں کے ساتھ کئی دوسری زبانوں کے لفظوں کی آمیزش اس خوبی سے کی ہے، کہ زبان کی وسعت میں اضافہ ہو گیا۔ یہ انتخاب و اختلاطِ الفاظ ہر شخص کے امکان میں نہیں ہے۔

حامد اللہ افسر

خالد زندگی کو، محبت کو اور خوشی کو باثر آواز عطا کرتے ہیں۔ وہ رُوح کے مصوّر ہیں، وہ حسن کے پیغمبر ہیں۔

عبد المغنی

اس وقت اردو شاعری میں عبد العزیز خالد کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں جو عصرِ حاضر کی کشمکش سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ابن انشاء

پیارے دوست عبد العزیز خالد کراچی سے لاہور گئے اور اب لاہور سے اسلام آباد میں وارد ہوئے ہیں۔ خیال ہے اب وہیں رہیں گے لیکن بڑی تشویش میں گرفتار تھے۔ لوگ تو اسلام آباد جاتے ہی یہ دیکھتے ہیں کہ راشن کی دکان کہاں ہے۔ سبزی کہاں ملتی ہے۔ گوشت والا کہاں بیٹھتا ہے۔ یہ منہ اندھیرے نکل گئے کہ یہاں کتابوں کی دکانیں دیکھیں۔ ہم نے بارہا کہا ہمارے پاس پہلے ہی بہت علم جمع ہو گیا ہے پہلے اسے خرچ کر لو پھر مزید کتابیں پڑھ لینا۔ ذخیرہ اندوزی ویسے بھی خلاف قانون ہے لیکن عمر کی عادت جاتے جاتے جاتی ہے۔ شکایت کر رہے تھے کہ بھلا وہ بھی کوئی شہر ہوا جس میں کتابوں کی دکانیں نہ ہوں، نئے پرانے ادب کی لائبریریاں نہ ہوں، ہم نے انہیں سمجھایا، سو اس شہر میں جو لوگ اور جس قسم کے لوگ رہتے ہیں ان کو کتابوں سے کبھی کام نہیں پڑتا اور کتابیں ہوں بھی تو ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں یہاں جو شخص آتا ہے اس طرف سے فارغ التحصیل ہو کر آتا ہے۔ بے شک یہاں کچھ لوگ پڑھے لکھے بھی رہتے ہیں مثلاً قدرت اللہ شہاب، ہماری بہن ادا جعفری، ہمارے دوست مختار مسعود وغیرہ لیکن ان کو کتابیں پڑھنے کے لئے کراچی آنا پڑتا ہے، مشاعرے یا دوسرے کا موقع نکالنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

خالد نے اپنا رشتہ عربی شاعری، انجیل اور معبرے الہامی صحیفوں اور ضمیات پر مبنی ڈرامائی شاعری سے جوڑ کر اپنی ڈگر علیحدہ بنائی ہے۔ یونانی اور انگریزی ادب کا مطالعہ بھی انہوں نے لگن کے ساتھ کیا ہے۔ خالد کی شاعری کا میدان بہت وسیع ہے اور انہوں نے علمی اور ثقافتی سرمایے سے بھی اکتساب کرنے کا ہنر سیکھا ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

قاعدہ تو یہی ہے کہ لوگ آتے ہیں ہم ہستی کے ساحل پر کچھ نقوش یا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ مرور ایام کے ساتھ کچھ نقوش مٹ جاتے ہیں اور کچھ دھندلا جاتے ہیں۔ لیکن میری حقیر رائے میں خالد نمبر ایک ایسا نقش ہے جو شاید دہ حیات پر سدا باقی رہے۔

جعفر طاہر

حضرت خالد پر اس لئے لکھا ہے کہ ایک صاحب ایمان و ایقان شاعر عصر حاضر کے حسین الطرفین ..... لوگوں کی کم نظری کا شکار نہ ہونے پائے۔ برادرم فضل من اللہ کو نیاز فقرانہ اور دعاہائے قلندرانہ کے بعد معلوم ہو کہ ہذا من فضل اللہ ——— ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ——— لاجواب اور مستقل ادبی افادیت کا حامل یہ نمبر ہماری زبان کی تاریخ جدید پر ایک سنگ میل ہی نہیں بلکہ نور بن کر جگمگاتا رہے گا۔

ابن انشاء

اپنے دوست عبدالعزیز خالد کو بھی ہم شروع میں پہلوان سمجھتے تھے بعد میں وہ شاعر نکلے۔

ماہر القادری

عبدالعزیز خالد کا مطالعہ اور مشاہدہ دونوں وسیع ہیں۔ جب کسی منظر اور کیفیت کو پیش کرتے ہیں ایک ایک جزئیہ پر ان کی نگاہ رہتی ہے۔ فلسفہ کی بزم ہو، رزم کا میدان ہو، حسینوں کی خلوت اور مجالس اور مرد رنگ کی سبھا ہو۔ خالد ان تمام مناظر کا بیان پورے تلازمہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری لطف انگیز ہی نہیں فکر انگیز بھی ہے۔

جہاں تک تلمیحات کا تعلق ہے اس صنف میں وہ تمام اردو شاعری میں منفرد ہیں۔ کبھی کبھی حسین تشبیہیں اور تلمیحات میں جو اردو شاعری کے قالب میں ڈھل کر سحر حلال بن گئی ہیں۔ ان کی نظموں کا پس منظر اور پیش منظر سمجھنے کے لئے مختلف قوموں اور ملکوں کی تہذیب و تمدن کا مطالعہ ضروری ہے۔

ظ - انصاری

خالد کی شاعری ہمیں بڑی شاعری کے قد و قامت کا اندازہ کرتے ہیں، اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اور ہاں اپنے حوصلے کا اندازہ کرنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ وہ تجربے کی جس بھٹی میں کود رہے ہیں، وہاں دیر تک رہنے والوں کو یاد رہ جاتی ہے یا کشتہ بن جاتا ہے۔

عبدالعزیز خالد ان گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جنہیں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ طبیعت کو ان کے شعر سے لگاؤ نہیں ہو گا تو لاگ ہو گی اور اس سے بھی خالد کی آواز کی اہمیت کھلتی ہے۔

عبادالله فاروقی

خالدؔ صاحب کا جذبۂ حُبِ رسول قابلِ داد ہے۔ ان کا نعتیہ کلام پڑھنے کے بعد فوراً یہ شعر لب پر آتا ہے:

کسے کہ محرمِ بادِ صباست می داند　　　　کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

ابن انشاء

فیروز تغلق نے فیروز اللغات کیوں لکھی تھی۔ کیا ملک الشعراء عبدالعزیز خالد کا کلام اس کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا تھا؟

انور

وہ تنہا شاعر ہیں جنہوں نے اردو شعر میں نہایت سلیقے سے ڈرامہ سمویا۔ عالمی ادب کا انہوں نے بے پناہ مطالعہ کیا ہے ان کی شاعری میں انسان کی عظمت اور شکوہ کا عکس ہے یہ حقیقت ان کو اپنے کرداروں کے لئے پرشکوہ الفاظ تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے ان کے الفاظ کا انتخاب، موضوع کی گہرائی سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔

تسنیم واسطی

محترم گرامی عبدالعزیز خالدؔ معارف پرور، انسان دوست سچے اور بڑے فن کار ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے۔ کہ عبدالعزیز خالد اپنے تبحرِ علمی اور اپنی انسان دوستی کے ذریعے بلند ترین معیار و منصب پر فائز ہیں۔ وہ اپنے معاصرین سے چشمک یا چشمِ حسود رکھ کر نہیں ملتے۔ بلکہ بڑے انسانوں کی طرح خاکساری و سربسادگی کے ساتھ ملتے ہیں۔ اور ؏

نہد شاخِ پُر میوہ سر بر زمین

کی تفسیر ہیں، انہیں کبر و نخوت ایسے مبتذل اور مصنوعی احساسات سے نفرت ہے۔ لفظ و بیان ان کے چاؤش اور بلاغت ان کی چیری ہے۔ انہیں زبان و بیان پر جو قدرت کا ملہ حاصل ہے۔ اس کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے"؟

میں ان کے ایک پُرخلوص نیازمند لیکن سخت گیر قاری کی حیثیت میں یہ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ انہیں ابلاغ کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ یہ شاعر اور اس کے قاری کے درمیان پل صراط ہے۔ جس پر سے سلامت روی کے ساتھ اگر نہ گزرا جائے تو دونوں کے درمیان افہام و تفہیم کا رشتہ مشکل سے قائم رہتا ہے۔

انور سدید

عبدالعزیز خالد کے ہاں شاعری محض فرض کفایہ نہیں بلکہ انہوں نے اس کی کلاسیکی روایات کو تازہ رکھنے اور انہیں نیا فکری عروج عطا کرنے کے لئے عمر عزیز کا بہترین حصہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف فن کے نقوش جاوداں ہی نہیں ابھارتے بلکہ ماضی پارینہ کی عظمت رفتہ کو بھی اجاگر کر ڈالتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

وہ ایک خلاق شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی کے لحنوں کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ متعدد زبانوں کے نبض شناس ہیں اور ان زبانوں کی روایات و تلمیحات کے ذریعے اپنے کلام میں رنگ بھرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

مظہر نیری

عبدالعزیز خالد شاید موجودہ شاعروں میں وہ تنہا شاعر ہے جس نے کبھی لکھنا بند نہیں کیا اور مسلسل مضامین نو کے انبار لگاتا رہا عبدالعزیز خالد کی شاعری کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ ہمارے نقادوں نے عبدالعزیز خالد کو شاید اس لئے قابل اعتنا نہیں سمجھا کہ وہ کسی انجمن یا گروپ سے وابستہ نہیں رہے۔

باقر مہدی

میں ان کی شاعری کے لئے بڑی اور عظیم کے الفاظ استعمال نہیں کرتا اس لئے کہ ایک تو یہ الفاظ کثرت استعمال سے اپنی قدر و منزلت کھو چکے ہیں دوسرے خالد ایک تجرباتی شاعر ہیں جنہیں سعئ پیہم کی عادت پڑ گئی ہے اور وہ محنت شاقہ، فکر بلیغ اور "سوختہ دلی" سے ایک ایسا کارنامہ تخلیق کرنا چاہتے ہیں جو شاہکار کہلایا جا سکے۔ خالد کی شاعری بڑی شاعری کے لب و لہجہ اقدار اور معیار کے مسائل پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور کیا یہ خالد کا ایک کارنامہ نہیں ہے!

انتظار حسین

۔۔ مگر ہم حیران اس بات پر ہوتے کہ یا اللہ ہم تو سمجھتے تھے کہ کراچی میں فیض صاحب کا ڈنکا بجتا ہے۔ عبدالعزیز خالد فیض صاحب سے بھی بازی لے گئے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اب کراچی میں ہر آدمی عربی اور فارسی میں علامہ ہے۔

ایف۔ ایم ساقی

عبدالعزیز خالد کے فن کلاسیکی عظمت کے پرتو کو آپ نے تاریخ کے صفحات کے لئے محفوظ کر لیا ہے وہ فن ادب کا بیش قیمت زاویہ ہے۔ آپ کی مساعی قابل تحسین ہے۔ خدا کرے عوام کا ذہن ایشیٔ فکر کی اس ضرورت کا قدر دان ہو سکے۔

جمیل جالبی

کتابیں رسالے پڑھنا میرا واحد مشغلہ ہے۔ ابھی کچھ عرصے سے عبدالعزیز خالد کی صحبت میں "یوگا" کا شوق پیدا ہوگیا ہے۔ صبح کو تھوڑا سا وقت اس دلچسپ اور مفید مشغلہ میں بھی لگاتا ہوں۔ اس کا اثر بحیثیت مجموعی صحت پر بہت اچھا پڑتا ہے اور اس سے کام کرنے کی قوت میں اضافہ ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ صبح کو کام کرنے کی قوت میں اضافہ ہوا ہے۔ صبح کو کام کرنے کے لئے صحت بہت ضروری ہے اور دیبوں کو جن کی زندگی غیر مرتب ہوتی ہے تھوڑا سا وقت "یوگا" میں ضرور صرف کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر محمد حسن

حال میں نظم میں ڈرامائی اہمیت پر بھی توجہ ہوئی اور منظوم ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں اور شاعروں نے نظم کی اس حیثیت کو بھی پہچانا ہے جسے ٹی ایس ایلیٹ نے شاعری کی تیسری آواز بتایا تھا یعنی خود کلامی اور تخاطب کا انداز اختیار کئے بغیر نظم میں خارجی زندگی کی عکاسی۔ اسے ڈرامے کی شکل میں سب سے زیادہ کامیابی سے برتا جا سکتا ہے۔ عبدالعزیز خالد کے منظوم ڈرامے اور افسانوی طویل نظمیں ایک عظیم ابتدا کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

جدید شاعری کی ظلمتوں کے بطون میں سے خالد کی شاعری کا آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ جدید ترقی پسند شاعری کے خلاف خالد کی شاعری کا سارا تارو پود دین قیم کے اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار سے تیار ہوا ہے۔ تخیل میں بجائے ژولیدگی اور انتشار کے ایک تسلسل، قطعیت اور مقصدیت ہے۔ ابلاغ اس کا نمایاں ترین وصف ہے۔ وہاں ابہام، اغلاق اور تعقیہ اس بلا کا ہوتا ہے کہ سررشتۂ مضمون کو پکڑنا آسان نہیں۔ اور یہاں تلمیحات اور تضمینات کی وہ بھرمار ہے کہ قاری جب تک علامہ نہ ہو پورے کلام کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور اس بنا پر خالد سے بھی لوگوں کو وہی شکایت ہوسکتی ہے جو ایک زمانہ میں غالب سے سخنورانِ کامل کو ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ جس طرح غالب کی شاعری نے نقطۂ عروج پر پہنچ کر خود ہی "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کا حل پیدا کر لیا تھا، خالد کی شاعری بھی وقت آنے پر ایک ایسا نہج اختیار کرلے گی جو اسے عوام کے قریب کردے گی۔

غلام احمد پرویز

وہ جگہ جگہ قرآن مجید کی آیات اور آثار کو اپنے مصرعوں میں یوں جڑتے ہیں جیسے انگشتری میں نگینہ

ٹی پال منل

جناب عبدالعزیز خالد ہندوستان اور پاکستان کے مشہور شاعر ہیں اور ادبی حلقوں میں ان کا نام بڑی عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اردو شاعری کی علمی سطح کو بلند کیا ہے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بے حد وسیع ہے اور مختلف قدیم و جدید تہذیبوں کے علم و ادب اور ان کے اساسی تصورات پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی اسی علمی بصیرت نے ان کی شاعری کو وہ وزن و وقار عطا کیا ہے جس میں ان کا کوئی ہم عصر مشکل ہی سے ان کا شریک ہو سکتا ہے۔

ریاض احمد

عبدالعزیز خالد کی قوت شعر گوئی اور سرمایۂ لغت حیرت انگیز ہے۔

اظہر جاوید

وجہ کائنات، فخر موجودات، شافع دوجہاں، سرور کون و مکاں، رسول خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کی محبت اور عقیدت میں عید میلاد النبیؐ کی تقریبات بہت شان و شوکت سے منائی گئیں۔ اہل دل شعرا نے بارگاہ رسالت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور استاد بیل آگروی سے لیکر اس عہد کے شاعر اعظم عبدالعزیز خالد تک نے نعت شریف لکھیں اور کئی تقریبات میں پڑھیں۔

ڈاکٹر محمد یعقوب

سرمایہ دار الفاظ و معانی شہنشاہ ادب و شعر محترم المقام عبدالعزیز خالد ـــــ اللہ تعالیٰ نے عشق رسول اور نعت رسول کی برکت میں ہی شاید آپ کو ادب اور معانی کا وہ بحر ناپیدا کنار بخش رکھا ہے کہ جس میں غوطہ زن ہو کر آپ ایک سے ایک بہتر اور انمول نگینہ حاصل کر کے اپنے زیور ہائے شاعری کو مزین اور مرصع کر سکتے ہیں

غازی صلاح الدین

عبدالعزیز خالد بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں انہوں نے یونانی اور عربی زبانوں کے کلاسیکل ادب کے سرمائے سے اردو زبان و شاعری کو مالا مال کیا ہے۔ ان کی نئی کتاب "فارقلیط" پر انہیں ادبی انعام دیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پُرانوار سے متعلق ایک نیا منظوم ہدیۂ عقیدت ہے جس میں اسلامی فلسفۂ اخلاق کی روح شاعری کی روح کیساتھ پیوست ہو گئی ہے۔

عبدالرؤف عروج

عبدالعزیز خالد اردو کے مشکل شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنی مشکل پسندی کے ذریعے اظہار و بیان کو جو وسعتیں دی ہیں وہ گہرے مطالعہ و فکر کے بغیر ممکن نہیں۔

نسرین حبیب

ایک عظیم شاعر کی عظمت کو اس طور پر تسلیم کرنا بذاتِ خود عظمت ہے۔ خالد کا فن، خالد کی شاعری، خالد کی شخصیت خالد کی ذات غرض خالد ہشت پہلو نگینے کی طرح "ستارہ" میں جگمگا رہے ہیں۔

منظور سعید احمد

ہند و پاک کے مشہور اور منفرد شاعر جناب عبدالعزیز خالد کسی تعارف کے محتاج نہیں علمی اعتبار سے ان کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی اور شاعر کو نصیب نہیں۔ بقول احمد ندیم قاسمی "ہم ان کے مقابلے میں جاہل ہیں"۔ وہ بیک وقت اردو، فارسی، عربی ہندی، سنسکرت اور انگریزی میں کمال دسترس رکھتے ہیں۔ ماہنامہ سیارہ نے خالد نمبر میں برصغیر کے نامور مشاہیر نے خالد کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ موصوف کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے گہرا لگاؤ ہے۔

اعجاز شاہد

— لیکن خالد ایسا وسیع و عریض سمندر ہے جس کی گہرائیوں کا اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے۔

اظہر جاوید

"تحریریں" کے خالد نمبر پر میری طرف سے مبارک قبول فرمائیں۔ رب العزت آپ کی محنتوں کو مزید ثمر بار کرے۔ اور دوستوں کی محنتوں کو استواد۔

اطہر صدیقی

عبدالعزیز خالد بلاشبہ اس عہد کے اہم ترین شاعر ہیں اور ان کی CONTRIBUTION اپنے ہر معاصر سے زیادہ بھی ہے اور لائق توجہ بھی۔

میری رائے میں ان کے نام کے ساتھ مشکل گوئی کو ایک لازمہ قرار دے دینا دراصل ارادی یا غیر ارادی طور پر ان کے اصل کام سے توجہ ہٹانے کے مترادف ہے۔ ان کا اپنا ایک رنگ ہے جسے جو بھی نام دیا جائے بہرحال

ان کا اپنا ہے اور یہی رنگ انہیں دوسرے ہمعصروں سے ممیز بھی کرتا ہے۔ مشکل اور آسان کے الفاظ تو ویسے بھی اضافی RELATIVE ہیں۔ ہر تحریر کسی کے لئے آسان اور کسی دوسرے کے لئے مشکل کہلا سکتی ہے۔ حتمی طور پر کسی بھی تحریر پہ مشکل یا آسان کا لیبل لگانا ممکن نہیں۔

ڈاکٹر نگہت فاطمہ

عبدالعزیز خالد اس عہد کے اہم ترین شاعر ہیں جن کی شاعری میں زبان و بیان کی انفرادیت، فن کی بلندی اور مقصدیت کی لہر نمایاں ہے۔ اقبالؒ کے بعد عبدالعزیز خالد اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں مصروف ہیں جسے اقبالؒ نے اپنی شاعری بلکہ زندگی کے مقصد کے طور پر قبول کیا تھا۔ خالد کی شاعری کا مطالعہ صرف زبان و بیان کی چاشنی ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ اس کے مقصدی پہلو کو پیش نظر رکھا جائے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ خالد کی شاعری کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچایا جائے اور انہیں ان کے قومی اور ملی مقاصد سے آگاہ کیا جائے۔ بلاشبہ خالد صرف علم و فن ہی کی خدمت نہیں کر رہے بلکہ اس دور میں جب کہ اخلاقی سطح پر قوم کو بیدار کرنے کی سخت ضرورت تھی وہ اہم قومی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔

رخسانہ صولت

واقعی ہوچی منہ کی عظیم تصنیف کو اپنی سلیس زبان میں پڑھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کر کے جناب خالد نے ہم پہ احسان کیا ہے۔

عابدہ ناہید

عبدالعزیز خالد کے فن پر تنقید تو چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہے۔ زندگی کے خزانے سے ہی ہر شخص جیب و دامن بھرتا ہے ـــ زندگی کو سمجھنے اور اس کو شعر و سخن کے کام میں لانے کی صلاحیت خالد میں بہت زیادہ ہے۔ خالد کی غزل تو اس مقام پر ہے جہاں بلندیوں کے شبستانوں کے کلس واضح طور پہ نظر آتے ہیں۔

ماہنامہ "تحریریں" لاہور

عبدالعزیز خالد

خروشِ خُم

اے شاعر!

(ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیارپوری، یوسف ظفر، مختار صدیقی،
سراج الدین ظفر کی یاد میں)

تو دشتِ درد میں کیا ڈھونڈتا ہے اے شاعر
نشانِ گمشدگاں؟ نقش ہائے راہرواں؟
ہے تیری پلکوں پہ کس کے زوال کا سایہ؟
ہے تیرے ہاتھ میں کس کے خیال کا داماں؟
ہوا سے کس کو ملا ہے گئے ہوؤں کا سراغ
الٹتی رہتی ہے دائم بساطِ ریگِ رواں
بہار سے زرِ پائیز کا تقاضا کیوں
خزاں سے ہوں دیتِ خونِ لالہ کا خواہاں
ہوا ہے کس کا جگر خوں؟ بجھا ہے کس کا چراغ
شفق کی آگ میں شامل ہے کس کے دل کا دھواں
فروغِ رنگ کا موسم ہے، رُت ہے پت جھڑ کی
نکلتے بیٹھتے دِن کیا ہے مغربِ جہاں کا سماں
یہ سوزِ عشق کا عالم، یہ سینہ کاویٔ غم
بہشت ہے کہ جہنم؟ بہار ہے کہ خزاں
نواحِ کوہِ ندا میں لوٹتی بازپسیں
تو کھینچتا ہے عبث انتظارِ ہم نفساں

گرانیٔ شبِ ہجراں ہے جانگسل، لیکن
کہیں نہ روگ کا درمن، نہ درد کا درماں
گماں ہے اپنی ندا پر صدا بصحرا کا
ہے برگِ نے میں تپاں میری نیم سوز فغاں
ہر احتمال دگرگوں ہے، واژگوں ہر شے
ہے زیرِ تیشۂ دعا، شہرِ آرزو زنداں
یہ رشتے بستے دلوں کی شکستگی بارو
کریں گے خانہ خراب اب قیامِ لیل کہاں
نرالی رسم نکالی ہے اب کے رندوں نے
خرابے مرگ کے آباد، میکدے ویراں
دلوں کے محرم اِک اِک کرکے اٹھتے جاتے ہیں
ملے کہیں سے تو لا آبِ چشمۂ حیواں
وہ جن سے ہم شرفِ اختصاص رکھتے تھے
انیسِ سینہ فگاراں، کفیلِ خستہ دلاں
جو اپنی آگ میں جلتے تھے شمع کی صورت
تھا چاک جن کے گریباں کا مطلعِ تاباں

مدام کے راز تیاتے سے جانب لیتے تھے
عیاں تھے جن پہ معانی کے معنیٔ پنہاں
خدایگانِ ہنر، آزرانِ فکر و نظر
صنم پرست، خدامست، مختلف، یکساں
ہنروروں میں تکبر بھی ہو، حلیمی بھی
شفیعِ مجرمِ جفا ہے جمالِ گلبدناں
کلام اِن کا خوش اسلوب، سادہ و پرسوز
دماغ اِن کے درخشاں طبیعتیں جولاں
نیاز و ناز، غزال و غزل کا سوز و گداز
نگاہِ نیم رسِ نوبراں ہے آفتِ جاں
وہ اپنے دل کا ہمیشہ کشادہ رکھتے تھے
چمن سرشت، مرنجاں مرنج، فیض رساں
گمانِ رنجشِ خاطر کبھی نہ ان سے ہوا
کہ تھا خیالِ ملال ان پہ تہمت و بہتاں
حریفِ حوصلۂ نارسا وہ شوقِ فضول
سمجھتے بوجھتے کھاتے فریبِ حُسنِ بتاں
کبھی حرم میں کبھی سومنات و کاشی میں
تلاشِ منزلِ شب میں رہے جو سرگرداں
کٹی ہے مرگِ مسلسل میں زندگی جن کی
مجرمِ عشق کی تعزیر ہے اے اہلِ جہاں

نہ دن کو اذنِ تماشا نہ شب کو رخصتِ خواب
کڑی ہے کتنی سزائے نصورِ جاناں
گراں فروشیٔ پیرِ مغاں کی لے دیکھیے
کہ خونِ نابِ جگر ہے بہائے رطلِ گراں
ہنر کی بات چلے تو باایں ہمہ رونق ہے
ہے ارضِ پاک وطن ایک شہرِ نا پرساں
چڑھا ہے نشہ وہ عیش گریزیا کہ نفس
دماغِ محرقِ دل ہے کسی کے پاس یہاں
نہ دردمند نہ جوہر شناسِ استعداد
جھکیں کسی سے نہ زرِ داغِ دل کے دام یہاں
گرہ میں مال ہے جن کے وہ اہلِ دشمن نہیں
جو اہلِ ذوق ہیں مفلوک و بے سر و ساماں
رقم ہیں چہروں پہ اسبابِ خانہ ویرانی
عیاں ہیں آنکھوں سے اسرارِ گردشِ دوراں
نہیں وفا کے شہیدوں کا خوں بہا کوئی
عدم کے جاوے کریں طے بکاوشِ مژگاں
ستائے خاکِ سیہ میں دباتے جاتے ہیں
تفو رسم و رواج طلسمِ نوِ انساں
خدا انہیں غمِ پرسش سے بے نیاز کرے
وہ مہربان ہمارے وہ بے نظیر انساں

[illegible] ادیب صدیقی ایڈیٹر پبلشر نے [illegible] نقوش پریس [illegible] لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ تحریریں [illegible] لاہور سے شائع کیا